تفسیر نمونہ موضوعی
پیام قرآن
از
آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی
ترجمہ
مولانا سید صفدر حسین نجفی
مصباح القرآن ٹرسٹ

تفسیر موضوعی

جلد ششم

زیر نظر

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

اہل قلم کی ایک جماعت

مولانا قیصر عباس

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

نام کتاب ---------------- تفسیر موضوعی : پیامِ قرآن

جلد ---------------------- ششم

مؤلف ------------------ آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم ------------------ مولانا قیصر عباس

فنی معاون ---------------- قلب علی سیال

کمپوزنگ ----------------- فضل عباس سیال (الحمد گرافکس لاہور)

سال اشاعت --------------- جون 2012ء

ناشر -------------------- مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ مکمل سیٹ (جلد اوّل تا دہم) ------ 3000 روپے

اس کتاب کی اشاعت کیلئے مدینۃ العلم فاؤنڈیشن کراچی نے بطور قرضِ حسنہ تعاون فرمایا ہے ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم ان کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے اور ان کے مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ ادارہ۔

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

www.misbahulqurantrust.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ ! مصباح القرآن ٹرسٹ ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِحاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشر واشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

دورِحاضر میں جب تفسیر قرآن کی بات ہوتو ذہن میں انہی کتب کا تصور آتا ہے جو عموماً صدرِاوّل سے لے کر آج تک لکھی جارہی ہیں کہ جن میں سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے مطابق نوبت بہ نوبت ان کی تفسیر کی جاتی ہے۔مگر تفسیر قرآن کا یہی ایک طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کتابِ الٰہی کی تفسیر کے پانچ طریقے ہیں۔۱۔تفسیر مفرداتی ۲۔تفسیر ترتیبی ۳۔تفسیرِ موضوعی ۴۔تفسیر ارتباطی ۵۔تفسیرِ کلی۔

تفسیر کے پہلے دوطریقے عام طور پر متعارف ہیں۔بلاشبہ تفسیر قرآن کا قدیمی طریقہ یہ رہا ہے کہ بالترتیب ایک کے بعد دوسری سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کی جاتی ہے۔لیکن آیت اللہ جعفر سبحانی اور آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی نے تفسیر کی ایک نئی روش اپنائی ہے کہ جس میں کسی اصل وفرع یا مضمون وعنوان سے تعلق رکھنے والی آیاتِ قرآنی کو ایک مقام پر لاکر ان کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔چونکہ اس میں ہر عنوان اور موضوع کی جملہ آیات اور ان کی تفسیر یکجا کردی گئی ہے،لہٰذا اس کو تفسیر موضوعی کا نام دیا گیا ہے۔

ادارہ ہذا کے ذریعے تفسیرِ موضوعی کا 12 جلدوں پر مشتمل پہلا سلسلہ (قرآن کا دائمی منشور) منظر عام پر آچکا ہے۔تفسیر موضوعی کا زیرِ نظر سلسلہ (پیام قرآن) جو کہ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی سعیٔ جمیل کا نتیجہ ہے،اس کی دس جلدیں (جلد اوّل تا جلد دہم) قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''تفسیر موضوعی۔ پیامِ قرآن جلد ششم'' کا اردو ترجمہ مولانا قیصر عباس نے کیا ہے۔جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔اس کتاب کی اشاعت میں مدینۃ العلم فاؤنڈیشن کراچی نے بطور قرضِ حسنہ تعاون فرمایا ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہرِ نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے۔اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔

مزید برآں مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ تیاری کے آخری مراحل میں ہے۔جون 2012ء تک آپ ہماری تمام کتب ہماری ویب سائٹ www.misbahulqurantrust.com کے ذریعے گھر بیٹھے پڑھ سکتے ہیں۔۔۔۔والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست

تفسیر موضوعی: پیامِ قرآن جلد نمبر 6

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اہداء

ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید سے عشق کی حد تک محبت کرتے ہیں۔

ان لوگوں کے نام جو اس چشمہ زُلال سے زیادہ آب حیات نوش کرنا چاہتے ہیں۔

ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید کو زیادہ سے زیادہ جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔

۱۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد رضا آشتیانی

۲۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد جعفر آملی

۳۔ حجۃ الاسلام آقائے عبدالرسول حسنی

۴۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد اسدی

۵۔ حجۃ الاسلام آقائے حسین طوسی

۶۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد محمدی

کے تعاون اور ہمکاری کے ساتھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

تفسیر موضوعی اور اُس کے موضوعات

تفسیر موضوعی کیا ہے اور کن مسائل کو حل کرتی ہے ان دو اہم سوالوں کا جواب اس کتاب اور اسی طرح کی دوسری کتابوں کے صحیح اور بہتر طور پر سمجھنے میں بہت معاون ثابت ہوگا، جب تک ان دو سوالوں کا جواب واضح نہ ہو جائے اس وقت تک یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ اس طرح کی کتب کن مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہیں۔

پہلے سوال کے جواب کے سلسلے میں ہم اس بات کی یاد دہانی کرواتے ہیں کہ قرآن مجید ۲۳ سال کے عرصے میں مختلف معاشرتی حالات، مختلف واقعات اور معاشرے کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے بتدریج نازل ہوا اور اسلامی معاشرے کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا۔

مکہ میں نازل ہونے والی سورتوں کی آیات کا بنیادی محور توحید اور معاد پر ایمان کی بنیادوں کو مضبوط کرنا و شرک و بُت پرستی کے ساتھ مسلسل و بے امان مقابلہ و مبارزہ ہے جب کہ مدینہ میں نازل ہونے والی سورتیں چونکہ اسلامی حکومت کی تشکیل کے بعد نازل ہوئی ہیں، لہذا طبعی طور پر اُن کی آیات کا مطمع نظر یہ تھا کہ اسلام کے اجتماعی، عبادتی اور سیاسی احکام کے ساتھ بیت المال کی تشکیل، اسلام کا عدالتی اور قضائی نظام، صلح اور جنگ سے متعلق مسائل، منافقین اور اسی طرح کی دوسری جماعتوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت جن سے اسلام نبرد آزما تھا، کے بارے میں احکام و مسائل بیان کئے جائیں۔

ظاہر ہے کہ یہ مسائل کسی فقہی مسائل کی کتاب یا درسی اور کلاسیکی کتاب کی صورت میں بیان نہیں ہوئے تھے بلکہ مختلف مناسبتوں، ضرورتوں اور احتیاجات کو مدنظر رکھتے ہوئے آیات نازل ہوتی ہیں، مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد، جنگی قونین، پیمان صلح، قیدیوں، تاوان جنگ اور اسی طرح کے دوسرے مسائل سے مربوط احکام ہر جنگ میں، اس جنگ کی مناسبت سے، جدا جدا نازل ہوئے ہیں بالکل ایک ماہر حکیم کے نسخوں کی طرح کہ جو ہر روز بیمار کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے نسخہ تحریر کرتا ہے تاکہ اسے صحت یابی کی منزل تک پہنچا دے۔

اگر ہم قرآن کی آیات کی تفسیر ان سورتوں کے لحاظ سے ترتیب وار کریں جن میں وہ نازل ہوئی ہیں تو اس کا نام ''تفسیر ترتیبی'' ہوگا، اسی طرح اگر ایک موضوع سے متعلق آیات کو پورے قرآن سے جمع کرنے کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر اور ان کی باب بندی کرنے کے بعد تفسیر کریں تو اس کا نا ''تفسیر موضوعی'' ہوگا۔

مثلاً اگر ہم جہاد سے متعلق تمام آیات کو جو دس سال کے عرصے میں مدنی سورتوں میں نازل ہوئی ہیں یا اسمائے خدا اور صفات خدا سے متعلق ۲۳ سال کے عرصے میں پورے قرآن میں نازل ہونے والی آیات کو جمع کر کے ایک دوسری کے ساتھ ملائیں اور ایک دوسری کے ساتھ ان کے تعلق اور رابطے کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی تفسیر کی جائے تو یہ ''تفسیر موضوعی'' کہلائے گی جب کہ ہر آیت کو اس کی جگہ پر الگ سے مورد بحث قرار دینے کا نام ''تفسیر ترتیبی'' ہے۔

تفسیر کی ان دونوں قسموں میں سے ہر ایک کی چند خصوصیات جو ہمیں ایک کو چھوڑ کر دوسری کو سمجھنے سے بے نیاز نہیں کرتی بلکہ ''ہر چیز اپنی جگہ پر خوب ہے'' کے مصداق کے طور پر قرآن شناسی کے سلسلے میں کام کرنے والوں کے لئے ان دونوں قسموں سے کام لینا ضروری ہے (البتہ کام کے پہلے مرحلے میں تفسیر ترتیبی ہے اور دوسرے مرحلے میں تفسیر موضوعی)۔

تفسیر ترتیبی کی خصوصیات:

اس میں ہر آیت کا اس کے نزول کے زمان اور مکان کے ساتھ اور اس کے ماقبل و مابعد کی آیات کے ساتھ ارتباط ملحوظ رکھا جاتا ہے، نیز اس میں ہر آیت کے خارجی اور داخلی قرائن کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا مقام واضح کیا جاتا ہے، ان تمام امور کے بغیر آیت کے دقیق اور وسیع معنی کو سمجھنا امکان پذیر نہیں ہوتا۔

دوسرے لفظوں میں تفسیر ترتیبی ہر آیت کو اس کے مقام اور محل پر دیکھتی ہے اور اسلامی معاشرے کی زندگی، ترقی اور تکامل کے ساتھ اس کے رابطے کو مدنظر رکھتی ہے یہ تعلق کئی مسائل کو حل کرتا ہے۔

تفسیر موضوعی میں آیات اپنی جزئی اور انفرادی حیثیت سے نکل کر ایک عمومی اور کلی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور اپنی مخصوص جگہ سے کسی حد تک بالا ہو جاتی ہیں۔

تفسیر موضوعی کی خصوصیات:

''تفسیر موضوعی'' مندرجہ ذیل مسائل کو واضح کرتی ہے:

۱۔ ایک موضوع کے مختلف اور ان متفرق پہلوؤں کو جو مختلف آیات میں بیان ہوئے ہوتے ہیں، ایک جگہ جمع کر دیتی ہے اور موضوعات کو ان کی مختلف جہات اور جامع صورت میں مدنظر رکھتی ہے، لہذا طبعی طور پر نئے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔

۲۔ بادی النظر میں بعض قرآنی آیات میں جو ابہام محسوس ہوتا ہے وہ اس بنیادی قانون ''القرآن یفسر بعضہ بعضا'' آیات قرآن ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں'' کو مدنظر رکھتے ہوئے دور ہو جاتا ہے۔

۳۔ اسلامی تصور کائنات اور مجموعی طور پر ہر مسئلے اور موضوع سے متعلق اسلام کے نکتہ نظر کو واضح کرتی ہے۔

۴۔ قرآن میں مخفی بہت سے رازوں سے فقط تفسیر موضوعی کے طریقے سے پردہ اٹھایا جا سکتا ہے اور آیات کی گہرائیوں اور گیرائیوں تک،

جہاں تک کہ انسانی بساط کی پرواز ہے، رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

لہذا کوئی بھی باریک بین مسلمان تفسیر کی ان دومختلف قسموں سے بے نیاز نہیں۔

بہت پہلے سے، یہاں تک کہ آئمہ معصومین علیہم السلام کے زمانے میں بھی تفسیر موضوعی کی طرف توجہ دی جاتی رہی اور مسلمان مفکرین نے اس سلسلے میں کئی کتابیں تحریر کیں جن میں سے بہترین نمونہ ''آیات الاحکام'' سے متعلق کتب ہیں، لیکن اس امر کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ تفسیر موضوعی اپنی شیان شان ترقی وتکمیل سے محروم رہی اور ابھی تک اپنے ابتدائی مراحل طے کررہی ہے، مفکرین اور علماء کی شبانہ روز کاوشوں کے ذریعے اسے اپنے مقام تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔

زیرنظر کتاب ''پیام قرآن'' میں بالکل نئے طریقے سے کام لیتے ہوئے قرآن کی تفسیر موضوعی کے سلسلے میں قدم اٹھایا گیا ہے، بحمداللہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے اس کی حوصلہ افزائی کی ہے اور یہ سلسلہ روز بروز آگے بڑھ رہا ہے لیکن پھر بھی یہ اس راستے پر پہلا قدم ہے منزل تک پہنچنے کے لئے علمائے اسلام اور مفسرین کی علمی اور فکری راہنمائی اور تعاون کی اور زیادہ ضرورت ہے، ہم ہمیشہ سے اہل نظر وفکر کی تعمیری اور مثبت رائے کے منتظر رہے ہیں اور ہیں۔

ہم خداوند تعالیٰ سے اس سے زیادہ توفیق اور ہدایت کے طالب ہیں۔

ناصر مکارم شیرازی

حوزہ علمیہ۔قم

قیامت کی منزلیں

''قیامت'' کا موضوع بہت وسعت رکھتا ہے کیونکہ یہ ایک بہت وسیع دنیا کے سلسلے میں گفتگو کرتا ہے چونکہ وہ ایک پر اسرار دنیا ہے اور ہماری دنیا سے بہت مختلف ہے، لہٰذا اس سلسلے میں ہونے والی گفتگو بھی فطرتاً کسی حد تک پیچیدہ اور پر اسرار ہوگی۔

لیکن دو وجہوں سے یہ گفتگو بہت ''جاذب'' اور ''پر کشش'' ہے۔

ایک تو اس لئے کہ یہ نیا موضوع ہونے کی وجہ سے ہر انسان کے احسان تجسس کو ابھارتی ہے اور دوسرے یہ کہ قیامت کے موضوع کے متعلق بحث، بالخصوص اس کی جزئیات کے بارے میں گفتگو انسان کی روح کی تہذیب اور تزکیہ کے لئے بہت بڑے نفسیاتی اور تربیتی اثر کی حامل ہے، بلکہ طبعی طور پر یہ انسان کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اس موضوع پر کی جانے والی گفتگو اپنے دامن میں اتنے ظریف، جاذب توجہ اور قابل سماعت نکات کی حامل ہے جو کسی اور موضوع کے سلسلے میں موجود نہیں ہیں۔

پہلے تو ہمارا خیال تھا کہ ''قیامت بزبان قرآن'' جیسے موضوع سے متعلق تمام بحثوں کو ایک مجموعے اور ایک جلد کی صورت میں قارئین کے سامنے پیش کریں، اسی وجہ سے جہاں تک ممکن ہوسکا ہم نے مباحث میں اختصار سے کام لیا (البتہ اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا کہ ان مسائل کو پیش کرنے کے سلسلے میں کسی طرح کی خامی نہ رہے) لیکن جب ہم نے قرآنی آیات کے بیکراں سمندر میں اپنی فکر کی تنگی داماں کے ساتھ غوطہ زن ہونے کی کوشش تو ہمارے ہاتھ ایسے ایسے قیمتی موتی لگے جن کا ایک مجموعے میں جمع کرنا امکان پذیر نہ تھا، چونکہ اس صورت میں وہ کتاب ایک ہزار صفحات سے کم نہ ہوتی، لہٰذا اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا کہ ہم اپنی پہلی رائے میں تجدید نظر کرتے اور اس مجموعے کو دو جلدوں میں شائع کرتے۔

حسن اتفاق سے پہلی اور دوسری جلد کی ابحاث ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں، گذشتہ جلد میں گفتگو کا محور معاد سے مربوط کلیات اور اساسی نکات تھے، جب کہ اس جلد میں معاد کی جزئیات اور خصوصیات کو قرآنی نکتہ نظر سے زیر بحث لایا گیا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اگر ہم معاد کے موضوع کو ایک بلند اور باعظمت عمارت سے تشبیہ دیں تو گزشتہ جلد میں اس عمارت کی بنیادوں کی تعمیر کی گئی اور اس جلد میں اس عمارت کی ژرف نگاری اور تزئین و آرائش کا کام کیا گیا ہے، اسی وجہ سے اس کا نام ''منازل آخرت'' یا ''قیامت کی منزلیں'' رکھنا بالکل مناسب ہے۔

اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ معاد کی بحث عمومی طور پر اور اس کی جزئیات سے متعلق گفتگو خصوصی طور پر بہت سے سوالات کو ذہن میں ابھارتی ہے، جہاں تک ہماری طاقت میں تھا ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ ان تمام سوالوں کے جوابات خود قرآن یا روایات اور علمی و منطقی دلائل کے ساتھ دیئے جائیں، ان اہمیت کے حامل مشکل مفاہیم کو ذہن کے قریب کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے، نیز ہماری یہ بھی سعی

رہی ہے کہ ان مطالب کی وضاحت کے لئے واضح اور روزمرہ مثالوں سے بھی کام لیں، تفسیر اور عقائد سے مربوط مباحث کے سلسلے میں جو ہمارے تجربات تھے انہیں بھی پیش نظر رکھا گیا ہے، امید ہے کہ اس کوشش کے ذریعہ اس راستہ میں توفیق ہمارے شامل حال رہی ہوگی، البتہ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

یقینی طور پر یہ کتاب آئندہ آنے والے لوگوں کے لئے راہ ہموار کرے گی کیونکہ کوئی شخص بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس سلسلے میں اس نے حرف آخر کہہ دیا ہے اور کہنے کے لئے کوئی اور بات باقی نہیں رہی۔

خداوند عالم ہمیں علم، عمل، تحریر، گفتگو اور ہر طرح کے باقی امور میں ہر قسم کی لغزش سے اپنے لطف وکرم کے ساتھ، محفوظ رکھے اور ہمیں اپنی رحمت اور لطف کے سائے میں اس منزل سے اصلی منزل یعنی اپنی رحمتوں کی جلوہ گاہ ''جنات عدن''، ''جنۃ الخلد'' تک صحیح وسالم پہنچائے کہ ان سنگلاخ راہوں سے عبور اس کی عنایت والطاف کے بغیر کسی کے لئے ممکن نہیں۔

ناصر مکارم شیرازی

قم۔حوزہ علمیہ

شعبان۔۱۴۱۱

اسفند ۱۳۶۹ ھ ش

اَشْرَاطُ السَّاعَةِ

قیامت کی نشانیاں

اشارہ:

حقیقت میں پہلی منزل قیامت کی علامتوں سے شروع ہوتی ہے یہ حقیقت قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں قیامت کے نزدیک ہونے کی علامتوں کو بہت سی آیات میں بیان کیا گیا ہے، یہ علامات ''اشراط الساعۃ'' کے نام سے مشہور ہیں، جیسا کہ آگے بیان ہوگا، یہ نام بھی قرآن مجید سے ہی لیا گیا ہے، ''اشراط'' جمع ہے، اس کا واحد ''شرط'' (بروزن ہدف) ہے، اس کے معنی ''نشانی'' ہیں اور ''ساعت'' یہاں پر قیامت کے معنی میں ہیں۔

یہ نشانیاں وہ اہم واقعات اور خوف ناک حادثات ہیں جو قیامت سے پہلے وقوع پذیر ہوں گے، ہر ایک نشانی دنیا کے خاتمہ کا اعلان ہوگی، یا قیام قیامت کے آغاز کی علامت، قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ واقعات ایک طرح کے نہیں ہوں گے، بلکہ ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے ایک طائرانہ نظر سے انہیں تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ وہ اہم حوادث جو اس جہان کے اختتام سے پہلے وقوع پذیر ہوں گے۔

۲۔ وہ ہولناک واقعات جو اس جہان کے خاتمے کے ساتھ ہی رونما ہوں گے۔

۳۔ وہ لرزا دینے والے حادثات جو قیامت کے آغاز اور نئی زندگی کی طرف لوٹنے کے ساتھ منصۂ شہود پر آئیں گے، ان میں سے ہر کیفیت قابل غور ہے۔

مندرجہ بالا مختصر گفتگو کے ساتھ ہم دوبارہ قرآن کی طرف پلٹتے ہیں، پہلے ہم قسم اول کے واقعات کے متعلق گفتگو کرتے ہیں اور ان سے متعلق آیات پر غور وفکر کرتے ہیں:

۱۔ فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۖ فَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا ۚ

؎ محمد:۱۸

۲۔ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴿القمر:۱﴾

۳۔ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ۱۰ ﴿الدخان:۱۰﴾

ترجمہ:

۱۔ پس کیا وہ انتظار نہیں کرتے مگر قیامت کا کہ وہ ان کے پاس اچانک آجائے (تب وہ ایمان لائیں گے) جب کہ اس کی نشانیاں آ گئی ہیں۔

۲۔ قیامت کی گھڑی قریب آ گئی اور چاند شق ہو گیا۔

۳۔ تو اس دن کا منتظر رہ جب آسمان پر ایک ظاہر دھواں چھا جائے گا۔

تفسیر اور جمع بندی آیات

قیامت کی نشانیاں واضح ہوگئیں!

موردِ بحث آیات میں پہلی آیہ مبارکہ میں ''اشراط الساعۃ'' کے موضوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، لیکن اس کے مصداق کو بیان نہیں کیا گیا، ارشاد ہوتا ہے ''کیا وہ (کافر اور مذاق اڑانے والے افراد) اس کے علاوہ کسی اور چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ناگہاں قیامت آجائے اور اس وقت وہ ایمان لائیں، جب کہ اس کی علامتیں تو واضح ہوگئی ہیں (فهل ينظرون الا الساعة ان تاتيهم بغتة فقد جآء اشراطها) لیکن جب قیامت آ گئی تو اس وقت ان کا ایمان لانا فائدہ مند نہیں ہوگا، (فانى لهم اذا جاء تهم ذكرهم)۔

جس طرح پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے ''اشراط'' جمع ہے ''شرط'' کی جس کے معنی علامت اور نشانی ہیں، لہٰذ ''اشراط الساعۃ'' کے معنی قیامت کی نشانیاں ہوگا، لیکن ان نشانیوں کے وقوع پذیر ہونے سے کیا مراد ہے جس کی طرف مندرجہ بالا آیت نے اشارہ کیا ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

اکثر مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہاں پر ''اشراط'' سے مراد نبی اکرمؐ کی بعثت وقیام اور آخری آسمانی کتاب یعنی قرآن مجید کا نزول ہے، اس بات پر گواہی کے طور پر ہم نبی اکرمؐ کی ایک مشہور حدیث پیش کرتے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا:

بعثت انا والساعة كهاتين، وضم السبابة والواسطى۔

''میری بعثت اور قیامت ان دو کے مانند ہیں'' اپنی دو مبارک انگلیوں کی طرف اشارہ کیا اور ''شہادت'' کی انگلی کو

بڑی انگلی کے ساتھ ملایا۔[1]

بعض مفسرین نے "شق القمر" والے واقعے کو بھی "اشراط الساعة" میں قرار دیا ہے، یہ تمام باتیں اس صورت میں ہیں کہ ان سے مراد قیامت کے نزدیک ہونے کی علامتیں ہوں نہ کہ اس کے امکان کی علامتیں، جب کہ بعض مفسرین نے دوسرے معنی کو اختیار کیا ہے، انہوں نے کہا ہے کہ مٹی سے انسان کو پیدا کرنا اور زمین و آسمان کی تخلیق، یہ سب کچھ مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر خدا کی قدرت کی علامتیں ہیں، اس صورت میں معاد کے امکان پر جو دلائل بھی لائے جائیں وہ قیامت کی علامتوں اور "اشراط الساعة" میں شمار ہوں گے (غور کیجئے گا)۔

لیکن پہلے معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں کیونکہ روایات میں ایسے امور کو قیامت کے نزدیک ہونے کی علامتوں اور "اشراط الساعة" کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے، جیسے یہ حدیث جو پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے، آپؐ نے فرمایا:

من اشراط الساعة ان یرفع العلم، ویظهر الجهل، ویشرب الخمر و یفشوالزنا۔

"قیامت کی علامتوں میں بساطِ علم کا اُٹھ جانا، جہالت کا عام ہو جانا، شراب نوشی اور زنا کا عام ہو جانا ہے"۔[2]

نیز بعض روایات میں حضرت مہدی (ارواحنا فداہ) کے ظلم و فساد کے خلاف قیام اور معرکے کو بھی "اشراط الساعة" میں سے شمار کیا گیا ہے۔

قیامت نزدیک آ گئی:

دوسری آیت میں قیامت کے نزدیک ہونے اور چاند کے شق ہو جانے کے متعلق گفتگو ہے، ارشاد ہوتا ہے۔ "قیامت نزدیک آ گئی اور چاند شق ہو گیا"۔ (اقتربت الساعة وانشق القمر)

یہ ایک ایسا واقعہ تھا جو ایک طرف تو خدائے بزرگ و برتر کے ہر چیز (ضمناً مردوں کے زندہ کرنے) پر قادر ہونے کی دلیل تھا، دوسری طرف خدا کے آخری سفیر پیغمبر اکرمؐ کے دعوئ کی تصدیق کرتا تھا، اور قیامت کے نزدیک ہونے کی حکایت بھی کرتا تھا، کیونکہ جیسے گزشتہ آیت کی تفصیل میں یہ بات گزر چکی ہے کہ خود آنحضرتؐ نے فرمایا:

"میری بعثت قیامت کے نزیک ہونے کی علامتوں میں سے ہے۔"

لیکن بعض دوسرے مفسرین، جن میں کئی گذشتہ اور کئی موجودہ مفسرین شامل ہیں، کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت ان حوادث اور واقعات کی

---

[1] اس حدیث کو بہت سے شیعہ اور اہل سنت مفسرین نے تھوڑے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے جیسے مجمع البیان، تفسیر قرطبی، فی ظلال القرآن، روح البیان اور دیگر تفاسیر (آیہ زیر بحث کے ذیل ہیں)۔

[2] تفسیر نور الثقلین، ج ۵۔ حدیث ۱۴، ص ۳۷

طرف اشارہ ہے جو اس جہان کے اختتام اور قیامت کے آغاز پر ظہور پذیر ہوں گے، انہی میں سے سورج کا تاریک ہوجانا اور چاند کا ٹکڑے ٹکڑے ہوجانا ہے، رہی بات آیت کی تعبیر ''انشق'' کی جو فعل ماضی کی صورت میں ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لغت عرب میں بہت سے ایسے مسائل جن کا آئندہ واقع ہونا قطع اور یقینی ہے، انہیں ماضی کی شکل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

لیکن چند مفسرین نے اس تفسیر کو قبول کیا ہے کہ یہ آیت اُن واقعات کی طرف اشارہ ہے جو دنیا کے اختتام پر ظہور پذیر ہوں گے، کیونکہ ہر صورت میں آیت کا ظاہر ماضی اور گذشتہ واقعات کے ساتھ مربوط ہے اور اس بات پر کوئی دلیل نہیں کہ ہم کسی واضح قرینہ کے بغیر اس کے معنی مستقبل اور آئندہ کے کریں، دوسری طرف بہت سی روایات جو کہ ''فی ظلال القرآن'' کے بقول تواتر کی حد تک پہنچ چکی ہیں۔ اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ ''شق القمر'' والا معجزہ پیغمبر اسلامؐ کے زمانے میں رونما ہوا۔[1]

''المیزان'' میں مرحوم علامہ طباطبائی کے مطابق علمائے حدیث اور علمائے تفسیر دونوں نے متفقہ طور پر اس معنی کو قبول کیا ہے کہ ''شق القمر'' کا واقعہ پیغمبر اکرمؐ کے دور میں وقوع پذیر ہوا، صرف چند ایک غیر معروف مفسرین نے اس بات سے انکار کیا ہے۔[2]

ابوالفتوح رازی بھی کہتے ہیں:

''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت آئندہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی طرف اشارہ ہے، اُن کی یہ بات علماء کے اجماع اور اتفاق کے خلاف ہے''۔[3]

''شق القمر'' کیسے ہوا؟ اس معجزہ نبویؐ کی تفصیل، اس سے متعلق روایات اور جدید علوم کی نظر میں اس کے امکان سے متعلق بہت سی ابحاث ہیں، چونکہ یہ ہمارے موضوع بحث ''اشراط الساعۃ'' کی تشریح سے خارج ہیں، لہٰذا انہیں یہاں بیان نہیں کیا گیا۔

قارئین اس سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۲۳ صفحہ ۱۲ سے ۱۹ تک رجوع کر سکتے ہیں۔

جس دن غلیظ دھواں آسمان کو ڈھانپ لے گا۔

تیسری آیت میں قیامت کے نزدیک ہونے کی علامتوں میں سے ایک اور علامت کو بیان کیا گیا ہے، یہ وہ دن ہوگا جب تاریک دھواں پورے آسمان کو ڈھانپ لے گا، یہ ایک عذاب کی صورت میں آئے گا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

''اُس دن کے منتظر رہو جب آسمان پر تاریک دُھواں ظاہر ہوگا جو تمام لوگوں کو ڈھانپ لے گا، یہ دردناک عذاب ہے''۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ يَّغْشَى النَّاسَ هٰذَا عَذَابٌ

---

[1] فی ظلال القرآن۔ج ۷ صفحہ ۶۴۴

[2] تفسیر المیزان۔ج۱۹۔ص ۶۱۔۶۰

[3] تفسیر ابوالفتوح رازی۔ج ۱۰ صفحہ ۳۶۴

اَلِيۡمٌ

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان بہت بحث ہوئی ہے، البتہ تین قول قابل توجہ ہیں:

بعض مفسرین اس کو روز قیامت کے عذاب کی طرف اشارہ جانتے ہیں، جب ایک وحشت ناک اور چنگاریاں اڑانے والا دھواں مجرموں کے سروں پر آ جائے گا، لیکن یہ احتمال بہت بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ آیت کے ذیل میں ہے:

''کافر اس دن عذاب الٰہی کے ختم ہونے کی استدعا کریں گے اور ایمان کا اظہار کریں گے، اُن سے خطاب کیا جائے گا کہ ہم تھوڑے سے عذاب کو کم کر دیتے ہیں لیکن تم پھر بھی اپنے کام (کفر) کی طرف پلٹ جاؤ گے۔''

اِنَّا كَاشِفُوا الۡعَذَابِ قَلِيۡلًا اِنَّكُمۡ عَآئِدُوۡنَ ١٥ ﴿الدخان: ١٥﴾

یہ معنی قیامت میں متصور نہیں ہیں، بالخصوص اس لئے کہ بعد کی آیت میں مستقل طور پر قیامت اور اس میں دیئے جانے والے بدلہ کے متعلق گفتگو کی گئی ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس سے پہلے جو کچھ ذکر ہوا ہے وہ قیامت سے متعلق نہیں ہے۔

يَوۡمَ نَبۡطِشُ الۡبَطۡشَةَ الۡكُبۡرٰى ۚ اِنَّا مُنۡتَقِمُوۡنَ ١٦ ﴿الدخان: ١٦﴾

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت اس قحط، کشک سالی اور اسی طرح کے دیگر امور کی طرف اشارہ کرتی ہے جن میں رسول اکرمؐ کے زمانے کے کفار گرفتار ہوئے تھے، وہ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں آئے اور اس عذاب الٰہی کے خاتمہ کی درخواست کی، آنحضرت نے دعا کی اور یہ عذاب ختم ہو گیا، لیکن وہ پھر بھی ایمان نہ لائے۔

اس تفسیر کے مطابق ''دخان'' (دھواں) یہاں پر ایک مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے کیونکہ ''دخان'' کا کلمہ عربی قواعد میں ایک ہمہ گیر عذاب اور بلا کے لئے استعارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے جیسا کہ فخر رازی نے ذکر کیا ہے۔[1]

یا یہ اس اعتبار سے ہے کہ خشک سالی کے دوران بہت زیادہ گرد و غبار آسمان پر چھا جاتا ہے، اس لئے یہاں پر اسے ''دخان'' سے تعبیر کیا گیا، کیونکہ بارش گرد و غبار کے ختم کرنے میں ایک موثر حیثیت کی حامل ہے۔[2]

اس لئے قحط والے سال کو ''سنته الغبرا'' (گرد و غبار سے بھرا ہوا سال) یا ''عام الرماد'' (راکھ والا سال) کہا جاتا ہے۔

اس تفسیر پر جو اعتراض وارد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر حال میں لفظ ''دخان'' اپنے حقیقی اور اصلی معنی یعنی دھوئیں میں استعمال نہیں ہوا اور کسی قرینے کے بغیر اس کے مجازی معنی مراد لئے گئے ہیں۔

اس سلسلے میں تیسری تفسیر یہ ہے کہ آیت مبارکہ قیامت کے نزدیک ہونے کی ایک نشانی بیان کر رہی ہے کہ آسمان کو دھواں

---

[1] تفسیر کبیر۔ ج ۲۷۔ صفحہ ۲۴۲

[2] روح المعانی۔ ج ۲۵ ص ۱۰۷۔ اور روح البیان۔ ج ۸ ص ۴۰۶

ڈھانپ لے گا اور لوگ خدا کے دامن لطف کی طرف ہاتھ بڑھائیں گے، خدا اپنے لطف وکرم سے اس عذاب کو تھوڑا سا کم کر دے گا لیکن منکر پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

یہ تفسیر آیت کے ظاہر کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے اور بہت سے روایت کے بھی مطابق ہے جو شیعہ اور اہل سنت کی تفاسیر کے منابع میں ذکر ہوئی ہیں۔

رسول خداؐ سے ایک حدیث میں مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

چار چیزیں قیامت کے نزدیک ہونے کی علامتوں میں سے ہیں:

۱۔ دجال کا ظاہر ہونا۔

۲۔ عیسیٰؑ کا (زمین) پر اترنا۔

۳۔ سرزمین عدن کی گہرائیوں سے ایک آگ کا نکلنا۔

۴۔ دھواں۔

ایک صحابی عرض کرتے ہیں: دھواں کیا ہے؟

پیغمبر اکرمؐ نے مندرجہ بالا آیت کی تلاوت فرمائی:

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۱۰ ﴿الدخان: ۱۰﴾

پھر فرمایا:

"یملا ما بین المشرق والمغرب یمکث اربعین یوما ولیلة اما المومن فیصیب منه کھیئة الزکمة واما الکافر بمنزلة السکون یخرج من منخریه واذنیه و دبرہ"۔

ایسا دھواں ہے کہ جو مشرق سے لے کر مغرب تک پھیل جائے گا، چالیس دن رات تک باقی رہے گا، مومن کو زکام کی سی کیفیت محسوس ہوگی اور کافر دیوانے شخص کی طرح ہوگا، دھواں اس کی ناک، کانوں اور پیچھے سے نکلے گا۔[1]

یہی معنی تھوڑے سے فرق کے ساتھ شیعہ ماخذ میں بھی آئے ہیں جہاں امیر المومنین حضرت علیؑ نے رسول خداؐ سے نقل کیا ہے کہ قیامت سے پہلے دس چیزیں یقینی طور پر ظہور پذیر ہوں گی اور میں حضرت مہدیؑ کا ظہور، حضرت عیسیٰؑ کا زمین پر اترنا اور دھوئیں کا ظاہر ہونا ہیں۔

کچھ اور روایات بھی اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں جو اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں، لہٰذا وہی تیسری تفسیر بہترین ہے۔

---

[1] تفسیر در المنثور ج۶ ص۲۹

پہلے حصے میں ان اہم ترین ''اشراط الساعة'' کا بیان تھا جن کی طرف قرآن مجید میں اشارہ ہوا ہے۔

علامتیں جو اختتام دُنیا پر ظاہر ہوں گی

قرآن کی دوسری آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ اس جہان کے خاتمہ پر کائنات اور زمین و آسمان میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوگا، دوسرے لفظوں میں اس جہان کی موت ایک تدریجی موت نہیں، بلکہ ایک ناگہاں اور اچانک موت ہے، جو لرزا دینے والے حوادث کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہوگی۔

یہ حوادث جو قیامت کی علامتوں کا حصہ ہیں مندجہ ذیل ہیں:

۱۔ پہاڑوں کی نابودی

یہ بات قرآن کی متعدد آیات میں بیان کی گئی ہے اور اس کے لئے مختلف مراحل ذکر کئے گئے ہیں، ان کا سات مراحل میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اول پہاڑ لرزنے لگ جائیں گے:

يَوۡمَ تَرۡجُفُ الۡاَرۡضُ وَالۡجِبَالُ (مزمل۔۱۴)

۲۔ دوسرے مرحلے میں وہ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے:

وَّحُمِلَتِ الۡاَرۡضُ وَالۡجِبَالُ ﴿الحاقة: ۱۴﴾

۳۔ تیسرے مرحلے میں وہ چلنا شروع کردیں گے:

وَّتَسِيۡرُ الۡجِبَالُ سَيۡرًا ۱۰ؕ ﴿الطور: ۱۰﴾

۴۔ چوتھے مرحلے میں وہ آپس میں ٹکرانا شروع کردیں گے:

''فدکتا دکة واحدة'' (حاقہ۔۱۴) ''زمین اور پہاڑ ریزہ ریزہ کردیے جائیں گے''

چوتھے مرحلے میں یہ سنگریزوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریوں میں تبدیل ہوجائیں گے:

وَكَانَتِ الۡجِبَالُ كَثِيۡبًا مَّهِيۡلًا ۱۴ ﴿المزمل: ۱۴﴾

۵۔ پانچویں مرحلے میں گرد و غبار کی صورت میں اُڑ جائیں گے:

وَّبُسَّتِ الۡجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتۡ هَبَآءً مُّنۡۢبَثًّا ﴿الواقعة: ۵۔۶﴾

۶۔ چھٹے مرحلے میں وہ دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہو جائیں گے جو تیز ہوا کے ساتھ محوسفر ہوتی ہے اور آسمان میں فقط اس کا رنگ دیکھا جا سکتا ہے۔

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴿القارعة:۵﴾

۷۔ آخرکار ساتویں مرحلے میں فقط اُن کا ایک سایہ سا رہ جائے گا جیسے ایک لق ودق خشک صحرا میں سراب دکھلائی دیتا ہے:

وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿النبا:۲۰﴾

اس ترتیب میں پہاڑ بالکل ختم ہو جائیں گے، اُن کا نشان تک باقی نہیں رہے گا اور زمین بالکل صاف اور ہموار ہو جائے گی:

فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿طه:۱۰۶﴾ [1]

یہ عجیب اور ہولناک حوادث جو پہاڑوں پر ٹوٹ پڑیں گے، کیا یہ ان کے اندرونی دھماکوں، ان کے ایٹمی نظام کی تباہی اور ان میں موجود مخفی قوتوں کے نکلنے کی وجہ سے ہوں گے یا باہر سے ان پر کوئی کاری ضرب لگے گی، جیسے آسمانی سیاروں کا تیزی کے ساتھ آپس میں ٹکرانا جو ایک دوسرے کی طرف کشش کی شدید قوت کے باعث ہوسکتا ہے یا اس کے کوئی اور عوامل ہوں گے، جو آج ہمارے لئے نامعلوم ہیں؟

کوئی شخص ان سوالات کا یقینی اور صحیح جواب نہیں دے سکتا، موجودہ علوم بھی اس سلسلے میں کوئی وضاحت پیش کرنے سے عاجز ہیں، وہ فقط یہ کہتے ہیں کہ آسمانی کروں پر اس سے پہلے بہت بڑے دھماکے ہوئے ہیں اور اب بھی ہو رہے ہیں۔

یہاں تک کہ وہ ان عوامل کی تفسیر کرنے سے عاجز ہیں، ہمیں صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ قرآن کی گواہی کے مطابق یہ واقعات دنیا کے خاتمہ پر وقوع پذیر ہوں گے، اگرچہ ان کے اسباب کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔

۲۔ دریاؤں کا پھٹنا

اس جہان کے خاتمے اور قیامت کے نزدیک ہونے کی ایک اور علامت دریاؤں کا پھٹ جانا ہے، چنانچہ اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿الإنفطار:۳﴾

اور جب دریا پھوٹ پڑیں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] ''قاع'' ایسی زمین کے معنی میں ہے جو بالکل صاف اور ہموار ہو اور ''صفصف'' ایسی زمین کے معنی میں ہے جو کسی قسم کے سبزے سے خالی ہو، یا صاف اور ہموار زمین کے معنی میں ہے، اس صورت میں دونوں کے ایک ہی معنی ہوں گے اور یہ تاکید کے لئے ہوگا۔

وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ﴿التکویر: ٦﴾

اور جب دریا چڑھ آئیں گے۔

سورہ طور کی آیت ٦ میں متعدد اور مسلسل قسموں کے ضمن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُورِ ﴿الطور: ٦﴾

چڑھے ہوئے دریا کی قسم۔

پہلی اور دوسری آیات یقیناً ''اشراط الساعۃ'' کی طرف اشارہ کر رہی ہیں چونکہ بعد والی آیات واضح طور پر اس بات پر گواہی دے رہے ہیں، تیسری آیت کے سلسلے میں بھی یہ تفسیر کی گئی ہے کہ یہ بھی قیامت کی نشانیوں سے متعلق ہے۔

ان آیات میں ایک جگہ ''فجرت'' کی تعبیر لائی گئی ہے جو ''فجر'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی پھاڑنا ہیں، ممکن ہے یہ دریاؤں کے پھٹنے اور طغیانی کی طرف اشارہ ہو۔

یہ بات آج کل ہمارے لئے بالکل واضح ہے کیونکہ پانی دو عنصروں سے مل کر بنا ہے، یعنی ''آکسیجن'' اور ''ہائیڈروجن''، اور یہ دو عناصر جلنے کی شدید خاصیت رکھتے ہیں، اگر کچھ عوامل پانی کے عناصر کا تجزیہ کر دیں تو سب سمندر پھڑکتی ہوئی آگ کی بڑی بڑی بھٹیوں میں تبدیل ہو جائیں گے اور ایک چھوٹی سے چنگاری ہی آگ کا ایک محشر برپا کر دینے کے لئے کافی ہوگی۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ قیامت کے آنے پر شدید زلزلوں کی وجہ سے زمین پھٹ جائے گی، جس کی وجہ سے دریاؤں کا رخ ایک دوسرے کی طرف پھر جائے گا، جس کے نتیجہ میں وہ آپس میں مل جائیں گے اور زمین کے تمام چھوٹے بڑے دریا ایک ہو جائیں گے، اس آیہ کی تفسیر یہ بھی ہے۔

اس سلسلے میں تیسری تفسیر بھی موجود ہے، وہ یہ کہ پہاڑوں کے نابود ہو جانے کی وجہ سے اُن کا گرد و غبار دریاؤں میں جا پڑے گا، جس کی وجہ سے دریا بھر جائیں گے اور پانی پوری خشکی پر پھیل جائے گا۔

یہی تینوں تفسیریں لفظ ''سجرت'' کے سلسلے میں بھی کی گئی ہیں اور یہ ''تسجیر'' کے مادہ سے ہے، ''تسجیر'' حقیقت میں آگ بھر جانے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی بھڑکانے کے معنی میں بھی آتا ہے اسی وجہ سے آگ کے بھرے ہوئے تنور کو ''مسجر'' کہتے ہیں۔

دریاؤں کے شعلہ ور ہونے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ ان کے جلنے والے مادے یعنی آکسیجن اور ہائیڈورجن کا تجزیہ ہو جائے گا یا بعض اور ایسے عوامل کی بناء پر ایسا ہوگا جو ہماری نظروں سے مخفی ہیں، دریاؤں کے پر ہونے کی وجہ یا تو یہ ہوگی کہ پہاڑوں کے تباہ ہو جانے کی وجہ سے ان کا ملبہ دریاؤں میں گر جائے گا یا آسمان سے بڑے بڑے پتھر آپ میں گر جائیں گے یا کوئی دوسرے نامعلوم عوامل ہوں گے۔

۳۔تباہ کن زلزوں کا آنا

دنیا کے خاتمہ اور قیامت کی نزدیکی کی ایک اور علامت ایسے بے سابقہ اور عظیم زلزلوں کا وقوع پذیر ہونا ہے جو ہمارے پورے کرہ ارض کو ہلا کر رکھ دیں گے، تمام چیزوں کو درہم برہم کر دیں گے اور انسانوں کو منٹوں میں دفن کر کے رکھ دیں گے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ١ ﴿الحج:١﴾

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو اور تقویٰ اختیار کرو، بے شک قیامت کا زلزلہ ایک عظیم چیز ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰی وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰی وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ ٢

٢ الحج:٢

جس دن تم اسے دیکھو گے (تو اس طرح گھبرا جاؤ گے) کہ دودھ پلانے والی مائیں اپنے دودھ پینے والے بچوں سے غافل ہو جائیں گی، ہر حاملہ عورت اپنے حمل کو زمین پر گرا دے گی اور تم لوگوں کو مدہوش دیکھو گے، حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کا عذاب بہت ہی سخت ہے۔

البتہ جیسے کہ ''اشراط الساعۃ'' کے تیسرے حصے میں ذکر کیا جائے گا، مُردوں کے زندہ ہونے سے پہلے بھی ایک زلزلہ وقوع پذیر ہوگا، قرآن کی بعض دوسری آیات میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس امر کا بھی احتمال ہے کہ یہ آیت بھی اسی زلزلے سے مربوط ہو اور اس امر پر دلیل ممکن ہے ''عذاب الله شدید'' کا جملہ ہو، لیکن اس صورت میں حاملہ عورتوں اور دودھ پیتے بچوں کو مجاز پر محمول کرنا پڑے گا، یعنی اس زلزلے سے پیدا ہونے والا خوف اتنا شدید ہوگا کہ حاملہ عوت کا حمل ساقط ہو جائے گا لیکن یہ تفسیر ظاہر آیت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

بہرحال سورہ مزمل آیت نمبر ۱۴ میں بھی یہ مطلب آیا ہے:

یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ [1]

جس دن زمین اور پہاڑ لرزیں گے۔

اسی طرح سورہ واقعہ آیت نمبر ۴ میں بھی ہے:

---

[1] ''ترجف'' ''رجف'' کے مادہ (بروزن کشف) سے ہے، یہ اضطراب اور شدید طور پر کپکپاہٹ کے معنی میں آتا ہے، چونکہ فساد پھیلانے والی خبریں معاشرے پر کپکپاہٹ اور اضطراب کی کیفیت طاری کر دیتی ہیں، اس لئے انہیں ''اراجیف'' کہا جاتا ہے)

﴿اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا﴾ (الواقعة: ۵)

جب زمین بہت لرزنے لگے گی اور پہاڑ ریزہ ریزہ کردیئے جائیں گے۔

۴۔سورج، چانداور ستاروں کا بےنور ہوجانا

قیامت کی نزدیکی کی ایک اور علامت سورج کا بجھ جانا اور ستاروں کا تاریک ہوجانا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ﴾ (التکویر: ۲)

جس وقت سورج (کے نور کے صحیفے) کو لپیٹ دیا جائے گا اور ستارے تاریک ہوجائیں گے۔

''کورت'' کا ماخذ ''تکویر'' ہے جس کے لغوی معنی کسی چیز کا باندھنا اور اکٹھا کرنا، ہیں جیسے عمامے کو سر پر باندھنا، یہ کلمہ تاریک ہونے اور بجھ جانے کے معنی میں بھی آتا ہے، ظاہرا سورج کے سلسلے میں یہ دونوں معانی لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لحاظ سے کہ خورشید تدریجاً کم ہوتا، سکڑتا جارہا ہے اور پھر تاریکی وسیاہی کی جانب محوِسفر ہے۔

''انکدرت'' کا ماخذ ''انکدار'' ہے، جس کے معنی تیرگی، تاریکی یا سقوط اور منتشر ہوجانا ہیں، ظاہرا یہ دونوں معانی ستاروں کے سلسلے میں لازم وملزوم ہیں۔

قرآن کی گواہی کے مطابق اس جہان کے خاتمہ پر ہمارے شمسی نظام کا روشن ترین منبع جو تمام سیاروں کو روشن کرتا ہے، بجھ جائے گا اور ختم ہوجائے گا، ستارے بھی اسی انجام کار سے دوچار ہوں گے۔

فخر الدین رازی اپنی ایک عبارت میں کہتے ہیں کہ بعض لوگ ''کورت'' کا اصل ''کور'' سمجھتے ہیں جس کے معنی نابینا اور اندھا ہیں، یہ بھی سورج کے بجھ جانے کے معنی میں ہی ہیں۔[۱]

آج کے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ خورشید کی توانائی جو فضا میں منتشر ہوتی ہے وہ ایٹم کے مرکزی حصے کے جلنے سے حاصل ہوتی ہے جس کا ایندھن ہائیڈروجن گیس اور راکھ ہیلیم گیس (HELIUM GAS) ہوتی ہے۔[۲]

اس بناء پر ہر روز اس کرہ کے وزن میں تین لاکھ پچاس ہزار ملین ٹن کی کمی واقع ہورہی ہے، یہ چیز اس بات کا باعث بنے گی کہ سورج آہستہ آہستہ چھوٹا اور کم نور ہوجائے گا، یہ وہی سورج کا اکٹھا ہونا اور اس کی روشنی کا کم ہونا ہے، یعنی یہ ایسے دو مفہوم ہیں جو ارباب لغت کے مطابق ''تکویر'' کے مادہ میں پائے جاتے ہیں، اگرچہ موجودہ شرائط اور اس کرہ کی بڑائی کے پیش نظر اس میں سے اتنی مقدار کا کم ہونا اس پر فوری طور پر کسی قسم کا اثر نہیں رکھتا۔

---

[۱] تفسیر کبیر، جلد ۳۱ ص ۶۶

[۲] زندگی ومرگ ستارگان۔ ص ۹۲

البتہ سورج کے گھٹنے کی رفتار اگر اسی حد تک رہے تو ممکن ہے کہ اس بات کے وقوع پذیر ہونے کے لئے کئی ملین یا کئی ارب سال لگ جائیں، لیکن کوئی بھی نظام شمسی پر وقوع پذیر ہونے والے آئندہ حالات سے واقف نہیں، اس لئے ممکن ہے کہ آئندہ ایسے حالات پیش آئیں جن کی وجہ سے سورج کی اس ٹکیہ کے حجم اور نور کے کم ہونے کی رفتار تیز تر ہو جائے اور تھوڑی ہی مدت میں یہ نور اور حرارت کا عظیم اور بھڑکتا ہوا منبع بالکل خاموش ہو جائے۔

باقی آسمانی کروں کے سلسلے میں بھی یہی معنی صادق آتے ہیں۔

ستاروں کا موجودہ مظام بھی درہم برہم ہو جائے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ستاروں کے اجسام اور ان کی رفتار کے درمیان جو قوت کشش اور قوت دافعہ کا توازن وتعادل موجود ہے وہ ختم ہو جائے گا اور شاید یہ وہی بات ہے جس کی طرف قرآن نے ایک اور جگہ پر اشارہ فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۲ ﴿الإنفطار: ۲﴾

جب ستارے منتشر ہو جائیں گے۔

البتہ اس آیت کی تفسیر خدا کے فضل سے آئندہ آئے گی۔

سورہ قیامت میں ارشادہ ہوتا ہے:

فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ يَقُوْلُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿القيامة﴾

پس جب آنکھیں خوف کی وجہ سے حرکت کرنے لگیں گی، چاند کو گہن لگ جائے گا اور سورج و چاند کو اکٹھا کر دیا جائے گا تو انسان کہے گا آج کے دن بھاگنے کی جگہ کہاں ہے۔

ان آیات سے اس مطلب کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تمام واقعات اچانک وقوع پذیر ہوں گے نہ کہ آہستہ آہستہ، ورنہ اس زمانے میں تو کسی انسان کا وجود باقی نہیں رہے گا کہ جو ایسی بات کرے۔ (غور کیجئے گا)

سورج اور چاند کی بساط کا لپیٹا جانا ممکن ہے اُن کے درمیان کشش اور دفع کی قوت کے توازن کے ختم ہو جانے کی وجہ سے ہو، جس کی بناء پر چاند اپنے اصلی مرکز یعنی سورج میں جذب ہو جائے گا۔

ہم گفتگو کے اس سلسلے کو قرآن کریم کی ایک اور آیت کی طرف اشارے کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے:

فَإِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۸ ﴿المرسلات: ۸﴾

جب ستارے بے نور اور تاریک ہو جائیں گے۔

یہ تعبیر بھی مندرجہ بالا آیات کے ساتھ ہم آہنگ اور اُن کے لوازم سے ہے۔

دوبارہ اس بات کی یاددہانی کراتے چلیں کہ یہ حوادث اور مسائل اب بھی جہانِ ہستی میں جاری وساری ہیں، لیکن تدریجی شکل میں، دنیا کے خاتمہ پر ان کی رفتار بڑھ جائے گی، تندوتلخ حوادث کے ایک سلسلے کے ساتھ ہی یہ نظام کائنات ختم ہو جائے گا، اس دنیا کی عمر تمام ہو جائے گی اور خدا کے حکم سے یہ نظام ختم ہو جائے گا۔

۵۔ آسمانی کروں کا پھٹ جانا

دنیا کے خاتمہ کی ایک اور علامت ستاروں کے نظام کا درہم برہم ہونا اور آسمانی کروں کا پھٹ جانا ہے، اس کی طرف قرآن مجید کی متعدد آیات میں اشارہ ہوا ہے اور اس سلسلے میں مختلف تعبیرات نظر آتی ہیں کبھی تو ''انشقاق'' جیسی تعبیر لائی گئی ہے:

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ١ ﴿الإنشقاق: ١﴾

جب آسمان پھٹ جائے گا۔

اسی معنی کی مثل سورہ حاقہ کی آیت ١٦ میں بھی ہے:

وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ١٦ ﴿الحاقة: ١٦﴾

اور آسمان پھٹ جائیں گے، کمزور ہو جائیں گے اور گر جائیں گے۔

سورہ فرقان کی آیت ۲۵ میں بھی یہی مطلب تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ ﴿الفرقان: ٢٥﴾

(اس دن کو یاد کرو) جب آسمان بادلوں کے ساتھ پھٹ جائے گا۔

ان آیات میں ''سما'' سے مراد آسمانی کرات ہیں جو کائنات کے خاتمے پر مسلسل دھماکوں سے پھٹ جائیں گے، لیکن بادلوں کے ذریعے اُن کے پھٹنے سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں یہ احتمال پایا جاتا ہے کہ آسمانوں کے ختم ہونے کے ساتھ ہی بڑے بڑے بادل پیدا ہو جائیں گے جو آسمانوں کے گرد وغبار سے بنیں گے، (ادبی اصطلاح کے مطابق ''الغمام'' پر جو باداخل ہے وہ ملابست اور ہمراہی کے معنی میں ہے جس طرح یہ بات ''تفسیر المیزان'' میں ایک احتمال کے طور پر ذکر کی گئی ہے)[1]

البتہ علامہ طباطبائی مرحوم اس بات کو بعید نہیں سمجھتے کہ مندرجہ بالا تعبیر استعارہ ہو، یعنی مراد جہالت اور نادانی کے پردوں کا

[1] تفسیر المیزان۔ ج۱۵، ص ۲۰۲

اُٹھ جانا ہو، جس سے عالم غیب نمایاں اور واضح ہو جائے گا، (اس وقت ''با'' ''عن'' کے معنی میں ہوگی) یعنی بادل چھٹ جائیں گے اور جہان غیب منصۂ شہود پر آ جائے گا۔

لیکن جب تک اس ستعاراتی تفسیر پر کوئی دلیل نہ ہو، اس وقت تک اُسے قبول نہیں کیا جا سکتا، قابل توجہ بات یہ ہے کہ حضرت علیؑ کا ایک فرمان اس طرح ہے:

"انہا تنشق من المجرة"

آسمان کہکشاؤں کی جانب سے پھٹ جائیں گے۔[1]

یہ دلنشین تعبیر ان آخری انکشافات سے ہم آہنگ ہے جو سائنسدانوں نے کہکشاؤں کے سلسلے میں کئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو منظومہ شمسی اور ستارے ہم دیکھ رہے ہیں، یہ اُس بڑی کہکشاں کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں جسے (MALKY WAY) کہتے ہیں اور جسے دوربین کے بغیر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

اور سورج، چاند اور ستاروں کا پھٹنا اس عظیم کہکشاں کے پھٹنے کے ساتھ ہے (غور کیجئے گا)۔

اسی طرح کبھی ''انفطار'' کی تعبیر لائی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ﴿انفطار:۱﴾

جب آسمان پھٹ جائے گا۔

سورہ مزمل کی آیت ۱۸ میں بھی یہی معنی آئے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

السَّمَآءُ مُنۡفَطِرٌۢ بِهٖ

اُس دن آسمان اُس کے ساتھ ہی پھٹ جائے گا۔

جیسے پہلے بھی کہا جا چکا ہے ''انفطار'' کا اشتقاق ''فطر'' سے ہے جس کے معنی پھارنا ہیں۔

کبھی اس طرح ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتۡ ﴿التکویر:۱۱﴾

اور جب آسمان سے پردہ ہٹا دیا جائے گا۔

ممکن ہے یہ تعبیر اُن پردوں کے اُٹھ جانے کی طرف اشارہ ہو جو اس دنیا میں آسمانوں کے ملکوت، فرشتوں جنت اور دوزخ کے دیکھنے

---

[1] تفسیر فخر رازی۔ ج ۱۳، ص ۱۰۳

میں حائل ہیں، اُس دن یہ پردے اُٹھ جائیں گے اور انسان عالم ہستی کے حقائق کا مشاہدہ کرے گا اس صورت میں اس آیت کا آسمانوں کے ختم ہوجانے والے موضوع کے ساتھ ارتباط نہیں پایا جاتا۔

بعض مفسرین، جیسے مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں اس کے معنی آسمانوں (کرات آسمانی) کا اپنی جگہ سے اکھڑ جانا کئے ہیں، اس کا لازمہ بھی اس نظام ہستی کا درہم برہم ہوجانا اور اس کی بساط کا لپیٹ لیا جانا ہے۔[۱]

کبھی اس طرح ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ ﴿المرسلات: ۹﴾

اور جب آسمان پھاڑ دیا جائے گا۔

''فطر'' اور ''فرج'' کا مادہ ایک ہی معنی میں ہے یا ان میں معمولی سا فرق ہے، اسی لئے مشکلات کے دروازے کھل جانے کو بھی ''فرج'' کہتے ہیں، اس کا متضاد شدت ہے جس کے معنی مشکلات میں گھر جانا ہیں۔ کبھی ''فتح'' کی تعبیر لائی گئی ہے، چنانچہ سورہ نبا کی آیت ۱۹ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَّفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ۱۹ ﴿النبإ: ۱۹﴾

اور آسمان کھول دیا جائے گا اور وہ متعدد دروازوں میں بٹ جائے گا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تعبیر آسمانوں کے پھٹ جانے کی طرف اشارہ ہو، جیسا کہ بعض مفسرین نے اس بات کا اظہار بھی کیا ہے، اس صورت میں یہ گزشتہ آیات کے ساتھ ہم آہنگ ہوگی، یعنی آسمانی کروں میں بہت سے شگاف پیدا ہوجائیں گے، گویا پورا آسمان دروازوں اور سوراخوں میں تبدیل ہوجائے گا۔

لیکن بعض مفسرین نے اس کے استعاراتی معنی مراد لئے ہیں اور کہا ہے کہ اس سے مراد عالم غیب کے دروازوں کا کھل جانا، حجابوں کا اُٹھ جانا اور فرشتوں کے جہان کا انسانوں کے جہان کے ساتھ ارتباط قائم ہوجانا ہے۔[۲]

کبھی ارشاد ہوتا ہے:

يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَوْرًا ۹ ﴿الطور: ۹﴾

جس دن آسمان تیز گردش کرے گا۔

---

[۱] مجمع البیان۔ ج ۱۰، ص ۴۴۴

[۲] پہلی تفسیر مرحوم طبرسی، فخر رازی اور بعض دوسرے مفسرین نے کی ہے، جب کہ دوسری تفسیر کو علامہ طباطبائی نے المیزان میں اسی آیت کے ذیل میں ذکر کیا ہے

''مور''، بروزن''قول''، کبھی تو تیز حرکت کے معنی میں آیا ہے، کبھی دائرے میں گردش کے معنی میں اور کبھی آمدورفت اور بے چینی کے معنی میں آتا ہے، اس لئے جس گردوغبار کو ہوا ہر طرف لے جاتی ہے، اسے''مور''(بروزن''زور'') کہتے ہیں۔

بہرحال یہ تعبیر آسمانی کرات کے متزلزل ہونے، اُن کے نظام کے درہم برہم ہوجانے اور نیست و نابود ہوجانے کے معنی میں ہیں۔

کبھی ارشاد ہوتا ہے:

یَوۡمَ تَکُوۡنُ السَّمَآءُ کَالۡمُهۡلِ ﴿المعارج:۸﴾

جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی مانند ہوجائے گا۔

مفسرین نے''مهل''کے معنی تیل کے وہ ذرات، جو تہہ میں بیٹھ جاتے ہیں اور درختوں سے نکلنے والے ایک مضر قسم کے مادے کے ہیں، کبھی یہ لفظ پگھلی ہوئی چاندی اور سونے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، یہ آخری معنی اس آیہ کی تفسیر کے لئے مناسب تر ہیں، بہرحال کرات آسمانی میں ایسی حالت کا پیدا ہونا اُن کے نابود ہونے کے نتیجے کے طور پر ہوگا۔

آخرکار ایک لرزا دینے والی تعبیر لائی جاتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

یَوۡمَ نَطۡوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلۡکُتُبِ ؕ کَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِیۡدُهٗ ؕ وَعۡدًا عَلَیۡنَا ؕ اِنَّا کُنَّا فٰعِلِیۡنَ ﴿الأنبیاء:۱۰۴﴾

اس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹیں گے جس طرح صحیفوں میں نوشتے لپیٹے جاتے ہیں، جس طرح ہم نے اُسے پہلے پیدا کیا تھا، اسی طرح ہم اُسے دہرا دیں گے۔

یہ تعبیر جہان کے خاتمہ پر آسمانوں اور ستاروں کے دگرگوں ہونے کی مختلف جہات کو واضح کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ تمام ستارے، سیارے اور دوسرا نظام ایک دوسرے کے ساتھ ایسے لپیٹ دیے جائیں گے جیسے صحیفوں میں نوشتے لپیٹے جاتے ہیں وہ ایسے ہوجائیں گے گویا ابتدائے خلقت میں ایک ٹیلے کی طرح تھے، ایک بار پھر خدا اس عالم ہستی کے لئے ایک نئی تدبیر بنائے گا اور قیامت اس نئی دنیا میں برپا ہوگی۔

گزشتہ آیات میں جو کچھ گزرا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قیامت اس دنیا کے دوام کا سلسلہ نہیں ہے بلکہ یہ عالم بالکل ختم ہوجائے گا، کیونکہ مسلسل دھماکے اور خطرناک زلزلے تمام چیزوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیں گے، پھر ایک نئے لائحہ عمل کے مطابق اس جہان کے کھنڈرات پر ایک نئی دنیا آباد کی جائے گی اور قیامت بھی اسی نئے عالم میں برپا ہوگی۔

آغاز قیامت کی نشانیاں

قیامت کے آنے پر بڑے بڑے حوادث وقوع پذیر ہوں گے، دنیا کا خاتمہ بہت بڑے حادثات کے ساتھ ہوگا، اسی طرح قیامت کا آغاز بھی بہت بڑے حوادث کے ساتھ ہوگا، یہ معنی قرآن مجید کی مختلف آیات میں پائے جاتے ہیں۔

۱۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۴۸

﴿ابراهيم: ۴۸﴾

خدا کا وعدہ اس دن پورا ہوگا، یہ زمین ایک دوسری زمین میں تبدیل ہو جائے گی، آسمان (دوسرے آسمانوں میں) اور تمام انسان خدائے واحد وقہار کے سامنے ظاہر ہوں گے، یہ تبدیلی تیسرے مرحلے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ آیت کے ذیل میں ارشاد ہوتا ہے:

''اس دن ہر شخص، اور جو کچھ بھی وہ رکھتا ہے، خدائے واحد وقہار کے سامنے ظاہر ہوگا''

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ یہاں پر زمین کے دوسری زمین میں تبدیل ہو جانے سے مراد زمین کی ذات اور ماہیت کا تبدیل ہو جانا نہیں، جیسا کہ بعض لوگ تصور کرتے ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ اس کی صفات اور خصوصیات تبدیل ہو جائیں گی، جیسے اُس پر پہاڑوں کا ختم ہو جانا، اس کا صاف اور ہموار ہو جانا اور لامحدود وسعت تک پھیل جانا، اس کے بغیر کہ اس کی ذات تبدیل ہو۔

اس بات کی دلیل وہ متعدد آیات ہیں جو کہتی ہیں کہ:

قیامت کے دن انسان اپنی قبروں سے اٹھیں گے، بالخصوص سورہ طٰہٰ کی آیت ۵۵ جو ارشاد فرماتی ہے:

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۵۵ ﴿طه: ۵۵﴾

ہم نے تمہیں اس زمین سے پیدا کیا پھر اسی کی طرف پلٹائیں گے اور دوبارہ اس سے نکالیں گے۔

بہرحال مفسرین نے اس آیت کی متعدد تفاسیر بیان کی ہیں، جن میں سے اکثر کی دلیل بعض مرسل احادیث یا بعض سابقہ مفسرین کے اقوال ہیں۔

کسی نے کہا ہے کہ زمین چاندی میں اور آسمان سونے میں تبدیل ہو جائے گا۔

کسی نے کہا ہے زمین آگ میں اور آسمان بہشت کے باغوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔

یا زمین کا ہر حصہ اس پر بسنے والے مومنوں اور کافروں کی نسبت سے چاندی یا آگ میں تبدیل ہو جائے گا۔

لیکن اس آیت سے اجمالی طور پر جو بات سمجھی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک عظیم تبدیلی رونما ہوگی، اگرچہ اس کی جزئیات اور تفصیل ہمارے لئے زیادہ روشن نہیں ہے۔

۲۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا﴾ (الزلزلة: ۱۔۲)

جب زمین شدید طور پر لرزنے لگے گی اور اپنی تمام بھاری چیزوں کو باہر نکال پھینکے گی۔

کیا اس زلزلے سے مراد وہ زلزلہ ہے جو دنیا کے خاتمہ پر پوری زمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیگا، اور پوری دنیا کو نیست و نابود کر دے گا، یا وہ زلزلہ ہے جو قیامت کے آغاز میں وقوع پذیر ہوگا، مفسرین کے درمیان اس سلسلے میں اختلاف نظر ہے، (فخر رازی نے اپنی تفسیر میں دونوں اقوال کو ذکر کیا ہے)[1]

البتہ اسی سورۃ کی دوسری آیت کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسرے معنی مناسب تر معلوم ہوتے ہیں کیونکہ آیت میں ہے:

''زمین اپنی بھاری چیزوں کو باہر نکال دے گی'' اس لئے کہ اثقال جمع ہے ''ثقل'' کی جس کے معنی خزانہ ہیں، احتمال قوی یہ ہے کہ یہاں پر یہ انسانوں کے معنی میں ہے جو اس وقت قبروں سے باہر نکالے جائیں گے۔

جیسے سورہ انشقاق کی آیت ۴ میں بھی ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ﴾ (الانشقاق: ۴)

زمین اپنے اندر والی چیزوں کو باہر نکال دے گی اور خالی ہو جائے گی۔

اس لحاظ سے دوسرا زلزلہ وہ ہے جو مُردوں کے زندہ ہونے سے پہلے اور قیامت کے شروع میں وقوع پذیر ہوگا، یہ ایک بہت بڑا زلزلہ ہوگا جو ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا، بخلاف دوسرے زلزلوں کے جو زمین کے ایک مختصر سے خطے پر واقع ہوتے ہیں ''اذا زلزلت الارض'' کی تعبیر میں عمومیت موجود ہے، اسی طرح ''زلزالھا'' کی تعبیر بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔

اسی تعبیر کی طرح بلکہ اس سے واضح تر تعبیر سورۃ ق کی آیت ۴۴ میں آئی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۚ ذَٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ﴾ (ق: ۴۴) [2]

---

[1] تفسیر کبیر۔ ج ۳۲۔ ص ۵۸

[2] ''تشقق'' کی اصل ''تتشقق'' ہے ایک تا کو حذف کر دیا گیا ہے

جس دن زمین اوپر سے پھٹ جائے گی اور (مردے) تیزی کے ساتھ (قبروں سے) نکلیں گے، انہیں جمع کرنا ہمارے لئے آسان ہے۔

ظاہر ہے کہ پوری زمین کا پھٹنا اور تیزی کے ساتھ قبروں سے مُردوں کا نکلنا، یہ سب ان ہمہ گیر زلزلوں کے ذریعے ہوگا جو پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔

بہر حال یہ زلزلہ مردوں کے زندہ کرنے کے وقت کا ہے نہ کہ دنیا کے خاتمہ کا، بالخصوص اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ آیت کے ذیل میں مردوں کو زندہ کرنے کے بجائے حشر کا عنوان لایا گیا ہے (جس کے معنی انسانوں کو زندہ ہونے کے بعد اکٹھا کرنا، یا بدن کے اجزا کو اکٹھا کرنا، یا روحوں اور بدنوں کو جمع کرنا ہے)۔

یہ زلزلہ باقی زلزلوں کے خلاف ایک تعمیر کنندہ زلزلہ ہے، جب کہ باقی زلزلے تباہی اور موت لانے والے ہوتے ہیں، یہ ایسا زلزلہ ہو گا جو انسانوں کو اس بات کی مہلت دے گا کہ وہ قبروں سے نکلیں اور نئی زندگی سے بہرہ مند ہوں۔

اس معنی کی نظیر سورہ نازعات میں بھی آئی ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝ [۷۹:۶]

جس دن زلزلے تمام چیزوں کو لرزا دیں گے اور ایک زلزلے کے بعد دوسرا زلزلہ آئے گا۔

بہت سے مفسرین نے پہلی آیت کو پہلی مرتبہ کے نفخ صور (ایسی بڑی چیخ جس کے ساتھ ہی دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا) کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور دوسری آیت کو نفخۂ دوم (دوسری چیخ، قیامت جس کے ساتھ شروع ہوگی) کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جب کہ یہ معنی آیت کے ظاہر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں کیونکہ ''راجفہ'' ''رجف'' کے مادہ سے ہے، مقائیس اللغت کے بقول یہ اصل میں اضطراب اور بے چینی کے معنی میں ہے، یا راحب کے بقول شدید اضطراب کے معنی میں ہے، لہٰذا موجزن دریا کو ''بحر رجاف'' کہتے ہیں اور ''اراجیف'' ان خبروں کو کہتے ہیں جو معاشرے کے عمومی افکار کو متزلزل اور مضطرب کر دیتی ہیں۔

درست ہے کہ بڑی چیخیں زلزلوں کے ساتھ نکلتی ہیں، لیکن یہاں پر اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ ہم حقیقی معنی یعنی پہلے زلزلہ اور دوسرے زلزلہ کو چھوڑ کر مجازی معنی یا معنی کے لوازم کو مراد لیں۔

۳۔ زمین کا دگرگوں ہونا قیامت کے شروع ہونے کی ایک اور نشانی ہے، زمین بالکل ہموار ہو جائے گی اور تمام انسان صفحۂ زمین پر نکل آئیں گے، چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ

آحَدًا ﴿الکھف: ۴۷﴾

اور اس دن کو یاد کرو جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور زمین کو تو آشکار اور ہموار دیکھے گا، اُس دن ہم تمام انسانوں کو محشور کریں گے۔

پہاڑوں کا حرکت کرنا ان کے تباہ ہونے کا مقدمہ ہے جیسے مندرجہ بالا آیت اور اسی طرح کی دوسری آیات سے استفادہ ہوتا ہے، زمین مکمل طور پر ہموار ہو جائے گی اور اس ویرانی کے بعد تمام انسان اس پر ظاہر و آشکار ہو جائیں گے۔

ان آیات کی طرف توجہ فرمائیں:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا

يَوْمَىِٕذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ (طٰہٰ۔۱۰۵تا۱۰۸)

اور تم سے پہاڑوں کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دیجئے میرا خدا ان کو (ختم) نیست و نابود کر دے گا، پھر زمین کو صاف اور ہموار بنا دے گا اور آب و گیاہ کے بغیر چھوڑ دے گا، اس طرح کہ تم اس میں کسی قسم کی بلندی یا پستی نہیں دیکھو گے، اُس دن سب، خدا کی طرف اس بلانے والے، جس میں کسی قسم کا انحراف نہیں ہے، کی پیروی کریں گے۔

یوں لگتا ہے کہ ان آیات میں دنیا کے خاتمہ پر وقوع پذیر ہونے والے کچھ واقعات اور پھر قیامت کے آغاز پر رونما ہونے والے بعض واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔

یہ ''اشراط الساعۃ'' اور قیامت کی نشانیوں کے متعلق بحث کا خلاصہ تھا جسے قرآن مجید کی آیات سے استفادہ کرتے ہوئے تین حصوں میں بیان کیا گیا ہے، اس میں دنیا کے خاتمہ پر رونما ہونے والی عظیم تبدیلیوں اور قیامت کے آغاز پر وقوع پذیر ہونے والے حوادث میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

نفخ صور موت اور حیات کی چیخ

اشارہ:

قرآن کی بہت سی آیات میں نفخ صور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا۔

ایک مرتبہ تو دنیا کے خاتمہ پر، جس سے پوری مخلوق مرجائے گی، یہ موت کی چیخ ہے۔

دوسری مرتبہ قیامت کے آغاز پر جب تمام مردے زندہ ہو جائیں گے، یہ زندگی کی چیخ ہے۔

حقیقت میں اس دنیا کا رک جانا اور دوسری دنیا کا آغاز ہونا، لشکروں اور قافلوں کی حرکت اور قیام کی طرح ہے جو ایک مخصوص طبل یا بلند آواز پر تمام کے تمام ایک جگہ رک جاتے اور قیام پذیر ہو جاتے ہیں، دوسری آواز پر کھڑے ہو کر کوچ کر جاتے ہیں۔

''صور'' کیا ہے اور ''نفخ'' سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں ہم تفصیلی بحث کریں گے، خداوند تعالیٰ کی توفیق سے آئندہ ان باتوں کا ذکر کیا جائے گا، یہاں پر جس امر کی طرف توجہ مبذول کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ان دو اہم واقعات کے متعلق قرآن مجید میں چھ مختلف تعبیریں آئی ہیں:

کبھی تو ''نفخ صور'' کی تعبیر آئی ہے۔

کبھی ''صیحة'' کی تعبیر آئی ہے۔

کبھی ''نقر فی الناقور'' کی عبارت آئی ہے۔

کبھی ''صاخة'' کی تعبیر آئی ہے۔

کبھی ''قارعة'' کی عبارت آئی ہے۔

اور کبھی ''زجرة'' کی تعبیر آئی ہے۔

ان چھ عنوانات کی شرح اور تفصیل آپ آئندہ آنے والی آیات میں ملاحظہ کریں گے، اس مختصر سے اشارے کے ساتھ ہم دوبارہ قرآن کی طرف پلٹتے ہیں اور مندرجہ ذیل آیات بغور ملاحظہ کرتے ہیں:

۱۔ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ، ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۶۸ ﴿الزمر: ۶۸﴾

۲۔ وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ

شَاءَ اللّٰهُ ؕ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ۸۷ ﴿النمل: ۸۷﴾

۳۔ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ۵۱

﴿یس: ۵۱﴾

۴۔ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝۱۳ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝۱۴ (حاقة: ۱۳۔۱۴)

۵۔ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَاءَلُوْنَ ۱۰۱ ﴿المؤمنون: ۱۰۱﴾

۶۔ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ۹۹ ﴿الكهف: ۹۹﴾

۷۔ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ۱۰۲ ﴿طه: ۱۰۲﴾

۸۔ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۱۸ ﴿النبا: ۱۸﴾

۹۔ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ﴿الأنعام: ۷۳﴾

۱۰۔ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ۲۰ ﴿ق: ۲۰﴾

۱۱۔ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ۵۳

﴿یس: ۵۳﴾

۱۲۔ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ۴۹ ﴿یس: ۴۹﴾

۱۳۔ وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ۱۵ ﴿ص: ۱۵﴾

۱۴۔ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ۴۲ ﴿ق: ۴۲﴾

۱۵۔ فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۹ ﴿المدثر: ۹﴾

۱۶۔ فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝۳۴ [۸۰:۳۴]

۱۷۔ اَلْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ

كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ (قارعة: ۱ تا ۴)

۱۸۔ فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَإِذَا هُمْ يَنْظُرُونَ ۱۹ (الصافات: ۱۹)

ترجمہ:

۱۔ صور پھونکا جائے گا، پھر سب لوگ جو زمین اور آسمانوں میں ہیں مر جائیں گے، سوائے اس کے جسے اللہ چاہے، پھر دوسری بار اس میں پھونکا جائے گا، پھر وہ یکا یک سب کھڑے ہو کر (حساب و کتاب کا) انتظار کرنے لگیں گے۔

۲۔ (اس دن کو یاد کرو) جس دن صور میں پھونکا جائے گا، پس جو شخص بھی آسمانوں اور زمین میں ہوگا، دہل جائے گا، سوائے اس کے جسے اللہ تعالیٰ چاہے، اور تمام اللہ کے سامنے خضوع کے ساتھ حاضر آئیں گے۔

۳۔ اور (دوسری مرتبہ) صور میں پھونکا جائے گا، پھر یکا یک وہ قبروں میں سے نکل کر اپنے پروردگار (کی عدالت) کی طرف دوڑے چلے جائیں گے۔

۴۔ صرف اس سے کہ ایک بار صور میں پھونکا جائے گا اور زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے، پھر ایک ہی بار توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے۔

۵۔ جب صور میں پھونکا جائے گا تو اس دن نہ اُن کے درمیان رشتے ناطے رہ جائیں گے اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھ سکیں گے۔

۶۔ اور صور میں پھونکا جائے گا، پھر ہم سب کو اکٹھا کر لیں گے۔

۷۔ جس دن صور میں پھونکا جائے گا اور تمام مجرم اس دن نیلگوں جسم کے ساتھ محشور کئے جائیں گے۔

۸۔ جس دن صور میں پھونکا جائے گا اور تم فوج فوج ہو کر محشر میں وارد ہو گے۔

۹۔ اس کا قول سچا ہے اور جس دن صور میں پھونکا جائے گا اس دن حکومت اسی کی ہوگی۔

۱۰۔ اور صور میں پھونکا جائے گا، یہی عذاب کے وعدہ کا دن ہے۔

۱۱۔ اُن کا عذاب ایک تند آواز کے سوا کچھ نہ تھا، پس وہ سب یکا یک ہمارے حضور کئے جائیں گے۔

۱۲۔ وہ انتظار نہیں کرتے مگر ایک عظیم (آسمانی) چیخ کا جو ان کو گھیر لے جب کہ وہ (دنیا کے معاملات میں) جھگڑتے ہوں گے۔

۱۳۔ وہ (اپنے ان اعمال کی وجہ سے) انتظار نہیں کرتے مگر ایک چیخ کا جو آسمان سے آئے جس سے کوئی چھٹکارا نہیں (اور وہ تمام کو نابود کر دے گی)

۱۴۔ جس دن وہ ایک سخت چیخ حق کے ساتھ سنیں گے، یہ خروج کا دن ہوگا۔

۱۵۔ جب صور میں پھونکا جائے گا وہ دن بہت سخت ہوگا۔

۱۶۔ جب وہ کان پھاڑ دینے والی (قیامت کی) چیخ آئے گی (کافر غم میں ڈوب جائیں گے) جس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگتا پھرے گا۔

۱۷۔ کھڑکھڑا دینے والی، کیا ہے کھڑکھڑا دینے والی؟ اور تم کیا جانو کہ کھڑکھڑا دینے والی کیا ہے؟ جس دن لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ہو جائیں گے۔

۱۸۔ صرف ایک چیخ اُٹھے گی، اچانک سب (قبروں سے نکل آئیں گے) اور دیکھیں گے۔

تفسیر و جمع بندی آیات

موت کی پُھونک اور زندگی کی پُھونک:

مندرجہ بالا اٹھارہ آیات میں، جیسے کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے، چھ مختلف انداز سے ''نفخ صور'' کا ذکر آیا ہے، مندرجہ بالا آیات میں انہیں ترتیب کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اب جب کہ ہم نے ان سب کو باہم ملا دیا ہے اور ایک جگہ اکٹھا ذکر کر دیا ہے، تو ان کی تفسیر کی طرف توجہ کرتے ہیں تا کہ اس پیوستگی کے ساتھ ''نفخ صور'' کا واقعی مفہوم واضح ہو جائے۔

پہلی آیت میں صور کے پہلی دفعہ پھونکنے اور اس طرح دوسری دفعہ پھونکنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، فقط یہ ہی ایک ایسی آیت ہے جس میں ان دونوں کو ذکر کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ونفخ فی الصور فصعق من فی السموات ومن فی الارض الا من شآء الله

اور صور پُھونکا جائے گا، زمین و آسمان میں جو بھی ہوگا مر جائے گا مگر وہ کہ جسے خدا چاہے۔

صاحب مقائیس اللغت نے ”صعق“ (بروزن ”صعب“) کے مادہ کو تیز آواز کے معنی میں لیا ہے، وہ صاعقہ کو اسی معنی سے مشتق سمجھتے ہیں، چونکہ ”صاعقه“ (آسمانی بجلی) موت اور بربادی کا باعث بنتی ہے اس لئے یہ مادہ ”موت“ کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن لسان العرب میں اس کا پہلا معنی لیا گیا ہے یعنی کسی تیز آواز کی وجہ سے بے ہوش ہونا اور عقل کا ضائع ہو جانا۔

اس نے دوسرے معنی موت لئے ہیں بعض لوگوں کے بقول اس نے صاعقہ کے ایک معنی موت کا ذکر کیا ہے۔

بہرحال مندرجہ بالا آیت میں اس سے مراد وہ اچانک موت ہے جو زمین و آسمان میں رہنے والوں کو (نفخ صور کی وجہ سے) دامن گیر ہوگی، یہ کہ ”الا من شآء اللہ“ مگر وہ کہ جسے خدا چاہے سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، بعض نے اس سے خدا کے بعض عظیم فرشتے (جیسے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل) مراد لئے ہیں، بعض نے اسے راہ خدا میں شہید ہونے والے لوگوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور بعض نے مذکورہ بالا چار فرشتوں کے ساتھ عرش الٰہی کو اٹھانے والے فرشتوں کو بھی شامل کیا ہے۔

لیکن بہرحال یہ بات مسلم ہے کہ وہ بھی آخر کار خدا کے حکم

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران۔۱۸۵)

کے مطابق موت کا ذائقہ چکھیں گے اور صرف خدا کی ذات جو ”حی لا یموت“ ہے، باقی رہ جائے گی۔

وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۲۷ ﴿الرحمن:۲۷﴾

آیہ کے ذیل میں دوسری دفعہ صور پھونکنے کا بھی ذکر ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۶۸ ﴿الزمر:۶۸﴾

پھر دوسری مرتبہ صور میں پھونکا جائے گا اور اچانک سب کھڑے ہو جائیں گے اور منتظر ہوں گے (تاکہ حساب لیا جائے)۔

”صور“ اصل میں ”بگل“ کے معنی میں ہے جو عموماً لشکروں اور کبھی کاروانوں کے روکنے یا چلانے کے لئے بجایا جاتا ہے، اس آیت میں عالم ہستی میں قافلہ زندگی کے عمومی توقف اور دوبارہ چلنے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس سلسلے میں تفصیلاً گفتگو خداوند تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ توضیحات کے حصے میں ذکر کی جائے گی۔

دوسری آیت میں فقط دوسری مرتبہ صور میں پھونکنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ

اس دن کو یاد کرو جب صور میں پھونکا جائے گا اور زمین و آسمان میں بسنے والے تمام لوگ خوف میں مبتلا ہو جائیں گے۔

بعض مفسرین (مثلاً علامہ طباطبائی) اس بات کو بعید نہیں سمجھتے کہ یہ آیت ہر دو صور پھونکنے کی طرف اشارہ ہو،لیکن ذیل آیہ میں ہے کہ "تمام کے تمام خضوع کے ساتھ خدا کے سامنے حاضر ہوں گے"۔

وَكُلٌّ أَتَوْهُ دَاخِرِينَ ﴿النمل: ۸۷﴾

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مراد دوسرا صور ہے، یہاں پر بھی استثناء یہ جملہ ہے: "الا من شآء" "مگر وہ کہ جسے خدا چاہے" اس کی تفسیر پہلی آیت کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

تیسری آیت دوسرے نفخہ جو قیامت کا نفخہ ہے، سے متعلق ہے، ارشاد ہوتا ہے "ونفخ فی الصور فاذا هم من الاجداث الی ربهم ینسلون" [1] صور پھونکا جائے گا، اچانک وہ قبروں سے تیزی کے ساتھ اپنے پروردگار (کی عدالت) کی طرف حرکت کریں گے۔

مفسرین نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ یہ آیت نفخہ دوم سے متعلق ہے، نیز اسی آیت کی تشریح اور اس کے بعد والی آیات بھی اسی بات کی شہادت دیتی ہیں، بعض لوگوں نے یہاں پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر اس دن انسان خدا کے حساب و کتاب سے خوف زدہ ہوں گے تو کیسے اس کی طرف تیزی سے پلٹیں گے؟ جواب یہ دیا گیا کہ یہ حالت اُن میں بغیر ان کے اختیار کے پیدا ہو جائے گی، اس طریقے سے خدا انہیں اپنی عدالت کی طرف بلائے گا۔

چوتھی آیت پہلی دفعہ والے صور میں پھونکنے سے متعلق ہے، وہ پھونک جس کے ساتھ انسان اور پوری عالم ہستی وادی فنا کی طرف کوچ کر جائیں گے، ارشاد ہوتا ہے:

"فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَاحِدَةٌ وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿الحاقة: ۱۳﴾

جب ایک بار صور میں پھونکا جائے گا اور زمین اور پہاڑوں کو ان کی جگہ سے اُٹھا لیا جائے گا پھر ایک ہی بار وہ توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے۔

ان آیات میں "واحدة" کی تعبیر دو جگہ استعمال کی گئی ہے، جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ واقعات اچانک اور ہنگامی صورت میں وقوع پذیر ہوں گے، دوسری طرف یہ تمام کی تمام تعبیرات خدا کی لامحدود قدرت کی علامت ہیں کہ ایک ہی دفعہ صور میں پھونکنے سے پوری کائنات فنا ہو جائے گی، بالکل ایک بگل بجانے کی طرح، جس سے ایک عظیم لشکر رک جاتا ہے یا چل پڑتا ہے۔

---

[1] "اجداث" جمع ہے "جدث" (بروزن "قفس") کی جس کے معنی "قبر" ہیں، "ینسلون" "نسل" (بروزن قفل) کے مادہ سے ہے جس کے معنی تیز تیز چلنا ہیں، راغب نے مفردات میں اس کے اصل معنی "جدا ہونا" ذکر کئے ہیں، فرزندان آدم پر نسل کا اطلاق بھی اسی لحاظ سے ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات نفخہ اول کی طرف اشارہ کرتی ہیں اگرچہ آئندہ آنے والی آیات میں کہیں کہیں محشر کے واقعات اور نامۂ اعمال اور بہشت کے اوصاف کا بھی ذکر ہے، یہ اس لئے ہے کہ یہ مذکورہ حوادث دنیا کے خاتمے اور قیامت کی ابتداء کے ساتھ ہی وقوع پذیر ہوں گے، ان کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہوگا، اسی لئے قرآن کی بہت سی آیات میں دنیا کے خاتمہ پر وقوع پذیر ہونے والے واقعات اور قیامت کے شروع میں رونما ہونے والے حادثات کا ذکر ایک دوسرے کے فورا بعد نظر آتا ہے۔

رہی یہ بات کہ بعض بڑے مفسرین نے اس آیت کو نفخہ دوم سے متعلق سمجھا ہے [1]، تو یہ بات بہت بعید لگتی ہے کیونکہ اس صورت میں اگلی آیت جو اس کے فورا بعد ہے اور زمین و آسمان کی تباہی کی خبر دے رہی ہے یہ اس کے ہم آہنگ نہ ہوگی، گو یا وہ آیات جو اس سے کافی فاصلے پر ہیں انہوں نے اس آیت کو اس معنی کی طرف چلایا ہے جب کہ قرآن کی مختلف آیات جو کہ قیامت کے سلسلے میں نازل ہوئی ہیں، میں غور و فکر کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان دو پھونکوں کے حوادث کبھی اکٹھے بھی ذکر ہوتے ہیں، ضروری ہے کہ قرائن اور شواہد کے ذریعے انہیں ایک دوسرے سے جدا کیا جائے۔

پانچویں آیت واضح طور پر ''نفخہ دوم'' کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ وہ اس بات کی خبر دے رہی ہے کہ صور میں پھونکنے کے ساتھ ہی تمام رشتہ داریاں اور تعلقات ختم ہو جائیں گے، ارشاد ہوتا ہے: ''فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینهم یومئذ ولا یتسآءلون'' (جب صور میں پھونکا جائے گا تو اُس دن اُن کے درمیان کوئی رشتہ نہیں رہے گا اور وہ ایک دوسرے سے سوال نہیں کریں گے)۔

واضح رہے کہ ایک دوسرے سے سوال کرنا چاہے ایک دوسرے کے حالات سے متعلق خبر معلوم کرنا ہو یا دوسرے سے مدد کی التجا ہو، یہ صرف قیامت اور زندگی کے صور میں ہی متصور ہے، عجیب بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے یہاں بھی یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ اس آیت سے مراد ''نفخہ اول'' ہے۔

بہر حال ایک دوسرے سے سوال نہ کرنا، چاہے مندرجہ بلا معنوں میں سے کسی معنی میں بھی ہو، اس لئے ہے کہ اُس دن ہر شخص اپنے آپ میں اتنا مصروف اور گرفتار ہوگا کہ دوسرے کے متعلق کچھ سوچ بھی نہیں سکے گا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مندرجہ بلا آیت قرآن کی اُن دوسری آیات کے ساتھ کیسے ہم آہنگ رہے جو یہ کہتی ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے سوال کریں گے اور مدد کی التجا کریں گے جیسے:

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۲۷ ﴿الصافات: ۲۷﴾

اسی طرح سورہ ابراہیم کی آیت ۲۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] یہ تفسیر المیزان ۔ج ۱۹، ص ۳۹۷ پر موجود ہے

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ﴿ابراهيم: ٢١﴾

وہ تمام خدا کے سامنے ظاہر ہوں گے، اس دوران کمزور (نادان پیروکار) مستکبروں سے کہیں گے ہم تمہارے پیروکار تھے، کیا تم حاضر ہو ہم پر ہونے والے عذاب الٰہی میں سے کچھ قبول کرلو اور اُسے ہم سے دور کردو۔

اس سوال کا جواب قرآن کی دوسری آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے واضح ہوجاتا ہے کہ قیامت کے مختلف مراحل و مواقف ہیں اور ہر مرحلے کی اپنی الگ الگ خصوصیات ہیں، اس بات کی تائید پیغمبر اکرمؐ کی اس حدیث سے ہوتی ہے، جو اس سوال کے جواب کے سلسلے میں آئی ہے:

"ثلاثة مواطن تذهل فيها كل نفس۔ حين يرمى الى كل انسان كتابه۔ وعند الموازين۔ وعلى جسر جهنم۔

تین جگہیں ایسی ہیں جہاں انسان اپنے علاوہ سب کچھ بھول جائے گا:

۱۔ جب اس کا نامہ اعمال اسے دیا جائے گا۔

۲۔ جب اعمال کو تولنے والی میزان کے سامنے پہنچے گا۔

۳۔ اور جب جہنم کے پل پر پہنچے گا۔[۱]

چھٹی اور ساتویں آیت میں "نفحہ دوم" کے متعلق گفتگو ہے، ارشاد ہوتا ہے: "وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ ﴿الكهف: ٩٩﴾" (دنیا کے خاتمے پر ہم اُن کو ایک دوسرے پر موجیں مارتا چھوڑ دیں گے)۔

یہ انسانوں کی تعداد کے زیادہ ہونے یا ان کے زیادہ خوف زدہ اور مضطرب ہونے یا دنیا کے خاتمے پر ایک بدنظمی پیدا ہونے کی وجہ سے ہے، بعض مفسرین نے اس آیت کو سید ذوالقرنین بنانے کے بعد یاجوج ماجوج کی تعداد کی طرف اشارہ سمجھا ہے، (اس سے پہلی آیات کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے) لیکن یہ معنی بعد والی آیات کو دیکھتے ہوئے کچھ بعید معلوم ہوتے ہیں۔[۲]، (غور کیجئے گا)

بہرحال آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: "وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا" (صور میں پھونکا جائے گا اس کے بعد ہم سب کو اکٹھا کریں گے)

بعد والی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: "يوم ينفخ فى الصور ونحشر المجرمين يومئذ زرقا" (قیامت کا دن وہ دن ہے

---

[۱] روح البیان۔ ج۶، ص ۱۰۷

[۲] یاجوج وماجوج اور سید ذوالقرنین کی داستان تفسیر نمونہ۔ ج ۱۲ (سورہ کہف آیہ ۹۸ کے ذیل) میں تفصیلا بیان کی گئی ہے۔

کہ جب صور میں پھونکا جائے گا اور ہم مجرموں کو اس دن نیلگوں بدن کے ساتھ اکٹھا کریں گے)۔

''زرق'' کی جمع ''ازرق'' ہے اس کے معنی نیلا یا نیلگوں رنگ ہیں، ممکن ہے یہاں یہ مجرموں کے بدن کے نیلگوں ہونے یا اُن کی آنکھوں کے اندھے پن یا شدید پیاس، جو بدن پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے، کی طرف اشارہ ہو (اس کے لئے یہ تینوں تفسیریں ذکر ہوئی ہیں) پہلے معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں کیونکہ یہ حقیقی معنی ہیں جب کہ دوسرے اور تیسرے معنی استعاراتی معنی ہیں۔

نویں اور دسویں آیت میں بھی نفحہ دوم کی طرف ہی اشارات ملتے ہیں، یعنی زندگی اور قیامت سے متعلق پھونک، ایک جگہ پر ارشاد ہوتا ہے: ''يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا﴿النبإ: ١٨﴾ ''(قیامت کے دن صور میں پھونکا جائے گا اور تم گروہ گروہ کر کے (میدان محشر میں) آؤ گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: ''وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ٢٠﴿ق: ٢٠﴾ ''(صور میں پھونکا جائے گا اور یہی وعید کا دن ہے)۔

لوگوں کا اس دن گروہ گروہ ہونا یا تو اس لئے ہے کہ ہر گروہ اپنے پیشوا کے ساتھ میدان حشر میں آئے گا، چاہے وہ پیغمبر ہو یا غیر پیغمبر یا مجرموں کا ہر گروہ جس نے ایک خاص گناہ کیا ہوگا وہ اکٹھا محشور ہوگا، یا یہ کہ ہر امت اپنے پیغمبر کے ساتھ میدان محشر میں وارد ہوگی۔

ہر صورت میں یہ تعبیر سورہ مریم کی آیت ۹۵ کے ساتھ کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتی، جو یہ ارشاد فرماتی ہے:

وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ٩٥﴿مریم: ٩٥﴾

ان میں سے ہر ایک قیامت کے دن تنہا اُس کے حضور آئے گا۔

کیونکہ جیسے پہلے گذر چکا ہے قیامت کے مختلف موقف اور مراحل ہیں، ممکن ہے ابتدا میں گروہ گروہ بن کر لوگ آئیں پھر الگ الگ ہو کر خدا کی عدالت میں حاضری دیں (غور کیجئے گا)۔

''وعید'' راغب اور بعض مفسرین اور ارباب لغت کے بقول عذاب کے وعدہ میں ہے، جب کہ ''وعد'' کا لفظ ثواب اور عقاب دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، آیہ مذکور میں خصوصا ''وعید'' ذکر کرنا جب کہ اس دن تو ثواب اور عقاب دونوں ہوں گے، مجرموں کے لئے ایک تنبیہ کے طور پر ہے۔

گیارہویں اور بارہویں آیات میں جو دونوں سورہ یٰسین سے ہیں، ایک عظیم مبارزہ کا ذکر کیا گیا ہے جو اس عالم کے خاتمہ پر ''موت کی چیخ'' کے طور پر، یا قیامت کے آغاز میں ''زندگی کی چیخ'' کے طور پر ہر جگہ پر گونجے گی۔

ایک جگہ پر دنیا کے اختتام پر اٹھنے والی چیخ کی طرف اشارہ ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وہ ہمیشہ سوال کرتے ہیں کہ خدا کا یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ کام خدا کے لئے مشکل ہے، نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہے، وہ اس کے علاوہ کسی چیز کا انتظار نہیں کرتے کہ ایک آسمانی چیخ بلند ہو اور اچانک سب کو

گھیر لے جب کہ وہ (دنیاوی امور میں) باہم لڑائی جھگڑا کر رہے ہوں۔

مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿يس: ۴۹﴾

دوسری جگہ دوسری چیخ کی طرف اشارہ ہے، ارشاد ہوتا ہے:

یہ بھی کوئی مشکل بات نہیں ہے، یہ بہت آسان ہے اور جلدی ہونے والی ''وہ ایک چیخ سے زیادہ نہیں، اچانک سب ہمارے سامنے حاضر ہو جائیں گے''۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۵۳﴾ (یٰس)

''صیحة'' راغب کے بقول، جیسا کہ اس نے ''مفردات'' میں ذکر کیا ہے، اصل میں کپڑے یا لکڑی کا اس طرح سے پھٹنا ہے کہ اس کے ساتھ آواز پیدا ہو، پھر یہ کلمہ ہر اونچی آواز اور پکار کے لئے استعمال ہونے لگا، یہ کلمہ کبھی قد کی بلندی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ ایک لمبا درخت گویا فریاد کر رہا ہوتا ہے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہا ہوتا ہے۔

لیکن ''مقائیس اللغۃ'' نے اس کے اصلی معنیٰ ''بلند آواز'' کئے ہیں اور ''تصیح''، جس کے معنی لکڑی کا پھارنا ہیں، اسے ''مادہ وادی'' سے سمجھا ہے، اس کے مطابق یہ اصل میں ''تصوح'' تھا۔ (غور کیجئے گا)

بہر حال مفسرین نے ''پہلی چیخ'' کو پہلی دفعہ صور میں پھونکنا اور ''دوسری چیخ'' کو دوسری مرتبہ صور میں پھونکنا سمجھا ہے، جب کہ اسی سورت کی آیت ۵۱ میں، جو کہ ان دو آیتوں کے درمیان واقع ہے، واضح طور پر صور پھونکنے اور مردوں کے قبروں سے اٹھنے کی طرف اشارہ موجود ہے، مگر یہ کہا جائے کہ ان دو کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے کیونکہ دوسری حقیقت میں پہلی ہی کی وضاحت کرتی ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ دوسری مرتبہ پھونکنا اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ایک عظیم چیخ بلند ہوگی اور تمام لوگ ہمارے حضور پیش ہو جائیں گے۔

یہ تمام تعبیرات اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ دنیا کا خاتمہ اور آخرت کا آغاز خدا کے لئے بالکل معمولی سی بات ہے اور مخالفین کا اس سلسلے میں تعجب فضول ہے، صرف ایک بہت بڑی چیخ کے ساتھ سب مر جائیں گے، پھر بوسیدہ ہو کر خاک بن جائیں گے، اور ایک دوسری چیخ کے ساتھ تمام کے تمام ایک نئی زندگی حاصل کر لیں گے اور تیزی کے ساتھ خدا کے حضور پیش ہو جائیں گے۔

تیرھویں اور چودھویں آیت میں ایک بار پھر زندگی اور موت کی دو بلند چیخوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

یہ (پیغمبروں کو جھٹلانے والے) اس کے علاوہ کسی چیز کا انتظار نہیں کر رہے کہ ایک چیخ بلند ہو، ایسی چیخ جس سے مفر نہیں (اور وہ سب کو نیست و نابود کر دے گی)'' وما ینظر ھو لآء الا صیحة واحدة ما لھا

من فواق‘‘۔

اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے،بعض لوگوں نے اسے عذاب استیصال (وہی عذاب دنیوی جو کافروں اور ظالموں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے جیسے قوم نوح،قوم لوط اور انہی جیسی دوسری قوموں پر نازل ہوا) کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جب کہ بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت صور میں پھونکنے کی طرف اشارہ ہے، پہلے معنی اس سے پہلے والی آیات کے ساتھ جو کہ قوم نوح، عاد، ثمود، اور انہی کی طرح کی دوسری اقوام پر نازل ہونے والے عذاب کے متعلق گفتگو کرتی ہیں، زیادہ ہم آہنگ ہیں،لیکن اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ یہ آیت کفار مکہ کے لئے ایک تنبیہ ہے اور سورہ انفال کی آیت ۳۳ میں ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ

جب تک تم ان کے درمیان ہو خدا اُن پر عذاب نازل نہیں کرے گا۔

کے مطابق ان کے لئے عذاب استیصال کا تصور نہیں کیا جا سکتا،لہٰذا اس اعتاب سے دوسرے معنی مناسب تر معلوم ہوتے ہیں (غور کیجئے گا)۔

اس تفسیر کے مطابق کیا یہ آیت پہلی دفعہ صور میں پھونکنے کی طرف اشارہ ہے یا دوسری دفعہ؟ اس سلسلے میں بھی مفسرین کے درمیان اختلاف ہے،لیکن بغیر کسی شک کے آیت کا انداز گفتگو پہلے صور کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے، چونکہ آیت کے ذیل میں ارشاد ہوتا ہے: ’’اس سے کوئی مضر نہیں‘‘ اور ایسا عموماً موت کی پھونک کے لئے کہا جاتا ہے۔

ایک حدیث جو پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے، اس میں بھی اس آیت کو نفخہ اول کے لئے دلیل کے طور پر لایا گیا ہے۔[1]

’’فواق‘‘ دراصل، جیسا کہ بہت سے مفسرین اور اہل لغت نے کہا ہے، اُس فاصلے کے معنی میں ہے جو اونٹنی کے دو مرتبہ دودھ دوہنے کے درمیان ہوتا ہے، اس میں ضمنی طور پر بازگشت کے معنی بھی پائے جاتے ہیں، مریض کے کسی حد تک درست ہونے اور بے ہوش افراد کے ہوش میں آجانے کے لئے جو ’’افاقہ‘‘ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، وہ اس لئے ہے کہ وہ تندرستی اور ہوش کی طرف لوٹ آتا ہے، بہرحال مراد یہ ہے کہ دنیا کے خاتمے والی چیخ کسی کو لوٹنے یا بچنے کا موقع نہیں دے گی، تمام چیزیں تھوڑے سے وقت میں ختم ہو جائیں گی، صفحہ الٹ جائے گا اور انسانوں اور گذشتگان کے درمیان ایک قابل نفوذ دیوار حائل ہو جائے گی۔

بعد والی آیت میں قیامت کی پکار اور چیخ کی طرف اشارہ ہے، ارشاد ہوتا ہے: اس روز کی چیخ وہ حق کے ساتھ سنیں گے، وہ نکلنے کا دن ہوگا۔ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۚ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ۴۲ ﴿ق:۴۲﴾

مفسرین اس چیخ کو وہی قیامت کے موقع پر بلند ہونے والی چیخ قرار دیتے ہیں، آیت کی عبارت بھی اس بات پر بخوبی دلالت کر رہی ہے۔ ’’حق سے مراد، جیسا کہ مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں، فخر رازی نے تفسیر کبیر میں اور آلوسی نے روح المعانی میں بیان کیا ہے، ممکن ہے

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۸، ص ۵۶۰۱، تفسیر فخر رازی، ج ۲۶، ص ۱۸۳

مردوں کا زندہ ہونا اور مبعوث ہونا ہی ہو، لیکن ظاہر یہ ہے کہ حق یہاں پر اپنے حقیقی معنی میں ہے یعنی ''المیز ان'' کی تعبیر کے مطابق حتمی اور یقینی قضا کے معنی میں ہے، اور قیامت اس کا ایک مصداق ہے، ''یوم الخروج'' کی تعبیر قبروں سے نکلنے والے دن کے لئے لائی گئی ہے۔

رہی یہ بات کہ اس چیخ کو کون سنے گا، روحیں بدنوں میں داخل ہونے سے پہلے، یا یہ کہ چیخ کی آواز پیدا ہونے کے ساتھ ہی بدن زندہ ہو جائیں گے اور ان میں روح پڑ جائے گی اور پھر انسان باقی چیخ کی آواز پیدا ہونے کے ساتھ ہی بدن زندہ ہو جائیں گے اور اُن میں روح پڑ جائے گی اور پھر انسان باقی چیخ کو سنیں گے، جیسا کہ ایک سوئے ہوئے شخص کے سرہانے کھڑے ہو کر بلند آواز سے اُسے بیدار کیا جاتا ہے، اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، اگرچہ دوسرے معنی مناسب تر معلوم ہوتے ہیں۔

پندرھویں آیت میں جو ایک نئی تعبیر نظروں سے گزرتی ہے، وہ ''نقو'' ہے ارشاد ہوتا ہے، پس جب نرسنگا میں پھونکا جائے گا تو وہ دن کافروں پر بہت سخت ہوگا۔ فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ۝ فَذٰلِكَ يَوْمَىِٕذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۝ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ۝

''نقر'' اہل لغت کے بقول کسی چیز کو کوٹنے کے معنی میں ہے۔ ''منقار'' وہ چیز ہے جس کے ساتھ کوٹا جائے، چونکہ کوٹنے سے آواز پیدا ہوتی ہے اس لئے کبھی یہ کلمہ آواز پیدا کرنے یا آواز پیدا کرنے کے آلہ، یعنی نرسنگا میں پھونکنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اسی لئے مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کو ''صور'' پھونکنے کے معنی میں لیا ہے (''نقر'' یعنی پھونکنا اور ''ناقور'' یعنی صور)۔ [۱]

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ نقر کی تعبیر اس لئے ہے کہ قیامت کے موقع پر نرسنگا کی آواز اس قدر ہیبت ناک ہوگی کہ وہ کان پھاڑ کر مغز میں اُتر جائے گی۔

بہر حال یہ تعبیر ''نفخ دوم'' کی طرف اشارہ ہے اور اس امر پر دلیل وہ آیات ہیں جو اس کے بعد ہیں اور اس دن کافروں کی بری حالت کے متعلق خبر دیتی ہیں، فخر رازی کے بقول اگر مراد ''نفخہ اول'' ہو (جیسا کہ بعض مفسرین نے اس امر کا احتمال ذکر کیا ہے) تو وہ دن تو کافروں کے لئے سخت نہیں ہوگا کیونکہ وہ تو موت اور آزادی کا دن ہے، سخت دن تو قیامت کا ہے کہ زندگی کی چیخ جس کے ساتھ ہے۔ [۲]

سولھویں آیت میں پھر ایک نئی تعبیر سامنے آتی ہے اور وہ ''صاختہ'' ہے، ارشاد ہوتا ہے: جب صاخہ (یعنی ڈراؤنی آواز) آئے گی، اس دن انسان اپنے بھائی سے بھی بھاگے گا، ''فاذا اجآءت الصآخة ۔ یوم یفر المرء من اخیه''۔

''صاخة'' ''صخ'' کے مادہ سے ہے، راغب کے بقول یہ ایسی شدید آواز کو کہتے ہیں جو بولنے والے شخص سے بلند ہوتی ہے اور ''مقائیس اللغت'' کے بقول یہ ایک ایسی چیخ ہے جو کان کو بہرہ کر دیتی ہے، بعض مفرسین نے اس کے معنی انسانی سر کو پتھر پر مارنا لئے

---

[۱] مجمع البیان، روح المعانی، تفسیر فخر رازی اور تفسیر قرطبی کی طرف زیر بحث آیت کے ذیل میں رجوع کیا جائے

[۲] تفسیر رازی۔ ج ۳۰، ص ۱۹۷

ہیں۔اور بعض نے اسے توجہ سے سننے کے معنی میں بھی لیا ہے۔[۱]

بہر حال یہ تعبیر بھی ''صور پھونکنے'' کی طرف اشارہ ہے، وہ بھی دوسری مرتبہ پھونکنا مراد ہے، وہی عظیم چیخ جو بیداری اور زندگی کی چیخ ہو گی، جو تمام لوگوں کو زندہ کر کے میدان محشر کی طرف روانہ کر دے گی، اس دن ہر انسان اپنے آپ میں اس قدر کھویا ہوا ہو گا کہ وہ بھائی، ماں، باپ اور دوستوں سے بھی بھاگتا پھرے گا۔

سترھویں آیت میں ''صور پھونکنے'' کے لئے ایک اور تعبیر لائی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''قارعة'' (یعنی وہ زبردست حادثہ) اور کیا ہے زبردست حادثہ؟ اور تم کیا جانو وہ زبردست حادثہ کیا ہے؟ جس دن لوگ پتنگوں کی طرح بکھرے ہوں گے اور پہاڑ دھنی ہوئی رنگین روئی کی طرح (فضا میں) بکھر جائیں گے جس کے اعمال کا پلڑا اس دن بھاری ہو گا وہ خوشحال زندگی میں ہو گا۔''

اَلْقَارِعَةُمَا الْقَارِعَةُ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُيَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ

''القارعة'' ''قرع'' (بروزن ''فرع'') کے مادہ سے ہے جو حقیقت میں کسی چیز کو زور کے ساتھ کوٹنے کے معنی میں ہو، جس سے بلند آواز پیدا ہو، اسی لئے ہتھوڑے کو ''مقرعہ'' کہا جاتا ہے۔

ان آیات میں ''قارعہ'' سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ قیامت کا ایک نام ہے کیونکہ جو حوادث قیامت کے وقت واقع ہوں گے وہ ظاہرا بھی سخت اور کوٹنے والے ہوں گے اور دل کو شدید خوف سے ریزہ ریزہ کر دیں گے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ تعبیر اُن تمام واقعات کے لئے ہے جو قیامت میں پہلی دفعہ صور پھونکنے سے لے کر بندوں کے خدا کے دربار میں حاضر ہونے تک رونما ہوں گے۔[۲]

فخر رازی اپنی تفسیر میں بیان کرتے ہیں:

مفسرین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ کلمہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے، پھر انہوں نے یہ نام رکھنے کی وجہ کے طور پر چند امور کا ذکر کیا ہے، مثلا یہ کہ یہ نام اس نفخۂ اول کی وجہ سے ہے جس کے ساتھ ہی زمین و آسمان میں بسنے والی مخلوق فنا ہو جائے گی۔

دوسرے یہ کہ یہ نام اُس بڑی تباہی کی وجہ سے ہے جو اس وقت اس دنیا کو لاحق ہو گی۔

تیسرے یہ کہ دل پر مختلف قسموں کے خوف اور ڈر طاری ہونے کی وجہ سے ہے۔

---

[۱] تفسیر مجمع البیان، ج ۱۰، ص ۴۴۰، تفسیر کبیر، ج ۳۱، ص ۶۳۔ روح المعانی، ج ۳۰، ص ۴۸ اور تفسیر قرطبی، ج ۱۰، ص ۷۰۱۵ کی طرف رجوع کیا جائے

[۲] روح البیان، ج ۱۰، ص ۴۹۹۔ روح المعانی، ج ۳۰، ص ۲۲۰

چوتھے یہ کہ خدا کے دشمنوں کے عذاب اور ذلت کی چکی میں پسنے کی وجہ سے ہے۔[۱]

لیکن اس کے بعد والی آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ تعبیر عموماً پہلے نفخہ کے لئے ہے جو تمام انسانوں پر خوف طاری کردے گا، پھر تباہی و بربادی لائے گا اور پہاڑوں کو نیست و نابود کردے گا، اس کے ساتھ ہی قیامت کے واقعات کا ذکر ایک فطری انداز سے ہوا ہے۔

بہرحال مذکورہ تعبیر یا تو نفخہ اول کی طرف اشارہ ہے، یا یہ کہ نفخہ اول بھی اس کا ایک حصہ ہے، البتہ یہ امکان کہ یہ تعبیر نفخہ دوم کی طرف اشارہ ہو، آیات کی فطری ترتیب کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا، کیونکہ یہ بہت مشکل ہے کہ ''يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ'' کی آیت دوسرے نفخہ کی طرف اشارہ ہو اور ''وتکون الجبال کالعھن المنفوش'' پہلے نفخہ کی طرف اشارہ ہو (غور کیجئے گا)۔

آخرکار اٹھارہویں اور آخری آیت میں پھر اس حادثے کے سلسلے میں ایک نئی تعبیر لائی گئی ہے، اور وہ ''زجرۃ'' (بہت بڑی چیخ) کی تعبیر ہے۔

جو لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے سلسلے میں تعجب کا اظہار کرتے تھے اُن کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے: (تعجب نہ کرو! یہ مشکل کام نہیں ہے) صرف ایک بلند چیخ اٹھے گی، پھر اچانک سب (قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے) حیرانی سے دیکھنے لگیں گے ''فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ''

''زجرۃ'' حقیقت میں بلند آواز کے ساتھ ہانکنے کے معنی میں ہے، جیسے اونٹ کو ہانکنا، پھر یہ دور پھینکنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا، کبھی یہ آواز کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔[۲]

''ینظرون'' ممکن ہے خوف کی زیادتی کی وجہ سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے معنی میں ہو، یا ایک دوسرے کو دیکھنے کے معنی میں ہو، یا خدا کے آخری حکم کا انتظار کرنے کے لئے ہو، بہرحال آیت کا ظاہر اس امر کی بخوبی وضاحت کررہا ہے کہ یہ ''زندگی کی پھونک'' کی طرف اشارہ ہے جس کے ساتھ ہی مردے قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور حساب و کتاب کے لئے تیار ہوجائیں گے، اکثر مفسرین نے بھی اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مجموعی طور پر ان تمام آیات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس دنیا کا خاتمہ اور اس جہان کا آغاز اچانک اور ایک بہت بڑی چیخ کے ساتھ ہوگا، کبھی اس کے لئے ''صیحة'' کی تعبیر لائی گئی ہے تو کبھی ''زجرة'' اور ''صاخة'' کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور کبھی ''نقر'' کا کلمہ لایا گیا ہے، بہت سی جگہوں پر ''نفخ صور'' کی تعبیر لائی گئی ہے۔

ان آیات میں ظاہری طور پر صور پھونکنے کے سلسلے میں کسی قسم کی توضیح اور تشریح نہیں کی گئی، حقیقت میں یہ آیات قیامت کے باقی

---

[۱] تفسیر فخر رازی، ج ۳۲، ص ۷۰

[۲] مقائیس اللغت اور مفردات راغب کی طرف مادہ ''زجر'' کے ذیل میں رجوع کیا جائے۔

واقعات کی طرح ہمارے لئے فقط ایک اجمالی سی تصویر پیش کرتی ہیں، لیکن جیسا کہ آگے آئے گا، احادیث میں یہ موضوع کچھ وضاحت کے لئے ساتھ بیان ہوا ہے، اگر چہ اس سے بھی پوری طرح صورت حال واضح نہیں ہوتی، یا یہ کہ اس صورت حال کو پوری طرح واضح نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ دوسرے عالم کے رازوں میں سے ایک راز ہے اور اس دنیا میں بسنے والے لوگوں کی عقل اس کی پوری تفصیل جاننے سے عاجز ہے۔

توضیحات

۱۔ "صور پھونکنا" یا "موت وحیات کی پکار" کیا ہے؟

نفخ، پھونکنے اور صور، جیسے کہ بہت سے ارباب لغت نے کہا ہے، طبل یا سینگ کے معنی میں ہے (کسی جانور کے سینگ کو کھوکھلا کر لیتے ہیں جو کہ نرسنگا کی شکل اختیار کر لیتا ہے، ایک طرف سے اس میں پھونک ماری جاتی ہے اور دوسری طرف سے ایک بلند آواز نکلتی ہے)۔

کیا یہ تعبیر اس جہان کے خاتمہ اور نئی دنیا کے آغاز کے فرمان کے لئے ہے جو خدا کی طرف سے صادر ہوگا اور یہ اس بات کی طرح ہے جیسے انسانوں میں معمول ہے کہ ایک قافلے کو چلانے یا روکنے کے لئے بگل بجایا جاتا ہے تاکہ تمام لوگوں کو معلوم ہو جائے؟ (البتہ قافلے کو روکنے اور چلانے کے وقت بجائے جانے والے بگل کے آہنگ میں فرق ہوتا ہے)۔

اب بھی بعض فوجی چھاونیوں میں یہ طریقہ ہے کہ رات کے وقت خاموش باش کا بگل بجایا جاتا ہے، اور تمام فوجیوں کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ ہی آرام کریں اور صبح کے وقت بیدار باش کا بگل بجایا جاتا ہے جس کے ساتھ ہی تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔[1]

یا یہ کہ یہ تعبیر کسی قسم کے استعاری معنی اپنے دامن میں نہیں رکھتی بلکہ حقیقت میں ہی بگل بجایا جائے گا، لیکن یہ بات واضح ہے کہ وہ کوئی عام بگل نہیں ہوگا، بلکہ ایک عظیم بجلی اور آواز ہوگی جو پوری دنیا میں گونج اُٹھے گی اور تمام موجودات کو ایک لحظہ میں تباہ و برباد کر دے گی، یا تمام لوگوں کو حرکت میں لے آئے گی اور اُن میں زندگی کا سانس پھونک دے گی، یہ احتمال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور آیات کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے۔

امام علی بن الحسینؑ سے ایک حدیث مروی ہے کہ:

ان الصور قرن عظیم له رائس واحد و طرفان، وبین الطرف الاسفل الذی یلی الارض الی الطرف الاعلی الذی یلی السماء مثل ما بین تخوم الارحنین السابعة الیٰ فوق السماء السابعة. فیه اثقاب بعد دار

---

[1] یہ احتمال تفسیر ابوالفتوح رازی، ج۹ ص ۴۲۱ پر ذکر ہوا ہے۔

واح الخلائق، وسع فمه ما بين السماء والارض۔

یعنی ''صور'' ایک بہت بڑا سینگ ہے جس کا ایک سر اور دو کنارے ہیں، نیچے والا کنارہ جو کہ زمین کی طرف ہے اوپر والے کنارے سے کہ جو آسمان کی طرف ساتویں زمین کی تہہ سے لے کر ساتویں آسمان کی بلندی جتنا فاصلہ رکھتا ہے اس میں مخلوق کی روحوں کی تعداد جتنے سوراخ ہیں اور اس کا منہ زمین و آسمان سے زیادہ کھلا ہے۔[1]

پیغمبر اکرمؐ سے منقول ایک حدیث اس طرح ہے:

"الصور قرن من نور فيه اثقاب على عدد ارواح العباد

''صور'' ''نور'' کا ایک سینگ ہے جس میں بندوں کی روحوں جتنے سوراخ ہیں۔[2]

یہ احادیث واضح کرتی ہیں کہ یہ تعبیر ایک بہت اہم بات کی طرف اشارہ ہے جو اس طریقے سے بیان کی گئی ہے، لیکن بعض مفسرین کے کلام میں یہ بات نظر آتی ہے کہ انہوں نے ''صور'' کو ''صورۃ'' کی جمع سمجھا ہے اور کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسانوں کی شکلوں اور جسموں میں پھونکا جائے گا اور وہ زندہ ہو جائیں گے،۔

یہ تفسیر فقط دوسری دفعہ صور پھونکنے کے ساتھ مناسب معلوم ہوتی ہے نہ کہ پہلے نفخہ کے ساتھ، علاوہ ازیں بعض ارباب لغت نے بھی اسے سختی کے ساتھ رد کر دیا ہے۔

ابن منظور نے لسان العرب میں بعض علماء لغت کی یہ بات بیان کی ہے کہ یہ ایک بہت بڑی غلطی اور خدا کے کلام میں تحریف ہے کیونکہ ''صور'' کی جمع قرآن کی دوسری آیت میں ''صوَر'' (بروزن سخن) کی شکل میں آئی ہے نہ کہ ''صور'' کے شکل میں اور اگر کوئی ''نفخ فی الصور'' کو ''نفخ فی الصوَر'' (واؤ پر زبر) پڑھے تو اس نے گویا خدا پر جھوٹ باندھا ہے اور کتاب خدا میں تحریف کی ہے۔

اس کے علاوہ یہ تفسیر گذشتہ روایات کے ساتھ بھی ہمنوا نہیں ہے اسی طرح اُن آیات کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں ہے، جن میں ''صعقة''، ''زجرة'' اور ''ناقور'' جیسی تعبیرات استعمال میں لائی گئی ہیں۔

یہ بات بعید نہیں کہ یہ تفسیر بیان کرنے والے چونکہ ''صور پھونکنے'' کو بگل بجانے یا سینگ میں پھونکنے کے معنی میں نہ سمجھ سکے ہوں، تو مجبوراً انہوں نے یہ تفسیر بیان کر دی ہو، جب کہ نہ تو ''صور'' ایک عام ''بگل ہوگا اور نہ ''نفخ'' ہمارے پھونکنے کی طرح ہوگا۔

بہر حال مذکورہ تینوں تفسیروں میں سے دوسری تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے اور یہی آیات کے ظاہر کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے، یہ تفسیر صور پھونکنے کی ایک اجمالی صورت ہمارے لئے بیان کرتی ہے، اگر چہ ہم اس کی پوری طرح وضاحت کرنے سے عاجز ہیں۔

---

[1] لئالی الاخبار، ج ۵، ص ۵۳ (نیا ایڈیشن، مکتبہ العلامہ)۔

[2] علم الیقین، ص ۸۹۲۔

۲۔ انسان اور باقی موجودات پر صوتی لہروں کے اثرات:

ہم جانتے ہیں کہ ''آواز'' اُن لہروں کا ایک حصہ ہے جو ہوا، پانی یا ٹھوس چیزوں میں پیدا ہوتی ہیں، انسانی کان تک جو کچھ پہنچتا ہے وہ ایسی آوازیں ہیں جن کی لہروں کی رفتار ایک سیکنڈ میں کم از کم بیس مرتبہ اور زیادہ سے زیادہ بیس ہزار مرتبہ ہے لیکن ایسی مخلوقات بھی ہیں جو اس سے بھی تیز لہروں کو سننے کی صلاحیت رکھتی ہیں، جانوروں میں چمگادڑ ایسی آوازوں کو بھی سن لیتی ہے جن کی رفتار ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ پینتالیس ہزار مرتبہ سے بھی زیادہ ہو۔[۱]

یہ جو بات مشہور ہے کہ حیوان انسان سے پہلے زلزلے کے آنے سے مطلع ہوجاتے ہیں یہ بھی شاید اس وجہ سے ہو کہ وہ زلزلے سے پیدا ہونے والی ان لہروں کو پہلے محسوس کر لیتے ہیں جنہیں انسان محسوس نہیں کرسکتا۔

یہ بھی واضح ہے کہ کبھی یہ تیز لہریں تمام چیزوں کو نابود کر دیتی ہیں، بموں اور دھاکہ خیز مواد اثرات انسانی جسموں اور عمارتوں پر بھی انہی شدید لہروں کی بدولت ہوتے ہیں جنہیں امواج انفجار (یا دھماکے کی لہریں) کہا جاتا ہے، یہ ایک لمحہ کے اندر ہر قسم کی رکاوٹ کو تباہ کر دیتی ہیں اور کبھی تو انسان یا کسی عمارت کے بالکل پرزے پرزے کر دیتی ہیں، لہٰذا یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ قیامت کی چیخ ایک مختصر سے لمحے میں انسانوں کو فنا اور پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کردے۔

حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ میں کیا خوبصورت جملہ فرمایا ہے:

" وینفخ فی الصور فتزهق کل مهجة وتبکم کل لهجة وتذل الشم الشوامخ۔ والصم الرواسخ فیصیر صلدها سرابا رقرقا۔ ومعهدها قاعا سملقا "۔

صور پھونکا جائے گا، اس کے ساتھ ہی دلوں کی دھڑکن بند ہوجائے گی، زبانیں گنگ ہوجائیں گی، بلند و بالا پہاڑ اور سخت پتھر آپس میں ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہوجائیں گے، اُن کی زمین ایسی ہموار اور برابر ہوجائے گی جیسے اس پر کبھی کوئی پہاڑ تھا ہی نہیں۔[۲]

البتہ یہ باتیں موت کی پھونک سے متعلق ہیں اور زندگی کی پھونک قطعی طور پر ایک الگ چیز ہے، وہ تو ایک زندگی بخش آواز ہے جو قافلہ حیات کو رواں دواں، متحرک کردے گی، اس سے متعلق بھی ہماری معلومات بالکل کم ہیں جیسا کہ قیامت کے باقی امور کے متعلق بھی واضح طور پر کم ہیں۔

---

[۱] کتاب صوت، ص ۵۷، کتاب نجوم برای ہمہ، ص ۹۰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[۲] نہج البالاغہ۔ خطبہ، ص ۱۹۵۔

۳۔ ''نفخِ صُور'' کے بارے میں چند سوالوں کے جوابات

۱۔ کیا صُور صرف دو مرتبہ پُھونکا جائے گا؟

قرآنی آیات میں دو دفعہ صُور پھونکنے (موت کی پھونک اور زندگی کی پھونک) کے بارے میں واضح طور پر گفتگو کی گئی ہے، گذشتہ آیات میں اس امر کا بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ''صور'' تین مرتبہ پھونکا جائے گا، ان روایات میں قرآنی آیات سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔

دیلمی مرحوم کی لئالی الاخبار اور ارشاد القلوب میں ایک حدیث اس طرح نقل کی گئی ہے:

اسرافیل تین دفعہ پھونکے گا ''نفخه فزع'' ''نفخئه موت'' اور نفخه بعث----------

دنیا کے خاتمے پر اسرافیل زمین پر آئے گا اور پہلی مرتبہ صور پھونکے گا جو ڈر اور خوف کا باعث بنے گا جیسے ارشاد خداوندی ہے:

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ، وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿النمل: ۸۷﴾

اس دوران زمین ایک بہت بڑے زلزلے کی زد میں آ جائے گی اور انسان مدہوش افراد کی طرح حیران و پریشان ادھر اُدھر دوڑنے لگیں گے، اس کے بعد ''نفخۂ صعق'' (موت کی پھونک) ہوگی جیسے قرآن نے فرمایا ہے:

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ

اس کے بعد زندگی کی پھونک ماری جائے گی جیسے ارشاد خداوندی ہے:

ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴿الزمر: ۶۸﴾ [۱]

بعض نے چوتھی مرتبہ پھونکنے کا بھی اضافہ کیا ہے اور وہ اکٹھے ہونے اور خدا کے حضور حاضر ہونے کی پھونک ہے۔

اُسے ظاہراً سورہ یٰسین کی آیت ۵۳ سے سمجھا گیا ہے:

---

[۱] لئالی الاخبار، ج ۵، ص ۵۴ (اختصار کے ساتھ) مذکورہ تینوں آیات کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿۵۳﴾

لیکن حقیقت میں وہی دو پھونک وسعت اختیار کر کے چار پھونکوں میں تبدیل ہوگئی ہیں ، کیونکہ ہر طرف خوف ووحشت کا پھیل جانا اہل دنیا کی موت کے لئے ایک تمہید ہوگی جس کے بعد پہلی پھونک ماری جائے گی جب کہ اکٹھا کرنا بھی اسی زندگی کی پھونک کی ایک کڑی ہے۔

اس بات کی تائید سورہ نازعات کی آیت ۶،۷ سے ہوتی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ

جب سخت زلزلہ ہر ہر جگہ کو ہلا کر رکھ دے گا اور اس کے بعد ایک ایسا زلزلہ وقوع پذیر ہوگا جو بندوں کو ایک صف میں میدان محشر میں حاضر کردے گا۔(غور کیجئے گا)

۲۔کون سا فرشتہ صور پھونکے گا؟

احادیث میں آیا ہے کہ یہ فرشتہ اسرافیل ہے،بعض علماء کے رائے ہے کہ اسرافیل سریانی زبان میں خدا کے بندے کو کہتے ہیں۔[۱]

امام سجاد علی بن الحسینؑ سے منقول ایک حدیث میں اس طرح ہے:

خدا اسرافیل کو حکم دے گا کہ وہ دنیا میں جائے اور وہی صور پھونکے گا۔[۲]

بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا کا مقرب ترین فرشتہ ہے۔[۳]

وہ سب سے پہلے آدمؑ کو سجدہ کرنے والا فرشتہ ہے۔[۴]

اصلی طور پر اس کے ہاتھ میں موت اور حیات کے سانس کا پھونکنا ہونا اس کی عظمت کی علامت ہے۔

لیکن امام علیؑ بن الحسینؑ سے مروی ایک حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ:

موت کی پھونک اسرافیل کی طرف سے ہوگی ، اس کے بعد خود اسرافیل پر موت طاری ہوجائے گی اور زندگی کا نفخہ خدا کی طرف سے ہوگا۔[۵]

---

[۱] لغت نامہ دھخدا، ج۶، مادہ اسرافیل۔

[۲] بحارالانوار۔ج۶،ص ۳۲۴،حدیث ۲۔

[۳] سفینۃ البحار۔ج۱،ص۶۱۶،(مادہ سرف

[۴] لغت نامہ دھخدا۔(مادہ اسرافیل)۔

[۵] نورالثقلین۔ج۴،ص ۵۰۲،حدیث ۱۱۶۔

۳۔نفخوں کے درمیان کا عرصہ:

قرآنی آیات سے اجمالی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت کی پھونک اور زندگی کی پھونک کے درمیان کچھ فاصلہ ہوگا، (ثُم کی تعبیر جو سورہ زمر کی آیت ۶۸ میں آئی ہے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے) لیکن یہ عرصہ کتنا ہوگا، قرآنی آیات سے اس سلسلے میں کوئی بات واضح نہیں ہوتی ،البتہ بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ عرصہ چالیس سال ہے:

ان ما بين النفختين اربعون سنة

کیا یہ سال اس دنیا کے سالوں کی مانند ہوں گے یا قیامت کے دنوں اور سالوں کی مانند جس کا ہر دن پچاس ہزار سال کے برابر ہے؟ یہ بات بھی ہمارے لئے واضح نہیں ہے، بہر حال اس عرصے کے دوران اس عالم ہستی میں بہت بڑی تبدیلیاں رونما ہوں گی، انسانوں کو پھر بسانے کے لئے ایک نئی دنیا آباد کی جائے گی، پس اس عرصے اور وقفے کے دوران پوری کائنات میں خدا کی ذات کے علاوہ کوئی موجود زندہ نہیں رہے گا۔

سورہ نمل کی آیت ۱۸۷ اور سورہ زمر کی آیت ۶۸ میں جو استثنائیہ جملہ''الا من شاء الله'' آیا ہے، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کچھ موجودات موت سے بچ جائیں گی بلکہ مراد یہ ہے کہ اُن کی موت کچھ تاخیر سے واقع ہوگی، اس بات کی گواہی یہ جملہ دے رہا ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ

یہ جملہ قرآن کی تین آیات میں آیا ہے۔[1]

یہ بات قابل غور ہے کہ''نفس''ایک وسیع مفہوم کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے جو تمام زندہ موجودات پر محیط ہے۔

البتہ یہ سوال کہ کن کا استثناء ہوا ہے، اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف احتمالات کو ذکر کیا ہے بعض نے کہا ہے کہ بعض مقرب فرشتے مثلاً اسرافیل، جبرائیل، میکائیل اور عزرائیل مراد ہیں، بعض نے عرش کو اٹھانے والے فرشتوں کا بھی اضافہ کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد شہداء کی روحیں ہیں (جو ابدان مثالی میں ہوں گی) بعض نے جنت اور دوزخ کے داروغاؤں کا ذکر کیا ہے۔

امام علیؑ بن الحسینؑ سے مروی ایک حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی چیخ کے وقت''اسرافیل''کے علاوہ جو صور پھونک رہا ہوگا، سب مر جائیں گے، پھر وہ بھی خدا کے حکم سے مرجائے گا۔

---

[1] آل عمران، ۱۸۵۔انبیاء، ۳۵۔عنکبوت، ۵۷۔

۴۔صور پھُونکنے کی حکمت:

اگرچہ صور پھونکنے کی حقیقت ہمارے لئے پوری طرح واضح نہیں ہے تاہم تربیتی لحاظ سے اس کا فلسفہ اور حکمت ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے ، ہمارے لئے قابل غور بات بھی ان عقائد حقہ کے تربیتی آثار ہی ہیں۔اولاتو صور پھونکنا یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ اس عالم کے موجودات کی زندگی اور موت کا کام خدا کے لئے کچھ مشکل نہیں ہے،فقط ایک عالم گیر اور پر اسرار چیخ کے ذریعہ پوری مخلوق مرجائے گی،اور دوبارہ ایک بلندو پر اسرار آواز کے ذریعہ تمام زندہ ہو جائیں گے، گویا کچھ ایسے سوئے ہوئے لوگ ہیں جو اس بیدار باش کی آواز کے ساتھ بیدار ہو جائیں گے۔

حقیقت میں یہ ان لوگوں کا جواب ہے جو قیامت کے سلسلے میں شک اور تردد کا شکار تھے،اُسے ایک مشکل اور ناممکن کام سمجھتے تھے اور ہمیشہ پیغمبر اسلامؐ پر اعتراض کرتے تھے۔

دوسرے یہ کہ یہ پوری دنیا کے انسانوں کے لئے ایک خطرے کی گھنٹی ہے کہ وہ اس زندگی کو پائیدار و جاوداں نہ سمجھیں،کسی قسم کے غرور یا غفلت میں مبتلا نہ ہوں اور ہر وقت موت کا نقارہ بجنے کے منتظر رہیں، جب موت کا اعلان ہوگا تو وہ وادی عدم کی طرف کوچ کر جائیں گے، ان کی تمام خواہشات اور امیدیں موت کے شکنجے میں جکڑی جائیں گی۔

تیسرے یہ ہے کہ صور پھونکنا،اس عالم کا خاتمہ اور ایک نئی دنیا کا آغاز بھی انسانوں کو ایک عمیق تربیتی درس دیتا ہے کہ وہ ہر حالت میں اس طرح کے واقعے کے منتظر رہیں،آج کے کام اور ذمہ داری کو کل پر نہ ٹالیں کیونکہ اس ناگہانی حادثہ کے لئے کوئی تاریخ معین نہیں ہے اور یہ کسی پیش خیمے کے بغیر ہی وقوع پذیر ہوگا۔

امام علیؑ بن الحسینؑ سے مروی ایک حدیث میں صور پھونکنے سے متعلق پوری تفصیل کے بعد یوں مرقوم ہے کہ راوی کہتا ہے: جب امام کی بات اس مقام تک پہنچی:

"رایت علی بن الحسین یبکی عند ذٰلك بکاء شدیدا"

تو امام کو میں نے اس حالت میں دیکھا کہ آپؑ شدید گریہ فرما رہے ہیں (اور دنیا کے اچانک خاتمہ، قیامت کی آمد اور خدا کے دربار میں حاضر ہونے کے متعلق سخت پریشان ہیں)[1]

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم۔زمر،آیہ ۶۸ کے ذیل میں، ج ۲ ص ۲۵۳۔بحار الانوار۔جلد ۶ ص ۳۲۴،حدیث ۲۔

اعمال نامہ

اشارہ:

قرآن کی آیات میں نامہ اعمال کے متعلق مفصل گفتگو کی گئی ہے اور اس سلسلے میں مختلف ومتنوع قسم کی عبارات وتعبیرات ذکر کی گئی ہیں۔

ان میں سے بہت سی آیات میں کتاب کی تعبیر لائی گئی ہے جو ایک وسیع مفہوم کی حامل ہے اور نامہ اعمال وکتاب دونوں پر محیط ہے۔

بعض دوسری آیات میں ''زبر'' کی تعبیر لائی گئی ہے جو کہ ''زبور'' کی جمع ہے،اس کا مفہوم بھی کتاب کے نزدیک نزدیک ہے۔

بعض دیگر آیات میں طائر کی تعبیر لائی گئی ہے جس کے معنی پرندہ ہیں، پرندوں سے عرب فال لیتے تھے اور اپنی قسمت کو ان کے ساتھ وابستہ سمجھتے تھے،قرآن اس تعبیر کے ذریعہ کہہ رہا ہے کہ تمہاری خوش بختی یا بدبختی کا پرندہ تمہارا یہی نامہ اعمال ہے۔

بعض آیات میں فقط نامہ اعمال لکھنے والوں کا تذکرہ ہے، انہیں ''رقیب''،''عتید'' یا ''خدا کے پیغام رساں'' یا ''کراماً'' یا ''متلقیان'' کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے،ان میں سے ہر نام اپنے ساتھ ایک مخصوص پیغام لئے ہوئے ہے (غور کیجئے گا)۔

نامہ اعمال کیا ہے؟ کیا ہر شخص کا ایک ہی نامہ عمل ہوگا یا زیادہ؟ نامہ اعمال لکھنے والے کون ہیں؟ وہ کیسے لکھا جاتا ہے؟ کس طرح انسان کے دائیں اور بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا؟ یہ سب مختلف سوالات ہیں جن کا جواب اس سلسلے میں وارد ہونے والی آیات کی تفسیر کے بعد دیا جائے گا۔

لیکن یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ یہاں بھی ان آیات کا تربیتی پیغام اور ان سے متعلق اخلاقی مسائل پہلے درجہ کی اہمیت کے حامل ہیں۔

اس مختصر سے اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کی طرف پلٹتے ہیں اور اس موضوع سے مربوط آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

۱۔ اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیِ الۡمَوۡتٰی وَ نَکۡتُبُ مَا قَدَّمُوۡا وَ اٰثَارَهُمۡ ؕ وَ كُلَّ شَیۡءٍ اَحۡصَیۡنٰهُ فِیۡۤ اِمَامٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۱۲﴾ (یس: ۱۲)

۲۔ وَ وُضِعَ الۡكِتٰبُ فَتَرَی الۡمُجۡرِمِیۡنَ مُشۡفِقِیۡنَ مِمَّا فِیۡهِ وَ یَقُوۡلُوۡنَ یٰوَیۡلَتَنَا مَالِ هٰذَا الۡكِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیۡرَةً وَّ لَا كَبِیۡرَةً اِلَّاۤ اَحۡصٰهَا (الکھف: ۴۹)

۳۔ اَمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّا لَا نَسۡمَعُ سِرَّهُمۡ وَ نَجۡوٰهُمۡ ؕ بَلٰی وَ رُسُلُنَا لَدَیۡهِمۡ

يَكْتُبُوْنَ۸۰﴿الزخرف:۸۰﴾

۴۔ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً۔ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا۔ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۲۸﴿الجاثية:۲۸﴾

۵۔ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ۔ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا اِقْرَاْ كِتٰبَكَ۔ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۱۴

۲ ال اسراء:۱۴

۶۔ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ﴿القمر:۵۲﴾

۷۔ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا۲۹﴿النبا:۲۹﴾

۸۔ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ......كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ۝۱۸

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ۝۱۹ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ۝۲۰ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ۝۲۱

۲ المطففین:۸

۹۔ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴿ق:۱۸﴾

۱۰۔ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ

۲ ال انفطار:۱۰۔۱۲

۱۱۔ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ۝۲۶ (حاقه:۱۹۔۲۵۔۲۶)

۱۲۔ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا وَّيَنْقَلِبُ

اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا (انشقاق۔۷تا۱۲)

۱۳۔ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ وَاَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ (واقعہ:۸۔۹)

۱۴۔ وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ (واقعہ:۲۷۔۲۸۔۴۱۔۴۲)

۱۵۔ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ (التکویر: ۱۴)

ترجمہ:

۱۔ یقیناً ہم مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا اور (جو کچھ اُن کے) پیچھے ہے ہم لکھتے جاتے ہیں اور ہم نے ہر چیز کو امام مبین میں جمع کر رکھا ہے۔

۲۔ اعمال نامے پیش کئے جائیں گے، پھر تم اس وقت مجرموں کو دیکھو گے کہ جو کچھ اس میں (درج) ہوگا، اس سے وہ ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے: ہم پر وائے! یہ کیسا اعمال نامہ ہے جو نہ چھوٹی بات کو چھوڑتا ہے نہ بڑی کو۔

۳۔ کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کی راز کی باتوں اور ان کی سرگوشیوں کو نہیں سنتے؟ ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) تو اُن کے پاس ہیں اور وہ لکھتے رہتے ہیں۔

۴۔ اور تو ہر امت کو (خوف اور ڈر کی وجہ سے) دیکھے گا کہ زانو ٹیک دے گی، ہر امت اپنے نوشتہ کی طرف بلائی جائے گی، یہ ہمارا نوشتہ ہے جو تمہارے خلاف حق کے ساتھ بولتا ہے (اور تمہارے اعمال کو بیان کرتا ہے) جو کچھ تم کرتے تھے ہم اُسے لکھتے جاتے ہیں۔

۵۔ اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو اس کے گلے میں لٹکا رکھا ہے اور ہم قیامت کے دن اس کے لئے ایک نوشتہ نکالیں گے جسے وہ اپنے سامنے پھیلا ہوا پائے گا (یہ اُس کا وہی اعمال نامہ ہوگا اور ہم اس سے کہیں گے) تو اپنا نوشتہ پڑھ لے، کافی ہے کہ آج کے دن تو اپنی ذات کا حساب لینے والا خود ہی ہو۔

٦۔ ہر وہ کام جو انہوں نے کیا، ان کے نامہ اعمال میں درج ہے اور ہر چھوٹا اور بڑا عمل لکھا جاتا ہے۔

٧۔ ہم نے ہر چیز کو جمع اور درج کر رکھا ہے۔

٨۔ ایسا نہیں ہے (جیسا کہ وہ قیامت کے متعلق خیال کرتے ہیں) یقیناً بروں کا اعمال نامہ سجین میں ہے، تم کیا جانو کہ سجین کیا ہے؟ وہ لکھی ہوئی دستاویز ہے اور یقینی ہے۔۔۔۔ایسا نہیں ہے جیسا (قیامت کے متعلق) وہ سوچتے ہیں، بلکہ نیک لوگوں کا نامہ اعمال علیین میں ہے، اور تم کیا جانو کہ علیین کیا ہے؟ وہ ایک نوشتہ ہے! اور حتمی نتیجہ، مقربین جس کے گواہ ہیں،۔

٩۔ توجہ رکھو کہ دائیں اور بائیں دو فرشتے جو انسان کے نگران ہیں، اس کے اعمال کو لکھتے ہیں، انسان جو بات بھی کرتا ہے اس کے پاس ایک فرشتہ اس کو لکھنے کے لئے مامور ہے۔

١٠۔ بے شک تم پر نگہبان مقرر کئے گئے ہیں، جن کا مقام بلند ہے اور وہ لکھنے والے ہیں، (تمہارے برے اور اچھے اعمال کو) تم جو کچھ کرتے ہو وہ جانتے ہیں۔

١١۔ جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہے (وہ خوشی اور اعزاز کے ساتھ) پکارے گا کہ (اے اہل محشر!) میرا اعمال نامہ پکڑو اور پڑھو، لیکن جس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ کہے گا! اے کاش! مجھے میرا نامہ اعمال نہ دیا جاتا اور مجھے معلوم نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے۔

١٢۔ جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، جلد ہی اُس کا حساب آسانی سے ہو جائے گا اور وہ خوشی خوشی اپنے خاندان کی طرف چلا جائے گا، لیکن جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا اور جلد ہی اُس کی فریاد بلند ہوگی، وائے ہو مجھ پر کہ میں ہلاک ہو گیا اور وہ دوزخ کی جلتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا۔

١٣۔ (پہلا گروہ) ''اصحاب میمنہ'' کا ہے، کیا ہیں اصحاب میمنہ؟ اور دوسرے اصحاب مشئمہ ہیں اور کیا ہیں اصحاب مشئمہ؟

١٤۔ اور دائیں ہاتھ والے، کیا (اچھا نصیب ہے) دائیں ہاتھ والوں کا! وہ بغیر کانٹوں کی جھکی بیریوں میں ہوں گے۔۔۔۔اور بائیں ہاتھ والے (کیا برا نصیب ہے) بائیں ہاتھ والوں کا (کہ اُن کے بائیں ہاتھ میں اعمال نامے کا ہونا اُن کے مجرم ہونے کی علامت ہوگا) وہ زہریلی گرم ہوا اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان ہوں گے۔

۱۵۔ جب نامہ اعمال کو کھولا جائے گا، اس وقت ہر شخص جان لے گا کہ اس نے کیا عمل کیا ہے!۔

تفسیر و جمع بندی آیات

اعمال نامہ

پہلی آیت میں موت کے بعد زندہ ہونے اور اعمال نامے کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، ایسا نامہ اعمال خدا کے قادر ہاتھ سے لکھا جائے گا انسانوں کے تمام اعمال اس میں اکٹھے لکھ دے جائیں گے، اسے امام ''مبین'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ہم ہیں جو مردوں کو زندہ کریں گے اور جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے اور ان کے تمام آثار کو لکھیں گے اور تمام چیزیں کو ہم نے کتاب مبین میں جمع کر دیا ہے ''انا نحن نحی الموتی و تکتب ما قدموا و اثارھم و کل شئی احصینه فی امام مبین''

سوال یہ ہے کہ آثار سے کیا مراد ہے؟ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ ''ما قدموا'' ان اعمال کی طرف اشارہ ہے جو انسان انجام دیتا ہے اور ''اثارھم'' اُن عادتوں کی طرف اشارہ ہے جنہیں وہ پیچھے چھوڑ کر جاتا ہے یا نیکی اور صدقات جاریہ کی طرف اشارہ ہے کوئی فلاحی مرکز قائم کرنا، اوقاف، علمی اور اخلاقی کتابیں تحریر کرنا وغیرہ۔

بعض نے کہا ہے کہ ''ما قدموا'' اچھے اور برے کاموں کی طرف اشارہ ہے جب کہ ''اثار'' ان قدموں کی طرف اشارہ ہے جو یہ کام سرانجام دینے کے لئے اٹھائے جاتے ہیں، قدم کو اس لحاظ سے اثر کہا گیا ہے کہ یہ زمین پر اپنا اثر چھوڑتے ہیں، بالخصوص نرم زمین پر۔

اس آیت کی شان نزول کے سلسلے میں مروی ایک حدیث میں ہے:

انصار کی ایک جماعت (قبیلہ بنی سلمہ) کے گھر مسجد النبوی سے دور تھے، انہوں نے نبیؐ سے اس سلسلے میں شکایت کی کہ اُن کے لئے نماز جماعت میں شریک ہونا مشکل ہے، لہٰذا آیت نازل ہوئی اور انہیں یہ نوید دی کہ وہ اس راہ میں جو قدم بھی اٹھائیں گے اس کا ثواب لکھا جائے گا۔[1]

''امام مبین'' سے مراد بہت سے مفسرین کے بقول ''لوح محفوظ'' ہے، جس میں تمام حقائق کو لکھ دیا گیا ہے، لہٰذا اس تعبیر سے یہ مطلب سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک مخصوص نامہ اعمال کے ساتھ ساتھ ایک عمومی نامہ اعمال بھی ہوگا جس میں تمام انسانوں کے اعمال درج ہوں گے، اس بات کی مزید وضاحت ''نامہ اعمال کی تعداد'' کے زیر عنوان بحث میں آئے گی۔[2]

''مبین'' کی تعبیر لوح محفوظ اور نامہ اعمال کے بالکل واضح اور روشن ہونے کی طرف اشارہ ہے جس میں انسان کے تمام کام بالکل

---

[1] مجمع البیان۔ ج ۸ ص ۴۱۸، تفسیر رازی۔ ج ۲۶ ص ۴۹، تفسیر قرطبی ج ۸ ص ۵۴، ۵۶۔

[2] لوح محفوظ کے سلسلے میں تفسیر نمونہ، ج ۲۶، سورہ بروج ۲۲ کے ذیل میں بحث کی گئی ہے۔

وضاحت سے درج ہوں گے اور نیک و بد کوئی چیز لکھنے سے رہ نہ گئی ہوگی۔

بہت سی روایات میں آیا ہے کہ ''امام مبین'' سے مراد امام معصوم ہے جو خدا کے حکم اور پیغمبر کے سکھائے ہوئے علم کے ذریعہ تمام حقائق کو بیان کرتا ہے۔

اس سلسلے میں تفسیر علی بن ابراہیم میں امیر المومنین حضرت علیؑ سے منقول ایک حدیث اس طرح ہے:

انا واللہ الامام المبین۔ ابین الحق من الباطل وورثته من رسول اللہ

اللہ کی قسم! میں امام مبین ہوں، جو حق کو باطل سے جدا کرتا ہوں اور یہ میرے پاس رسول اکرمؐ کی میراث ہے۔[1]

مذکورہ بالا تمام تفسیروں سے مراد یہ ہے کہ ''امام مبین'' کی تعبیر ایک وسیع مفہوم کی حامل ہے جیسا کہ اس کا ظاہر اُس نامہ اعمال کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں انسانوں کے تمام اعمال درج ہوں گے، اس کا باطن امام معصوم کی طرف اشارہ ہے، جو اپنے اُس فراوان علم کے ذریعے، جو اُسے پیغمبرؐ سے وراثت میں ملا ہے، حق کو باطل سے جدا کرتا ہے۔

دوسری آیت بھی اسی معنی کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: قیامت کے دن نوشتہ (انسانوں کے تمام اعمال پر مشتمل خدا کی عدالت میں) رکھا جائے گا اور گنہگاروں کو دیکھو گے کہ جو کچھ اس میں ہے اس سے بہت خوف زدہ ہیں اور کہتے ہیں: افسوس ہم پر! یہ کیسی کتاب ہے جس میں ہر بڑا اور چھوٹا کام درج ہے: ''ووضع الکتاب فتری المجرمین مشفقین مما فیه ویقولون یویلتنا مال هذا الکتب لا یغادر صغیرة ولا کبیرة الا احصها''۔

کیا اس نوشتہ سے مراد انسانوں کا وہ عمومی نامہ اعمال ہے جس کی طرف پہلی آیت میں بھی اشارہ ہوا ہے؟ یا ہر امت کا عمومی نامہ اعمال ہے؟ یا وہ خصوصی اور انفرادی نامہ اعمال ہے جو ہر انسان کے ساتھ ہوگا (اور جس کے متعلق گفتگو انشاء اللہ آگے چل کر کی جائے گی، ان تینوں قسم کے اعمال ناموں کا ذکر قرآن کی مختلف آیات میں ہوا ہے)۔ اس آیت کی تفسیر میں تینوں مذکورہ احتمال ممکن ہیں، گرچہ ''کتاب'' کا لفظ جو بطور مفرد ذکر ہوا ہے، انسانوں کے عمومی نامہ اعمال کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔

ضمناً اس آیت سے یہ بات بھی بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ اس اعمال نامے میں ہر چھوٹے اور بڑے انسان کا چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی، چاہے وہ برا ہو یا اچھا، لکھا ہوا ہوگا، یہاں تک کہ جس کا یہ نامہ عمل ہوگا وہ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جائے گا، ان کے اس خوف کا سبب ایک طرف تو ان اعمال کی وجہ سے اُن کا خدا کی عدالت میں حاضر ہونا ہے اور دوسری طرف یہ کہ وہ ان میں سے بہت سے کاموں کو بھلا بیٹھے ہوں گے، یا ان کے لئے وہ کسی اہمیت کے قائل نہ ہوں گے لیکن اب وہ ان تمام کاموں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے اور لوگوں کے سامنے بھی ذلیل و خوار ہوں گے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ''لا یغادر'' کا مادہ ''غدر'' ہے، جس کے معنی دنیا ہیں، لہٰذا اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ کسی چیز کو چھوڑا

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم، ج ۲، ص ۲۱۲۔

نہیں جائے گا، پیمان شکنی کو جو غدر کہتے ہیں تو اس کی وجہ بھی وفا اور عہد کو چھوڑ دینا ہے۔

تیسری آیت میں خدا کی طرف سے اس نامہ اعمال کو لکھنے والے فرشتوں کا ذکر ہے، ارشاد ہوتا ہے: وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم اُن کے پوشیدہ رازوں اور سرگوشیوں کو نہیں جانتے، ہاں ہم سنتے ہیں اور ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس موجود ہیں اور وہ سب کچھ لکھتے ہیں''ام یحسبون انا لا نسمع سرھم ونجوھم بلی ورسلنا لدیھم یکتبون''

یہ بات واضح ہے کہ اس آیت اور پہلی آیت جس میں تھا کہ ہم اُن کے اعمال لکھتے ہیں کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے، خدا کے فرستادوں اور فرشتوں کا کام حقیقت میں خدا کا کام ہی ہے، کیونکہ وہ یہ کام اس کے حکم سے انجام دیتے ہیں۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ انسانوں کا عمومی اعمال نامہ''امام مبین'' خدا کی قدرت سے کسی وسیلہ کے بغیر لکھا جائے جب کہ ہر انسان کا خصوصی اعمال نامہ، جو اس آیت میں بیان ہوا ہے، اُسے فرشتے لکھیں۔

''رسل''، ''رسول'' کی جمع ہے، یہاں اس سے مراد خدا کے فرشتے ہیں، اس کے معنی یہ نہیں کہ ہر انسان کے ساتھ کئی کئی فرشتے ہیں جو اس کے اعمال لکھتے ہیں، بلکہ اس بات کا امکان ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک یا دو فرشتے ہوں لہٰذا تمام انسانوں کے لئے اس کلمہ و بطور جمع ذکر کیا گیا ہے۔

''زمخشری'' کشاف میں کہتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں''سر'' سے مراد حدیث نفس ہے جو انسان باطنی طور پر اپنے ساتھ کرتا ہے یا کسی دوسرے کے ساتھ خلوت میں جو گفتگو کرتا ہے، لیکن نجوی وہ سرگوشی ہے جو محفل میں دوسرے کے کان میں کی جائے۔[1]

اعمال نامے بول اٹھیں گے:

چوتھی آیت میں ایک بار پھر اعمال درج کرنے کی نسبت خداوند عالم کی طرف دی گئی ہے، اس کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اعمال نامے اس دن گفتگو کریں گے اور بول اٹھیں گے، ارشاد ہوتا ہے: اس دن تم ہر قوم کو دیکھو گے کہ خوف کی زیادتی کی وجہ سے وہ لوگ زانو ٹیک دیں گے، ہر قوم اپنے نوشتہ اور نامہ اعمال کی طرف بلائی جائے گی اور (اس سے کہا جائے گا) جو کچھ تم نے انجام دیا ہے آج تمہیں اس کا بدلہ ملے گا، پھر ارشاد ہوتا ہے: یہ ہمارا نوشتہ ہے جو تم سے حق کے ساتھ بات کرتا ہے (ہاں) جو کچھ تم نے کیا ہم نے اسے لکھا ہے۔

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۗ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ ﴿الجاثیة: ۲۸﴾

یہ آیت واضح طور پر امتوں کے اعمال نامے کے متعلق گفتگو کر رہی ہے، یہ تین قسم کے اعمال ناموں میں سے ایک ہے، ان اعمال ناموں کے تعدد کا تذکرہ حقیقت میں اس امر پر تاکید کے لئے ہے کہ انسان کے تمام اعمال لکھے جائیں گے اور اس کا چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی

[1] تفسیر کشاف، ج ۴، ص ۲۶۵۔

نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔

''تدعی'' کی تعبیر یہ بتاتی ہے کہ اُن سے کہا جائے گا کہ اپنے اعمال نامے پڑھیں اور حقیقت میں اپنا محاسبہ خود کریں، جیسے کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۱۴ میں یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ آئی ہے:

''اقرا کتابك کفی بنفسك الیوم علیك حسیبا''

اپنا نامہ اعمال پڑھو، کافی ہے کہ آج کے دن خود اپنے محاسب بنو۔

''جاثیة'' کا مادہ ''جثو'' (بروزن ''علوّ'') ہے جس کے معنی زانو ٹیک کر بیٹھنا ہیں، اہل محشر کی یہ حالت یا تو اس لئے ہے کہ خوف کی شدت سے تمام لوگ زانو ٹیک کر بیٹھ جائیں گے، یا یہ اس حالت کی مانند ہے جو گذشتہ زمانے میں عدالت میں آنے کے بعد اور فیصلہ سننے کے بعد ملزم اختیار کرتے تھے، یعنی کھڑے کھڑے جھک جایا کرتے تھے جیسا کہ انسان کسی عظیم چیز کے انتظار میں بھی اسی حالت کو اختیار کرتا ہے۔

قابل توجہ یہ ہے کہ یہاں پر نامہ اعمال لکھنے کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے تا کہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ نامہ اعمال لکھنے والی ذات ایسی ہے کہ نہ تو اس کے بارے میں غفلت کا تصور کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی غلطی کا سوچا جا سکتا ہے، وہ ہر شے سے آگاہ ہے اور تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

''نستنسخ'' کا مادہ ''نسخ'' ہے جو ارباب لغت کے بقول حقیقت میں کسی چیز کو دوسری چیز کے ذریعے مٹا دینے کے معنی میں ہے چونکہ اس کا لازمہ ایک چیز کی نفی اور دوسری چیز کا اثبات ہے، اس لئے کبھی یہ کلمہ ''نفی'' کے معنی میں اور کبھی اثبات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی کبھار ہر دو معنی میں آتا ہے، چونکہ کسی چیز کا نسخہ بنانا یا فوٹو گرافی بھی ایک مطلب کے اثبات کے لئے ہوتی ہے جب کہ پہلے مطلب سے چشم پوشی کی جاتی ہے، اس لئے اس کے لئے ''نسخ'' اور ''استنساخ'' کے کلمات استعمال ہوتے ہیں۔

پانچویں آیت میں اعمال نامہ کے لئے ایک اور تعبیر لائی گئی ہے اور وہ ہے طائر (پرندے) کی تعبیر، ارشاد ہوتا ہے: ہم نے ہر انسان کے پرندے کو اس کی گردن پر قرار دیا ہے اور قیامت کے دن اُس کے لئے ایک کتاب نکالیں گے جسے وہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائے گا۔

پھر ارشاد ہوتا ہے: ''ہم اُسے کہیں گے: اپنی کتاب پڑھ۔ کافی ہے کہ آج کے دن تم خود اپنے محتسب بنو!۔۔۔'' ''وکل انسان الزمنه طٰئره فی عنقه۔ ونخرج له۔ یوم القیمة کتبا یلقه منشورا۔ اقر کتبك۔ کفی بنفسك الیوم علیك حسیبا''۔

طائر حقیقت میں پرندے کو کہتے ہیں، یہاں پر بہت سے مفسرین کے بقول نامہ اعمال کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، یہ اس لئے ہے کہ عربوں میں یہ رواج تھا کہ پرندوں کے ذریعے اچھی یا بری فال نکالتے تھے، بعض پرندوں کو تو وہ خوش بختی اور سعادت کی علامت سمجھتے تھے اور اگر گھر سے یا شہر سے نکلتے وقت اُن پرندوں سے سامنا ہو جاتا تو اُسے کامیابی اور کامرانی کا ذریعہ سمجھتے، جب کہ بعض دوسرے پرندوں کو بدبختی اور ناکامی کی علامت سمجھتے، اس لئے ''طائر'' خوش قسمتی اور ناکامی دونوں کے لئے استعمال ہونے لگا، لہٰذا

بعض مفسرین نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ فارسی میں کلمہ طائر کا مترادف ''بخت'' ہے[1] چونکہ قرآن اعمال کو انسان کی خوش بختی اور بدبختی کا بنیادی عامل سمجھتا ہے، اس لئے یہ کلمہ نامہ اعمال کے لئے استعمال کیا گیا ہے، یعنی قرآن نے ایک خیالی بات سے ایک مشاہداتی واقعیت پیدا کی اور لوگوں کو اس کی طرف بلایا ہے۔

البتہ''ونخرج له یوم القیمة کتبا یلقه منشورا''(قیامت کے دن اس کے لئے نوشتہ نکالا جائے گا جسے وہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائے گا) کے جملہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ''طائر'' کے معنی نامہ اعمال کرنے کے بجائے عمل کرنا زیادہ مناسب ہیں، کیونکہ نامہ اعمال کو دوبارہ الگ سے ذکر کیا گیا ہے، انسان کے اعمال کا اس کی گردن پر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ یہ اس سے الگ نہیں ہوں گے، اگر اچھے ہوئے تو اس کی زینت اور عزت کا باعث ہوں گے اور اگر برے ہوئے تو طوق وزنجیر کے مانند اسے تکلیف دیتے رہیں گے۔

اس آیت میں دو اور نکتے بھی قابل توجہ ہیں، ایک تو یہ کہ قیامت کے دن اعمال نامہ کھولے جائیں گے اور تمام لوگ اُن سے آگاہ ہو جائیں گے اور ہر کسی کا نامہ عمل اس کے لئے دوسروں کی نظر میں رسوائی یا عزت کا باعث ہوگا، دوسرا یہ کہ نامہ عمل کی تحریر اس قدر واضح ہوگی کہ کسی دوسرے حساب کرنے والے کی ضرورت نہیں ہوگی، اتنا ہی کافی ہوگا کہ خود انسان اپنا حساب کرلے یا تو وہ ایک اُڑی رنگت اور بیمار وافسردہ شخص کی مانند حساب کرے گا، جس سے اُس کی بیماری اور بداعمالی ظاہر ہوجائے گی، یا پھر اس کے برعکس ایک شاداب چہرے اور مسکراہٹ کے ساتھ، اور یہ کیفیت اس کی فلاح کی دلیل ہوگی، لہٰذا وہ خود اپنی حالت سے اپنا اندازہ لگا سکے گا، کسی دوسرے کی گواہی کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

چھٹی آیت میں اعمال نامہ کے سلسلہ میں ایک اور تعبیر لائی گئی ہے اور وہ''زبر'' ہے جو''زبور'' کی جمع ہے یہ کلمہ کتاب کے معنی میں ہے، ارشاد ہوتا ہے: وہ تمام اعمال جو انہوں نے انجام دیے کتابوں (اُن کے نامہ اعمال) میں درج ہیں اور ہر چھوٹا بڑا کام لکھا جائے گا۔''**وکل شئی فعلوہ فی الزبر۔ وکل صغیر و کبیر مستطر**''

اگرچہ یہ آیت ان گذشتہ اقوام کی طرف اشارہ کرتی ہے جن کے اعمال پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کے کفار جیسے تھے، تاہم یہ بات واضح ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ اُن کے اعمال لکھے گئے ہیں تو اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ تمہارے اعمال بھی اسی طرح لکھے جارہے ہیں۔

''زبر'' حقیقت میں''زبرة''(بروزن''سفرة'') سے ماخوذ ہے، جو لوہے کے ایک بڑے ٹکڑے کے معنی میں ہے، پھر یہ کلمہ ان موٹے اور بڑے خطوط کے لئے استعمال ہونے لگا جو بڑے صفحات پر کھینچے جاتے ہیں، راغب مفردات میں کہتے ہیں:

"کل کتاب غلیظ الکتابة یقال له زبور"

ہر وہ تحریر جو جلی حروف میں لکھی جائے اُسے زبور کہتے ہیں۔

اس تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ''زبور'' ہر کتاب کو نہیں کہتے بلکہ اس میں الفاظ کا بڑا اور واضح ہونا بھی ضروری ہے، نامہ اعمال کے لئے اس تعبیر کا انتخاب بہت بامعنی ہے، جو نامہ اعمال کے واضح اور مستحکم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] فخر رازی نے یہ بات اپنی تفسیر کی جلد ۲۰، ص ۱۶۷ پر ابوعبیدہ سے نقل کی ہے۔

''صغیر''اور''کبیر'' کی تعبیر بالخصوص''صغیر'' کو کبیر پر جو مقدم کیا گیا ہے، جیسا کہ قرآن کی چند دیگر آیات میں بھی ایسا ہی ہوا ہے، اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ نامہ اعمال کے سلسلے میں کسی شخص اور کسی عمل کی بھی چھوٹ نہیں ہوگی، بلکہ سب کچھ تحریر کیا جائے گا۔ [۱]

''مستطر'' کا مادہ''سطر'' ہے یہ بھی لکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، یہ اعمال کے ثبت ہونے کے لئے مزید تاکید ہے، البتہ نہ فقط اعمال کو لکھا جائے گا بلکہ گفتار اور نیتوں کا ثبت ہونا بھی دونوں آیات کے مفہوم میں موجود ہے (غور کیجئے گا)۔

ساتویں آیت میں یہ اعلان کرنے کے بعد کہ کافر قیامت کے دن ہرگز اپنے اعمال کے حساب کے سلسلے میں امیدوار نہیں ہوں گے، (اور اسی وجہ سے) وہ آیات الٰہی کو جھٹلاتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے: (یہ اس حالت میں ہے) کہ ہم یقینی طور پر تمام چیزوں کو شمار کر لیا ہے اور لکھ لیا ہے،''وکل شیءٍ احصینہ کتابا''۔

''احصینہ'' کا مادہ''احصاء'' ہے جو حقیقت میں''حصی'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی سنگریزہ ہیں، چونکہ پہلے زمانے میں چیزوں کی گنتی کے لئے انگلیوں کے بجائے پتھر کے ٹکڑوں سے کام لیا جاتا تھا، اس لئے''احصاء'' کا کلمہ گننے اور کسی چیز کا حساب رکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لہٰذا بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کلمے کا مفہوم یہاں''لکھنا'' ہے اسی لئے''کتابا'' کو''احصینا'' کے لئے مفعول مطلق کے طور پر لایا گیا ہے، جب کہ مفعول مطلق کو چاہیے کہ وہ پہلے والے فعل کے مصدر سے ہی ہو، لیکن یہاں پر چونکہ ہر دو کلموں کے ایک ہی معنی ہیں اس لئے ایک کو دوسرے کا جانشین بنایا جا سکتا ہے۔ [۲]

علیین اور سجین میں رکھے جانے والے اعمال نامے

آٹھویں آیت ورہ مطففین میں دو جگہ آئی ہے یہ نیک اور برے لوگوں کے نامہ اعمال کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں کچھ زیادہ جزئیات بیان کرتی ہے، پہلے تو بروں کے نامہ اعمال کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے: ایسا نہیں ہے جیسا کہ وہ (قیامت کے متعلق) خیال کرتے ہیں یقینی طور پر گنہگاروں کا اعمال نامہ''سجین'' میں ہے اور تم کیا جانو کہ سجین کیا ہے؟ وہ ایک نوشتہ ہے اور یقینی ہے''کلا ان کتب الفجار لفی سجین، وما ادرك ما سجين ۔ کتب مرقوم ۔''

چند آیات کے بعد اسی سورہ میں نیک لوگوں کے نامہ اعمال کے متعلق ارشاد ہوتا ہے: ایسا نہیں ہے جیسا کہ وہ (قیامت کے متعلق سوچتے ہیں) نیک لوگوں کا نامہ اعمال''علیین'' میں ہے اور تم کیا جانو کہ علیین کیا ہے؟ وہ ایک حتمی اور لکھی ہوئی کتاب ہے جس کے گواہ مقربین میں''کلا ان کتب الابرار لفی علیین ۔ وما ادرك ما عليون، کتب مرقوم ۔ يشهده المقربون''۔

ان آیات میں''سجین'' اور''علیین'' کے متعلق گفتگو کی گئی ہے جن میں برے اور اچھے لوگوں کے نامہ اعمال کو رکھا جائے گا، لہٰذا ان

---

[۱] سورہ توبہ، آیت نمبر ۱۲۱، اور سورہ کہف، آیت ۴۹ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[۲] بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ''کتابا'' حال ہو، لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

لفظوں کے معنی کو پوری طرح واضح ہونا چاہیے۔

''سجین'' مبالغے کا صیغہ ہے جو ''سجن'' کے مادہ سے ہے، جس کے معنی قید خانہ ہیں، یہاں اس کے لئے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں، جیسے دوزخ، یا دوزخ کا ایک خاص حصہ جس میں برے لوگوں کا اعمال نامہ رکھا جائے گا، لیکن سب سے زیادہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''سجین'' ایک جامع نوشتہ ہے جس میں تمام برے لوگوں کے اعمال مجموعی طور پر لکھ دیئے جائیں گے، سادہ الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک جرنل کی مانند ہوگا جیسے وہ بہی کھاتہ جس میں تمام قرض خواہوں اور قرض داروں کا حساب کتاب لکھا جاتا ہے کیونکہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ اعمال نامے متعدد ہیں۔

''علیین'' جمع ہے علی (بروزن ''ملی'') کی جو حقیقت میں ''علو'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی بلندی ہیں، یہ بلند و بالا مکان کی طرف اشارہ ہے، جو افراد پہاڑوں کی بلندیوں پر ساکن ہوں ان پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے، بہت سے مفسرین کے بقول یہاں یہ بہشت کے بہترین مکان یا آسمان کے بالاترین مکان کی طرف اشارہ ہے لیکن اوپر جو کچھ ''سجین'' کے متعلق کہا گیا ہے اس کے ساتھ اس کا موازنہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک بڑی کتاب کے معنی میں ہے جس میں تمام نیک لوگوں کے اعمال مجموعی طور پر درج ہوں گے۔ یہ ایک بلند مرتبہ کھاتہ ہوگا جو خدا کے قرب میں ہوگا۔[1]

نگران فرشتے:

نویں آیت میں ظاہری طور پر تو نامہ اعمال کی کوئی بات نہیں لیکن حقیقت میں یہ بات ایک دوسری تعبیر کے ساتھ بیان کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''یاد کرو جب کہ دائیں اور بائیں دو فرشتے جو انسان کے نگہبان ہیں، اُس کے اعمال حاصل کرتے ہیں'' ''اذ یتلقی المتلقین عن الیمین وعن الشمال قعید''۔

واضح ہے کہ ان کا حاصل کرنا نامہ اعمال لکھنے کی طرف اشارہ ہے، پھر مزید تاکید کے لئے ارشاد ہوتا ہے: انسان جو بات بھی کرتا ہے اس کے پاس فرائض کو پوری طرح ادا کرنے والا ایک بالکل تیار نگران کھڑا ہے ''ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید''۔

''یتلقی'' کا مادہ ''لقی'' ہے جو ''ملاقات'' کے معنی میں ہے، لیکن یہاں پر تلقی اعمال اُن کو لکھنے اور درج کرنے کی طرف کنایہ ہے اور ''متلقیان'' سے مراد وہ دو فرشتے ہیں جو انسانوں کے اعمال لکھنے پر متعین ہیں۔

''قعید'' کا مادہ ''قعود'' ہے جس کے معنی بیٹھنا ہیں یہاں یہ نگہبان اور نگران کے معنی میں آیا ہے جیسا کہ روزمرہ کی گفتگو میں بھی

---

[1] یہ بات قابل توجہ ہے کہ ''علیین'' قاعدے کے مطابق تو جمع مذکر عامل ہے (جب کہ ''سجین'' مفرد ہے) لیکن یہ اس امر سے مانع نہیں کہ یہ ایک بلند و بالا مکان کے لئے اس کے بلند مقام ساکنین کی وجہ سے استعمال ہو۔

کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں کا ہم نشین اور مصاحب ہے یعنی اس کا نگہبان ہے۔[1]

''یلفظ''، ''لفظ'' کے مادہ سے ہے جو حقیقت میں کسی چیز کو پھینکنے کے معنی میں ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے لفظ ''الرحی الدقیق، (چکی نے آٹے کو باہر نکال پھینکا)۔

یہ کلمہ اس چیز کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو انسان اپنے منہ سے نکالتا ہے، اس لئے یہ اس بات کے لئے جو کہ منہ سے نکلتی ہے، ایک خوبصورت کنایہ ہے گویا یہ ایسی چیز ہے جو باہر نکالی جاتی ہے۔

''رقیب'' جیسا کہ راغب نے مفردات میں ذکر کیا ہے ''رقبہ'' کے مادہ سے ہے جس کے معنی گردن ہیں، جو شخص ایک چیز کی حفاظت اور نگرانی کرے اُسے ''رقیب'' کہتے ہیں، یا تو اس لئے کہ وہ چاروں طرف گردن گھما تا رہتا ہے تا کہ جو کچھ اُس کے پاس واقع ہو اُس سے باخبر رہے، یا اس لئے کہ رقبہ اور گردن اپنی زیر نگرانی چیز کی حفاظت اور نگرانی کرتی ہے۔

''عتید'' کا مادہ ''عتاد'' (بروزن ''جهاد'') ہے جس کے معنی ضرورت پڑنے سے پہلے کسی چیز کو آمادہ کرنا یا ذخیرہ کرنا ہیں، لہٰذا جو شخص ایک کام کے لئے آمادہ اور تیار ہو اُسے ''عتید'' کہا جاتا ہے۔

لیکن مقائیس اللغت میں اس کے حقیقی معنی ''طاقت'' اور نزدیکی'' کئے گئے ہیں جو پہلے معنی کی نسبت لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بہر حال کیا ان دونوں وصفوں میں سے ہر ایک اُن دو فرشتوں میں سے ایک سے متعلق ہے جو نگرانی کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے اور دوسرا لکھنے کے لئے تیار بیٹھا ہے، یا یہ کہ یہ دونوں کی صفت ہے، اس لحاظ سے کہ وہ دونوں انسان کے کاموں کی نگرانی کر رہے ہیں اور دونوں ہی لکھنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں؟

بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ''رقیب'' دائیں فرشتے کا نام ہے (جو اچھے اعمال لکھنے پر مامور ہے) اور ''عتید'' بائیں فرشتے کا نام ہے (جو برے اعمال لکھنے پر متعین ہے)۔

لیکن بعض دوسرے مفسرین کی عبارات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں وصف دونوں فرشتوں کے لئے ہیں، یعنی اُن میں سے ہر ایک نگرانی کا کام بھی کر رہا ہے اور لکھنے کے لئے بھی تیار بیٹھا ہے۔

ان دو فرشتوں کے متعلق کئی روایات ذکر ہوئی ہیں جو بہت بامعنی ہیں انہی میں سے ایک حدیث پیغمبر اکرمؐ سے یوں منقول ہے:

''جب انسان اچھا کام کرتا ہے تو دائیں طرف والا فرشتہ دس ثواب اس کے لئے لکھ دیتا ہے اور جب کوئی برا کام کرتا ہے تو بائیں طرف والا فرشتہ اسے لکھنا چاہتا ہے تو دائیں طرف والا فرشتہ اس سے کہتا ہے کہ اسے سات گھنٹے

---

[1] ''متلقیان'' تثنیہ ہے لہٰذا ''قعید'' کو بھی تثنیہ یعنی ''قعیدان'' ہونا چاہیے، لیکن آیت میں درحقیقت کچھ محذوف ہے اور پوری عبارت یوں ہے: ''عن الیمین قعید و عن الشمال قعید'' پہلا دوسرے کے قرینہ کی وجہ سے محذوف ہو گیا ہے۔

مہلت دو، اگر اس دوران اس نے توبہ کر لی تو اس کے لئے کچھ نہ لکھو، لیکن توبہ نہ کرے تو اُس کے نامہ اعمال میں فقط ایک گناہ لکھو۔[1]

اس طرح کی روایات کا تربیتی پیغام بہت واضح اور روشن ہے اس روایت اور اسی طرح کی دوسری روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دو فرشتوں کا کام جدا جدا ہے، اس سلسلے میں مزید وضاحت انشاء اللہ آگے چل کر آئے گی۔

اعمال نامہ لکھنے والے:

دسویں آیت میں نامہ عمل کے ''کاتبوں'' کا تذکرہ ہے اور ان کی معلومات کے وسیع ہونے کی طرف اشارہ ہے، ارشاد ہوتا ہے: یقینی طور پر تم پر نگہبان مقرر کئے گئے ہیں جو بلند مقام اور لکھنے والے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ تمہارے اعمال سے پوری طرح آگاہ ہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ جانتے ہیں'' وان علیکم لحفظین، کراما کاتبین، یعلمون ما تفعلون''۔

ظاہر ہے کہ حافظین سے مراد وہ فرشتے ہیں جو انسانوں کے اعمال کی نگہبانی پر مقرر کئے گئے ہیں نہ کہ مختلف حوادث سے اس کی حفاظت کے لئے۔

درحقیقت خداوند عالم نے ان فرشتوں کی چار صفات بیان کی ہیں جو ایک دوسرے کی لازم وملزوم ہیں، ایک تو انسانوں کے اعمال کی نگرانی اور نگہبانی، پھر اُن کو کرام (جمع کریم) کی صفت سے متصف کیا ہے جو اُن کی عظمت کی طرف اشارہ ہے اگر چہ اُن کی ذمہ داری انسان کے اعمال لکھنا ہے، لیکن وہ یہ کام کسی کدورت کے ساتھ انجام نہیں دیتے، بلکہ مہربانی اور کرم فرمائی سے یہ فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اُن کی بزرگواری اس لحاظ سے ہے کہ وہ نیک اعمال اور ان کے دس گناہ ثواب کو تو فوراً لکھ لیتے ہیں، جب کہ برے اعمال لکھنے کے سلسلے میں بہت تاخیر کرتے ہیں، جیسا کہ پہلے حدیث میں بھی گذر چکا ہے، اس لئے کہ شاید یہ برا کام کرنے والا توبہ کر لے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اُن کی مہربانی اس لحاظ سے ہے کہ وہ نیک اعمال آسمانوں پر لے جاتے ہیں اور فرشتوں کی محفل میں اُن کا اظہار کرتے ہیں جب کہ برے کاموں کو اس ستار العیوب ذات کی ہدایت سے چھپا لیتے ہیں۔

علاوہ ازیں اُن کی مہربانی اس بات کا باعث بنے گی کہ انسان اپنے اعمال کی طرف زیادہ متوجہ رہے کیونکہ کوئی شخص بھی یہ نہیں چاہتا کہ وہ کسی مہربان اور بزرگ شخص کی موجودگی میں کوئی برا کام انجام دے۔

اُن کی تیسری صفت ''کاتبین'' بیان کی گئی ہے جو انسان کے کاموں پر اُن کی نگرانی کی تشریح اور وضاحت ہے، واضح طور پر ارشاد ہوتا ہے: کہ وہ تمام اعمال کو لکھتے ہیں تا کہ تم جان لو کہ اُن سے کوئی چیز نہیں چھوٹتی۔

چونکہ یاد رکھنے اور پھر لکھنے کے لئے ایک ہمہ پہلو علم کی ضرورت ہے اس لئے ان کی چوتھی صفت کے طور پر ارشاد ہوا کہ وہ جانتے ہیں

---

[1] مجمع البیان، ج ۹ ص ۴۴۱، یہی مضمون روح المعانی، ج ۲۶ ص ۱۶۴ اور تفسیر مراغی، ج ۲۶ ص ۱۶۱ پر بھی آیا ہے۔

تم جو کچھ کرتے ہو، یہ تعبیر جسمانی کام اور قلبی کام کے ساتھ ساتھ گفتگو پر بھی محیط ہے۔

کلمہ ''حافظین'' کو جمع یا تو اس لئے لایا گیا ہے کہ دن کے وقت دو فرشتے اور رات کے وقت دو دوسرے فرشتے انسانی کاموں کی نگرانی کرتے ہیں (جیسا کہ بعض روایات میں بھی آیا ہے [1]) یا اس لئے ہے کہ یہاں پر مخاطب تمام انسان ہیں اور جو فرشتے تمام لوگوں کی نگرانی کر رہے ہیں ان کا ذکر جمع کے طور پر لایا گیا ہے۔

نامہ اعمال دائیں بائیں ہاتھ میں

گیارہویں آیت ایک نئے مطلب کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور وہ ہے نامہ اعمال کا انسان کے ہاتھوں میں دیا جانا، قیامت کے دن برے لوگوں کا نامہ اعمال اُن کے بائیں ہاتھ میں اور نیک لوگوں کا نامہ اعمال اُن کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، یہ کام بذات خود محشر میں بروں اور اچھوں کے ایک دوسرے سے جدا ہونے کی علامت ہوگا، ارشاد ہوتا ہے: جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہوگا (ایک اعزاز کے ساتھ) پکارے گا کہ اے اہل محشر! میرا نامہ اعمال لو اور پڑھو! مجھے معلوم ہوتا تھا کہ قیامت آئے گی اور میرے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔''

فاما من اوتی کتبه بیمینه فیقول ھآؤم اقرءوا کتبیه، انی ظننت انی ملق حسابیه"

اس کے برعکس جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں ہوگا وہ پکارے گا: اے کاش! مجھے میرا نامہ اعمال دیا ہی نہ جاتا، اے کاش مجھے کبھی معلوم نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے؟ اے کاش مجھے موت آجاتی'' واما من اوتی کتبه بشماله، فیقول یلیتنی لم اوت کتبیه، ولم ادر ما حسابیه، یلیتها کانت القاضیة''۔

کیا دایاں اور بایاں ہاتھ انسانی جسم کے اس خاص حصے کی طرف اشارہ ہے یا یہ کہ یہ نیکی اور برائی کے لئے کنایہ ہے کیونکہ دائیں ہاتھ کو نیکی کے لئے کنایہ سمجھا جاتا ہے اور بائیں ہاتھ کو برائی کے لئے کنایہ کے طور پر لایا جاتا ہے؟

یہ معنی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' میں ایک احتمال کے طور پر ذکر کئے گئے ہیں، لیکن اس تاویل کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ واقعی طور پر نیک لوگوں کا نامہ عمل اُن کے دائیں ہاتھ اور برے لوگوں کا نامہ عمل اُن کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تاکہ قیامت کے دن وہ پہچانے جاسکیں۔

بہت سے مفسرین اور اہل لغت کے بقول ''ھاؤم'' دو کلموں کا مرکب ہے، ایک کلمہ ''ھاء'' ہے جو اسم فعل ہے اور ''خذ'' (پکڑو) کے معنی میں ہے اور دوسرا ''میم'' ہے جو جمع مذکر مخاطب کی ضمیر سے مرکب ہے، اس کلمے کی گردان فعل امر کی طرح کی جاتی ہے۔ھاءَ،ھاءِ،ھائُمَا،

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۱۵۴، ۱۵۵ باب ۲۸، از باب مواقیت۔ اس باب میں بہت سی روایات ہیں جن کے مطابق جو شخص بھی صبح کی نماز طلوع فجر کے آغاز میں ادا کرے گا دن اور رات کے فرشتے، جن کی ڈیوٹی اس وقت تبدیل ہو رہی ہوتی ہے، دونوں اس کا ثواب لکھ لیتے ہیں، سورہ بنی اسرائیل، آیت ۷۸ (ان قرآن الفجر کان مشھودا) کی تفسیر میں سنی اور شیعہ دونوں نے اسی طرح کی متعدد احادیث نقل کی ہیں۔ (تفسیر نمونہ میں اسی آیت کے ذیل کی طرف رجوع کیا جائے)۔

ھائوم، ھائن (واحد مذکر، واحد مونث تثنیہ و جمع مذکر اور تثنیہ و جمع مونث) اور کبھی اس کا ہمزہ کاف میں بدل جاتا ہے اور یوں کہا جاتا ہے: **ھاكَ،ھاكِ، ھا کُما، ھا کُمْ، ھا کُنَّ۔**

''کتابیہ اور حسابیہ'' کے آخر میں آنے والی هاء کو اصطلاح میں ''هاء سکت'' کہتے ہیں یہ ضمیر نہیں ہے اس لئے یہ کلام میں صرف آسانی کے لئے لائی گئی ہے اور کسی خاص مفہوم کی حامل نہیں ہے، اس لئے یہ کلام میں صرف آسانی کے لئے لائی گئی ہے اور کسی خاص مفہوم کی حامل نہیں ہے۔

حنظلہ جو غسیل الملائکہ کے لقب سے مشہور ہیں اور جنگ اُحد کے شہداء میں شامل ہیں، اُن کے بیٹے عبداللہ ایک حدیث کے راوی ہیں جو اس طرح ہے:

قیامت کے دن خدا اپنے بندے کو روکے گا، اُس کے گناہ اس کے نامہ اعمال کی دوسری طرف ظاہر کرے گا اور اس سے پوچھے گا: ''کیا تم نے یہ گناہ کیا ہے؟'' وہ کہے گا: ''ہاں! اے میرے پروردگار'' پھر اس سے خطاب ہوگا: ''میں نے تجھے ذلیل ورسوا نہیں کیا (لہٰذا میں نے یہ حکم دیا کہ تیرے گناہ نامہ اعمال کی دوسری طرف لکھے جائیں تا کہ کوئی انہیں دیکھ نہ سکے) اور میں نے تیرے یہ گناہ (تیری نیکیوں کی وجہ سے) بخش دیے، یہاں پر مومن (بہت خوشی اور سرور کے ساتھ) آواز بلند کرے گا: ''**ھاؤم اقرء وا کتابیه**'' (اے اہل محشر! یہ میرا نامہ اعمال پکڑ و اور اسے پڑھو)[1]

نامہ اعمال کے دائیں یا بائیں ہاتھ میں ہونے کا تذکرہ ہی بارہویں آیت میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: جس کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا گیا ہے اس کا حساب جلدی اور آسانی کے ساتھ ہو جائے گا اور وہ خوشی خوشی اپنے خاندان کی طرف پلٹ آئے گا، لیکن جس کا نامہ اعمال اُسے پیچھے کی طرف سے پکڑایا جائے گا جلد ہی اُس کی آواز بلند ہوگی: مجھ پر وائے کہ میں برباد ہو گیا، اور وہ جہنم کے لپکتے ہوئے شعلوں میں داخل ہو جائے گا'' (**فاما من اوتی کتبه بیمینه، فسوف یحاسب حسابا یسیرا، وینقلب الیٰ اهله مسرورا، واما من اوتی کتبه ورآء ظهره، فسوف یدعوا ثبورا، و یصلی سعیرا**)۔

پہلی آیات میں برے لوگوں کے نامہ اعمال کا اُن کے دائیں ہاتھوں میں ہونے کا تذکرہ ہے، لیکن ان آیات میں پچھلی طرف سے نامہ اعمال پکڑانے کی بات ہے، یہ اس لئے ہے کہ جب مجرموں کو اُن کا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ شرمندگی کے مارے اپنے ہاتھ کو پیچھے کی طرف چھپالیں گے تا کہ لوگ اُن کے جرم اور رسوائی کے اس ثبوت کو نہ دیکھ سکیں، یا یہ اس لئے ہے کہ اُن کا بایاں ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دیا جائے گا، جیسا کہ انہوں نے دنیا میں کتاب خدا کو پیچھے کی طرف دھکیل دیا تھا، قیامت میں اُن کا نامہ اعمال بھی اُن کے پیچھے ہوگا، یا یہ اس لئے ہے کہ اُن کے چہرے پچھلی طرف مڑ جائیں گے اور وہ اپنا نامہ عمل دیکھنے کے لئے دائیں ہاتھ کو پیچھے کی طرف لائیں گے۔

---

[1] تفسیر درمنثور، ج ۶ ص ۲۶۱، تفسیر فی ظلال القرآن، ج ۸ ص ۲۵۶ (اگر چہ یہ حدیث عبداللہ بن حنظلہ سے منقول ہے لیکن قاعدے کے مطابق اس نے اُسے پیغمبر اکرمؐ سے بالواسطہ سنا ہے۔

ان تینوں معنوں میں سے جو بھی مراد ہو یہ پہلی آیات جو یہ کہتی ہیں کہ بدکاروں کا نامہ اعمال اُن کے بائیں ہاتھ میں ہوگا، کے ساتھ کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتیں۔

یہاں خاندان سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ ان سے مراد وہ عورتیں، اولاد اور قریبی رشتہ دار ہیں جو اہل ایمان تھے اور اب کشتی نجات پر بیٹھ کر اس سے پہلے جنت میں داخل ہو چکے ہیں۔

بعض دوسرے مفسرین نے اُسے جنتی بیویوں کی طرف اشارہ قرار دیا ہے اور بعض دیگر نے اس سے مراد وہ سب مومن لئے ہیں جو اس سے پہلے جنت میں داخل ہو چکے ہوں گے کیونکہ تمام مومنین ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں اور حقیقت میں تمام ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، بالخصوص اس بات کے پیش نظر کہ اسی سورت کی آیت ۱۳ میں یہی اہل کی تعبیر خاندان، بیوی، اولاد اور قریبی رشتہ داروں کے لئے لائی گئی ہے اور وحدت سیاق کا یہ تقاضا ہے کہ یہاں پر بھی وہی معنی مراد لئے جائیں۔

تیرہویں آیت میں افراد کی یہی گروہ بندی (دائیں ہاتھ اور بائیں ہاتھ میں نامہ اعمال والے) ایک اور شکل میں بیان کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''اصحاب میمنہ! کیا ہیں اصحاب میمنہ (اُن کا کیا پر افتخار اور مسرت آمیز انجام ہے)''فاصحاب المیمنة ما اصحاب المیمنة'' پھر ارشاد ہوتا ہے: ''اصحاب مشمه، کیا هیں اصحاب مشمه؟ (کس دردناک اور شرمناک انجام سے دوچار ہیں؟)'''' واصحاب المشئمة ما اصحاب مشمة''۔

میمنہ ''یمن'' کے مادہ سے ہے، جس کے معنی سعادت اور خوش بختی ہیں، بعض لوگوں نے اسے ''یمین'' کے مادہ سے سمجھا ہے جس کے معنی دایاں ہاتھ ہیں، وہ کہتے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کا نامہ اعمال اُن کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا (یہ تو صحیح ہے کہ یمن اور یمین کا مادہ ایک ہی بنیاد سے ہے، لیکن پہلے کے معنی برکت اور سعادت اور دوسرے کے دایاں ہاتھ ہیں جو کہ برکت کی ایک علامت ہے)۔

راغب نے مفردات میں اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اس کی بنیاد وہی دائیں ہاتھ والا مفہوم رکھتی ہے اور چونکہ دائیں ہاتھ سے انجام پانے والے کاموں سے ہی برکت حاصل ہوتی ہے، اس لئے یہ کلمہ خیر اور برکت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس کا متضاد لفظ ''مشمه'' ہے جو ''شوم'' کے مادہ سے ہے، مقائیس اللغت کے بقول اس کے حقیقی معنی بایاں ہاتھ ہیں، لیکن چونکہ بائیں ہاتھ اور اس سے انجام پانے والے کاموں کو بدبختی اور بدقسمتی کی علامت سمجھا جاتا تھا، اس لئے کلمہ ''شوم'' اس معنی میں استعمال ہوا ہے اس طرح سے ''اصحاب المیمنة'' اور ''اصحاب المشئمة'' حقیقت میں انہی افراد کے معنی میں ہیں، جن کا نامہ اعمال اُن کے دائیں یا بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، اس کی تفسیر خوش قسمت اور سعادت مند جماعت اور بدقسمت اور ناکام جماعت کے عنوان سے دوسرے معنی کے زمرے میں آتی ہے۔

فخر رازی نے اپنی تفسیر میں ''اصحاب المیمنۃ'' کو اصحاب جنت کے عنوان سے یاد کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

''یہ یا تو اس لئے ہے کہ ان کا نامہ اعمال اُن کے دائیں ہاتھ میں ہے یا اس لئے ہے کہ میدان محشر میں اُن کے دائیں ہاتھ سے ایک نور پھوٹے گا'' (یسعی نورھم بین ایدیھم وبایمانھم) (حدید۔۱۲)

یا یہ اس لئے ہے کہ دایاں ہاتھ اچھائی اور نیکی کی علامت ہے اور عرب ان پرندوں کو جو ان کے دائیں طرف سے گزرتے تھے، نیک فال سمجھتے تھے اور جو اُن کے بائیں طرف سے اڑ جاتے تھے انہیں فال بد سمجھتے تھے۔[1]

''مآ اصحاب المیمنۃ وما اصحاب الشئمۃ'' جو سوالیہ جملے کے طور پر ہیں، پہلے گروہ کے بہت بلند مقام ہونے اور دوسرے گروہ کے بہت پست مقام ہونے کی طرف اشارہ ہیں گویا پہلے گروہ کے مقام کی بلندی اور ان کے لئے برکات کی فراوانی فکر انسانی کے دائرہ سے باہر ہے، یہ تعبیر اس معنی کے لئے ایک بہت لطیف کنایہ بھی ہے، جب کہ دوسری تعبیر اُن کے انحطاط اور ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں گرے ہوئے ہونے کی طرف اشارہ ہے، اگرچہ ان آیات میں نامہ عمل کے متعلق کوئی بات نہیں کی گئی، تاہم قرآن کی باقی آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے جن میں ان دو کلموں کو نامہ اعمال کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے، مذکورہ بالا تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

چودھویں آیت جو سورہ واقعہ میں مذکورہ بالا آیت کا تتمہ ہی ہے، میں ارشاد ہوتا ہے: ''اور اصحاب یمین (دائیں ہاتھ والے لوگ) کیا ہیں اصحاب یمین؟ وہ بغیر کانٹوں کی بیری کے درخت کے (سکون بخش) سایوں میں ہوں گے''۔ ''واصحاب الیمین، مآاصحاب الیمین، فی سدر مخضود''۔

پھر بعد والی آیت میں ارشاد ہوا: ''اور اصحاب الشمال (بائیں ہاتھ والے لوگ) کیا ہیں اصحاب الشمال؟ وہ جان سوز ہواؤں اور تلخ پانیوں کے درمیان ہوں گے'' ''واصحاب الشمال مآ اصحاب الشمال فی سموم وحمیم''۔

ان آیات کی تفسیر میں بہت سے مفسرین نے پہلے والی آیات کے ذیل میں مذکورہ تفسیر کو ہی اختیار کیا ہے، کبھی تو یہ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا نامہ اعمال اُن کے دائیں بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور کبھی انہیں فلاح یافتہ، سعادت مند اور بد بخت و بدقسمت لوگوں کے معنی میں لیا گیا ہے۔

اور کبھی ان لوگوں کے معنی میں لیا گیا ہے جو دائیں طرف سے جنت کی طرف اور بائیں طرف سے جہنم کی طرف جائیں گے یا نور ان کی دائیں طرف سے ضوفشاں ہوگا۔[2]

نامہ عمل سب کے سامنے

پندرھویں اور آخری آیت میں نامہ اعمال کے سلسلے میں ایک نئی تعبیر پیش نظر ہے جو بہت واضح ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''جب اعمال

---

[1] تفسیر کبیر، فخر رازی، ج۲۹ ص ۱۴۲۔

[2] تفسیر تبیان، ج۹ ص ۴۹۳، تفسیر مجمع البیان، تفسیر فخر رازی، تفسیر فی ظلال القرآن، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

نامے کھولیں جائیں گے۔۔۔۔ جب ہر شخص یہ جان لے گا کہ اس نے کیا تیار کیا ہے" واذا الصحف نشرت، واذا السماء کشطت، واذا الجحیم سعرت، واذا الجنة ازلفت، علمت نفس ما احضرت"۔

"نشرت" کا مادہ "نشر" ہے جو کھولنے اور پھیلانے کے معنی میں ہے، نامہ اعمال کے لئے یہ تعبیر یا تو اس لئے ہے کہ یہ نامہ اعمال موت کے بعد بند ہوں گے اور حساب و کتاب کے موقع پر دوبارہ کھولے جائیں گے، جیسے کسی مقدمہ کی مسل تفتیش کے ختم ہو جانے پر بند کر دی جاتی ہے اور پھر عدالت میں کھولی جاتی ہے، یا پھر یہ اس لئے ہے کہ وہ تمام اعمال نامے خدا کے پاس جمع ہو جائیں گے اور قیامت میں انسانوں کے درمیان تقسیم کر دیئے جائیں گے۔

ہر ایک مفسر نے ان دونوں معانی میں سے ایک کا چناؤ کیا ہے اور بعض نے ان دونوں احتمالوں کو اکٹھا ذکر کیا ہے لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال اعمال نامے اس طرح پھیلا دیے جائیں گے کہ نہ فقط یہ کہ جس کا نامہ اعمال ہو گا وہ دیکھے گا اور اپنے بھولے ہوئے کاموں کو یاد کرے گا، بلکہ اہل محشر بھی دیکھیں گے، یہ امر خود نیک لوگوں کے لئے خوشی کا باعث اور بروں کے لئے عذاب کا باعث ہو گا۔

سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۳ میں ہے:

"ونخرج له یوم القیامة کتابا یلقه منشورا"

ہم قیامت کے دن اس کے لئے نامہ عمل یوں لائیں گے کہ وہ اُسے کھلا ہوا پائے گا"۔

یہ آیت بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔

مذکورہ بالا تمام آیات سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خدا کے ان تمام کاموں پر آگاہ و عالم ہونے کے ساتھ ساتھ جسمانی اعضاء بھی قیامت کے گواہوں میں شامل ہوں گے، اعمال کے متعلق ان کی گواہی بھی نامہ اعمال میں ثبت ہو گی اور یہ کام خدا کے فرشتوں کے ذریعے انجام پائے گا، قیامت کے دن برے لوگوں کا نامہ اعمال اُن کے بائیں ہاتھ میں اور نیک لوگوں کا نامہ اعمال اُن کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، یہ نامہ اعمال خود بات کرے گا اور تمام کہنے والی باتیں کہے گا۔

اعمال نامے کھول دیئے جائیں گے اور اہل محشر ان کی برائیوں اور نیکیوں سے آگاہ ہو جائیں گے، نیک عمل انجام دینے والے خوشی اور اعزاز کے ساتھ تمام لوگوں کو اپنا نامہ اعمال پڑھنے کی دعوت دیں گے جب کہ برے لوگ خوف، شرمندگی اور رسوائی کے ڈر سے آہ و نالہ کرتے پھر رہے ہوں گے۔

یہ تعبیرات بہت سے تربیتی نکات کی حامل ہیں جنہیں "توضیحات" کے حصہ میں بیان کیا جائے گا۔

توضیحات

ا۔ اسلامی روایات میں اعمال نامے کا تذکرہ:

''نامہ اعمال'' یا ''صحیفہ اعمال'' کے موضوع کو احادیث میں بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے، ان میں سے کچھ روایات گذشتہ آیات کی تفسیر کے سلسلے میں گزر چکی ہیں، ان کے علاوہ بھی کچھ روایات الگ سے ہیں جن میں سے نمونے کے طور پر چند کو ذکر کیا جارہا ہے، ان میں سے ہر ایک اہم نکات کی حامل ہے۔

ا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں ہے:

اذا كان يوم القيامة دفع الى الانسان كتابه، ثم قيل له اقرا قلت: فيعرف مافيه؟ فقال: ان الله يذكره فما من لحظة ولا كلمة ولا نقل قدم ولا شيء فعله، الا ذكره كانه، فعله تلك الساعة! فلذلك قالوا ياويلتنا ما لهذا الكتاب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة الا احصاها۔

جب قیامت برپا ہوگی تو انسان کا نامہ اعمال اس کے ہاتھ میں دیا جائے گا، پھر اس سے کہا جائے گا کہ (اسے) پڑھ۔

راوی کہتا ہے: میں نے عرض کیا: جو کچھ اس میں ہے وہ اسے جانتا ہوگا؟

امام نے ارشاد فرمایا: خدا اسے یاد دلائے گا، آنکھ کی کوئی جھپک، زبان کی کوئی بات، پاؤں کا کوئی قدم اور ہر ایسا دوسرا کام جو اس نے انجام دیا ہوگا اُسے یاد آجائے گا، اس طرح گویا یہ کام اس نے ابھی ابھی انجام دیا ہے۔

''وہ کہے گا: مجھ پر وائے! یہ کیسی کتاب ہے جس میں ہر چھوٹا اور بڑا کام لکھ دیا گیا ہے''۔

۲۔ نہج البلاغہ کے ایک خطبے میں امیر المومنینؑ کا یہ ارشاد ہے:

وتستغفره مما احاط به علمه واحصاه كتابه علم غير قاصر و كتاب غير مغادر۔

''میں خدا سے مغفرت طلب کرتا ہوں اس چیز پر جس کا اس کے علم نے احاطہ کیا ہوا ہے اس کی کتاب (بندوں کے

نامہ اعمال) نے ان کو شمار کیا ہوا ہے، اس کے علم میں کوئی کمی نہیں، وہ ایسا نامہ عمل ہے جس نے کوئی بات (لکھنے سے)نہیں چھوڑی''۔[1]

۳۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ایک حدیث اس طرح ہے:

ولیست تشهد الجوارح علی مومن ، انما تشهد علی حقت علیه کلمة العذاب فاما المومن فیؤتی کتابه بیمینه۔

''مومن کے اعضاء اس کے خلاف گواہی نہیں دیں گے، یہ شہادت صرف ان کے خلاف ہوگی جو عذاب کے مستحق ہیں، مومن کا نامہ عمل تو اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔[2]

۴۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ایک اور حدیث اس طرح ہے:

'' خدا جب کسی مومن کا حساب لینا چاہے گا تو نامہ عمل اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور اُسے خود اپنا حساب لینے کے متعلق کہے گا اور ارشاد کرے گا: اے میرے بندے! کیا تم نے فلاں فلاں کام کیا ہے؟ تو وہ عرض کرے گا: اے میرے پالنے والے! ہاں! میں نے یہ کیا ہے؛

ارشاد ہوگا: میں نے تجھے بخش دیا اور تیرے ان گناہوں کو (ان نیکیوں کی وجہ سے جو زیادہ ہیں) نیکیوں میں تبدیل کر دیا، (اس دوران وہ ہر گناہ سے پاک لوگوں کے سامنے آئے گا) لوگ کہیں گے: سبحان اللہ! کیا اس بندے نے ایک گناہ بھی نہیں کیا؟ اور یہی خدا نے قرآن میں فرمایا ہے:

فاما من اوتی کتابه بیمینه فسوف یحاسب حسابا یسیرا وینقلب الی اهله مسرورا۔

یعنی جس کا نامہ عمل اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اُس کا حساب آسان ہوگا، پھر وہ خوشی خوشی اپنے خاندان کی طرف (جنت میں) چلا جائے گا۔[3]

۵۔ سنن الترمذی میں رسول خداؐ سے یہ حدیث منقول ہے:

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۱۴۔

[2] بحارالانوار، ج ۷ ص ۳۱۸، حدیث ۱۴۔

[3] بحارلانوار، ج ۷ ص ۳۲۴، حدیث ۱۷۔

يعرض الناس يوم القيامة ثلاث عرضات: فاما عرضتان فجدال ومعاذير، و اما العرضة الثالثة فعند ذلك تطير الصحف في الايدي، فاخذ بيمينه فاخذ بشماله۔

''قیامت کے دن لوگ تین مرتبہ خدا کے حضور حاضر ہوں گے، پہلی اور دوسری مرتبہ تو بحث و عذر خواہی ہوگی (یہ کبھی کوشش کریں گے کہ اپنے گناہوں کو دوسروں کی گردن میں ڈال دیں اور کبھی عذر خواہی کریں گے) لیکن تیسری مرتبہ اُن کے اعمال نامے پرواز کریں گے اور اُن کے ہاتھوں میں آ جائیں گے، بعض کے دائیں ہاتھ میں اور بعض کے بائیں ہاتھ میں''۔[1]

اس تعبیر سے ضمنی طور پر ''تطایر کتب'' (اعمال ناموں کے اڑنے) کے معنی کی نشاندہی ہو رہی ہے اور یہ بات مختلف عبارات میں بیان ہوئی ہے، اعمال نامے اپنے اصلی مقام (عرش خدا کے پاس سے یا علیین اور سجین کے پاس سے، یا جو بھی ان کے جمع ہونے کا مرکز ہوگا) سے پرواز کریں گے اور انسانوں کے ہاتھوں میں آ جائیں گے، یہ تعبیر واضح طور پر بتاتی ہے کہ نامہ اعمال انسانی روح کا ایک صفحہ نہیں، بلکہ ایسے آثار ہیں جو انسانی وجود سے باہر کسی اور چیز پر ثبت ہوتے ہیں (غور کیجئے گا)۔

۲۔ نامہ عمل کی حقیقت

اس میں کوئی شک نہیں کہ اعمال نامہ کسی معمولی کتاب، کاغذ یا کاپی کی طرح نہیں ہوگا بلکہ وہ ایک بولنے والی تحریر کی صورت میں ہوگا جسے کوئی جھٹلا نہیں سکے گا، اس بات کی دلیل یہ ہے کہ اگر وہ عام کاغذوں کا کوئی مجموعہ ہوتو ایک آدمی کے ہی عمر بھر کے اعمال لکھنے کے لئے ہزاروں کاغذات کی ضرورت پڑے گی، اور پھر اس طرح کے مجموعے کا مطالعہ تمام لوگوں کے لئے کوئی آسان بات نہیں ہوگی، نیز یہ بدکاروں کے لئے رسوائی اور نیک لوگوں کے لئے کسی اعزاز کا ذریعہ نہیں بن سکتا، جب کہ کئی آیات و احادیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ انسان کے اعمال اس میں اس طریقے سے درج ہوں گے جنہیں ایک نگاہ سے ہی پڑھا جا سکے گا۔

علاوہ ازیں عام قسم کی لکیریں اور نقش ایسے نہیں ہوتے جن کا انکار نہ کیا جا سکے، جب کہ آیات و روایات سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ اس کے مندرجات کا کوئی انکار نہ کر سکے گا، یہاں تک کہ جس کا یہ اعمال نامہ ہے وہ بھی اسے نہیں جھٹلا سکے گا۔

اعمال نامے کے سلسلے میں مختلف تفسیریں کی گئی ہیں، جن کا مطالعہ دقیق نظر سے ضروری ہے۔

(ا)۔ بعض نے اس کی تفسیر یوں کی ہے:

---

[1] سنن ترمذی، ج ۴، ص ۶۱۷، حدیث ۲۴۲۵۔

هی بعینها نفسه التی رسخت فیها اثار اعماله بحیث انتقشت بها۔

یہ بالکل وہی انسانی روح ہے جس میں اس کے اعمال کے اثرات اس طرح نفوذ کر چکے ہیں کہ اس (روح پر ان کا نقش جم گیا ہے)۔[1]

یہ تفسیر فیض کا شانی مرحوم نے کی ہے، اس کے مطابق اعمال نامہ انسان کی روح کے لئے کنایہ ہے جس پر اُس کے اعمال کے اثرات نقش بٹھا چکے ہوں۔

واضح سی بات ہے کہ یہ کنایہ والے معنی قرآنی آیات کے ظاہر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں، کیونکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ نیک لوگوں کا اعمال نامہ اُن کے دائیں ہاتھ میں جب کہ برے لوگوں کا اعمال نامہ اُن کے بائیں ہاتھ میں یا پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا، یہ تعبیر مذکورہ بالا تفسیر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے، صرف ایک صورت نکل سکتی ہے اور وہ یہ کہ یمین اور شمال اور اسی طرح قرآن و حدیث میں اس سلسلے میں آنے والی تمام تعبیرات سے کنایہ والے معنی مراد لئے جائیں لیکن یہ ظاہر کے خلاف ہے جو کہ دلیل کے بغیر جائز نہیں ہے، علاوہ ازیں یہ تفسیر ''نوشتوں کی پرواز'' کے مفہوم کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔

(۲)۔علامہ طباطبائی مرحوم نے المیزان میں اس سلسلے میں ایک اور تفسیر کی ہے انہوں نے سورہ آل عمران کی آیت ۳۰ سے استفادہ کرتے ہوئے یہ فرمایا، وہ آیت یہ ہے:

''یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرا و ما عملت من سوء''

جس دن ہر انسان اپنے برے اور اچھے اعمال کو اپنے ساتھ حاضر دیکھ لے گا۔

علامہ کہتے ہیں:

اعمال نامہ انسانی اعمال کے حقائق پر مشتمل ہوگا یہ عام لکیروں اور نقوش کی طرح نہیں کہ جو دنیا کی کتابوں میں ہوتے ہیں، بلکہ وہ خود انسان کے اعمال کی صورت میں ہے جن سے خدا انسان کو واضح طور پر آگاہ کرے گا جس پر مشاہدہ سے بہتر کوئی دلیل نہیں ہے، یہ نوشتہ دنیا میں انسانی نگاہوں سے اوجھل ہے اور غفلت کے پردوں نے اُسے ڈھانپا ہوا ہے، قیامت کے دن خدا اُسے کھولے گا، غفلت کے حجابوں کو ہٹا دے گا اور انسان کو اس کے متعلق بتائے گا۔[2]

مختلف آیات و روایات میں اعمال نامہ لکھنے والے فرشتوں اور اُن کی خصوصیات کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے، یہ تفسیر اس کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے، کیونکہ حقائق اعمال سے ظاہری طور پر مراد اعمال کے وہی آثار ہیں جو وہ انسان کی روح پر ترتب کرتے ہیں، مرحوم فیض کا شانی

---

[1] تفسیر صافی، آیت ۱۳ سورہ اسراء ص ۳۱۲ (سنگی ایڈیشن)۔

[2] تفسیر المیزان، ج ۱۳، ص ۵۸ سورہ بنی اسرائیل آیہ ۱۳ کے ذیل میں (اختصار کے ساتھ)۔

پر ہونے والا اعتراض یہاں پر بھی وارد ہوتا ہے:

''روح المعانی'' کے مصنف نے اسی تفسیر کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، پھر وہ خود ہی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ تفسیر آیات کے ظاہر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔[۱]

ممکن ہے یہ بات کہی جائے کہ انسانی اعمال، جیسا کہ انسانی روح پر اثر انداز ہوتے ہیں، اسی طرح بیرونی دنیا، اردگرد کی فضا و ہوا، جس زمین پر وہ زندگی بسر کرتا ہے اور باقی تمام چیزوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، گویا یہ اُن پر اپنا نقش جما دیتے ہیں، طبیعی اور نا قابل انکار نقش، ایسے نقوش جو اس عالم ہستی کی طاقت ورذات اور فرشتوں کے ذریعے ان موجودات پر ثبت ہوتے ہیں، قیامت کے دن اس سے پردہ ہٹا دیا جائے گا اور وہ سامنے آجائے گا، پورے ماحول کے اثرات ایک جگہ اکٹھے کر دیئے جائیں گے اور مختصر صورت اختیار کر لیں گے، پھر ہر شخص کے ہاتھ میں انہیں تھما دیا جائے گا، انہیں صرف ایک نظر دیکھنے سے ہی پوری معلومات حاصل ہو جائیں گی۔

یہ اثرات یقینی طور پر اس دنیا میں ہمارے لئے قابل فہم نہیں ہیں، لیکن ان کا وجود ایک قطعی چیز ہے، جس دن ہمیں ایک نئے نور بصارت سے نوازا جائے گا اس دن انہیں دیکھ لیں گے، پھر پڑھیں گے اور اُن کی تصدیق کریں گے۔

آثار قدیمہ کے ماہرین ہزاروں سال قبل کے مجسموں کو دیکھ کر نہ فقط یہ کہ ان کی شکل وصورت کا اندازہ لگا لیتے ہیں بلکہ اُن کی زندگی سے متعلق کئی حقائق کا بھی انکشاف کرتے ہیں، یہ مجسمہ یقیناً خود حیوان نہیں ہے بلکہ اس کا وہ اثر ہے جو زمین پر باقی بچا ہے، حقیقت میں زمین کے یہ پتھر ان حیوانات کے کاموں اور شکلوں کا نامہ اعمال ہیں، البتہ یہ ایسے نقوش سے مرتب ہوا جن سے انکار کی مجال کسی کو نہیں ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اعمال نامہ قیامت میں اس طرح کا نہیں ہوگا کیونکہ کئی مرتبہ یہ بات دہرائی جا چکی ہے کہ ہم قیامت اور اس سے متعلق مسائل کے بارے میں فقط اجمالی حد تک معلومات رکھتے ہیں۔ لیکن بعض جہات سے طبعی اثر کے اعتبار سے یہ ایک دوسرے کے مانند ہو سکتے ہیں، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے:

يذكر العبد جميع ما عمل وما كتب عليه، حتى كانه فعله تلك الساعة فلذلك قالوا يويلتنا مال هذا الكتاب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة الا احصاها۔

انسان اعمال نامے کے مطالعہ سے اپنے تمام اعمال سے یوں آگاہ ہو جائیگا جیسا کہ اس نے انہیں ابھی ابھی انجام دیا ہے، لہٰذا کہے گا: مجھ پر وائے! یہ کیسا نوشتہ ہے جس نے کسی چھوٹے اور بڑے عمل کو نہیں چھوڑا۔[۲]

---

[۱] روح المعانی، ج ۱۵ ص ۳۲۔

[۲] نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۶۷، حدیث ۱۱۵۔

(۴) بعض مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ انسان کا اعمال نامہ اس کا وجدان باطنی یا ضمیر ہے علم نفسیات میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ انسان کے اعمال اس کے ضمیر یا تحت الشعور پر اثر انداز ہوتے ہیں، یہ تفسیر بھی فیض کا شانی اور دوسرے مفسرین کی تفسیر کے ساتھ ملتی جلتی ہے حقیقت میں اُسی پرانی بات کے لئے ایک نیا انداز اختیار کیا گیا ہے۔

اب تک اعمال نامے کے سلسلے میں چار تفسیریں بیان کی گئی ہیں جن میں سے دوسری تفسیر سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال یا تو یہ کہا جائے کہ چونکہ اعمال نامے کا موضوع قرآن کی مختلف آیات اور بہت سی روایات میں ذکر ہوا ہے اس لئے اس پر ایمان رکھنا ضروری ہے، اگر چہ اس کا مفہوم اور پوری تفصیل ہمیں معلوم نہ ہو، جیسا کہ قیامت سے متعلق دوسرے امور میں بھی معاملہ کچھ اسی طرح ہے، یا پھر یہ کہا جائے کہ اعمال نامہ ہمارے کاموں کا وہی اثر ہے جو ہمارے وجود سے باہر ہوتا ہے، قیامت کے دن خدا کے حکم سے یہ آثار اکٹھے ہو جائیں گے اور ہمارے ہاتھ میں تھما دئے جائیں گے، دوسرے لفظوں میں اس طرح کہ یہ ان تکوینی اور حقیقی آثار کا مجموعہ ہے جنہیں ایک لحاظ سے وڈیو کیسٹ، آڈیو کیسٹ یا مجسموں (Fossile) کی طرح سمجھا جا سکتا ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ بالکل اسی طرح ہے بلکہ ہماری بات کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک لحاظ سے اُن سے ملتا جلتا ہے (غور کیجئے گا)۔

۳۔ اعمال نامے کا فلسفہ:

مختلف آیات وروایات میں اعمال نامے کے متعلق تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے، بالخصوص اس بات کے پیش نظر کہ انسان کا ہر چھوٹے سے چھوٹا عمل، اس کی ہر بات اور نیت کو اعمال نامے میں درج کیا جائے گا، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سب سے زیادہ اہمیت اس کے تربیتی آثار کے حوالے سے ہے، ہم نے کئی بار یہ بات کی ہے کہ تمام حقیقی معارف کی شرح وتفصیل سے قرآن کا مقصد تزکیہ نفس، بالیدگی روح اور اخلاق وتقویٰ کے زیور سے انسان کو مزین کرتا ہے، یہ انسان کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کراتا ہے کہ وہ اپنے گفتار وکردار پر غور کرے، ہر چیز لکھی جائے گی اور قیامت کے دن کسی کمی پیشی کے بغیر سب کچھ اس کے سامنے لایا جائے گا۔

یہ بات صحیح ہے کہ خدا کا علم ان سب چیزوں کو اپنے وسیع دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور جو شخص خدا کے حاضر وناظر ہونے اور اس کے علم کے بیکراں ہونے پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے اعمال نامے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن لوگوں کی اکثریت کا اس بات کی طرف متوجہ ہونا بھی کئی تربیتی آثار کا باعث بنتا ہے۔

جسے یہ معلوم ہے کہ ایک ٹیپ ریکارڈر ہمیشہ اس کے ساتھ ہے اور ایک بہترین وڈیو کیمرہ ہے جو خلوت وجلوت، ظاہر وباطن اور ہر جگہ پر اس کی فلم بنا رہا ہے اور ایک دن یہ تمام فلمیں اور کیسٹیں ایک زندہ، نا قابل انکار صورت میں خدا کی عدالت میں پیش کی جائیں گی، تو ایسا انسان یقینی طور پر اپنے اعمال، رفتار اور گفتار کی طرف ہمہ وقت توجہ رکھے گا اور اس کا ظاہر وباطن تقویٰ کے لباس سے مزین رہے گا۔

ایسے اعمال نامے پر ایمان جس میں ہر چھوٹا اور بڑا عمل لکھا جائے گا، اس بات پر یقین کہ انسان کے کے ساتھ کچھ ایسے فرشتے ہیں جو روز شب اس کے اعمال لکھتے ہیں، اس حقیقت پر ایمان کہ روز محشر اعمال نامے کو تمام لوگوں کے سامنے کھولا جائے گا اور اس کے تمام چھپے ہوئے گناہ

اس دن ظاہر ہوجائیں گے جس سے دوستوں اور دشمنوں کے درمیان اس کی رسوائی ہوگی ، یہ سب کچھ گناہوں سے روکنے کے لئے ایک بہت موثر اور حیرت انگیز عامل ہے۔

جب کہ نیک لوگوں کے اعمال نامے اُن کے لئے عزت اور آبرو کا باعث بنیں گے، فلم اور کیسٹ وغیرہ میں جو کچھ کہا جاتا ہے یہ بات اس سے بھی زیادہ موثر ہوتی ہے، یہ نیک اعمال پر ابھارنے کے لئے ایک اہم عامل ہے لیکن کبھی ایمان کمزور ہوتا ہے اور کبھی غفلت اور جہالت کے پردے انسان کو ان حقائق سے دور کردیتے ہیں ورنہ اس قرآنی حقیقت پر ایمان ہر انسان کی تربیت اور اصلاح کے لئے کافی ہے۔

لہٰذا بعض دعاؤں میں (جو کہ یقینی طور پر انسان کی اصلاح کے لئے لائحہ عمل ہیں) اس بات کو بیان کیا گیا ہے معروف دعائے کمیل میں اس طرح ہے:

وكل سيئة امرت باثباتها الكرام الكاتبين، الذين وكلتهم بحفظ ما يكون مني وجعلتهم شهودا علي مع جوارحي، وكنت انت الرقيب علي من ورائهم، والشاهد لما خفي عنهم۔

خدایا! میرے ان تمام گناہوں کو جنہیں تو نے اپنے فرشتوں کو لکھنے کا حکم دیا تھا، معاف فرمادے، وہی فرشتے جنہیں تو نے اس بات پر مامور فرمایا ہے کہ مجھ سے جو کچھ سرزد ہوا اُسے لکھ لیں، اور تو نے انہیں میرے بدن کے علاوہ مجھ پر بھی گواہ بنایا ہے، ان سے اوپر تو میرا نگہبان ہے، اور گواہ ہے اس بات پر جو اُن سے پوشیدہ ہے۔

اس سلسلہ گفتگو کو حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں:

احتجاج طبرسی میں آیا ہے کہ ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ اچھے اور برے اعمال کے لکھنے پر فرشتے کیوں مامور کئے جاتے ہیں جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ خدا " عالم السر والخفيات وما هو اخفي " ہے اور ہر مخفی (پوشیدہ) سے مخفی (پوشیدہ) بات کو وہ جانتا ہے، امامؑ نے جواب میں فرمایا:

استعبدهم بذلك وجعلهم شهودا على خلقه ليكون العباد بملا زمتهم اياهم اشد على طاعة الله مواظبة، وعن معصيته اشد انقبا ضا وكم من عبديهم بمعصية فذكر مكانهما فارعوى وكف فيقول ربي يراني، وحفظتي على بذالك تشهدا:

خدا نے ان فرشتوں کو اپنی عبادت پر مامور کیا ہے، اور انہیں اپنے بندوں پر گواہ بنایا ہے، تاکہ بندے اُن کی

ہمراہی کی وجہ سے خدا کی اطاعت کے لئے اور آگے بڑھیں اور اس کی نافرمانی سے زیادہ سے زیادہ بچیں، بہت سے ایسے بندے ہیں جو کسی گناہ کا ارادہ کر لیتے ہیں، پھر انہیں یہ دو فرشتے یاد آ جاتے ہیں، لہٰذا وہ گناہ سے رک جاتے ہیں اور کہتے ہیں! ہمارا رب ہمیں دیکھ رہا ہے! اور اعمال پر نگران فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں۔

۴۔اعمال نامے کی قسمیں:

جیسا کہ پہلے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے قرآن سے اس بات کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے کہ ہر انسان کے لئے تین طرح کے نامہ اعمال ہوں گے!

(۱)۔ ہر انسان کے لئے ایک الگ کتاب ہوگی جس میں اس کے تمام اعمال درج ہوں گے یہ اس کے دائیں یا بائیں ہاتھ میں دی جائے گی، یہ بات قرآن کی متعدد آیات میں بیان کی گئی ہے، مثلاً سورہ اسراء آیت نمبر ۱۳ ''**وکل انسان الزمنه طائرہ فی عنقه و نخرج له یوم القیمة کتبا یلقه منشورا۔ اقرا کتبك كفى بنفسك اليوم عليك حسيبا**'۔

کل انسان (ہر انسان) اور کتبك (تیرا اعمال نامہ) کی تعبیرات واضح طور پر اس خصوصی اعمال نامے کی طرف اشارہ کر رہی ہیں، ''**ھاؤم اقرءوا کتابیه**'' (آؤ میرا اعمال نامہ پڑھو) یا ''**یلیتنی لم اوت کتابیه**'' (اے کاش مجھے میرا نامہ اعمال نہ دیا جاتا) کی تعبیرات جو کہ سورہ حاقہ آیت ۱۹ اور ۲۵ میں آئی ہیں، بھی اسی سلسلے کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔

(۲)۔ امتوں کا نامہ اعمال جس میں پوری امت کے اعمال اکٹھے لکھے ہوں گے، سورہ جاثیہ آیت ۱۸ میں ارشاد ہوتا ہے ''**کل امة تدعی الی کتابها**'' (ہر امت اپنے اعمال نامے کی طرف بلائی جائے گی)، ''کتاب'' کی تعبیر اور وہ بھی جمع کی صورت میں، نہ کہ مفرد کی صورت میں، ہماری بات کی تائید کرتی ہے۔

(۳)۔ ایک ہی اعمال نامہ ہوگا جس میں تمام امتوں اور اول سے لے کر آخر تک تمام لوگوں کے اعمال درج ہوں گے، یہ حقیقت میں ایک مرکزی نوشتہ کے مانند ہوگا، سورہ کہف، آیت ۴۹ میں اس اعمال نامے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''**ووضع الکتاب فتری المجرمین مشفقین مما فیه**' (وہاں پر نوشتہ رکھ دیا جائے گا، تم دیکھو گے کہ تمام گنہگار اُس میں موجود باتوں سے خوف زدہ ہوں گے)، اس سے بھی واضح تر سورہ یٰسین آیت ۱۲ ہے جو مُردوں کے زندہ ہونے اور خدا کی طرف سے اُن کے اعمال اور آثار کے لکھے جانے کا ذکر کرنے کے بعد فرماتی ہے: ''**وکل شئی احصینه فی امام مبین**'' (ہم نے تمام چیزوں کو واضح نوشتہ میں جمع کر دیا ہے) اس میں ''کتاب'' کو بطور نکرہ لانا جو کہ مفرد کے معنی میں ہے، اور پھر تمام چیزوں کے لکھے جانے کا ذکر کرنا، اس بات پر واضح دلیل ہے کہ تمام انسانوں کے اعمال، بلکہ تمام اشیاء ایک نوشتہ میں اکٹھی لکھی ہوئی ہوں گی۔

علامہ طباطبائی مرحوم نے بھی تفسیر ''المیزان'' میں ان تین قسموں کے اعمال نامے کی طرف اشارہ کیا ہے اگر چہ اس سلسلے میں انہوں

نے جن آیات سے استفادہ کیا ہے وہ مذکورہ بالا بیان سے کسی حد تک فرق رکھتی ہیں۔[1]

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سورہ مطففین (آیت ۷،۱۸) سے ایک چوتھی قسم کے اعمال نامے کا اثبات بھی ممکن ہے جو ''ابرار'' اور ''فجار'' (نیکوکاروں اور بروں) کے لئے ایک الگ الگ نامہ اعمال کی صورت میں ہوگا۔

ان کتاب الفجار لفی سجین......... ان کتاب الابرار لفی علیین۔

بہرحال یہ بات واضح ہے کہ ان اعمال ناموں کے درمیان کسی قسم کا تفاوت نہیں ہے اور اس بات سے کوئی چیز بھی مانع نہیں ہے کہ ایک عمل کو مضبوطی اور تاکید کیلئے مختلف جگہوں پر لکھا جائے، لوگ اپنے دنیاوی معاملات میں بھی اسی طرح کرتے ہیں۔

بہرحال یہ سب کچھ اس حقیقت پر تاکید کے لئے ہے کہ انسان پوری طرح بیدار اور متوجہ رہے اور اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اُس کے اعمال نہ فقط ایک جگہ پر، بلکہ کئی جگہ پر لکھے جا رہے ہیں، اس بات کا امکان نہیں ہے کہ اس سے کوئی کام سرزد ہو لیکن قیامت کے دن اس کا حساب نہ لیا جائے، بلکہ ان سے بڑھ کر خدا کی علم و آگہی بھی اس کے اعمال کے متعلق ہے۔

۵۔اعمال نامے کی خصوصیات

گذشتہ آیات و روایات سے مجموعی طور پر اعمال نامے کی مندرجہ ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں:

۱۔ اعمال نامہ انسان کی پوری زندگی کے اعمال کا نتیجہ ہے جس میں کوئی چیز چھوڑی نہیں جائے گی۔

۲۔ اعمال نامہ ایک ایسی گویا اور بولتی ہوئی سند ہے جو قابل انکار نہیں ہوگی، ہر شخص اُسے دیکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے، یہاں تک کہ خود گنہگار بھی۔

۳۔ اعمال نامہ لکھنے والے دو فرشتے ہیں جو قرآن کی زبان میں ''رقیب'' اور ''عتید'' کے نام سے پکارے جاتے ہیں، جیسا کہ بعض روایات سے استفادہ ہوتا ہے دن اور رات کے فرشتے جدا جدا ہیں، ہر ایک اپنی جگہ دوسرے کو دے دیتا ہے، قرآن کی بھی بعض آیات میں اس معنی کی طرف ایک مبہم سا اشارہ پایا جاتا ہے۔

۴۔ بعض روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ کچھ اور فرشتے بھی ہیں جو چند خاص قسم کے اعمال لکھنے پر مامور ہیں، مثلاً رسول اکرمؐ سے مروی ایک حدیث اس طرح ہے:

اذا کان یوم الجمعة کان علی کل باب من ابواب المسجد ملائكة یکتبون الاول فالاول، فاذا جلس الامام طووا الصحف وجاء وایستمعون الذکر!

---

[1] تفسیر المیزان، ج ۳ ص ۳۴۸۔

جب جمعہ کا دن آتا ہے تو مسجد کے ہر دروازے پر فرشتے بیٹھ جاتے ہیں جو آنے والے لوگوں کے نام ترتیب سے لکھتے ہیں اور جب امام جماعت (منبر پر) بیٹھ جاتا ہے (خطبہ شروع کرنے سے پہلے) تو وہ اپنی تحریریں ایک جگہ اکٹھی کر لیتے ہیں اور خدا کا ذکر سننے لگتے ہیں۔[۱]

۵۔ بعض احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نیکیاں تو فوراً لکھ لیتے ہیں، لیکن برائیاں کچھ عرصے بعد (شاید برائی کرنے والا پشیمان ہو جائے اور توبہ کر لے)، اس بحث کو امام سجادؑ کے صحیفہ سجادیہ کی مشہور دعاؤں کے چند پر معنی جملات پر ختم کرتے ہیں اور ان جملات میں ہم سب امامؑ کے ساتھ ہم آواز ہوتے ہیں۔

امامؑ خدا کے حضور یوں عرض کرتے ہیں:

اللهم يسر على الكرام الكاتبين موونتنا واملالنا من حسناتنا صحائفنا، ولا تخزنا عندهم بسوء اعمالنا۔۔۔[۲] فصل على محمد واله، واجعل ختام ما تحصى علينا كتبة اعمالنا توبة مقبولة۔[۳]

خدایا! ہمارے کام کو ان مہربان فرشتوں کے لئے، جو اُسے لکھتے ہیں، آسان فرما، ہمارے اعمال نامے کو ہماری نیکیوں سے بھر دے اور ہمیں ان کے سامنے ہمارے برے اعمال کی وجہ سے رسوا نہ فرما!۔۔۔۔خدایا! محمدؐ و آل محمدؐ پر درود بھیج، اور اعمال نامہ لکھنے والے جو ہماری آخری بات لکھیں اُسے ہماری توبہ مقبولہ قرار دے۔

---

[۱] صحیح مسلم، ج ۲ صفحہ ۵۸۷، حدیث ۸۵۰، شاید حدیث کے ذیل کا مفہوم یہ ہو کہ جو لوگ نماز جمعہ میں دیر سے جاتے ہیں اُن کا نام اس نوشتے میں نہیں لکھا جائے گا۔

[۲] صحیفہ سجادیہ، دعائے ششم۔

[۳] صحیفہ سجادیہ، دعائے یازدہم۔

تجسمِ اعمال

اشارہ

جولوگ قرآنی آیات سے کچھ آشنائی رکھتے ہیں انہیں یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ قرآن میں ایسی متعدد آیات ہیں جو ظاہری طور پر قیامت کے دن ''تجسم'' یا ''تجسد'' اعمال کے متعلق گفتگو کرتی ہیں، یعنی اس دن ہر شخص کا عمل چاہے وہ برا ہو یا اچھا، اس کے سامنے آئے گا، یہ یا تو اس کے خوشی وانبساط کا باعث بنے گا یا سزا اور عذاب کا موجب ہوگا، اس کے ذریعے یا تو وہ عزت وافتخار محسوس کرے گا یا شرمندگی اور رسوائی۔

کیا یہ ممکن ہے کہ انسان کے اعمال باقی رہ جائیں جب کہ یہ اعمال چند ایسی حرکات کا مجموعہ ہوتے ہیں جو محو اور نابود ہو جاتی ہیں؟ اس سے بڑھ کر کیا یہ ممکن ہے کہ عمل جو انسانی وجود کے عوارض میں سے شمار ہوتا ہے وہ ایک جسم کی شکل اختیار کرلے اور ایک الگ صورت میں ظاہر ہو؟

چونکہ بعض مفسرین ان دو سوالوں کا جواب نہیں دے سکے، لہٰذا ناچار ہو کر وہ اس طرح کی آیات کی تفسیر میں کسی محذوف کے قائل ہو گئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ عمل کے حاضر ہونے یا اُسے دیکھنے سے مراد یہ ہے کہ انسان اس عمل کی جزا یا سزا کا مشاہدہ کرے گا۔

لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ مذکورہ بالا سوالوں میں سے کوئی بھی لا جواب نہیں ہے، لہٰذا وہ آیات جو تجسم اعمال پر دلالت کرتی ہیں اُن سے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں، بلکہ ان آیات کے حقیقی معنی (نہ کہ مجازی معنی) سے قیامت اور ثواب وعتاب سے متعلق بہت سے سوالات اور مشکلات کو حل کیا جا سکتا ہے، ان آیات کے مطابق بہت جاذب، بامعنی اور بہت موثر ہونے کے ساتھ ساتھ تربیتی نکتہ نظر سے بھی حد درجہ اہمیت کے حامل ہیں۔

اس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی، اس مختصر سے اشارے کے ساتھ ہی ہم دوبارہ قرآن کی طرف پلٹتے ہیں اور اس موضوع سے متعلق آیات کو دیکھتے ہیں۔

۱۔ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ

۲۔ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا

۳۔ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْۗءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا

۴۔ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۴۸
﴿الزمر: ۴۸﴾[۱]

۵۔ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ(آل عمران۔۱۸۰)

۶۔ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ
(تکویر۔۱۲ تا ۱۴)

۷۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ
(احقاف۔۱۹)

۸۔ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ۷۰(زمر۔۷۰)

۹۔ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ(بقرہ: ۲۷۲)[۲]

۱۰ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ(بقرہ:۲۸۱
۔آل عمران:۱۶۱)

۱۱ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ
(التوبۃ۔۳۵)[۳]

۱۲ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ(طور:۱۶۔ تحریم ﷺ۷)[۴]

---

[۱] اسی سے ملتا جلتا زمر آیت ۵۱ آیت میں بھی آیا ہے۔

[۲] اسی مضمون کی اور آیات بھی ہیں۔ جیسے نحل ۱۱۱، آل عمران ۲۵، ہود ۱۱۱۔

[۳] سورہ زمر آیت ۲۴ میں بھی یہی مضمون آیا ہے۔

[۴] اسی معنی کی اور آیات بھی ہیں۔ جیسے اعراف ۱۴۷، ۱۸۰۔ سباء ۳۳۔

ترجمہ

۱۔ اس دن لوگ مختلف گروہوں کی شکل میں قبروں سے نکل پڑیں گے تا کہ انہیں انکے اعمال دکھائے جائیں، پس جوکوئی ذرہ بھر بھی نیکی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا، اور جوکوئی ذرہ بھر بھی برائی کرے گا وہ بھی اُسے دیکھ لے گا۔

۲۔ وہ اپنے تمام اعمال کو اپنے سامنے دیکھ لے گا اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

۳۔ اس دن ہر شخص اپنی نیکی جو وہ کر چکا ہے سامنے دیکھے گا اور ہر برائی جو وہ کر چکا ہے اُسے موجود پائے گا، (اور وہ یہ) خواہش کرے گا کہ اُس (برائی) کے اور اس کے اپنے درمیان ایک لمبی مدت حائل ہو جائے۔

۴۔ جو برے اعمال انہوں نے انجام دیئے ہوں گے وہ اس دن ان کے لئے ظاہر ہوں گے اور انہیں وہی عذاب گھیر لے گا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

۵۔ جلد ہی قیامت کے دن، جس چیز کے بارے میں انہوں نے بخل کیا وہ ان کے گلے میں طوق بنا کر پہنایا جائے گا۔

۶۔ جب دوزخ بھڑ کائی جائے گی اور جب جنت نزدیک ہو جائے گی تو ہر نفس جو کچھ لایا ہو گا اُسے جان لے گا۔

۷۔ اوران میں سے ہر ایک کے لئے درجات ہیں اُن کے اعمال کے اعتبار سے جو انہوں نے انجام دئے تا کہ خدا ان کے اعمال کسی کمی بیشی کے بغیر اُن کے سپرد کر دے اور اُن پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہوگا۔

۸۔ ہر ایک کو جو اس نے انجام دیا ہے بغیر کسی کمی بیشی کے دیا جائے گا اور جو کچھ وہ کرتے ہیں خدا اسے خوب جانتا ہے۔

۹۔ اور جو کچھ تم نیکی میں خرچ کرو گے اس کا فائدہ تمہاری اپنی ذات کے لئے ہوگا، البتہ وہ کہ جو کچھ تم خدا کی خوشنودی کے لئے خرچ کرتے ہو اور جو کچھ تم نیکی میں خرچ کرو گے، تم کو پورا پورا دیا جائے گا۔

۱۰۔ پھر ہر شخص نے جو کچھ انجام دیا ہے اُسے لوٹا دیا جائے گا۔

۱۱۔ جس دن کہ اُس سونے اور چاندی (مال و دولت) کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس سے اُن کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور اُن کی پیٹھیں داغی جائیں گی (اور اُن سے کہا جائے گا) یہ وہی ہے جو تم اپنی ذات کے

لئے جمع کرتے تھے، پس تم جو کچھ جمع کرتے تھے اُس کا مزہ چکھو۔

۱۲۔ صرف تمہارے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔

تفسیر

انسان اس دن اپنے تمام اعمال دیکھ لے گا:

سب سے پہلی آیت جو کہ سورہ زلزال کے آخر میں آئی ہے اس میں تقسیم اعمال کی طرف تین مرتبہ اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:
اس دن لوگ مختلف گروہوں کی شکل میں قبروں سے نکل پڑیں گے تا کہ انہیں انکے اعمال دکھائے جائیں ''یومئذ یصدر الناس اشتاتا لیروا اعمالھم'' پھر ارشاد ہوتا ہے: جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی وہ اسے دیکھ لے گا ''فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ'' پھر اس کے فورا بعد ارشاد ہوتا ہے: جس نے ذرہ برابر بھی بدی کی وہ اسے دیکھ لے گا ''ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ''۔

''اشتات'' جمع ہے ''شت'' (بروزن ''شط'') کی جس کا معنی ہے متفرق اور جُدا جُدا۔[1]

لوگوں کا اس دن جدا جدا ہو کر آنا شاید اس لئے ہو کہ ہر امت اپنے امام کے ساتھ میدان محشر میں وارد ہوگی یا برے لوگوں کا گروہ الگ اور اچھے لوگوں کا الگ اور اسی طرح علماء طلباء، شہیداء وغیرہ کے گروہ الگ الگ آئیں گے۔

''مثقال'' کے معنی بھاری ہونا اور ''ذرہ'' کے معنی بہت چھوٹا سا ذرہ ہیں، اس لئے کبھی اس کے معنی غبار کے ذرات اور کبھی چھوٹے پتنگے کئے گئے ہیں۔

ان آیت کا ظاہر واضح طور پر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ خود برے اور اچھے اعمال انسان کے سامنے پیش کئے جائیں گے اگرچہ بعض مفسرین نے یہاں پر کلمہ ''جزاء'' کو محذوف سمجھا ہے جس کی وجہ ان کا تجسم اعمال کو قبول نہ کرنا ہے، جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے، ان کا خیال ہے کہ اس سے مراد اعمال کے ثواب اور عذاب کو دیکھنا ہے، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں پر ''رویت'' (دیکھنے) سے مراد علم اور معرفت ہے جس کا تعلق عقلی مشاہدے سے ہے، بعض نے کہا ہے کہ مراد اعمال نامے کا دیکھنا ہے، یہ بات یقینی ہے کہ یہ تینوں تفاسیر آیت کے ظاہر کے خلاف ہیں کیونکہ اعمال کی جزا یا اعمال نامے کو محدوف سمجھنا آیت کے ظاہر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے اور رویت کے معنی بھی ظاہری آنکھ سے دیکھنا ہیں، کلمہ ''رویت'' جب علم اور معرفت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو عموما اس کے لئے دو مفعول درکار ہوتے ہیں جب کہ یہاں پر صرف ایک مفعول ذکر ہوا ہے (غور کیجئے گا)۔

قابل غور بات یہ ہے کہ ابن عباسؓ جو کہ اسلامی مفسرین میں بہت قدیم ہیں، انہوں نے بھی اس جگہ پر تجسم اعمال کو قبول کیا ہے ان

---

[1] تاج العروس فی شرح القاموس، مادہ ''شت''، بعض نے اسے ''شیت'' اور بعض نے ''شتات'' کی جمع قرار دیا ہے۔

سے جو حدیث مروی ہے وہ یوں ہے:

لیس من مومن ولا کافر عمل خیرا اوشرا الا اراہ اللہ ایاہ اما المومن فیغفر لہ سیئاتہ و یثیبہ بحسناتہ واما الکافر فیرد حسناتہ تحسیرا لہ۔

ہر مومن اور کافر جس نے بھی کوئی نیکی اور برائی کی ہے، خدا اس کا عمل اُسے دکھائے گا، مومن کے گناہ بخش دے گا اور نیکیوں کی اُسے پاداش ملے گی اور کافر کی نیکیاں ٹھکرا دے گا تا کہ وہ حسرت میں مبتلا ہو جائے۔[1]

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کے سلسلے میں معصومین علیہم السلام سے منقول احادیث میں تجسم اعمال کے متعلق کئی تعبیرات آئی ہیں، مثلا حضرت علی علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں یوں آیا ہے:

فمن کان من المومنین عمل فی هذه الدنیا مثقال ذرة من خیر وجده ومن کان من المومنین عمل فی هذه الدنیا مثقال ذرة من شر وجده۔

جو مومن بھی اس دنیا میں ذرہ برابر بھی نیک کام کرے گا اُسے پالے گا اور جو مومن بھی اس دنیا میں ذرہ برابر بھی برائی کرے گا اُسے بھی پالے گا۔[2]

دوسری آیت میں اسی موضوع سے متعلق ایک اور تعبیر لائی گئی ہے، اعمال نامے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: وہ اپنے تمام اعمال کو حاضر دیکھ لیں گے ''ووجدوا ما عملوا حاضرا''۔

لہذا وہ اپنے عمل سے جیسی کھیتی بوئیں گے ویسی ہی کاٹیں گے، ''اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا'' ''ولا یظلم ربك احدا''۔

جو مفسرین تجسم اعمال کے قائل نہیں انہوں نے یہاں پر بھی آیت سے مراد اعمال ناموں کا حاضر کرنا لیا ہے، یا پھر اعمال کی جزا ملنے کا معنیٰ کیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے خود عمل کے حاضر ہونے کا احتمال بھی ذکر کیا ہے۔[3]

علامہ طباطبائی مرحوم کے بقول آیت کا ذیل بھی اسی بات کی تائید کر رہا ہے کیونکہ خود عمل کا حاضر ہونا خدا کے ظالم ہونے کی نفی کرنے کے لئے زیادہ بہتر اور واضح ہے۔ (غور کیجئے گا)

تیسری آیت میں یہی بات زیادہ واضح اور عمومی انداز میں بیان کی گئی ہے کیونکہ پہلی آیت میں کافروں اور مجرموں کے متعلق گفتگو کی

---

[1] تفسیر روح البیان، ج ۱۰ ص ۴۹۴۔

[2] تفسیر نور الثقلین، ۵، ص ۶۵۰۔

[3] روح المعانی، ج ۱۵، ص ۲۶۷ اور روح البیان، ج ۵ ص ۲۵۴۔

گئی تھی لیکن یہاں پر ارشاد ہوتا ہے: اس دن ہر شخص اس نیک کام کو دیکھ لے گا جو اس نے انجام دیا ہوگا اور یہ پسند کرے گا کہ برے عمل اور اس کے درمیان ایک لمبا فاصلہ حائل ہو جائے "یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرا ۔ وما عملت من سوء ۔ تودلوان بینها وبینه امدا بعیدا"۔

اس آیت کی ۲ تفسیریں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ جو بھی کوئی اچھا یا برا عمل انجام دے گا وہ اسے اس دن دیکھ لے گا، دوسرا یہ کہ جس نے بھی کوئی نیک کام کیا ہوگا اُسے حاضر دیکھے گا اور چاہے گا کہ برے کام اور اس کے درمیان ایک لمبا فاصلہ حائل ہو جائے (یہ اختلاف اس امر سے مربوط ہے کہ ہم آیت میں کس جگہ پر وقف کرتے ہیں "محضرا" کے بعد یا "سوء" کے بعد)۔

لیکن ہر دو کا نتیجہ ایک ہی ہے کیونکہ دوسرے معنی کا بھی یہی مطلب ہے کہ اس کے برے اعمال بھی اس کے سامنے موجود ہوں گے اگر چہ اس شخص کی آرزو یہ ہوگی کہ وہ اس سے دور چلے جائیں، بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ گنہگار یہ خواہش کریں گے کہ اُن کے درمیان اور اس دن کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ حائل ہو جائے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ عموماً ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے درمیان اور اس کے ناپسندیدہ کاموں کے درمیان مکانی اعتبار سے بہت فاصلہ حائل ہو جائے، جب کہ آیت میں جو "امدا بعیدا" آیا ہے، اس کا معنی زمانے کے اعتبار سے ایک لمبا فاصلہ ہونا ہے، یہ تعبیر شاید اس لئے ہو کہ مکان کے اعتبار سے فاصلوں میں ٹکراؤ اور آمنے سامنے کا زیادہ خدشہ ہوتا ہے جب کہ زمانی فاصلوں میں آمنے سامنے ہونے کا اندیشہ نہیں ہوتا، مثلاً جو شخص عالمہ جنگ کے دوران جنگی علاقے سے بہت دور کسی علاقے میں رہتا تھا اسے بھی تھوڑا بہت خطرہ تھا لیکن جن لوگوں کا اس جنگ سے فاصلہ زمانی اعتبار سے تھا اُن کے لئے کسی قسم کی پریشانی یا خطرے کا سوال ہی نہ تھا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ "امد" ہمیشہ وقت کے لئے آتا ہے اور جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے اس کا معنی "ابد" کے قریب قریب ہے، فرق صرف یہ ہے کہ "ابد" ایسا زمانہ ہے جس کی کوئی حد نہیں لیکن "امد" کی ایک مبہم سی حد ہوتی ہے، پہلی آیت میں اعمال کے حاضر ہونے کے متعلق گفتگو تھی، جب کہ اس آیت میں اعمال کے حاضر کرنے کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، یعنی یہ اس سے زیادہ مطالب پر مشتمل ہے۔

اس آیت کے مطابق خدا اپنی قدرت مطلقہ کے ذریعے تمام اچھے اور برے اعمال کو حاضر کرے گا چاہے اس عمل کے انجام دینے والے لوگ اسے پسند کریں یا نہ کریں، اسی لئے بعض مفسرین نے اس آیت کی عبارت کو پہلی آیت کی عبارت سے زیادہ سخت اور زیادہ خبردار کرنے والی قرار دیا ہے۔

چوتھی آیت میں اس سلسلے سے متعلق ایک اور تعبیر لائی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے، انہوں نے جو برے کام انجام دیئے ہوں گے اس دن وہ ان کے لئے ظاہر ہو جائیں گے "وبدالهم سیات ما کسبوا" اور وہ جس روز قیامت، عذاب اور خدا کے عقاب کا مذاق اڑاتے تھے وہ ان پر نازل ہوگا "وحاق بهم ما کانو به یستهزؤن"۔

"بدا" کا مادہ "بدو" ہے جس کا معنی پوری طرح ظاہر ہو جانا ہے "بادیہ" کو اسی لئے "بادیہ" کہتے ہیں کہ وہ واضح اور آشکارا سرزمین ہوتی ہے جب کہ شہروں میں ایسے نہیں ہوتا بلکہ پہلے زمانے کے شہر اتنے مکانوں اور پر پیچ گلیوں کے باوجود شہر کی فصیل میں چھپ جاتے تھے۔

''سیئات ما کسبوا'' برے اعمال کے معنی میں ہے لیکن بعض لوگوں نے اس سے برے اعمال کی سزا مراد لی ہے یا یہ کہ کلمہ ''جزا'' کو انہوں نے یہاں محذوف سمجھا ہے، لیکن ظاہری طور پر یہاں مراد برے اعمال ہی ہیں جو اُس دن آشکار ہوں گے، کیونکہ ''سیئات'' جمع ہے ''سیئة'' کی، جس کا معنی برا کام ہے نہ کہ عمل کی بری سزا۔ (غور کیجئے گا)

ممکن ہے یہ تعبیر اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ اس دنیا میں بہت سے برے اعمال کا اپنا حقیقی چہرہ چھپ جاتا ہے جیسے وہ ریاکارانہ کام جو غیر خدا کے لئے انجام دیئے جائیں لیکن وہ دن چونکہ ظاہر اور آشکار ہونے کا دن ہے لہٰذا تمام اعمال کا حقیقی رخ واضح ہو جائے گا، اسی آیت کی تفسیر میں بنی اکرمؐ کی ایک حدیث یوں ہے:

"ھی الاعمال حسبوھا حسنات فوجدوھا فی کفة السیئات"

یہ وہی اعمال ہیں جنہیں وہ نیکیاں خیال کرتا تھا اس دن انہیں وہ برائیوں کے پلڑے میں دیکھے گا۔[1]

(خود اس حدیث کی عبارت اپنی جگہ پر تجسم اعمال کے موضوع پر ایک اور دلیل ہے)۔

پانچویں آیت میں اس موضوع سے متعلق ایک اور تعبیر لائی گئی ہے، بخیل لوگوں کی مذمت اور یہ کہنے کے بعد کہ بخل اُن کے فائدے میں نہیں بلکہ نقصان میں ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''جلد ہی قیامت کے دن جس چیز کے متعلق وہ بخل کرتے تھے وہ (ایک بھاری) طوق کی صورت میں اُن کے گلے میں ڈال دی جائے گی''۔ ''سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیامة''

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دولت جس کے واجب حقوق ادا نہ کئے جائیں اور کوئی دوسرا اس سے بہرہ مند نہ ہو سکے، قیامت کے دن اُن کے گلے میں ایک طوق کی شکل میں پڑ جائے گی جیسا کہ دنیا میں بھی وہ اس مال سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے تھے اور یہ اُن کے کندھوں پر ایک بوجھ کی صورت میں تھا۔

تفسیر عیاشی میں اس معنی کی وضاحت میں حضرت امام محمد باقرؑ کی ایک حدیث یوں ذکر ہوئی ہے:

ما من عبد منع زکاة مالہ الا جعل اللہ ذلك یوم القیمة ثعبانا من نار مطوقا فی عنقہ۔

جو بندہ بھی زکوۃ ادا نہ کرے تو قیامت کے دن خدا اس کے مال کو آگ کے ایک اژدہے کی صورت میں اس کے گلے کا طوق بنا دے گا۔[2]

خدا نے جو کچھ دیا ہے اس میں کنجوسی اور بخل سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے اس سے علم و دانش کے سلسلے میں کنجوسی سے کام لینا

---

[1] تفسیر روح البیان، ج۸، ص۱۲۱۔

[2] تفسیر عیاشی، ج۱، ص۲۰۷ و ص۱۵۸۔

مراد لیا ہے اور اس پر دلیل اس شان نزول کو قرار دیا ہے جسے ابن عباسؓ نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ آیت یہودیوں کی طرف سے پیغمبرؐ کی نشانیوں کو چھپانے کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے۔[1] جب کہ دوسری طرف بہت سی روایات میں آیت کی تفسیر زکوۃ ادا نہ کرنے والوں کے متعلق کی گئی ہے، یہ بات بھی بعید نہیں ہے کہ یہ آیت ایک وسیع اور عمومی مفہوم کی حامل ہو اور خدا کی تمام نعمتوں کے بارے میں ہو، چاہے اُن کا ذکر ہوا ہے چاہے نہیں۔

یہاں پر بھی بعض مفسرین نے آیت کے ظاہر کو قبول نہیں کیا اور اس کی تفسیر اعمال کی جزاء کے معنی میں کی ہے، یا یہ کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ انہیں قیامت کے دن اس بات پر مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنے مال جیسا لائیں جب کہ وہ ایسا نہیں کر سکیں گے، (یعنی اُن کی گردنوں میں جو طوق کی صورت میں ہے وہ تکلیف ہے نہ کہ خود مال)، لیکن یہ تفسیر کسی قسم کی دلیل نہ رکھنے کے ساتھ ساتھ آیت کے ظاہر کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں ہے اور اس سلسلے میں ہادیان دین سے جو متعدد احادیث منقول ہیں ان سے بھی ہمنوا نہیں ہے۔

چھٹی آیت میں ایک بار پھر عمل کے حاضر ہونے کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: جب دوزخ شعلے اگلے گی اور جنت ے نزدیک ہوگی، ہر شخص یہ جان لے گا کہ اُس نے کیا حاضر کیا ہے"**واذا الجحیم سعرت۔ واذا الجنة ازلفت۔ علمت نفس ما احضرت**"۔

طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں ذکر کیا ہے کہ "**ما احضرت**" کا معنی "**ماوجدت حاضرا من عملها**" (یعنی اس کے وہ اعمال جنہیں وہ حاضر پائے گا)۔

تعجب کی بات ہے کہ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ عمل کا حاضر ہونا ایک مجازی بات ہے کیونکہ عمل کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو باقی رہ جائے، انجام پانے کے بعد وہ ختم ہو جاتا ہے، لہٰذا مراد یہ ہے کہ کسی کا حساب بھی نہیں چھوڑا جائے گا، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مراد اعمال ناموں کا حاضر ہونا ہے۔[2]

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کا معنی اعمال کا بدلہ ملنا ہے جب کہ جیسا آئندہ توضیحات میں آئے گا عمل کوئی فنا ہونے والی چیز نہیں ہے، وہ ہمیشہ باقی رہتا ہے، لہٰذا یہ بات مشکل نہیں کہ قیامت کے دن وہ کسی مناسب صورت میں ظاہر ہو۔

احضار عمل کا معنی چاہے حاضر کرنا ہو، چاہے حاضر ہونا ہو (کیونکہ دونوں تفسیریں ذکر ہوئی ہیں) ہر صورت میں ہماری بات کی تائید ہوتی ہے۔

---

[1] ابن عباسؓ کی یہ روایت بہت سی تفسیروں میں آئی ہے مثلاً تفسیر قرطبی، تفسیر روح المعانی اور تفسیر المنار میں زیر نظر آیت کے ذیل میں۔
[2] مجمع البیان، ج ۱ ص ۴۴۴۔

اعمال سپرد کردیئے جائیں گے

ساتویں، آٹھویں، نویں اور دسویں آیت میں بھی تجسم اعمال کے متعلق ہی گفتگو کی گئی ہے، کیونکہ ان آیات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے تمام اعمال، چاہے برے ہوں یا اچھے پوری طرح اس کے سپرد کردیئے جائیں گے اور انسان اُن سب کو وصول کرے گا (غور کیجئے گا)۔

ان آیات کا یہ ظاہر یہ بتاتا ہے کہ انسان خود اپنے عمل کو وصول کرے گا نہ کہ اُن کی جزا وسزا یا نامہ عمل کو، ساتویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ان (جن وانس) میں سے ہر ایک کے لئے اُن کے اعمال کے مطابق درجات ہیں، مقصد یہ ہے کہ اُن کے اعمال کسی کمی بیشی کے بغیر اُن کے سپرد کئے جائیں گے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

"ولکل درجات مما عملوا ولیوفیھم اعمالھم وھم لا یظلمون"

آٹھویں آیت میں قیامت کی عدالت، اعمال نامے، گواہوں کی حاضری اور کسی پر ظلم نہ ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: جس نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ اس کے سپرد کیا جائے گا، جو کچھ وہ کرتے ہیں خدا اسے سب سے زیادہ جانتا ہے۔ "ووفیت کل نفس ما عملت وھو اعلم بما یفعلون"۔

نویں آیت میں بھی یہی معنی آیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: (خدا کی راہ میں) جو نیکیاں تم خرچ کرتے ہو، وہ کسی کمی بیشی کے بغیر تمہیں دی جائیں گی اور تم پر ظلم نہیں ہوگا "وما تنفقوا من خیر یوف الیکم وانتم لا تظلمون"۔

دسویں آیت میں بھی یہی مسئلہ زیادہ مکمل انداز میں بیان ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے: جس دن تم خدا کی طرف پلٹو گے، جس نے جو کچھ بھی کیا ہوگا اسے لوٹا یا جائے گا اور اُن پر ظلم نہیں ہوگا "ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون"۔

''وفیت''، ''توفی'' اور ''یوفی'' سب ''وفا'' کے مادہ سے ہیں جس کا معنی کمال تک پہنچنا ہے ''توفیۃ'' کسی چیز کو پوری طرح ادا کرنے کے اور ''توفی'' کسی چیز کو مکمل طور پر لینے کے معنی میں ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

"انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب"

صابر لوگ اپنی بے حساب جزا لیں گے۔ (زمر۔۱۰)

لیکن مذکورہ بلا آیات اور کلام الٰہی میں بعض دوسری آیات کے مطابق: خود اپنے اعمال وصول کریں گے، جیسا کہ آگے ذکر ہوگا، یہ دو مفہوم آپس میں کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتے کیونکہ قرآن کی آیات سے مجموعی طور پر یہ واضح ہوتا ہے کہ اس دن اعمال کا بدلہ بھی ملے گا اور خود اعمال کو بھی انسان کے سامنے لایا جائے گا، یہ بالکل ایسا ہے کہ جب انسان ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اُسے جرمانہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے

اور حادثے کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔

بہت سے مفسرین نے ان آیات کو اعمال کی جزا دینے سے متعلق کنایہ قرار دیا ہے جو کسی دلیل کے بغیر ہے، بلکہ بہت سی آیات و روایات آگے چل کر آئیں گی، جو واضح طور پر اس امر کی تائید کرتی ہیں کہ انسان قیامت کے دن خود اعمال کو دیکھ لے گا، لہٰذا ہم ان آیات کو ان کے ظاہر پر باقی رکھتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر تجسم اعمال کے موضوع کو آگے بڑھاتے ہیں، بعض مفسرین اور محققین نے بھی یہی روش اپنائی ہے۔

گیارہویں آیت میں بھی اس مال کا ذکر ہے کہ جسے لوگ خزانے کی صورت میں اپنے پاس جمع کر لیتے ہیں اور راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے اور جس کی وجہ سے اُن پر شدید عذاب نازل ہوگا، اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: یہ دردناک عذاب اس دن ہوگا جب ان سکوں کو جہنم کی جلا دینے والی آگ میں تپایا جائے گا اور اُن کے پہلوؤں، پیشانیوں اور پشتوں کو ان سے داغا جائے گا (اور اُن سے کہا جائے گا) یہ وہی ہے جس کا تم نے اپنے لئے ذخیرہ کر رکھا تھا اور جو کچھ تم نے خزانے (کی صورت میں) جمع کیا تھا اب اس کا مزہ چکھو' يوم يحمى عليها في نار جهنم فتكوى بها جباههم و جنوبهم وظهورهم هذا ما كنزتم لا نفسكم فذوقوا ما كنتم تكنزون''

یہ آیت واضح طور پر بتاتی ہے کہ جو درہم دینار خزانے کی صورت میں جمع کئے جائیں اور انہیں راہ خدا میں خرچ نہ کیا جائے وہ قیامت کے دن سامنے آئیں گے، انہیں جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور مال جمع کرنے والوں کی پیشانی، پشت اور پہلوؤں کو اُن سے داغا جائے گا اور اُن سے کہا جائے گا یہ وہی کچھ ہے جو تم نے خزانے کی صورت میں جمع کر رکھا تھا (غور کیجئے گا)۔

صرف ان تین اعضاء کو ہی کیوں داغا جائے گا؟ اس کا جواب بعض نے تو یہ دیا ہے کہ بدن کے اہم حصے یہی ہیں۔[1]

بعض نے کہا ہے کہ یہ لوگ چونکہ سائل کے سامنے اپنا چہرا بگاڑا کرتے تھے، پھر پہلو بچاتے تھے اور آخر میں پشت پھیر کر چل پڑتے تھے اس لئے اُن کے ان تین اعضاء کو جلایا جائے گا جن کے ساتھ وہ غریبوں سے بے اعتنائی کرتے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ جب یہ دولت کے پجاری اپنا مقصد حاصل کر لیتے تھے، اور مال و دولت ان کے ہاتھ آجاتا تھا تو پہلے تو یہ قہقہے لگاتے اور خوشی کے آثار ان کے چہروں پر ظاہر ہوتے، اس کے بعد وہ بغلیں بجاتے اور اس مال سے فائدہ اٹھاتے، شاہانہ لباس تیار کرواتے اور پشت پر ڈال لیتے، اسی لئے ان تین اعضاء پر سزا دی جائے گی۔[2]

یہ آیت اگرچہ واضح طور پر تجسم اعمال کو بیان نہیں کر رہی بلکہ صرف مال و دولت کے حاضر ہونے کے متعلق گفتگو کر رہی ہے لیکن یہی تعبیر تجسم اعمال کی طرف بھی اشارہ قرار پا سکتی ہے، اس لحاظ سے کہ یہ سکے اور مال تو ظاہری طور پر نابود ہو جاتے ہیں لیکن قیامت کے دن یہ دوبارہ لوٹ آئیں گے اور ان سے پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغنے کا کام لیا جائے گا۔

---

[1] مجمع البیان، ج۵، ص۲۶۔

[2] فخر رازی نے اپنی تفسیر، ج۱۶ ص۴۸ پر اس بات کے لئے مجموعی طور پر چھ وجوہ ذکر کی ہیں، تفسیر روح المعانی، روح البیان اور قرطبی میں بھی زیر نظر آیت کے ذیل میں ان وجوہات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

یہاں پر کنز (خزانے) سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ ''کنز'' ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے جو ہر اُس قیمتی مال کے لئے استعمال ہوتا ہے جسے ایک جگہ چھپا کر ذخیرہ کرلیا جائے۔

کیا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص بھی اپنی ضروریات سے زائد کسی مال کو چھپا کر خزانے کی صورت میں جمع کرلے تو اس نے حرام کام کیا ہے اور وہ خدا کی اس سزا کا موجب ہے، یا یہ کہ یہ آیت ان افراد سے متعلق ہے جو واجب حقوق مثلاً زکوۃ وغیرہ ادا نہیں کرتے لیکن جو شخص ان واجب حقوق کو پوری طرح ادا کرتا ہے، اس نے کوئی حرام کام انجام نہیں دیا اور وہ اس سزا کا بھی مستحق نہیں؟

فقہا مفسرین اور محدثین کے درمیان دوسرا معنی زیادہ مشہور ہے، اس سلسلے میں شیعہ اور سنی مآخذ سے متعدد احادیث بیان کی گئی ہیں، چنانچہ پیغمبر اسلامؐ سے منقول ایک حدیث میں ہے:

ای مال ادیت زکاته فلیس بکنز

ہر وہ مال کہ جس کی زکوۃ دے دی جائے وہ کنز نہیں ہے۔[1]

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جب بھی اسلامی معاشرہ دولت کے ارتکاز کی وجہ سے تنگ دستی اور سختی میں مبتلا ہو جائے تو صاحبان ثروت پر واجب ہے کہ وہ انفاق یا کام کے لئے سرمایہ گزاری کریں اور ضرورتمندوں کی حاجت کے لئے اپنے مال کو خرچ کریں، چنانچہ ایسی صورت میں اگر انہوں نے اپنا مال خرچ کرنے سے اجتناب کیا اور ذخیرہ کرلیا تو مذکورہ بالا آیت ان پر بھی محیط ہو جائے گی، شاید حضرت امیرالمومنینؑ سے منقول حدیث بھی اسی طرف اشارہ ہو۔

"ماذا د علی اربعة الاف فهو کنز ادی زکاته اولم یودها وما دونها نهی نفقه فبشر هم بعذاب الیم"

جو کچھ چار ہزار (درہم) سے زائد ہو وہ خزانہ شمار کیا جائے گا، چاہے اس کی زکوۃ دی گئی ہو چاہے نہ دی گئی ہو، جو کچھ اس سے کم ہو وہ زندگی کا خرچ ہے، پس اس طرح کے لوگوں کو دردناک عذاب کی خبر دے دو۔[2]

تمہارے اعمال۔۔۔۔۔۔۔۔۔تمہاری جزا

آخری اور بارہویں آیت میں اس سلسلے میں ایک اور تعبیر لائی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے دن تمہاری جزا تمہارے

---

[1] تفسیر المنار، ج ۱۰، ص ۴۰۶۔ صحیح بخاری میں بھی ایک بات ''ما ادی زکاته فلیس بکنز'' کے عنوان سے آیا ہے، ج ۱ جز ۳، ص ۱۳۲ اور تفسیر نور الثقلین، ج ۲ ص ۲۱۳۔

[2] تفسیر نور الثقلین، ج ۲ ص ۲۱۳، حدیث ۱۳۲۔

اعمال ہیں، یہ تعبیر قرآن کی متعدد آیات میں آئی ہے مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

تمہاری جزا فقط تمہارے وہ اعمال ہیں جو تم انجام دیتے ہو''انما تجزون ما کنتم تعملون''۔

بالکل یہی تعبیر طور، ۱۶ اور تحریم ۷ میں بھی آئی ہے۔

سورہ یٰسین، آیت ۵۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

"ولا تجزون الا ما کنتم تعملون"

تمہیں جزا نہیں دی جائے گی مگر تمہارے اعمال۔

سورہ نمل کی آیت ۹۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

"هل تجزون الا ما کنتم تعملون"

کیا تمہاری جزا تمہارے اعمال کے علاوہ بھی کچھ ہوگی؟

سورہ یونس آیت ۵۲ میں یوں ہے:

"هل تجزون الا بما کنتم تکسبون"

کیا تمہاری جزا اس کے علاوہ کچھ اور ہوگی کہ جو تم نے انجام دیا ہے۔؟

تھوڑے سے فرق کے ساتھ اسی طرح کی کئی اور تعبیرات بھی ہیں ان آیات کا ظاہر یہ ہے کہ انسان کی جزاء اس کے اعمال ہی ہیں، اُس کے اعمال ہی اُس کی طرف لوٹ کر آئیں گے، یہی اُسے تکلیف پہنچائیں گے یا خوشی و مسرت کا باعث بنیں گے، یہ تجسم اعمال پر ایک واضح دلیل ہے جو یہ بتاتی ہے کہ انسان کے اعمال اس کی طرف پلٹ کر آئیں گے اس کے ساتھ ساتھ یہ خدا کے عادل ہونے پر بھی تاکید کرتی ہے۔

یہاں پر بھی بعض لوگوں نے ''کلمہ با'' کو محذوف سمجھا ہے (باسببیت کو) اور کہا ہے کہ یہ حقیقت میں ''بما کنتم تعملون'' یعنی تمہاری جزا اُن اعمال کی وجہ سے ہے جو تم نے انجام دیئے ہیں۔[1]، جب کہ یہاں پر کسی چیز کو محذوف سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں اس میں کیا مانع کیا ہے، خود انسان کے اعمال حاضر ہوں اور اس کی جزاء کا زیادہ حصہ انہی اعمال پر مشتمل ہو۔

علامہ طباطبائی مرحوم نے تفسیر المیزان میں سورہ تحریم کی آیت نمبر ۴ کے ذیل میں یوں کہا ہے:

"ای ان العذاب الذی تعذبونه هو عملکم السئی الذی عملتموه وقد برزلکم الیوم حقیقته"

---

[1] بعض لوگوں نے ''علیٰ'' کو تقدیر میں لیا ہے اور کہا ہے کہ حقیقت میں یوں تھا ''علی ما کنتم تعلمون''

یعنی تم جس عذاب میں گرفتار ہو یہ تمہارے برے اعمال ہی ہیں جنہیں تم نے انجام دیا تھا اور آج اُن کی حقیقت واضح ہوگئی ہے۔[1]

مذکورہ بالا آیات سے مجموعی طور پر یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اگر ان آیات کے ظاہر میں کسی قسم کی تاویل نہ کریں اور کسی جملے یا کلمے کو محذوف نہ سمجھیں یعنی ان کے ظاہر کی واضح طور پر تفسیر کریں تو ان سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ خدا کی عدالت یا قیامت کے دوسرے مراحل میں ہمارے اعمال ہمارے سامنے آئیں گے، برے اعمال بری اور ڈراؤنی صورت میں ظاہر ہوں گے جب کہ اچھے اعمال خوبصورت، دل پذیر اور روح بخش شکل میں ظاہر ہوں گے اور اپنے عمل کنندہ کی ہمراہی کریں گے۔

توضیحات

اسلامی احادیث میں تجسمِ اعمال:

شیعہ اور سنی ہر دو سے منقول متعدد روایات میں ''تجسم اعمال'' کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے، جیسا کہ شیخ بہائی مرحوم نے کہا ہے:

"تجسم الاعمال فی النشاة الا خروية قد ورد فی احادیث متکثرة من طرق المخالف والموالف"

دوسرے جہان میں تجسم اعمال سے متعلق فریقین (شیعہ اور سنی) نے بہت سی روایات ذکر کی ہیں۔[2]

ہم یہاں پر صرف چند احادیث ذکر کرتے ہیں:

۱۔ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ایک حدیث یوں ہے:

مشہور صحابی قیس بن عاصم کہتے ہیں کہ میں قبیلہ بنی تمیم کے ایک گروہ کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔۔۔۔۔۔ میں نے عرض کی: ''اے پیغمبر اسلامؐ! ہمیں نصیحت کیجئے، ایسی نصیحت جو ہمارے لئے سودمند ہو کیونکہ ہم لوگ بیابانوں سے گزرتے ہیں (اور شہروں سے دور زندگی گزارتے ہیں) پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

"قا قیس! ان مع العز ذلا، وان مع الحیاة موتا۔ وان مع الدنیا اخرة، فان لکل شئی حسیبا وان لکل اجل کتابا وانه لا بدلك یا قیس من قرین

[1] تفسیر المیزان، ج۱۹ ص۳۸۸۔

[2] بحار الانوار، ج۷ ص۲۲۸۔

يدفن معك و هو حي، وتدفن معه وانت ميت، وان كان كريما اكرمك وان كان ليما اسلمك ثم لا يحشر الا معك، ولا تحشر الا معه، ولا تسئل الا عنه، فلا تجعله الا صالحا، فانه ان صلح انست به وان فسد لا تستوحش الا منه وهو فعلك"۔

''اے قیس! عزت کے ساتھ ذلت ہے اور موت کے ساتھ زندگی اور دنیا کے ساتھ آخرت اور ہر چیز کا ایک حساب کرنے والا ہے اور ہر اجل کے لئے کتاب ہے۔

''اے قیس! تو اُس چیز کو دوست بنا جو تیرے ساتھ دفن ہو جب کہ وہ زندہ ہے اور تو اُس کے ساتھ دفن ہو جب کہ تو مردہ ہو، اگر وہ کریم ہوا تو تجھے بھی کریم بنا دے گا اور اگر وہ پست ہوا تو تجھے بھی پست بنا دے گا، وہ فقط تیرے ساتھ اٹھایا جائے گا اور تو بھی فقط اُس کے ساتھ، فقط اس کے بارے میں تجھ سے سوال کیا جائے گا، پس اسے نیک بنا، اگر وہ نیک ہوا تو تیرے لئے راحت کا باعث ہوگا اور اگر برا ہوا تو تیرے لئے خوف اور ڈر کا باعث ہوگا، اور وہ تیرا عمل ہے''۔

جاذبِ نظر یہ ہے کہ اس روایت کے ذیل میں یہ بھی ہے:

قیس بن عاصم نے عرض کی: ''اے رسول خدا! کیا خوب ہے اگر اس بات کو شعر کے انداز میں بیان کیا جائے تا کہ جو لوگ ہمارے ساتھ ہیں وہ فخر محسوس کریں اور اپنے پاس رکھ لیں''۔ رسول اسلامؐ نے 'حسان بن ثابت'' کو حاضر کرنے کا حکم فرمایا'' صلصال بن صلصال'' نامی شخص بھی اسی محفل میں موجود تھا، اس نے عرض کی:

''یا رسول اللہؐ! مجھے کچھ اشعار سوجھے ہیں، میرا خیال ہے کہ یہ قیس کی مراد کے مطابق ہیں!''

آپؐ نے فرمایا: ''پڑھو!'' اس نے اشعار پڑھے جن میں سے کچھ یوں ہیں!

تجنب خليطا من مقامك انما
قرين الفتى فى القبر ماكان يفعل
ولن يصحب الانسان من قبل موته
ومن بعده الا الذى كان يعمل

یعنی متفرق باتوں سے بچو کہ قبر میں انسان کا ہم نشین اُس کے اعمال ہوں گے، اور اس کے عمل کے علاوہ کوئی اور چیز

موت سے پہلے اور موت کے بعد اس کے ہمراہ نہیں ہوگی۔[۱]

۲۔ ابوبصیر نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام یا حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث یوں روایت کی ہے:

''جب بندہ مومن مرتا ہے تو اس کے ساتھ قبر میں چھ صورتیں آتی ہیں جن میں ایک صورت سب سے خوبصورت ہوتی ہے۔۔۔۔ ایک صورت دائیں طرف اور ایک بائیں طرف، ایک صورت سامنے اور دوسری پیچھے، ایک پاؤں کی طرف، اور جو صورت سب سے خوبصورت ہے وہ سر کے اوپر کھڑی ہوتی ہے، جب بھی عذاب دائیں طرف سے آتا ہے تو دائیں طرف والی صورت اُسے روک لیتی ہے اور باقی پانچ صورتیں بھی اسی طرح کرتی ہیں، جو صورت سب سے خوبصورت ہے وہ باقی صورتوں سے مخاطب ہو کر کہتی ہے:

''تم کون ہو؟ خدا تمہیں جزائے خیر دے، دائیں طرف والی صورت کہتی ہے میں نماز ہوں، بائیں طرف والی کہتی ہے میں زکوۃ ہوں، سامنے والی کہتی ہے میں روزہ ہوں، پیچھے والی کہتی ہے میں حج اور عمرہ ہوں، پاؤں کی طرف والی کہتی ہے میں وہ نیکیاں ہوں جو تم نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیں، پھر وہ سب اس خوبصورت سے پوچھیں گی کہ تم کون ہو کہ جو تمام سے خوبصورت ہو۔۔۔۔۔۔ وہ اپنا تعارف یوں کرائے گی:

انا الولایۃ لآل محمدا

میں ولایت آل محمد ہوں۔[۲]

۳۔ رسول خداؐ سے منقول ایک حدیث یوں ہے کہ آپ نے فرمایا:

جبرائیل نے مجھ سے کہا:

یامحمد! عش ماشئت فانك میت..........واعمل ماشئت فانك ملاقیه

یا محمد! جتنی چاہو زندگی گزار لو، آخرکار اس زندگی کو الوداع کہنا ہے، جو دل چاہے عمل انجام دو کہ سرانجام اس عمل سے ملاقات ہوگی۔[۳]

---

[۱] گذشتہ حوالہ، ص ۲۲۸، ص ۲۲۹ لیکن ''خصال'' میں صدوق مرحوم کی روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اشعار خود قیس بن عاصم نے فی البدیہ کہے، صدوق کے بقول پہلا شعر یوں تھا: تخیر خلیطا من فعالک انما۔ قرین الفتی فی القبر ما کان یفعل (اپنا دوست اپنے اعمال کو بنا، قبر میں انسان کا ساتھ اس کا عمل ہوگا) خصال ج ابات الثلاثہ، حدیث ۹۳۔

[۲] کتاب محاسن کے حوالے سے اُسے علامہ مجلسی نے ذکر کیا ہے، ج ۶ بحارالانوار ص ۲۳۴، حدیث ۵۰۔

[۳] کنزالعمال، ج ۱۵ ص ۵۴۶۔

۴۔ ایک اور حدیث جو پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے اُس میں ہے:

ان المومن اذا خرج من قبره صور له عمله فی صورة حسنة فيقول له ما انت؟ فوالله انی لا راك امرا صدق، فيقول له انا عملك فيكون له، نورا وقآئدا الى الجنة-----------------

''جب مومن (قیامت کے دن) اپنی قبر سے نکلے گا تو اس کا عمل اس کے سامنے ایک خوبصورت شکل میں ظاہر ہو گا، یہ اُس سے کہے گا: تم کون ہو؟ خدا کی قسم میں تمہیں ایک سچا شخص پاتا ہوں، وہ جواب میں کہے گا: میں تمہارا عمل ہوں، یہ اُس مومن کے لئے نور و ضیاء اور جنت کی طرف راہنما بنے گا''۔ [۱]

۵۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں آپ نے یوں فرمایا:

اذا وضع الميت فی قبره، مثل له شخص وقال له يا هذا كنا ثلاثة كان رزقك فانقطع بانقطاع اجلك وكان اهلك فخلفوك وانصر فواعنك وكنت عملك فبقيت معك، اما انی كنت اهون الثلاثة عليك---------

''جب میت قبر میں رکھ دی جاتی ہے تو ایک شخص اُس کے سامنے آتا ہے اور اس سے کہتا ہے: اے انسان! ہم تین تھے، ایک تمہارا رزق تھا جو تیری عمر کے خاتمے کے ساتھ ختم ہو گیا، دوسرا تیرا خاندان تھا جس نے تجھے یوں رکھا اور چل دیا، میں تیرا عمل ہوں جو تیرے ساتھ ہوں، لیکن میں تیرے لئے ان سب سے کم اہمیت تھا''۔ [۲]

اس سلسلے میں احادیث بہت زیادہ ہیں، انہی میں سے معراج پیغمبرؐ کی احادیث میں ہے کہ آپؐ جنت اور دوزخ کے پاس سے گزرے اور گنہگاروں کو اُن کے اعمال کے عذاب میں گرفتار دیکھا، اسی طرح نیک لوگوں کی امیدوں کو دیکھا جن کے سبب سے وہ جنت کی نت نئی نعمتوں کو حاصل کر رہے تھے، غیبت کے سلسلے میں منقول احادیث غیبت کے بد بودار گوشت میں مجسم ہونے کی خبر دیتی ہیں جو غیبت کرنے والا کھائے گا، یہ بھی ہمارے دعویٰ کی تصدیق کرتی ہیں۔

---

[۱] کنز العمال، ج ۱۴ ص ۳۶۶۔

[۲] فروع کافی، ج ۳ (کتاب الجنائز) ص ۲۴۰ حدیث ۱۴۔

گزشتہ آیات و روایات سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے کہ انسان کے اعمال کسی مناسب صورت میں عالم برزخ یا قیامت کے دن سامنے آئیں گے، مزید برآں:

الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا

[۲] النساء: ۱۰

جو یتیموں کا مال ظلم وستم کے ساتھ کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں صرف آگ داخل کر رہے ہیں۔

یہ آیت بھی بتاتی ہے کہ ہر عمل کا باطن اس دنیا میں بھی ایک تجسم اور ظہور رکھتا ہے چنانچہ یتیم کا مال باطن میں جہنم کی آگ ہے اگرچہ کوتاہ نظر لوگ اسے اس دنیا میں نہیں دیکھ سکتے۔

اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ ہم ان تمام آیات و روایات کو کسی مجازی اور استعاری معنی پر محمول کریں اور سب کی تاویل وتوجیہ کریں جب کہ ان کے ظاہر کو قبول کرنے میں بھی کوئی اشکال نہیں، اس کی وضاحت انشاء اللہ آگے آئے گی۔

تجسم اعمال ۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔منطق عقل

تجسم اعمال پر سب سے بڑا اعتراض وہ ہے جسے طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ عمل ''اعراض'' میں شامل ہے نہ کہ ''جوہر'' میں (وہ نہ تو خود مادہ ہے اور نہ ہی مادہ کے خواص کا حامل ہے)، دوسرا یہ کہ عمل انجام ہونے کے بعد نابود اور فنا ہو جاتا ہے، اسی لئے ہمارے گذشتہ اعمال، گفتار اور رفتار کا اثر باقی نہیں رہتا، صرف ان اعمال کا اثر باقی رہ جاتا ہے جو بعض مادوں پر اثر انداز ہوتے ہیں جیسے لکڑی، پتھر اور اینٹوں کو ملا کر ایک عمارت بنا دی جاتی ہے، حقیقت میں یہ بھی تجسم عمل نہیں ہے بلکہ عمل سے پیدا ہونے والی تبدیلیاں اور تغیرات ہیں۔ (غور کیجئے گا)

لیکن دو نکتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان اعتراضوں کا جواب بالکل واضح ہو جاتا ہے اور اسی طرح تجسم اعمال کی کیفیت بھی بالکل روشن ہو جاتی ہے۔

پہلا یہ کہ آج یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس جہان میں کوئی چیز مکمل طور پر ختم نہیں ہوتی، یہاں تک کہ ہمارے اعمال بھی کہ جو مختلف توانائیوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، اگر ہم کوئی بات کرتے ہیں تو ہماری آواز مخصوص قسم کی لہروں کی شکل میں فضا میں پھیل جاتی ہے جو ہوا کے موجزن ذرات (MOLECULES) ہمارے اطراف میں موجود دیواروں اور دیگر جسموں سے ٹکرا کر ایک دوسری توانائی میں تبدیل ہو جاتی ہے، یہ دوسری توانائی بھی ممکن ہے کئی اور صورتیں بدلے، لیکن بہت حال یہ نابود اور فنا نہیں ہوتی، ہمارے ہاتھ اور پاؤں کی حرکات بھی توانائی (ENERGY) کی ایک قسم ہیں، یہ مکینیکل توانائی بھی ہرگز فنا نہیں ہوتی، البتہ اس بات کا امکان ہے کہ وہ حرارتی توانائی یا کسی اور توانائی میں تبدیل ہو جائے، خلاصہ کلام یہ کہ اس جہان میں موجود مادہ ہی فقط پائیدار نہیں ہے بلکہ اُن میں موجود توانائی بھی ثابت اور قائم رہتی ہے،

اگر چہ وہ مختلف شکلیں بدلتی رہتی ہے۔

دوسرا یہ کہ سائنسدانوں کی کاوشوں اور اُن کے تجربات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مادہ (MATTER) اور توانائی (ENERGY) کے درمیان ایک قریبی رابطہ موجود ہے، یعنی مادہ اور توانائی ایک ہی حقیقت کے دو جلوے ہیں، مادہ سمٹی ہوئی توانائی ہی کا نام ہے اور توانائی پھیلا ہوا مادہ ہی ہے ، لہٰذا مخصوص حالات میں یہ ایک دوسرے میں تبدیل ہو جاتے ہیں (یعنی ان کی تحویل (REDUCTION) کا عمل جاری رہتا ہے۔

ایٹمی توانائی (ATOMIC ENERGY) مادے کا توانائی میں تبدیل ہونا ہی ہے یا دوسرے الفاظ میں ایٹم کو پھاڑنا اور اس میں موجود توانائی کو آزاد کرنا ہے۔

یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سورج کی حرارتی توانائی (HEAT ENERGY) بھی ایٹمی توانائی کا ہی کرشمہ ہے جو سورج کے ایٹموں کے پھٹنے سے حاصل ہوتی ہے، اسی لئے ہر چوبیس گھنٹوں میں سورج کا وزن کچھ کم ہو جاتا ہے، اگر چہ سورج کے وزن اور حجم کے مقابلے میں یہ مقدار بالکل معمولی ہے۔

جیسے مادہ توانائی میں تبدیل ہو سکتا ہے اسی طرح توانائی بھی مادہ میں تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے، اگر متفرق اور پھیلی ہوئی توانائیاں ایک جگہ جمع ہو جائیں اور ایک جسم کی صورت اختیار کر لیں تو پھر یہ وہی مادہ ہوگا۔

اس بناء پر اس امر میں کسی قسم کی مشکل نہیں ہے کہ ہمارے اعمال اور گفتار جو مختلف توانائیوں کی صورت میں ہیں وہ نابود اور فنا نہ ہوں بلکہ خدا کے حکم سے ایک جگہ جمع ہو کر ایک جسم کی صورت اختیار کر لیں، یہ بات قطعی ہے کہ ہر عمل ایک ایسے جسم کی صورت میں ہوگا جو اس کی خصوصیات اور اُن توانائیوں کے مطابق ہوگا جو اس نے لوگوں کی خدمت، معاشرے کی اصلاح اور تقویٰ وفضیلت کے حصول کے لئے خرچ کی ہوں گی، یہ جسم بھی خوبصورت شکل کا ہوگا، لیکن وہ توانائیاں جو اُس نے ظلم وستم کرنے اور معاشرے میں برائی کے فروغ کے لئے استعمال کی ہوں گی اُن کا جسم بھی ایک بری اور نفرت آور صورت میں ظاہر ہوگا۔

لہٰذا تجسم اعمال کو قرآن کا ایک علمی معجزہ سمجھا جا سکتا ہے، جن دونوں اصلا توانائی کی بقاء، مادہ کا توانائی میں تبدیل ہونا یا توانائی کا مادہ میں تبدیل ہونا اور اس طرح کے دوسرے موضوعات کسی کو معلوم نہ تھے، قرآن نے واضح طور پر اس بات کو بیان فرمایا۔

لہٰذا نہ تو عمل کا ''عرض'' ہونا قابل اعتراض ہے اور نہ اس کا نابود ہونا کیونکہ عمل نابود نہیں ہوتا اور عرض اور جوہر بھی ایک ہی حقیقت کے دو کرشمے ہیں، یہ بات حرکت جوہری کو مدنظر رکھتے ہوئے پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کیونکہ جو لوگ حرکت جوہری کے قائل ہیں وہ عرض میں واقع ہونیوالی تبدیلیوں سے جوہر میں حرکت کا استدلال پیش کرتے ہیں، ان کا یہ خیال ہے کہ یہ دونوں تبدیلیاں (جوہر اور عرض میں تبدیلی) ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔

مذکورہ مطلب کی تکمیل کے لئے اس نکتے کی یاد آوری بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مشہور فرانسیسی مفکر ''لاوازیہ'' نے ''بقائے مادہ'' کو مسلسل سعی وکوشش کے ساتھ کشف کیا ہے اور اُس نے یہ بات ثابت کی ہے کہ مادہ ختم اور نابود نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ صورتیں بدلتا رہتا ہے، اس بات

کو گزرے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ پیر کوری اور اس کی بیوی نے پہلی مرتبہ مادہ اور توانائی کے درمیان رابطے کو ریڈیو ایکٹو(RADIO ACTIVE) جسام(وہ اجسام جو ناپائیدار ایٹمز کے حامل ہوتے ہیں اور اُن کے بعض حصے تدریجا توانائی میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں) کے مطالعے سے کشف کیا جس سے بقاء مادہ کا قانون مادہ اور توانائی کے بقاء کے قانون میں تبدیل ہو گیا، اس طرح سے بقاء مادہ والا قانون ختم ہو گیا اور مادہ اور توانائی کے بقاء کا قانون اس کا جانشین ہو گیا، پھر رفتہ رفتہ مادہ سے توانائی کی تبدیلی کا یہ قانون ایٹمی دھماکے سے تجرباتی طور پر ثابت ہو گیا اور واضح ہو گیا کہ یہ دو چیزیں (مادہ اور توانائی) آپس میں ایک قریبی رابطہ رکھتی ہیں اور ایک دوسرے میں تبدیل ہونے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ہی حقیقت کے دو مظہر ہیں۔

اس عظیم سائنسی انکشاف نے سائنسدانوں کے مطالعے کو ایک نئی جہت عطا کر دی جس سے اس کائنات کی وحدت کے نظریے کی زیادہ سے زیادہ تائید ہوئی۔

اس قانون نے معاد اور تجسم اعمال سے متعلق ابحاث اور کئی سوالات کو بھی حل کر دیا۔

اس سلسلے میں اس کی معاونت واضح ہے، تجسم اعمال کے سلسلے میں جو اعتراضات کئے جاتے تھے وہ بھی اس کے ذریعے دور ہو گئے۔

تجسمِ اخلاق۔۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔انسانی خصائل:

اسلامی روایات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت کے دن انسانی اعمال کے مجسم ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کا اخلاق اور عادات بھی ظاہر ہوں گی، اسی لئے انسان شکلوں اور صورتوں میں میدان محشر میں آئیں گے، ایسی صورتیں جو ان کے اخلاق اور عادات کے مطابق ہوں گی، جن کا دل ایمان کی روشنی سے منور تھا وہ سفید اور نورانی چہروں کے ساتھ آئیں گے اور جن کا دل کفر کی تاریکیوں سے سیاہ تھا وہ سیاہ اور ڈراؤنی صورت میں آئیں گے، چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ فاما الذین اسودت وجوھھم ا کفر تم بعد ایمانکم فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون۔۔۔۔ واما الذین ابیضت وجوھھم ففی رحمتہ اللہ ھم فیھا خلدون۔

جس دن چہرے سفید اور سیاہ ہو جائیں گے، جن کے چہرے سیاہ ہوں گے (اُن سے کہا جائے گا) کیا تم ایمان کے بعد کافر ہو گئے تھے؟ پس اپنے کفر کی وجہ سے اب عذاب کا مزہ چکھو اور وہ کہ جن کے چہرے سفید ہیں وہ خدا کی رحمت میں ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (آل عمران، ۱۰۶، ۱۰۷)

ایک اور جگہ گنہگاروں کے انجام کے متعلق یوں خبر دی:

كانما اغشيت وجوههم قطعامن اليل مظلما۔

اُن کے چہرے یوں تاریک ہوں گے کہ تاریک رات کے ایک حصے نے ان کوڈھانپ رکھا ہو۔ (یونس، ۲۷)

ہاں! وہ ظاہر اور آشکار ہونے کا دن ہے، انسان کی اندرونی نیتیں اور ذاتی ملکات ظاہر ہوں گے اور انسان کے تمام جسم پر اپنا رنگ چڑھا دیں گے۔

ہر خیالی کو کند در دل وطن
روز محشر صورتی خواہد شدن
سیرتی کان دروجودت غالب است
ہم بر آن تصویر حشرت واجب است

سورہ نبا آیت نمبر ۱۸ میں ہے:

يوم ينفخ في الصور فتاتون افواجا۔

جس دن صُور پھونکا جائے گا تم فوج درفوج میدان محشر میں آؤ گے۔

بعض بزرگ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث ذکر کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

ابو ایوبؓ انصاری کے گھر میں بعض صحابہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر تھے، معاذ بن جبلؓ نے مذکورہ بالا آیت کی تفسیر پوچھی تو پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

''اے معاذ! تم نے ایک بہت بڑی بات دریافت کی ہے''، پھر آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور آپؐ نے فرمایا:

''میری امت کے دس گروہ جدا جدا میدان محشر میں آئیں گے، جو تمام مسلمانوں سے مختلف ہوں گے، بعض جانوروں کی صورت میں ہوں گے اور بعض اندھے ہوں گے، بعض گونگے اور بہرے ہوں گے تو بعض مردار سے بھی زیادہ بدبودار، چغل خور بندروں کی شکل میں اور حرام خور خنزیروں کی شکل میں آئیں گے، ظالم حکمران اندھے ہو کر اور مغرور لوگ گونگے اور بہرے ہو کر اور شہوت پرست مردوں سے بھی زیادہ بدبو دار ہو کر محشور ہوں گے''۔ [1]

گشتہ گرگان یک بہ یک خوہای تو
می درانند از غضب اعضای تو

---

[1] مجمع البیان، ج ۱۰ ص ۴۲۳، اس حدیث کو کئی اور مفسرین نے بھی ذکر کیا ہے جیسے ابوالفتوح رازی، قرطبی، صاحب روح البیان اور صاحب تفسیر صافی، اس آیت کے ذیل میں ہیں۔

این سخن ہای چو مار و کثر دمت
مار و کثردم فی شود گیرد دمت
زانیاں را گندہ اندام نہاں
خمر خوران ر ا بود گندہ دہان
گند مخفی کان بہ دلہامی رسید
گشت اندر حشر محسوس و پدید

ترجمہ: تمہاری خصلتیں ایک ایک کر کے وحشی جانوروں کی طرح ہو جائیں گی جو غصے سے تمہارے اعضاء کو چیر پھاڑ کھائیں گے۔ یہ تمہاری سانپ اور بچھو جیسی باتیں سانپ اور بچھو ہی بن جائیں گی، اور تمہیں دامن گیر ہو جائیں گی۔ زانیوں کے اندر سے گندے جسم اور شراب خواروں کے بدبودار منہ کی مخفی گندگی ان کے دلوں تک جا پہنچے گی۔ اور میدان محشر میں محسوس اور ظاہر ہو جائے گی۔

خدا کی عدالتِ انصاف

گواہ۔۔۔۔۔۔۔میزان۔۔۔۔۔۔۔حساب

اشارہ:

قیامت کا سب سے مشکل مرحلہ لوگوں کے اعمال کا حساب کتاب ہے، جب تمام لوگ خدا کی عدالت میں حاضر ہوں گے اور مختلف گواہوں کی موجودگی میں اُن کے اعمال کے ترازو میں رکھیں جائیں گے۔

ایک ایسی عدالت جو انسانوں کے لئے کمر شکن ہوگی اور جس سے تمام لوگوں پر ایک خوف اور اضطراب طاری ہو جائے گا، ایسی عدالت جس کا جج اور منصف خدا ہے اور جس کے گواہ خدا کے مقرب فرشتے ہیں۔

ایک ایسی عدالت جس میں انسان کے ہر بڑے اور چھوٹے عمل کا ریکارڈ ہوگا، جس میں انسان کی نیت تک کا حساب کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں معاد کی بہت سی آیات ہیں، اُن میں کبھی تو اس عدالت کے حاکم، خدا تعالیٰ کا ذکر ہے، اور کبھی اس عدالت کے گواہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور کبھی ترازو کا تذکرہ کیا گیا ہے، تو کبھی اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ لوگوں کا حساب کتاب کیسے ہوگا۔

اس موضوع سے متعلق آیات بہت سے دقیق اور ظریف نکات کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ چند اہم تربیتی پیغامات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں جو دلوں اور جانوں کو تقویٰ اور ہدایت کی شمع کی طرف لے جاتے ہیں اور انسانوں کو اس کی ذمہ داریاں بتاتے ہیں اور سعادت اور کمال کی طرف اس کی راہنمائی کرتے ہیں۔

اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کی طرف پلٹتے ہیں اور اس موضوع کے مختلف عنادین سے متعلق منتخب آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

۱۔ وَإِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ (یٰس۔ ۳۲)

۲۔ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿۶۹﴾ (حج)

۳۔ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْحٰكِمِينَ (التین۔ ۸،۷)

۴۔ فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُونَ (یونس۔ ۴۶)

۵۔ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيدًا

(نسآء۔ ۴۱)

۶۔ وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَّشَهِيْدٌ (ق۔۲۱)

۷۔ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (نور:۲۴)

۸۔ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا۔ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (حٰم السجدۃ:۲۱)

۹۔ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (زلزال:۴،۵)

۱۰۔ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا۔ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا۔ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ (انبیاء:۴۷)

۱۱۔ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ۔ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ (اعراف:۸،۹)

۱۲۔ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ (ص:۵۳)

۱۳۔ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ

(آل عمران:۱۹۹۔ مائدہ:۴۔ ابراهیم:۵۱۔ مومن:۱۷)

۱۴۔ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ۔ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ (انعام:۶۲)

۱۵۔ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (الغاشية:۲۵،۲۶)

۱۶ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ۔ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (اسراء:۱۴)

ترجمہ

۱۔ وہ سب قیامت کے دن ہمارے سامنے حاضر ہوں گے۔

۲۔ تم جس چیز میں اختلاف رکھتے ہو قیامت کے دن خدا اس کا فیصلہ کرے گا۔

۳۔ پس کیا چیز سبب بنی ہے (اے انسان) کہ ان تمام (دلائل) کے باوجود تم روز جزا کو جھٹلاتے ہو؟ کیا خدا سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا نہیں؟

۴۔ انہیں لوٹ کر ہماری ہی طرف آنا ہے، پھر خدا گواہی دے گا اس پر جو انہوں نے انجام دیا ہے۔

۵۔ اُن کا حال کیا ہوگا جس دن ہر امت پر ہم اس کے اعمال کا گواہ بلائیں گے اور تجھے ہم اس امت پر گواہ قرار دیں گے۔

۶۔ ہر انسان محشر کے میدان میں آئے گا جب کہ اس کے ساتھ ایک چلانے والا اور ایک گواہ ہوگا۔

۷۔ اُس دن اُن کی زبانیں، ہاتھ اور پاؤں اُن کے خلاف اس عمل پر گواہی دیں گے جو انہوں نے انجام دیا ہوگا۔

۸۔ وہ اپنی جلدوں سے کہیں گے: کیوں ہمارے خلاف گواہی دے رہی ہو؟ (وہ) جواب دیں گی: وہی خدا کہ جس نے ہر موجود کو بولنے کی صلاحیت دی ہے اسی نے ہمیں گویائی عطا فرمائی ہے۔

۹۔ اس دن زمین اپنی تمام خبریں بیان کرے گی کیونکہ تیرے پروردگار نے اس کی طرف وحی کی ہے۔

۱۰۔ اور ہم قیامت کے دن عدل کے ترازو کو قائم کریں گے، لہٰذا کسی پر کچھ ظلم نہیں ہوگا، اور اگر (کوئی عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا (برا کام ہو یا اچھا) تو ہم اُسے حاضر کریں گے، اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں۔

۱۱۔ اُس دن (اعمال کا) وزن کرنا (اور ان کی اہمیت کو پرکھنا) حق ہے، پس جن کی (نیکیوں) کا پلہ بھاری ہوا، وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کا (نیکیوں) کا پلہ ہلکا ہوا یہ وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اس لئے کہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کرتے تھے۔

۱۲۔ یہ وہی چیز ہے جس کا تمہیں حساب کے دن کے لئے وعدہ دیا گیا ہے۔ (ایک اٹل وعدہ)

۱۳۔ اللہ سریع الحساب ہے (نیک اعمال کا جلدی سے حساب کر دیتا ہے اور ان کی جزا دیتا ہے)۔

۱۴۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔ جان لو کہ فیصلے کا حق صرف اسی کو ہے، بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

۱۵۔ بے شک اُن کی بازگشت ہماری طرف ہی ہے اور یقیناً اُن کا حساب بھی ہمارے ہاتھ ہے۔

۱۶۔ (یہ اس کا وہی اعمال نامہ ہے، ہم اس سے کہیں گے) اپنے نوشتے کو پڑھ، کافی ہے کہ آج تو خود اپنا حساب کرنے والا ہو۔

تفسیر

سب کی اس عدالت میں حاضری:

پہلی آیت میں تمام قوموں کے خدا کی عدالت میں حاضر ہونے کے متعلق گفتگو ہے، پہلی قومیں اپنے گناہوں کی وجہ سے کس طرح ہلاک ہوئیں، یہ بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: یقیناوہ سب ہماری بارگاہ میں حاضر ہوں گے (تا کہ اُن سے حساب لیا جا سکے)''وان کل لما جمیع لدینا محضرون''[1]

یہ بات بھی صحیح ہے کہ اس دنیا میں اور ہر وقت تمام انسان اور تمام اشیاء خدا کے سامنے حاضر ہیں کیونکہ وہ ہر جگہ موجود ہے اور ہم سے بھی زیادہ ہمارے نزدیک ہے لیکن یہ چیز قیامت کے دن ایک نئی شکل میں ہوگی، کیونکہ ایک طرف تو غفلت، جہالت اور نادانی کے پردے اٹھا دیئے جائیں گے، نظر تیز ہو جائے گی اور دل کی آنکھیں کھل جائیں گی تو دوسری طرف خدا کے آثار وہاں ہر دور سے زیادہ آشکار ہوں گے، اُس کی عدالت انصاف سجائی جائے گی، اس لئے اس عدالت میں سب لوگوں کی حاضری ایک نئے طریقے سے ہوگی اور تمام لوگوں کو اس بات کا احساس بھی ہوگا۔

دوسری آیت میں اس کے فیصلہ کرنے اور انسانوں کے درمیان قضاوت کرنے کے متعلق گفتگو ہے، اس دنیا میں جو بھی اختلاف تھے اُن کو اس عدالت میں حل کر دیا جائے گا، چاہے وہ اختلاف عقائد سے متعلق ہوں یا زندگی کے عملی پروگرام کے بارے میں یا کسی اور معاملے میں، ارشاد ہوتا ہے: تم جن چیزوں میں اختلاف کرتے تھے خدا قیامت کے دن تمہارے درمیان اُن کا فیصلہ کرے گا۔''اللہ یحکم بینکم یوم القیمۃ فیما کنتم فیہ تختلفون''۔

اس دنیا میں انسانی فکر و نظر اور قلب و دماغ پر جو مختلف قسم کے پردے پڑے ہوئے ہیں، (مثلاً حب ذات، خود پرستی، شخصی اور گروہی مفادات، تعصب، کینہ، گناہوں اور عالم مادہ کے دوسرے رنگا رنگ پردے) وہ انسان کو اس بات کی مہلت نہیں دیتے کہ وہ قوموں، گروہوں اور ملتوں کے درمیان اختلاف ختم کر سکے، لیکن وہاں یہ تمام پردے اُٹھ جائیں گے اور فیصلہ بھی خدا کے ہاتھ میں ہوگا، تو یہ تمام اختلاف ختم ہو جائیں گے، وہاں اس بات کا مشاہدہ کیا جا سکے گا کہ جھوٹے اور خود غرض مدعی ایسے نرم ہو جائیں گے اور اُن کی عقل یوں ٹھکانے

---

[1] بعض مفسرین نے مذکورہ بالا آیت کا تجزیہ و ترکیب یوں کیا ہے''ان''نافیہ ہے اور''لما''الا کے معنی میں ہے جب کہ''جمیع''،''مجموع''کے معنی میں ہے اور''کل''کے لئے''خبر''ہے،''کل''کی تنوین بھی''مضاف الیہ''کے بدلے میں ہے جو کہ محذوف ہے اور حقیقت میں''کلھم''تھا اور''محضرون''یا تو خبر کے بعد خبر ہے یا''جمیع''کے لئے صفت ہے، لہٰذا پورا جملہ یوں ہے:''وما کلھم الا مجمعون یوم القیمۃ محضرون لدینا''اس آیت کی ترکیب نحوی کے سلسلے میں اور بھی کئی اقوال ذکر کئے گئے ہیں، جو قابل قبول نہیں ہیں۔

آجائے گی کہ وہ خود اپنے محاسب بن جائیں گے۔

یہی مفہوم تیسری آیت میں ایک اور پیرائے میں ذکر کیا گیا ہے، پیغمبر اکرمؐ نے گفتگو کا رخ اس انسان کی طرف کیا ہے، جسے خدا نے ''احسن التقویم'' سے پیدا کیا لیکن وہ اپنے برے اعمال کی وجہ سے ''اسفل السافلین'' تک جا پہنچا، اور قیامت و معاد کا مذاق اور تمسخر اڑانے لگا، چنانچہ ارشاد فرمایا: کیا چیز سبب بنی ہے کہ اتنی ساری دلیلوں کے باوجود تو روز جزا کا انکار کرتا ہے (''فما یکذبك بعد بالدین''[1]

کیا خدا سب سے اچھا حاکم نہیں ہے؟ ''الیس اللہ باحکم الحاکمین''

ہاں! وہ بہترین منصف ہے کیونکہ ایک طرف تو اس کا علم سب چیزوں پر حاوی ہے اور کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے اور فیصلہ کرنے کی سب سے بڑی شرط بھی قضیے سے مکمل اور صحیح آگاہی ہے، دوسری طرف وہ کسی چیز اور شخص کا محتاج نہیں کہ جس کی وجہ سے ناحق فیصلہ کرے، یہ تو ضرورت مند انسان ہیں جو کبھی اپنے شخصی اور گروہی مفادات اور کبھی غلط جذبات اور احساسات کے تابع ہو کر ناحق فیصلے کرتے ہیں، لیکن وہ احکم الحاکمین ہے اور بہترین منصف ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بہت سی تفاسیر میں پیغمبر اکرمؐ سے یہ حدیث منقول ہے جو آپؐ نے ان آیات کے خاتمے پر ارشاد فرمائی:

بلی وانا علی ذلك من الشھدین

ہاں! میں گواہی دیتا ہوں کہ روز جزا حق ہے اور خدا احکم الحاکمین ہے۔

یہ حدیث بھی مذکورہ بالا تفسیر کی ہی تائید کرتی ہے۔ (غور کیجئے گا)

محشر کے گواہ

چوتھی آیت میں قیامت کے گواہوں کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، سب سے پہلے تو خدا کی پاک ذات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جو سب سے بڑا گواہ ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

ہماری طرف ہی تمام لوگوں نے لوٹ کر آنا ہے، پھر خدا گواہ ہے اُس پر جو وہ انجام دیتے ہیں۔

---

[1] اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت کے مخاطب وہ انسان ہیں جن کی صفات کی طرف اس سے پہلے والی آیات میں اشارہ کیا گیا ہے، لیکن بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے، کہ مخاطب رسول اسلامؐ ہیں (تفسیر مجمع البیان، فخر رازی، قرطبی اور فی ظلال القرآن، زیر نظر آیت کے ذیل میں) پہلی صورت میں ''یکذبك'' کا معنی ''یجعلك کاذبا'' کیا گیا ہے لیکن اگر مخاطب پیغمبر اسلامؐ ہوں تو پھر ''یکذب'' اپنے اسی ظاہری معنی پر باقی رہے گا یعنی ''ما ینسبك الی الکذب'' بہر صورت مراد یہ ہے کہ اتنی واضح اور روشن دلیلوں کے ہوتے ہوئے قیامت کو جھٹلانے کی کوئی وجہ نہیں اور نہ ہی قیامت کے مدعی کو جھٹلانے کا کوئی سبب ہے۔

"فالينا مرجعهم ثم الله شهيد على ما يفعلون" [1]

ایک ایسی عدالت کہ جس کا حاکم بھی خدا ہے اور پہلے درجے پر گواہ بھی وہی ہے کیا ممکن ہے کہ اس میں کسی بات سے غفلت برتی جائے اور حساب کے وقت کسی چیز کو بھلا دیا جائے؟

لہٰذا ایسی عدالت سے یقینی طور پر اضطراب ہونا چاہیے البتہ اس امر سے نہیں کہ کوئی فیصلہ ناحق کیا جائے گا بلکہ اپنے اعمال کی وجہ سے ڈرنا چاہیے۔

بعض مفسرین نے یہاں پر گواہی اور شہادت کو سزا اور جزا کے معنی میں لیا ہے جب کہ کسی ایسی خلاف کر گذریں گے اس طرح سے کہ کبھی آگ اُن کے کسی حصے کو پکڑ لے گی اور کسی حصے کو چھوڑ دے گی۔ [2]

جہنم کے اوپر سے ہی کیوں گزر کر جنت میں جانا پڑے گا؟ اس سلسلے میں بہت دقیق اور لطیف نکات ہیں، ایک تو یہ کہ اہل جنت دوزخ کا نظارہ کرنے سے جنت کے راحت وسکون کی قدر جان لیں گے، دوسرا وہاں صراط کی حالت اس دنیا میں ہمارے اعمال کی حالت کے مطابق ہی مجسم ہوگی، اس دنیا میں بھی شہوت کے دھکتے ہوئے پُل سے گزر کر ہی تقویٰ کی جنت میں پہنچا جا سکتا ہے، تیسرا مجرموں اور گنہگاروں کے لئے یہ ایک تنبیہہ اور خطرے کا اعلان ہے کہ آخر کار انہیں اس باریک اور خطرناک راستے سے گذرنا ہوگا۔

مفضل بن عمر نے امام جعفر صادقؑ سے حدیث روایت کی ہے، کہتے ہیں میں نے صراط کے بارے میں امامؑ سے پوچھا:

تو آپؑ نے فرمایا: صراط خدا کی معرفت اور شناخت کا راستہ ہے۔

پھر آپ نے فرمایا:

هما صراطان: صراط فی الدنیا۔ صراج فی الاخرة۔ فاما الصراط الذی فی الدنیا فهو الامام المفروض الطاعة۔ من عرفه فی الدنیا واقتدی بهداه مر علی الصراط الذی هوا جسر جهنم فی الاخرة ومن لم یعرفه فی الدنیا زلت قدمه عن الصراط فی الاخرة فتر دی فی نار جهنم۔

صراط دو ہیں! ایک دنیا میں ہے اور ایک آخرت میں، دنیا میں صراط واجب الاطاعت امام ہے، جو بھی اُسے پہچان

---

[1] تفسیر المیز ان میں ذکر ہوا ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں "ثم" بیان میں تاخیر کے لئے ہے نہ کہ زمان میں تاخیر کے لئے جب کہ اس آیت کے سلسلے میں تراخی زمان کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے، کیونکہ خدا پہلے لوگوں کو محشور کرے گا اور پھر اس کے بعد اُن کے اعمال پر گواہی دے گا، کیونکہ مراد حساب کے وقت کی گواہی اور شہادت ہے۔

[2] امالی صدوق، مجلس ۳۳۔

لے اور ہدایت کے لئے اس کی پیروی اور اطاعت کرے وہ آخرت کے پل صراط سے بھی گزر جائے گا، جو جہنم پر ہے، لیکن جو شخص دنیا میں اُسے نہ پہچانے اس کے قدم آخرت کے صراط پر ڈگمگا جائیں گے، اور وہ جہنم میں گر جائے گا۔[۱]

تفسیر امام حسن عسکریؑ میں ان دو صراط (دنیا اور آخرت کے صراط) کی تفسیر یوں کی گئی ہے کہ ایک تو غلو اور تقصیر کے مابین معتدل صراط مستقیم ہے اور دوسری صراط آخرت۔[۲]

ظاہر تفسیر کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس بات سے کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ خدا اس دن بندوں کے اعمال پر گواہی دے اور اپنی یہ گواہی حساب پر متعین فرشتوں پر الہام کے ذریعے دے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ خدا کی گواہی یوں ہوگی کہ وہ انسان کے مختلف اعضاء کو بولنے کی صلاحیت عطا کردے گا، تاکہ انہوں نے جو کچھ کیا ہوا ُسے بیان کریں۔

پانچویں آیت میں بھی قیامت کے گواہوں کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، لیکن یہاں پر پیغمبروں کی اپنی امتوں اور پیغمبر اسلام کی تمام پیغمبروں پر گواہی کا تذکرہ کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: اُن کا کیا حال ہوگا جس دن ہم ہر امت کے اعمال پر گواہ کو بلائیں گے اور تجھے اُن پر گواہ قرار دیں گے ''فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بك علی ھوالآء شھیدا ''۔

البتہ مذکورہ بالا آیت میں یہ بات واضح طور پر بیان نہیں کی گئی کہ ہر امت کا گواہ اُس کا پیغمبر ہوگا لیکن مختلف قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بات یوں ہی ہے کیونکہ ہر امت کا پیغمبر اس بات کی زیادہ لیاقت رکھتا ہے کہ وہ اپنی امت پر بطور گواہ پیش ہو۔

نیز آیت میں یہ بھی بیان نہیں ہوا کہ ''ھولاء'' (یہ لوگ) سے کون سے لوگ مراد ہیں، اسی لئے مفسرین نے یہاں پر دو احتمال ذکر کئے ہیں، بعض نے کہا ہے کہ یہ پیغمبر اسلامؐ کی امت کی طرف اشارہ ہے اور آپؐ قیامت کے دن اپنی امت کے لوگوں پر گواہ ہوں گے، امت کے صالحین کو بھی پہچان کروائیں گے اور جھوٹوں اور بروں کا بھی تعارف کروائیں گے۔[۳]

لیکن بہت سے مفسرین نے کہا کہ ''ھو الائ'' انبیاء کے گروہ کی طرف اشارہ ہے جن کی طرف پہلے جملے میں اشارہ کیا گیا ہے، اس لحاظ سے پیغمبر اسلامؐ گواہوں پر گواہ اور شاہدوں پر شاہد ہیں۔

انبیاء کی اپنی اُمتوں پر گواہی یا رسول اسلامؐ کی انبیاء کے لئے گواہی کس طرح سے ہوگی جب کہ ''شھود'' کا معنی ایسی آگاہی ہے جو اس واقعے کے وقت حاضر ہونے کی صورت میں ہو اور ہر ایک نبی اور اسی طرح نبی اکرمؐ اپنی امت کے ایک خاص دور میں تھے، ممکن ہے یہ اس

---

[۱] معانی الاخبار، ص ۳۲ (حدیث ۱)۔

[۲] بحار، ج ۸، ص ۶۹ (حدیث ۱۸)۔

[۳] یہ احتمال تفسیر کشاف، ج ۱ ص ۵۱۲ اور تفسیر مجمع البیان، ج ۳ ص ۴۹ پر ذکر ہوا ہے۔

لحاظ سے ہو کہ عالم برزخ میں اُن کی روح تمام امتوں کے احوال وافعال کا مشاہدہ کرتی ہے، یہ بات سورہ مائدہ کی آیت ۱۱۷ کے بالکل منافی نہیں ہے کہ جو حضرت مسیحؑ کی زبانی کہتی ہے:

" وكنت عليهم شهيدا مادمت فيهم فلما توفيتني كنت انت الرقيب عليهم "

میں جب تک اُن (عیسائیوں) کے درمیان تھا اُن کے اعمال پر گواہ تھا پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو پھر تو اُن پر نگران تھا۔

کیونکہ یہاں پر شہادت اور گواہی ایسی موجودگی کی صورت میں ہے کہ جو انحراف سے روکے یہاں صرف گواہی اور موجودگی کا مسئلہ نہیں ہے (غور کیجئے گا)۔

پیغمبر اکرمؐ کے سلسلے میں بھی ممکن ہے یہ بات کہی جا سکے کہ اُن کی پاکیزہ روح پوری تاریخ بشریت کے درمیان موجود رہی ہو اور اُن کے اعمال اور کردار کو دیکھ رہی ہو جیسا کہ روایات میں بھی ہے کہ خدا کی سب سے پہلی مخلوق پیغمبر اسلام کا نور ہے۔ [۱]

یہاں پر گواہی کا ایک اور معنی بھی بیان کیا گیا ہے اور وہ ایک چیز کا دوسری چیز سے موازنہ کرنے کی میزان اور معیار ہے کیونکہ ایک مثالی فرد نیک لوگوں کی نیکی (یعنی جو لوگ اس جیسے ہیں) اور برے لوگوں کی برائی (جو لوگ اس سے دور ہیں) پر عملی طور پر ایک بہترین گواہ ہو سکتا ہے، اس صورت میں اس آیت کا مفہوم قیامت کے گواہوں سے مختص نہیں ہو گا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث یوں ہے:

ایک دن آنحضرتؐ نے ابن مسعودؓ سے فرمایا: ''مجھے قرآن سناؤ''۔

انہوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! آپؐ نے تو قرآن ہمیں سکھایا ہے''۔

آپؐ نے فرمایا: ''میری خواہش ہے کہ میں کسی دوسرے سے قرآن سنوں''۔

ابن مسعودؓ نے سورہ نساء پڑھنا شروع کی، جب وہ مذکورہ بالا آیت ''فكيف اذا جئنا من كل امة بشهيد'' پر پہنچے تو رسول اللہؐ نے گریہ فرمایا۔ [۲]

ایک اور جگہ پر اسی حدیث کا باقی حصہ یوں آیا ہے:

آپؐ نے یوں گریہ فرمایا کہ آپؐ کا چہرہ مبارک تر ہو گیا، پھر آپؐ نے فرمایا:

---

[۱] بحار الانوار، ج ۱۵، ص ۴۔

[۲] تفسیر کبیر، ج ۱۰، ص ۱۰۵۔

"یا رب هذا علی من انا بین ظهر انیهم، فکیف من لم ارهم"

خدایا! یہ اُن لوگوں کی نسبت ہے میں جن کے درمیان ہوں، پس اُن لوگوں کی نسبت کیا ہوگا کہ جنہیں میں نے دیکھا نہیں ہے۔"[1]

پیغمبر اسلام کا گریہ ظاہری طور پر قیامت کی وحشت کے متعلق اور اُس عظیم ذمہ داری پر تھا، جو اُن پر ڈالی گئی تھی یعنی حاضرین پر گواہی کا فریضہ اور اس سے بڑھ کر غائبین پر گواہی کی ذمہ داری کہ جس پر آپؐ خدا کی نصرت سے قادر ہوں گے۔

چھٹی آیت میں خدا کی عدالت میں فرشتوں کی گواہی کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ہر انسان میدان محشر میں آئے گا جب کہ اُس کے ساتھ چلانے والا اور گواہ ہوگا 'وجآءت کل نفس معها سائق وشهید'۔

''سائق'' اُسے خدا کی عدالت کی طرف چلائے گا اور ''شهید'' اس کے اعمال پر گواہی دے گا۔

اگرچہ آیت میں اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ وہ چلانے والا اور گواہ فرشتوں میں سے ہوگا یا کوئی اور، اور اگر وہ فرشتہ ہوگا تو خدا کا کون سا فرشتہ ہوگا، لیکن مختلف قرائن وشواہد سے یہ بات واضح ہوتی ہے، کہ وہ یقینی طور پر فرشتہ ہوگا کیونکہ اس عظیم کام کے لئے مناسب ترین فرشتہ ہی ہے نیز یہ بات اور زیادہ مناسب ہے کہ جو دو فرشتے نیکیاں اور برائیاں لکھنے پر مامور ہیں اور وہ آدمی کے اعمال پر باقی تمام فرشتوں کی نسبت زیادہ باخبر ہیں وہ ہی یہ فریضہ انجام دیں، لیکن بعض لوگوں نے ''سائق'' سے مراد موت کا فرشتہ لیا ہے جو اُسے موت کی طرف چلائے گا اور ''شاهد'' سے مراد انسان کا عمل یا اس کے بدن کے اعضاء یا اس کا اعمال نامہ لیا ہے جب کہ بعض دوسرے مفسرین نے ''سائق'' سے مراد شیطان اور ''شاهد'' سے مراد فرشتہ لیا ہے، لیکن مذکورہ بالا تفسیر کے سوا ان تمام تفسیروں میں سے کوئی بھی آیت کے ظاہر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

بہر حال پہلا فرشتہ اُسے بھاگنے نہیں دے گا اور دوسرا فرشتہ اسے انکار نہیں کرنے دے گا یعنی

نہ جای ماندن نہ پای رفتن۔

ان اشخاص کی حالت بالکل ایسے مجرموں کی سی ہے جنہیں اس دنیا میں عدالت کی طرف لایا جاتا ہے، ایک سپاہی انہیں آگے کی طرف دھکیلتا ہے جب کہ دوسرا سپاہی اس کے اعمال کی فائل اٹھائے ساتھ ہوتا ہے، نہج البلاغہ میں آیا ہے کہ امیر المومنین حضرت علیؑ نے اس آیت کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

"سائق یسوقها الی محشرها وشاهد یشهد علیها بعملها"

ایک اُسے میدان محشر کی طرف دھکیلنے والا ہوگا اور ایک اس کے اعمال پر گواہی دینے والا۔

---

[1] تفسیر قرطبی، ج ۳، ص ۱۷۶۷، یہ حدیث دوسروں نے تھوڑے سے فرق کے ساتھ ذکر کی ہے۔

ساتویں آیت میں اس عدالت میں انسانی اعضاء کی گواہی کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:
اس دن ان کی زبانیں، ہاتھ اور پاؤں ان کے خلاف ان اعمال پر گواہی دیں گے جو انہوں نے انجام دے ہیں، ''یوم تشھد علیھم السنتھم وایدیھم وارجلھم بما کانو یعملون''۔
جی ہاں! اُس دن خدا اُن کی واقعی جزا کسی کمی وبیشی کے بغیر دے گا "یومئذ یوفیھم اللہ دینھم الحق"
آٹھویں آیت بھی اسی سے ملتی جلتی ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اب انسانی جلد کی گواہی دینے کی بات ہے، ارشاد ہوتا ہے: جب دشمنان خدا دوزخ کے کنارے پر آئیں گے تو اُن کے کان، آنکھیں اور جلد ان کے اعمال پر گواہی دیں گے، اس وقت وہ اپنے بدن کی جلدوں سے کہیں گے:
ہمارے خلاف کیوں گواہی دے رہے ہو "وقالو الجلودھم لم شھد تم علینا"
تو وہ جواب میں کہے گی: وہی خدا جو ہر موجود کو بولنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے اُسی نے ہمیں نطق عطا کیا ہے ''قالوا انطقنا اللہ الذی انطق کل شئی''
مذکورہ بالا آیات کا ظاہر یہ ہے کہ خدا بدن کے اعضاء یہاں تک کہ جلد کو بھی شعور اور توانائی عطا کردے گا تا کہ وہ بات کریں اور ہر عضو نے جو کام انجام دیا ہے، اُسے بیان کرے گا، کان نے جو کچھ سنا ہے، آنکھ نے جو کچھ دیکھا ہے، جلد سے جو کچھ مس ہوا ہے، زبان نے جو کچھ کہا ہے، ہاتھ نے جو کچھ انجام دیا ہے اور پاؤں نے جو حرکت کی ہے، سب بیان کریں گے (یہ چھ اعضاء اپنے اپنے اعمال کی گواہی دیں گے)۔
بعض مفسرین نے جو یہ بیان کیا ہے کہ ان اعضاء میں سے بعض زمانے کی طرح انسان کے پورے اعمال پر گواہی دیں گے، نہ کہ فقط اپنے اعمال پر، آیات کے ظاہر کے ساتھ کوئی زیادہ مناسبت نہیں رکھتا، یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اگر بعض اعضاء کا ذکر ان آیات میں نہیں آیا (مثلاً دل، دماغ، لب، دانت اور اسی طرح دوسرے اعضاء جن سے نیت، کھانے اور گفتار کا تعلق ہے) تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ فقط یہی چھ اعضاء گواہی دیں گے بلکہ ہر عضو اپنے اعمال کا اعتراف کرے گا، لہٰذا ان سے بڑھ کر کونسا گواہ ہوسکتا ہے۔
واضح ہے کہ یہ گواہی اعضاء کی گواہی ہے، اگر چہ یہ خدا کی طرف سے دی گئی قدرت کے ساتھ ہوگی لیکن یہ خود خدا کی طرف سے گواہی نہیں ہوگی جب کہ تفسیر رازی میں یہ بات بعض مفسرین کی طرف سے ذکر کی گئی ہے۔[1]
یہ بات قابل غور ہے کہ ان آیات کے مطابق اس دن گنہگار فقط اپنے جسم کی جلد سے سوال کریں گے کہ تم ہمارے خلاف گواہی کیوں دے رہی ہو یا تم ہمارے خلاف کیونکر گواہی دے رہی ہو، (پہلی صورت میں علت کے متعلق سوال ہے جب کہ دوسری صورت میں کیفیت کے متعلق سوال ہے) لیکن باقی پانچ اعضاء سے ایسا سوال نہیں کیا جائے گا، ایسا شاید اس لئے ہو کہ جلد کی گواہی باقی تمام گواہیوں کی نسبت عجیب اور

---

[1] تفسیر فخر رازی، ج ۲۳، ص ۱۹۴۔

غیر متوقع ہے، علاوہ ازیں بدن کی جلد سے اُن کاموں کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ جو کسی طریقے سے اُس کے ساتھ مس ہوئے ہیں اور کسی مخصوص عضو کے ساتھ مختص نہیں ہیں، ایسا نہیں کہ یہ فقط ''شرم گاہ'' کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے:

اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زبان کے علاوہ باقی اعضاء گواہی دیں گے اور یہ باتیں بالکل روشن اور واضح ہوگئیں تو پھر زبان بھی حقیقت کا اعتراف کرے گی، جیسا کہ سورہ یٰسین آیت ۶۵ میں ہے:

الیوم نختم علی افواههم وتکلمنا ایدیهم وتشهد ارجلهم بما کانو یکسبون۔

آج اُن کے مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی اور ان کے ہاتھ ہمارے ساتھ گفتگو کریں گے اور اُن کے پاؤں اُن اعمال پر گواہی دیں گے جو انہوں نے انجام دے ہیں۔

نویں آیت میں انسانی اعمال پر زمین کی شہادت اور گواہی کو بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: اُس (قیامت کے) دن زمین اپنی تمام خبریں بیان کرے گی ''یومئذ تحدث اخبارها''، کیونکہ تیرے پروردگار نے اس کی طرف وحی کی ہے ''بان ربك اوحی لها''

اس طرح ایک نہایت اہم گواہ زمین ہوگی جو اس دن اُن اعمال پر گواہی دے گی جو اس پر انجام پائے ہیں، پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں ہے:

آپؐ نے پوچھا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ''اخبار'' سے کیا مراد ہے؟

صحابہ نے عرض کی: ''خدا اور اُس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں''۔

تو آپؐ نے فرمایا:

اخبار هآ ان تشهد علی کل عبد و امة بما عملوا علی ظهرها تقول عمل کذا و کذا، یوم کذا، فهذآ اخبارها۔

''زمین کے خبر دینے سے مراد یہ ہے کہ بندگان خدا چاہے وہ مرد ہوں یا عورت، اُن کے وہ اعمال جو زمین پر انجام پائے ہیں وہ ان کے متعلق بتائے گی اور کہے گی: فلاں شخص نے فلاں دن فلاں کام کیا تھا، یہ ہے زمین کا خبر دینا''۔ [1]

ابو سعیدؓ خدری سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں:

---

[1] تفسیر مجمع البیان، ج ۱۰، ص ۵۲۶، زیر نظر آیت کے ذیل میں یہی مفہوم قرطبی، تفسیر روح المعانی اور تفسیر فخر رازی میں بھی مذکور ہے۔

جب تم بیابان میں ہوتو اپنی آواز اذان کے وقت بلند کرو کیونکہ میں نے رسول خداؐ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

لا یسمعه انس ولا جن ولا حجر (ولا شجر) الا یشهدله

''جو انسان، جن، پتھر اور درخت بھی اُسے سنے گا وہ (قیامت کے دن) اس کی گواہی دے گا۔[1]

لیکن بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں کئی اور احتمالات بھی ذکر کئے ہیں، مثلاً یہ کہ زمین قیامت کے متعلق خبر دے گی، اُس وقت انسان قیامت کا زلزلہ دیکھ کر کہے گا: زمین کو کیا ہوگیا ہے (کہ یوں لرز اٹھی ہے)''وقال الانسان مالها''۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ زمین اُن انسانوں کے متعلق خبر دے گی جنہیں وہ باہر نکالے گی اور کہے گی یہ فلاں کا جسم ہے اور یہ فلاں آدمی ہے۔[2]

لیکن پہلی تفسیر سورت کی تمام آیات کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ اس سلسلے میں منقول متعدد احادیث کے ساتھ بھی ہمنوا ہے۔

بہت سی احادیث میں حضرت علیؑ کا یہ قول مذکور ہے:

''زمین قیامت کے دن نماز اور یہاں تک کہ بیت المال کی تقسیم پر بھی گواہی دے گی''

ایک اور حدیث میں ہے:

صلوا المساجد فی بقاع مختلفة فان کل بقعة تشهد للمصلی علیها یوم القیمة

مساجد میں مختلف جگھوں پر نماز پڑھو کیونکہ زمین کا ہر حصہ قیامت کے دن اس پر نماز پڑھنے والے کے لئے گواہی دے گا۔[3]

زمین کیسے خبر دے گی؟ بعض نے تو اس سلسلے میں آیت کے ظاہر کو ہی قبول کیا ہے کہ خدا کے حکم سے اُس دن اُسے شعور اور فہم کی قوت حاصل ہوگی اور وہ بولنے لگے گی۔۔۔۔اور اُس پر جو کام ہوئے ہیں، اُن کو بیان کرے گی، یہ بات کچھ عجیب بھی نہیں ہے کیونکہ قیامت کا دن حقیقی زندگی اور حیات کا دن ہے:

---

[1] مجمع البیان، ج۱۰، ص۵۲۶۔ کالموں میں دی گئی عبارت اس روایت کے مطابق ہے جو روح البیان ص ۴۹۳، ج۱۰ میں مذکور ہے۔
[2] تفسیر قرطبی۔ زیر نظر آیت کے ذیل میں۔
[3] لئالی الاخبار، ج۵، ص۹۷ (نیا ایڈیشن)۔

وان الدار الاخرة لهی الحیوان(عنکبوت:٦٤)

لہٰذا ممکن ہے کہ زمین بھی ایک قسم کی زندگی اور شعور کی حامل ہو۔

بعض نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ خدا آواز کی لہروں کو اس میں پیدا کردے گا، لہٰذا درحقیقت بات کرنے والا خدا ہے (اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی باشعور شخص اپنی آواز ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے ریکارڈ کرلیتا ہے)۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ زمین کے بات کرنے اور بولنے سے مراد اُن اعمال کے اثرات کا ظاہر ہونا ہے جو اس پر انجام پائے ہیں کیونکہ انسان جو عمل بھی انجام دیتا ہے اُس کے آثار اس دنیا اور زمین پر نقش ہوجاتے ہیں۔

لیکن سب سے بہتر وہی پہلی تفسیر ہے۔

گذشتہ آیات سے مجموعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قیامت کے دن خدا کی گواہی کے علاوہ فرشتے، انسانی بدن کے اعضاء اور زمین بھی انسان کے اعمال پر گواہی دیں گے۔

اعمال کا ترازو

دسویں آیت ''میزان'' اور اعمال کے ترازو کے متعلق گفتگو کرتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ہم قیامت کے دن انصاف کا ترازو رکھیں گے، کسی پر بھی کچھ ظلم نہیں ہوگا ''ونضع الموازین القسط لیوم القیمة فلا تظلم نفس شیئا''۔

اس ترازو سے تمام چیزوں کو تولا جائے گا، چاہے وہ چھوٹی ہوں یا بڑی ''یہاں تک کہ اگر کچھ رائی کے دانے کے برابر بھی ہو تو اس کا حساب کیا جائے گا اور کافی ہے کہ ہم حساب کرنے والے ہوں''۔ ''وان کان مثقال حبة من خردل اتینا بها و کفی بنا حسبین''

رائی کا دانہ بہت چھوٹا اور کم وزن ہوتا ہے، چھوٹے اور حقیر ہونے میں اس کی مثال دی جاتی ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی اُس دن اس ترازو کے پلڑے میں رکھا جائے گا ''موازین'' جمع ہے میزان کی جو وزن تولنے کے آلہ کے معنی میں ہے، یہ تعبیر بتاتی ہے کہ اس دن صرف ایک ترازو نہیں ہوگا بلکہ اعمال تولنے کے لئے متعدد ترازو رکھے جائیں گے۔

بعض نے کہا ہے کہ ممکن ہے ہر انسان کے لئے ایک الگ ترازو ہو یا ہر امت کے لئے ایک الگ ترازو یا ہر عمل کے لئے الگ ترازو مثلاً نمازوں کو ایک ترازو میں تولا جائے گا اور روزہ، حج اور جہاد کو بھی الگ الگ ترازو میں رکھا جائے گا۔

بعض نے کہا ہے کہ حقیقت میں ترازو ایک ہی ہوگا اور اس پر کئی احادیث بھی ہیں جو آئندہ آئیں گی، یہاں پر جمع کا صیغہ اس ترازو کی عظمت کو بیان کرنے کے لئے لایا گیا ہے، وہ ایک ترازو ہی اتنا بڑا ہوگا، جو ہزاروں جتنا کام کرے گا۔[1]

---

[1] روح المعانی، ج۱۷، ص۵۰، ۵۱۔

لیکن جیسا کہ ہم بیان کریں گے اس تفسیر پر جو کہ خلاف ظاہر ہے کسی قسم کی دلیل موجود نہیں ہے جب کہ کئی ترازو ہونے پر ہمارے پاس دلیل موجود ہے۔

اہم یہ ہے کہ یہاں پر یہ بات واضح ہوجائے کہ ''میزان'' سے کیا مراد ہے، کیا یہ مروجہ ترازو کے مانند ہوگا جس کے دو پلڑے ہوتے ہیں اگر چہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو؟ اس صورت میں اس میں اعمال تولنے کا معنی یہ ہوگا کہ اس میں اعمال ناموں کو رکھ کر تولا جائیگا کیوں کہ عمل خود تو کوئی وزن نہیں رکھتا یا اس طرح ہوگا کہ عمل مجسم ہوکر ایک صورت اختیار کرلے گا اور وزنی ہوجائے گا۔

بہر حال جو لوگ کہتے ہیں کہ وہ ترازو ہمارے معمول کے ترازو کی طرح ہوگا وہ مجبور ہیں کہ انسان کے اعمال کے لئے ایک قسم کا وزن تصور کریں تا کہ انہیں اس ترازو میں تولا جاسکے۔

لیکن مختلف شواہد سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ''میزان'' سے مراد تولنے کا آلہ ہے اور وہ بھی عمومی مفہوم میں کیونکہ ہر چیز کے لئے اُس کی مناسبت سے ایک ترازو ہوتا ہے، درجہ حرارت ناپنے کے لئے ''میزان الحرارہ'' ہوتا ہے جسے تھرمامیٹر کہتے ہیں، ہوا کو ''میزان الهوا'' کے ذریعے ناپتے ہیں جسے بیرومیٹر (BAROMETER) کہتے ہیں۔

لہٰذا اعمال تولنے کے ترازو سے مراد یہاں وہ افراد ہیں جن کے اعمال کے ساتھ نیک اور برے لوگوں کے اعمال کا موازنہ کیا جائے گا، چنانچہ علامہ مجلسی مرحوم نے شیخ مفید سے یہ روایت ذکر کی ہے:

ان امیر المومنین والائمة من ذریته هم الموازین۔

امیر المومنینؑ اور اُن کے امام بیٹے قیامت کے دن عدل کے ترازو ہیں۔[1]

اصول کافی اور معانی الاخبار میں بھی حضرت امام جعفر صادقؑ سے یہ حدیث منقول ہے کہ ایک شخص نے مذکورہ بالا آیت کے معنی کے متعلق سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا:

هم الانبیآء ولاوصیاء۔

عدل کے ترازو، انبیاء اور اُن کے جانشین ہیں۔[2]

حضرت علیؑ کی ایک زیارت مطلقہ میں یہ جملہ ہے:

السلام علی میزان الاعمال

---

[1] بحار الانوار، ج ۷، ص ۲۵۲۔

[2] تفسیر برہان، ج ۳، ص ۶۱، اصول کافی، ج ۱، ص ۴۱۹، اسی حدیث سے ملتی جلتی دیگر احادیث بھی تفسیر کی دوسری کتب میں آئی ہیں۔

اعمال کے ترازو پر سلام![1]

حقیقت میں عظیم اور مثالی شخصیتیں ہی اعمال کو ناپنے کا پیمانہ ہیں، جس کے اعمال ان سے جتنی حد تک ملتے ہوں گے اتنے ہی وزنی ہوں گے اور جوان سے نہیں ملتے ہوں گے یا تو وہ ہلکے ہوں گے یا بالکل بے وزن ہوں گے، اس جہان میں اولیائے خدا اعمال کی پیمائش کا ترازو ہیں، لیکن اُس عالم میں یہ بات ثبوت اور ظہور کے مقام تک پہنچ جائے گی، یہیں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ''موازین'' جمع اس لئے ہے کیونکہ یہ بزرگ ہستیاں متعدد ہیں۔

البتہ ''میزان عمل'' کے سلسلے میں چند اور روایات اور مفاہیم بھی ہیں جن کا ذکر توضیحات کے ذیل میں آئے گا۔

گیارہویں آیت میں بھی میزان عمل سے مربوط بحث کی تشریح اور تکمیل کے لئے ہے، ارشاد ہوتا ہے: اُس دن (اعمال کا) وزن کرنا حق ہے، جن کے عمل کے ترازو بھاری ہوں گے وہ کامیاب ہوں گے اور جن کے (عمل کے) ترازو ہلکے ہوں گے یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہماری آیات پر ظلم کرنے کی وجہ سے اپنا سرمایہ ضائع کر دیا'' **والوزن یومئذن الحق فمن ثقلت موازینه فآولٓیك هم المفلحون، ومن خفت موازینه فاولیك الذین خسروا انفسهم بما کانو بآیتنا یظلمون**''

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہاں پر ہر انسان کے لئے کئی ترازو ذکر کئے گئے ہیں، یہ تعبیر اُسی تفسیر کی تائید کرتی ہے جس کے مطابق ہر عمل کے لئے الگ ترازو ہوگا۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ انسان کی روح، گفتار، کردار، بدن اور نیت ہر ایک کے لئے اُس دن الگ الگ ترازو ہوگا۔

یہ سب کچھ اس صورت میں ہے جب ہم ''موازین'' کو ''میزان'' کی جمع قرار دیں جب کہ بعض لوگوں نے موازین کو ''موزون'' کی جمع قرار دیا ہے، (یعنی جس چیز کا وزن کیا جائے گا اور وہ انسان کے اعمال ہی ہیں)، اس صورت میں ہر انسان کئی ''موازین'' کا حامل ہے، یعنی اس کے مختلف اعمال ہیں جن کا اس دن وزن کیا جائے گا، لیکن یہ معنی بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ مفسرین اور اہل لغت کی اکثریت نے ''موازین'' کو ''میزان'' کی جمع قرار دیا ہے، گذشتہ روایات میں بھی موازین ''تولنے کے آلہ'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

لہٰذا ترازو کا وزنی ہونا اُن اعمال کے بھاری ہونے کی وجہ سے ہے جو اس میں رکھے جائیں گے، قیامت کے میزان عدل سے متعلق کئی اور موضوعات بھی ہیں جو توضیحات کے ذیل میں آئیں گے۔

اعمال کا حساب جلدی ہوگا

زیر نظر آیات میں سے بارہویں، تیرہویں اور چودھویں آیت حساب کے دن اور خدا کی طرف سے جلدی حساب لینے کے متعلق ہیں، پہلی آیت میں بہشت کی مختلف نعمات اور جاوداں باغات کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: یہ وہ چیز ہے جس کا تم سے حساب

---

[1] شیخ عباس قمی مرحوم نے یہ روایت مفاتیح الجنان میں پہلی زیارت مطلقه کے عنوان سے ذکر کی ہے۔

کے دن کے لئے وعدہ کیا گیا ہے ''ھذا ما توعدون لیوم الحساب''۔

یعنی اس دن حساب اور اعمال کے محاسبے کا مسئلہ اتنا واضح اور روشن ہے کہ اس دن کا نام ہی روز حساب رکھ دیا گیا ہے۔ ا ے، بعد والی آیت میں حساب کی جلدی کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: خدا سریع الحساب ہے ''ان اللہ سریع الحساب''[۱]

یہ بات کہ خدا بندوں کا جلدی حساب لے گا کلام خدا کی متعدد آیات میں بیان ہوئی ہے۔[۲]، بار بار اس بات کا ذکر موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ہے کیونکہ ایک طرف تو یہ نیک لوگوں کے لئے خوشخبری ہے کہ اُس دن انہیں جلدی ہی جزا مل جائے گی، اور دوسری طرف گنہگاروں کے لئے ایک تہدید ہے کہ اُن کی سزا میں کسی قسم کی تاخیر نہیں ہوگی، اُن کا حساب جلدی ہی نمٹا دیا جائے گا اور اُن کا حق ان کے سپرد کر دیا جائے گا۔

اُس دن خدا کے حساب کی سرعت کے متعلق روایات میں بہت لرزا دینے والی تعبیرات آئی ہیں، حضرت علیؑ سے ایک حدیث یوں منقول ہے:

انہ سبحانہ یحاسب جمیع عبادہ علی مقدار حلب شاۃ

خدا اس دن تمام بندوں کے حساب کو بھیڑ کے دودھ کے دوہنے جتنی دیر میں (یعنی بہت تھوڑے وقت میں) مکمل کر دے گا۔[۳]

یہ تشبیہ حقیقت میں حساب کے عرصے کے بہت مختصر ہونے کے لئے لائی گئی ہے، اسی لئے ایک اور حدیث ہے:

ان اللہ یحاسب الخلآئق کلھم فی مقدار لمح البصر

خدا بندوں کا حساب پلک جھپکنے جتنے عرصے میں نبٹا دے گا۔[۴]

اس جلدی کی دلیل بالکل واضح ہے کیونکہ حساب و کتاب مکمل علم اور آگاہی، قدرت کاملہ اور ہر لحاظ سے عدالت کو ملحوظ رکھنے سے وابستہ ہوتا ہے، چونکہ خدا میں یہ صفات کمال درجے کی پائی جاتی ہیں، اس لئے وہ پلک جھپکنے میں ہی لوگوں کا حساب نبٹا سکتا ہے۔

اصولی طور پر انسانوں کے اعمال اور اُن کے وہ اثرات جو روح و جسم پر مرتب ہوتے ہیں ایسے ہیں کہ خود بخود اُن کا حساب محفوظ رہتا ہے، اس لحاظ سے انہیں کاروں، جہازوں اور بحری جہازوں کے مسافت پیما سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، جو پورے فاصلے کا حساب محفوظ رکھتا ہے، انہوں نے پوری عمر میں جتنا فاصلہ بھی طے کیا ہوتا ہے مسافت پیما اُس کا حساب رکھتا ہے، صرف ایک نظر سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے

---

[۱] ''لیوم الحساب'' میں ''لام'' اختصاص کے لئے ہے، بعض نے یہ جو کہا ہے کہ یہ لام علت ہے کچھ درست معلوم نہیں ہوتا۔

[۲] مذکورہ بالا آیات کے علاوہ مائدہ، ۴، ابراہیم، ۵۱ اور مومن ۱۷ میں بھی یہی تعبیر آئی ہے۔

[۳] مجمع البیان، ج ۳، ص ۳۱۳۔

[۴] مجمع البیان، ج ۱، ۲، ص ۲۹۸۔

اب تک کتنا سفر طے کیا ہے،لیکن انسانوں کا حساب دیکھنے کے لئے اُس چشم بینا کی ضرورت ہے جو اُن کا حساب دیکھ سکے، یہ سب تعبیرات بہت سے اہم ترین پیغامات کی حامل ہیں کہ جو تھوڑے سے غور وفکر کے ساتھ روشن ہوجاتے ہیں۔

پندرہویں آیت میں بندوں کا حساب لینے والی ذات یعنی خدا کا تذکرہ کیا گیا ہے، چنانچہ واضح طور پر ارشاد ہوتا ہے: بے شک اُن سب نے ہماری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے اور پھر یقیناً اُن سب کا حساب ہم پر ہے ''ان الینا ایابھم ثم ان علینا حسابھم''

البتہ مذکورہ بلا دونوں تعبیروں کے درمیان باہم کوئی تضاد نہیں ہے، اصلی حساب لینے والا خدا ہے لیکن انسان سے بھی کہا جائے گا کہ تم اپنا حساب خود بھی کر سکتے ہو، ان حسابوں کا نتیجہ ایک ہی ہے، کیونکہ حساب کا ماخذ بھی روشن اور واضح ہوگا اور خدا کے قوانین اور جزا بھی معین ہے لہٰذا کسی استنباطی نظریے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ جس سے فیصلہ کرنے کے سلسلے میں کوئی اختلاف پیدا ہو۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ''ان الینا ایابھم'' اور ''ثم ان علینا حسابھم'' میں ''الینا'' اور ''علینا'' کہ جو خبر ہیں اور مقدم ہیں، لہٰذا حصر کا فائدہ دے رہے ہیں، یعنی اُن کی برگشت صرف خدا کی نفی کی گئی ہے۔

بہر حال یہ کفار اور مجموں کے لئے خطرے کی گھنٹی ہے جو حق کی آیات سے روگردانی کرتے تھے۔ گذشتہ آیات میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ اولیائے خدا کے لئے ایک خوشخبری بھی ہے کہ اُن کا حساب خدا کے ہاتھ ہے اور اُن کی برگشت بھی اپنے محبوب حقیقی کی طرف ہے، اس لئے اگر نیک اعمال کے ساتھ کوئی خطا اور لغزش بھی ہوئی تو وہ اس کے لطف وکرم سے بخش دی جائے گی۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعض احادیث اور زیارتوں میں ہے کہ مخلوق کی بازگشت اور اُن کا حساب حضرت علیؑ یا باقی آئمہ معصومینؑ کے ہاتھ میں ہے یہی بات بعض اہل سنت مفسرین کے اعتراض کا باعث بنی ہے جیسا کہ آلوسی نے روح البیان میں کہا ہے کہ یہ بات مذکورہ بالا آیات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

لیکن یہ بات سب کو معلوم ہے کہ حضرت علیؑ اور باقی آئمہ خدا کے فرمان کو ہی انجام دینے والے ہیں، لہٰذا اُن کا حساب لینا بھی خدا ہی کا حساب لینا ہے، بالکل ایسے جیسے فرشتے جو اعمال تکوین یا عالم تشریع میں انجام دیتے ہیں، یہ تمام خدا کے کام ہی سمجھے جاتے ہیں کیونکہ اس کے حکم اور فرمان پر انجام پاتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ان کاموں کی نسبت فرشتوں کی طرف بھی دی گئی ہے۔

حقیقت میں ان بھائیوں نے جو غلطی سب جگہوں پر کی ہے یہاں پر بھی اسی کو دہرایا ہے اور وہ ''ما بالعرض'' اور ''ما بالذات'' کا اشتباہ ہے، واضح لفظوں میں یہ کہ کوئی شخص بھی یہ نہیں کہتا ہے کہ لوگوں کی برگشت، اُن کا حساب حضرت علیؑ اور آئمہ معصومینؑ کی طرف بطور استقلال ہے بلکہ سب یہ کہتے ہیں کہ یہ کام ذاتاً خدا کے لئے ہے، آئمہ کے لئے بالواسطہ ہے (جیسا کہ ہم نے شفاعت، علم غیب اور اسی طرح کے دوسرے مسائل کے متعلق کہا ہے کہ یہ تمام امور بالذات تو خدا کے لئے ہیں اور بالعرض انبیاء اولیاء اور فرشتوں کے لئے ہیں)۔

عجیب بات یہ ہے کہ جناب آلوسی اپنے کلام کے خاتمے پر اس نکتے کی طرف متوجہ ہوئے ہیں لیکن پھر انہوں نے بحث کے سیاق کو

تبدیل کر دیا ہے اور کہا ہے کہ اگر مراد یہی ہے تو پھر انبیاء اولیاء اور ملائکہ مقربین کے درمیان علیؑ کیا خصوصیت رکھتے ہیں۔[1]

اس سوال کا جواب بھی بالکل واضح ہے، علیؑ اُن میں ایک ممتاز اور عظیم شخصیت ہیں چونکہ وہ امت اسلامی میں اس لحاظ سے غیر معروف رہے، خدا یہ چاہتا ہے کہ وہ اس طریقے سے ان کا بلند مرتبہ اور مقام پورے عالم کو دکھائے، اس بات کی دلیل یہ ہے کہ اہلسنت کی بہت سی کتب میں ایسی احادیث منقول ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے حضرت علیؑ کے متعلق فرمایا:

تم جنت اور دوزخ تقسیم کرنے والے ہو۔

علاوہ ازیں یہ احادیث بھی ہیں:

۱۔ ''ابن مغازلی'' نے کتاب ''مناقب امیر المومنینؑ'' میں پیغمبر اسلامؐ کی یہ حدیث ذکر کی ہے کہ آپ نے حضرت علیؑ کو مخاطب کر کے فرمایا:

انك قسيم الجنة والنار۔

تو جنت اور دوزخ کو تقسیم کرنے والا ہے۔[2]

۲۔ مناقب خوارزمی میں بھی یہی بات رسول اکرمؐ سے منقول ہے۔[3]

۳۔ ''ابن حجر'' نے ''الصواعق المحرقہ'' میں دارقطنی سے روایت کی ہے کہ حضرت علیؑ نے حضرت عمر کی تشکیل کردہ چھ اشخاص پر مشتمل شوریٰ میں ایک طویل گفتگو کے ذیل میں فرمایا:

کیا تمہارے درمیان میرے سوا کوئی اور ایسا شخص ہے جس کے متعلق رسول اکرمؐ نے یہ فرمایا ہو:

يا على انت قسيم النار والجنة

سب نے کہا: نہیں۔[4]

۴۔ حافظ سلیمان قندوزی حنفی نے اپنی کتاب ''ینابیع المودۃ'' کا ایک باب اسی عنوان ''فی بیان علیؑ قسیم الجنۃ والنار'' کے تحت بیان کیا ہے اور اس ضمن میں متعدد احادیث ذکر کی ہیں۔[5]

۵۔ یہاں تک کہ ''ابن اثیر'' نے بھی اپنی کتاب ''نہایہ'' میں مادہ ''قسم'' کے ذیل میں اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔

---

[1] تفسیر روح المعانی، ج ۳۰، ص ۱۱۸ و ۱۱۹۔

[2] احقاق الحق، ج ۴، ص ۲۵۰۔

[3] مناقب، صفحہ ۲۳۴۔

[4] الصواعق المحرقہ، ص ۱۲۴ (قاہرہ ایڈیشن)۔

[5] ینابیع المودۃ، ص ۸۶۔

۶۔ امام شافعی کی طرف منسوب ان اشعار میں بھی یہی بات کہی گئی ہے:

علی حبه جنة
قسیم النار والجنة
وصی المصطفی حقا
اما الانس والجنة [1]

ایسی اور بھی کئی احادیث ہیں، نجانے اس کے باوجود آلوسی نے روح المعانی میں حضرت علیؑ کے متعلق اس بات کو جھوٹ اور تہمت کیوں سمجھا ہے، اس بات کی اجازت نہیں ہونا چاہیے کہ تعصّبات علمی تحقیقات کے راستے میں حائل ہوں۔

توضیحات:

اس عظیم عدالت کی ایک جھلک

اگر چہ قیامت سے متعلق حقائق کا تفصیلی طور پر سمجھنا اور جاننا ہم ایسے قیدیوں کے لئے کہ جو اس دنیا کے اسیر ہیں، امکان پذیر نہیں کیونکہ وہ اس عالم سے بالاتر ایک عالم ہے، اُس جہان میں موجود مفاہیم کا سمجھنا ہمارے لئے بہت مشکل ہے، جیسے پرائمری کلاس کے بچے کے لئے یونیورسٹی کے علوم کی وسعت کا اندازہ مشکل ہے، لیکن اس کے باجود مذکورہ بالا آیات واحادیث کے ذریعے اُس عدالت کے متعلق ایک اجمالی ساخا کہ ہمارے ذہن میں ابھر آتا ہے۔

وہ ایسی دنیا ہے جس میں تمام پوشیدہ باتیں آشکار ہو جائیں گی، بے جان چیزوں میں زندگی پڑ جائے گی، ہر جگہ اور ہر چیز میں زندگی کی لہر دوڑ جائے گی۔

ہاتھ، پاؤں، کان اور آنکھ سے لے کر بدن کی جلد تک سب اعضا بولنے لگیں گے وہ ان اعمال کا اعتراف کریں گے جو انہوں نے انجام دیئے ہوں گے۔

دوسری طرف انسان کے تمام اعمال اُس کی آنکھوں کے سامنے مجسم ہو جائیں گے، سب کے سب ظاہر ہو جائیں گے، اعمال نامے نا قابل انکار تحریر کی صورت میں سامنے آئیں گے اور فرشتے، انبیاء اور اولیاء بطور گواہ پیش ہوں گے، ان سب سے بڑھ کر انسان کے اعمال پر خدا کی گواہی ہوگی، یہ بہت لرزا دینے اور خوف زدہ کر دینے والا منظر ہوگا، اس وقت ایک رائی کے برابر عمل کا بھی حساب ہوگا، اعمال ناموں میں نیتوں کا فتور یا پاکیزگی بھی بالکل نمایاں صورت میں ظاہر ہوگی۔

ایک لحظے میں سب کا حساب ہو جائے گا، اُس عدالت میں حق وانصاف کی حکمرانی ہوگی، ہر چھوٹا بڑا حتی کہ انبیاء بھی اُس عدالت

---

[1] ینابیع المودۃ، ص ۸۶۔ (طبع دار الکتب العراقیہ)

میں حاضر ہوں گے۔

تمام جھگڑے ختم ہو جائیں گے، ہر قسم کی بحث وجدال رک جائے گی، پوری دنیا کے مظلوموں کا حق ظالموں سے واپس لیا جائے گا، اور دوسری اور بہت سے باتیں جن کا عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا، اُس عدالت میں ظاہر ہوں گی۔

ان حقائق پر ایمان اور عقیدہ انسانی روح میں تربیتی لحاظ سے ایک انقلاب بر پا کر سکتا ہے، خواہش نفس کو روک کے شہوت پرستی کو لگام ڈال سکتا ہے، بے ایمانی کا خاتمہ کر کے تقویٰ کی شمع روشن کر سکتا ہے اور اس خاکی انسان کو ایک پاک و پاکیزہ فرشتہ بنا سکتا ہے۔

قرآن مجید میں ان حقائق کی تشریح سے بھی کلام الٰہی کا مقصد یہی ہے۔

قیامت کے گواہ

جیسا کہ مذکورہ بالا آیات میں بیان ہوا ہے اس عدالت کے گواہ مختلف ہوں گے:

۱۔ پہلے درجے پر تو خدا کی ذات پاک ہے۔

۲۔ پھر انبیاء اور رسل۔

۳۔ پھر مقرب فرشتے۔

۴۔ اُس کے بعد انسانی اعضاء وجوارح۔

۵۔ پھر وہ زمین کہ انسان جس پر زندگی بسر کرتا رہا ہے۔

مزید برآں احادیث میں ان پانچ گواہوں کے علاوہ بھی دوسرے گواہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مثلاً

۶۔ اوصیاء اور آئمہ کی گواہی۔

چنانچہ اس سلسلے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث سورہ نساء کی اس آیت کے ذیل میں ہے:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾

[1] النساء: ٤١

آپ نے فرمایا:

نزلت فی امة محمد خاصة، فی کل قرن منهم امام منا شاهد علیهم، و محمد شاهد علینا۔

یہ آیت حضرت محمدؐ کی امت کے سلسلے میں خصوصی طور پر نازل ہوئی ہے، اس امت کی ہر صدی میں ہم میں سے امام

ہوگا جو اس پر گواہ ہوگا اور حضرت محمد صہم پر گواہ ہیں۔[۱]

آنحضرتؐ کی امت کا خصوصی طور پر ذکر ممکن ہے تاکید کے لئے ہو، یعنی اس امت میں بالخصوص ہر صدی میں امام معصوم گواہ ہوگا، لہٰذا اس بات کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے کہ پیغمبر اسلامؐ گذشتہ انبیاء پر بھی گواہ ہوں۔

محشر کا ساتواں گواہ بعض روایات کے مطابق زمانہ ہے، جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام سے مروی اس حدیث میں ہے۔

ما من یوم یمر علی ابن ادم الا قال له ذلك الیوم یا بن ادم انا یوم جدید، و انا علیك شهید فقل فی خیر، واعمل فی خیر اشهد لك به فی القیامة، فانك لن ترانی بعده ابدا۔

فرزند آدم پر جو دن بھی گذرتا ہے وہ اسے کہتا ہے: اے فرزند آدم! میں ایک نیا دن ہوں اور تجھ پر گواہ ہوں، مجھ میں اچھی بات کہہ اور نیک کام انجام دے تاکہ قیامت کے دن تیرے بارے میں گواہی دوں کیونکہ اس کے بعد تو مجھے دیکھ نہیں سکے گا۔[۲]

ذرا سوچئے تو! یہ تمام گواہ کس لئے ہیں؟ زمین، زمان، فرشتے، پیغمبر، انسانی بدن کے اعضاء اور سب سے بڑھ کر خدا، کیا صرف خدا کی گواہی کافی نہیں ہے؟

بالکل کافی ہے کیونکہ وہ ''احسن الناظرین'' اور ''احسن الحاکمین'' ہے اور 'عالم السر والخفیات' ہے لیکن چونکہ مقصد انسان کی تربیت ہے اس لئے گواہوں اور نگرانوں کی تعداد جتنی زیادہ ہو اس کا تربیتی اثر اتنا ہی زیادہ ہوگا، اسی لئے گواہوں کی تعداد اتنی رکھی گئی ہے، ایسے گواہ جنہوں نے چاروں طرف سے انسان کو گھیرے میں لے رکھا ہے اور اُس کے اعمال سے پوری طرح آگاہ ہیں۔

جو شخص ان میں سے کسی ایک گواہ کا بھی خیال کر لے تو وہ اپنے اعمال کا خیال رکھے گا، اگر ان سب گواہوں پر ایمان لے آئے تو اس کی کیا منزلت ہوگی۔

یہ گواہ کسی قرارداد یا دفتری نظام کے تحت نہیں ہیں کہ یہ سوال کیا جائے کہ ایک عمل کے لئے اتنے گواہ کیوں مقرر کئے گئے ہیں، بلکہ یہ حقیقی اور واقعی امور کے سلسلے کی کڑی ہیں کیونکہ ہم جو کام بھی کرتے ہیں وہ ہمارے وجود پر اثر انداز ہوتا ہے اور ہمارے بدن کی جلد اُس کیسٹ کی مانند ہے جو ہمارے عمر بھر کے اعمال کو ریکارڈ کرتی ہے، یہ زمین ہمارے اردگرد کا ماحول اور جس زمانے میں ہم زندگی گزار رہے ہیں وہ بھی اسی طرح ہے، وہ ہمارے تمام آثار کو ثبت کر رہا ہے۔

---

[۱] اصول کافی، ج ۱ ص ۱۹۰۔

[۲] بحار الانوار، ج ۶۸، ص ۱۸۱ حدیث ۳۶ (طبع بیروت)۔

فرشتوں کا آنا یا انبیاء اور اوصیاء کی مقدس روحوں کی گواہی بھی ایک حقیقت ہے جو ان کی روحانی عظمت اور بلندی سے پھوٹتی ہے اس طرح ہر جگہ اور ہر زمان ومکان میں خدا کا حاضر وناظر ہونا بھی ایک نا قابل انکار حقیقت ہے۔

آج کے ماہرین آثار قدیمہ زمین کے مختلف حصوں اور طبقات اور اسی طرح اُن میں پوشیدہ حیوانات کے مجسموں اور گذشتہ انسان کے آثار کا مطالعہ کر کے یہ بتا دیتے ہیں کہ اُن کی زندگی کیسی تھی، اس سلسلے میں وہ کئی کتابیں اور رسالے لکھ دیتے ہیں۔

اگر انسان اپنے محدود سے علم کیساتھ گذشتہ حیوانوں، انسانوں اور مختلف حادثات کے متعلق اُن کے آثار دیکھ کر رائے قائم کر سکتا ہے اور گواہی دے سکتا ہے تو قیامت میں کیا ہوگا جب کہ دنیا میں کئی راز پوشیدہ ہیں اور آخرت کے دن سب کچھ ظاہر ہو جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ جب انسان ان عمیق موضوعات پر غور وفکر کرتا ہے اور ان کی گہرائیوں کے متعلق غور وخوض کرتا ہے تو وہ لرز جاتا ہے، کبھی تو اس کی فریاد بلند ہوتی ہے کہ ہائے افسوس! میری غفلت کا کیا عالم ہے، اتنے گواہوں کی موجودگی میں بھی میرا عمل اسطرح کا ہے؟۔

عمل کا ناپنے والا ترازو

شیخ مفید مرحوم کہتے ہیں:

میزان کا معنی ایسا ترازو نہیں جیسا اس دنیا کا دو پلڑوں والا ترازو ہوتا ہے، فکری جمود کے شکار بعض اخباریوں نے یہی سمجھا ہے بلکہ جیسا کہ حدیث میں بھی آیا ہے حضرت علیؑ اور اُن کی اولاد میں سے جو امام ہیں وہ قیامت کے دن اعمال کے تولنے کا ترازو ہیں، یہی وہ ہستیاں ہیں کہ جو اعمال اور اُن کے بدلے کے درمیان موازنہ قائم کریں گی۔[1]

لیکن بعض مفسرین نے اس بات کو قبول نہیں کیا، اُن کا خیال ہے کہ وہ ترازو بھی اس دنیا کے ترازو کی طرح ہوں گے انسانی اعمال کا بھی وزن ہوگا یا اعمال نامے کہ جو اس دن وزنی ہو جائیں گے ان کو تولا جائے گا۔

علامہ مجلسی مرحوم کہتے ہیں:

ہم میزان پر اجمالی طور پر ایمان رکھتے ہیں، البتہ اس کی جزئیات اور باقی تفصیلات کے متعلق ہم اپنے پاس سے کچھ نہیں کہتے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت داوَدؑ نے خدا سے کہا کہ انہیں میزان دکھائی جائے، خدا نے انہیں میزان دکھائی جس کا ہر پلڑے کا آپس میں فاصلہ مغرب سے لے کر مشرق تک تھا، جب حضرت داوَدؑ نے یہ منظر دیکھا تو بے ہوش ہو گئے، جب ہوش میں آئے تو عرض کی: میرے خدا! اس کے پلڑے کو نیکیوں سے کون بھر سکتا ہے؟ تو جواب آیا: اے داوَد! جب میں کسی بندے سے راضی ہو جاؤں تو اُسے ایک کھجور کے بدلے (جو کہ راہ خدا میں خرچ کرتا ہے) بھر دیتا ہوں، حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

روی ان داؤد۔ سال ربه ان یریه المیزان فاراه، کل کفة کما بین

---

[1] بحار الانوار، ج ۷، ص ۲۵۲ (کچھ اختصار کے ساتھ)۔

المشرق والمغرب۔ فغشی علیه! ثم افاق فقال: الهی !من الذی یقدر ان یملا کفته حسنات؟ فقال : یاداؤد! انی اذا رضیت عن عبدی ملا تها بتمرة۔ [1]

امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ جب آپؑ سے ''میزان'' کے معنی کے متعلق سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا! ''المیزان العدل'' عدل ہی ترازو ہے۔ [2]

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حدیثوں کو آپس میں کیسے جمع کیا جائے کیونکہ بعض میں تو میزان آئمہ معصومین کو قرار دیا گیا ہے اور بعض میں اس سے عدل مراد لیا گیا ہے جب کہ حضرت داؤدؑ سے متعلق حدیث میں ایسی چیز مراد لی گئی ہے جس کے دونوں پلڑے زمین وآسمان پر حاوی ہوں گے، یہ تین تفسیریں ظاہری طور پر باہم تضاد رکھتی ہیں۔

لیکن ایک نکتے کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ظاہری تضاد حل ہوجاتا ہے، وہ یہ کہ میزان کی حقیقت وہی عدل الٰہی ہے، جب کہ پیغمبر اسلامؐ، آئمہ معصومینؑ اس کے عدل کا ایک نمونہ اور مظہر ہیں، دوسری طرف یہ بھی واضح ہے کہ اس کا قانون عدل سب زمین وآسمان کو اپنے وسیع دامن میں لئے ہوئے ہے۔

"بالعدل قامت اسموات والارض" [3]

یہاں سے اس بات کی بھی وضاحت ہوجاتی ہے کہ حضرت داؤد اس میزان کی عظمت کو دیکھ کر بے ہوش ہوگئے کیونکہ عدل کا مقام اور محمدؐ وآل محمدؐ کی بلندی اس درجہ پر تھی کہ انہوں نے اپنے اعمال کو اس کے سامنے معمولی سمجھا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ یہ اتنا عظیم ترازو کھجور کے اس دانے سے ہی پر ہوجاتا ہے جس میں اخلاص کی روح کارفرما ہو اور جو حق کی رضا کا باعث ہو۔

بعض محققین کا نظریہ ہے کہ رہبران دین اور اولیائے خدا اس ترازو کے ایک پلڑے کے مانند ہیں اور خود انسان اپنے اعمال، عقیدوں اور نیتوں کے ساتھ دوسرے پلڑے کے مانند ہیں، قیامت کے دن ان دو پلڑوں کا آپس میں موازنہ کیا جائے گا، اس بات کا خود اُن قرآنی تعبیرات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے جہاں پر یہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] تفسیر روح البیان، ج۵، ص۴۸۶ آیت ۲۰ سورہ انبیاء کی تفسیر کے ذیل میں، نیز یہی بات کچھ فرق کے ساتھ تفسیر فخر رازی میں مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں بھی آئی ہے اور تفسیر المعانی میں اسی آیت کے ذیل میں مذکور ہے۔

[2] تفسیر نور الثقلین، ج۲، ص۵۔

[3] فیض کاشانی مرحوم نے پیغمبر اکرمؐ کی اس حدیث کو تفسیر صافی سے سورہ رحمن آیت ۸ کے ذیل میں ذکر کیا ہے۔

من خفت موازینه (جن کا میزان عمل ہلکا ہوگا) یا

فمن ثقلت موازینه (جن کا میزان عمل بھاری ہوگا) یا

(سورہ کہف:۱۰۵) میں کافروں کے ایک گروہ کے متعلق ہے:

فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿الکهف:۱۰۵﴾

قیامت کا دن ان کے لئے وزن برپا نہیں کرے گا۔

کیونکہ میزان کا ہلکا ہونا اُن افراد کے اعمال صالح کی کمی اور حق کے متعلق اُن کے عقیدے کی کمزوری کی وجہ سے ہے اور میزان کا بھاری ہونا اس سرمائے کی فراوانی کی وجہ سے ہے، بہر حال ایک طرف انسان ہوں گے اور دوسری طرف اولیا خدا اور پھر اُن کا آپس میں وزن کیا جائے گا، لہٰذا ہمارے اعمال اور عقائد جتنے بھی اُن کے قریب اور اُن سے ملتے جلتے ہوں گے ہماری میزان عمل اتنی ہی بھاری ہو گی۔ (غور کیجئے گا)

میزان میں کون سے اعمال بھاری ہوں گے

اسلامی احادیث میں اُن اعمال کے متعلق متعدد عبارات پائی جاتی ہیں جن کا وزن قیامت کے دن بھاری ہوگا جو انسان کے لئے نجات کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی سر بلندی کا بھی موجب ہوں گے، یہ حقیقت میں مختلف مسائل میں اسلام کے نظام اقدار کی طرف اشارہ ہیں۔

۱۔ پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث ہے:

ما من شئی یوضع فی المیزان اثقل من حسن الخلق، وان صاحب حسن الخلق لیبلغ به درجة صاحب الصوم والصلاة۔

میزان عمل میں کوئی چیز حسن اخلاق سے بڑھ کر وزنی نہیں ہوگی، اچھے اخلاق والا اپنے اخلاق کی وجہ سے اہل روزہ اور اہل نماز کے درجات کا حامل ہوگا۔[1]

۲۔ پیغمبر اسلامؐ کی ہی ایک اور حدیث ہے جس میں توحید اور آپ کی نبوت کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:

خف میزان ترفعان منه، وثقل میزان توضعان فیه

جس ترازو سے یہ دو چیزیں اٹھالی جائیں وہ ہلکا ہو جائے گا، جس میں یہ دو چیزیں رکھ دیں جائیں وہ بھاری ہو

---

[1] سنن ترمذی، ج ۴ ص ۳۶۳، (حدیث ۲۰۰۳)۔

جائے گا۔[1]

۳۔ امام محمد باقرؑ یا امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک حدیث یوں ہے:

ما فی المیزان شئی اثقل من الصلاۃ علی محمد وال محمد وان الرجل لتوضع اعمالہ فی المیزان فتمیل بہ. فیخرج الصلاۃ علیہ فیضعھا فی میزانہ فیرجع (بہ)۔

میزان عمل میں کوئی چیز محمدؐ وآل محمدؐ پر صلوات سے بڑھ کر بھاری نہیں ہے، بعض لوگوں کے تمام اعمال ترازو میں رکھے جائیں گے پھر بھی وہ ہلکا ہوگا، پھر محمدؐ وآل محمدؐ پر درود کو لیا جائے گا اور اُس میں رکھ دیا جائے گا جس سے اُن کا میزان عمل بھاری ہوجائے گا۔[2]

۴۔ بعض احادیث میں یوں آیا ہے کہ:

بعض ذکر جیسے ''الحمدللہ و سبحان اللہ واللہ اکبر'' اور اسی طرح ''لا الہ الا اللہ'' قیامت کے دن میزان عمل کو بھر دیں گے۔[3]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات وہ اعمال جو دیکھنے میں معمولی اور مختصر سے معلوم ہوتے ہیں خدا کی بارگاہ میں اتنی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کہ عمل کے ترازو کو بھر دیتے ہیں، یہ ان چیزوں کی اسلام میں اہمیت کے پیش نظر ہے۔

حقیقت توحید، حقیقت حمد، حقیقت تسبیح، محمدؐ وآل محمد کے ساتھ روحانی وابستگی اور حسن خلق انہی امور میں سے ہیں، نیز یہ بھی آپ نے پڑھا کہ بعض اوقات خلوص نیت سے راہ خدا میں خرچ کی ہوئی ایک کھجور ہی عدل الٰہی کے پلڑوں کو بھر دیتی ہے، جب کہ یہ ترازو بھی پورے زمین وآسمان پر حاوی ہے۔

۵۔ بعض احادیث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس دن انسانوں کو بھی ترازو میں رکھا جائے گا اور پھر اُن کا وزن کیا جائے گا، پیغمبر اسلامؐ سے مروی ایک صحیح حدیث میں ہے:

انہ لیأتی الرجل العظیم السمین یوم القیمۃ لا یزن جناح بعوضۃ۔

---

[1] نور الثقلین، ج۵ ص۶۵۹ (حدیث ۸)۔

[2] اصول کافی، ج۲ ص ۴۹۴۔ باب الصلاۃ علی النبی (حدیث ۱۵) بحار الانوار، ج۹۱ ص۵۶ (حدیث ۳۱) میں بھی یہی مفہوم پیغمبر اسلامؐ سے مروی ہے۔

[3] اصول کافی، ج۲، ص ۵۴۷ (حدیث ۵)۔

قیامت کے دن خدا کی بارگاہ میں بہت موٹا شخص آئے گا جس کا وزن مچھر کے پر جتنا بھی نہیں ہوگا۔[1]

یہ اس لئے ہے کہ اس دنیا میں اُن کے اعمال، افکار اور شخصیت ظاہری خوبصورتی کے باجود اندر سے خالی ہوتے ہیں۔

کن چیزوں کے متعلق سوال کیا جائے گا؟

اس سلسلے میں بھی متعدد احادیث ہیں جن میں اُن کاموں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کا سب سے پہلے حساب کتاب ہوگا، ہر ایک کے متعلق بہت بامعنی قسم کی عبارات پائی جاتی ہیں، ان کا مطالعہ انسان کی اخلاقی تربیت کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی اقدار کو بھی واضح کرتا ہے۔

۱۔ پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث ہے:

لا تزول قدما عبد یوم القیامة حتی یسئل عن اربع: عن عمره فیما افناه، و شبابه فیما ابلاه وعن ما له من این اکتسبه وفیما انفقه وعن حبنا اهل البیت۔

قیامت کے دن کوئی بندہ اس وقت تک پاؤں آگے نہیں بڑھا سکے گا جب تک اُس سے ان چار چیزوں کے متعلق پوچھ نہ لیا جائے:

اس نے اپنی عمر کو کیسے گزارا؟

اس نے اپنی جوانی کہاں کھوئی؟

اس نے دولت کہاں سے حاصل کی اور کہاں خرچ کی؟

اور ہم اہل بیت سے اُس کی محبت کیسی تھی؟[2]

۲۔ پیغمبر اسلامؐ سے ایک اور حدیث میں ہے:

قیامت کے دن بندگان خدا میں سے ہر ایک کے لئے دن رات کے گھنٹوں کے مطابق اس کی عمر کے ہر دن میں چوبیس خزانے کھولے جائیں گے، ایک خزانہ تو نور اور خوشی سے معمور ہوگا، اسے دیکھ کر وہ بندہ اتنا خوش ہوگا کہ اگر اس کو تمام دوزخیوں میں تقسیم کر دیا جاتا تو اُن کی آگ بجھ جاتی، یہ اُسی لمحے کا خزانہ ہوگا جب اس نے خدا کی اطاعت کی تھی۔

پھر اس کے لئے دوسرے خزانے کا منہ کھولا جائے گا جسے وہ تاریک، بدبودار اور ہولناک پائے گا، اس پر اس قدر خوف اور دہشت

---

[1] مجمع البیان، ج ۶ ص ۴۹۷۔

[2] خصال صدوق (بحار الانوار، ج ۷، ص ۲۵۸۔ حدیث (۱) کے مطابق)۔

طاری ہوگی کہ اگر اُسے اہل بہشت میں تقسیم کیا جائے تو وہ اپنی نعمتوں کی لذت کو بھول جائیں، یہ اُس لمحے کا خزانہ ہوگا جس میں اس نے خدا کی نافرمانی کی تھی۔

پھر اس کے لئے تیسرے خزانے کو کھولا جائے گا جسے وہ خالی پائے گا، اس میں نہ تو خوشی کا سامان ہوگا اور نہ ہی خوف کا، یہ اس لمحے کا خزانہ ہوگا جس میں وہ سویا ہوا تھا یا دنیا کے جائز کاموں میں مشغول تھا، یہ دیکھ کر اُسے اتنا افسوس ہوگا کہ قابل بیان نہیں کیونکہ وہ اسے نیکیوں سے بھر سکتا تھا، اسی وجہ سے خدا نے فرمایا ''ذلك يوم التغابن''[1]

۳۔ پیغمبر اسلامؐ سے ہی ایک اور حدیث میں ہے:

انا اول قادم على الله، ثم يقدم على كتاب الله، ثم يقدم على اهل بيتي، ثم يقدم على امتي، فيقفون، فيسئلهم، ما فعلتم في كتابي واهلبيت نبيكم۔

میں سب سے پہلے خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوں گا، پھر میرے سامنے کتاب خدا کو لایا جائے گا، پھر میرے اہل بیت آئیں گے، پھر میری امت میرے سامنے آئے گی، وہ کھڑے ہو جائیں گے اور خدا ان سے پوچھے گا کہ تم نے میری کتاب اور اپنے پیغمبرؐ کی اہل بیت کے ساتھ کیا سلوک کیا؟[2]

۴۔ امام محمد باقرؑ سے ایک حدیث یوں مروی ہے:

"اول ما يحاسب به العبد الصلاة فان قبلت قبل ما سواها"

بندے سے سب سے پہلے جس کا حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے، اگر وہ قبول ہوگئی تو باقی اعمال قبول ہوں گے۔[3]

ایک اور حدیث ہے کہ:

ان اول ما يسئل عنه العبد يوم القيامة عن جلسآئه۔

بندے سے قیامت کے دن سب سے پہلے اُس کے ہم نشینوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔[4]

---

[1] بحار الانوار، ج ۷، ص ۲۶۳ (حدیث ۱۵)۔

[2] بحار الانوار، ج ۷، ص ۲۶۳ (حدیث ۲۲)۔

[3] بحار الانوار، ج ۷، ص ۲۶۷ (حدیث ۳۳)۔

[4] در المنثور، ج ۵، ص ۲۷۳۔

ممکن ہے سب سے پہلے جس چیز کے بارے میں سوال ہونا ہے اس سے متعلق احادیث میں کسی قسم کا تضاد محسوس ہو، یعنی اگر چہ یہ چیز اول ہے تو دوسری اس سے پہلے کس طرح ہو سکتی ہے؟ لیکن مراد یہ ہے کہ چند کام ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں پہلے مرحلے میں سوال کیا جائے گا، احادیث میں جن چیزوں کا ذکر اس حوالے سے ہے وہ سب پہلے مرحلے میں شامل ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ احادیث اسلام میں مذکورہ مسائل کی اہمیت کو بھی روشن کرتی ہیں یعنی توحید اور نبوت پر ایمان، محبت اہل بیتؑ، نماز اور ساتھی وغیرہ۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ قیامت میں مختلف مواقف ہوں گے اور ہر موقف پر جس چیز کے بارے میں پہلے سوال کیا جائے گا وہ ان امور میں سے ہی ایک ہوگا۔

۶۔ امیر المومنین حضرت علیؑ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

"اتقوا اللہ فی عبادہ وبلادہ فانکم مشولون حتی عن البقاع والبھآئم"

خدا سے اس کے بندوں اور آبادیوں کے بارے میں ڈرو کیونکہ خدا کی بارگاہ میں تم سے زمین اور حیوانوں تک کے بارے میں پوچھا جائے گا۔[1]

یہ حدیث بتاتی ہے کہ انسان سے فضائی ماحول کی تباہی اور حیوانوں کو بلا وجہ قتل کرنے کے بارے میں بھی اس روز سوال ہوگا۔

حساب محشر کی آسانی اور مشکل

احادیث اور قرآن کی بعض آیات میں موجود اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن حساب بہت باریک بینی سے لیا جائے گا۔

امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث یوں منقول ہے:

آپؑ نے ایک شخص سے فرمایا:

تم اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ یہ سلوک کیوں کرتے ہو؟

اُس نے عرض کیا:

آپؑ پر قربان! میرا حق اس کے ذمے تھا اور آخر تک میں نے اس سے نہ لیا۔

امامؑ نے فرمایا:

ذرا بتاؤ تو کہ خدا نے جو یہ کہا ہے کہ بعض لوگ اپنے حساب عمل کی برائی سے ڈریں گے "ویخافون سوٓء الحساب" کیا تمہارا

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۶۷۔

خیال ہے کہ وہ لوگ خدا کے ظلم سے خوف زدہ ہوں گے؟ اللہ کی قسم! نہیں بلکہ وہ اس بات سے ڈریں گے کہ کہیں اُن کے حساب میں باریک بینی سے کام نہ لیا جائے اور آخری مرحلے تک اُن سے حساب نہ لیا جاتا رہے۔[۱]

امام محمد باقرؑ سے منقول ایک حدیث میں ہے:

انما یداق اللہ العباد فی الحساب یوم القیمة علی قدر ما آتاهم من العقول فی الدنیا.......

خدا قیامت کے دن ہر شخص کا حساب اس کی عقل کے مطابق لے گا، جو اس نے اس دنیا میں انہیں دی ہے۔[۲]

اس تعبیر سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ فہم وشعور کی مقدار اور ذمہ داریوں کے درمیان ایک رابطہ ہے کیونکہ خدا کا حساب ذمہ داریوں کے لحاظ سے ہوگا۔

ایک تو یہ گروہ ہے کہ جس کے حساب کتاب کے سلسلے میں سختی اور باریک بینی سے کام لیا جائے گا لیکن دوسرا وہ گروہ ہے جس کا حساب بالکل آسان ہوگا، یہ وہی لوگ ہوں گے جن کے بارے میں کلام الٰہی میں ارشاد ہوتا ہے:

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا

۲ ال انشقاق: ۷-۸

جس کا اعمال نامہ اُس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا جلد ہی اس کا حساب آسانی سے ہو جائے گا۔

(انشقاق۔ ۷،۸)

رسول اسلامؐ کی ایک حدیث ہے:

"ثلاث من کن فیه حاسبه الله حسابا یسیرا، وادخله الجنة برحمته"

تین باتیں جس میں بھی ہوں خدا اس کا حساب آسان لے گا اور اُس کو اپنی رحمت کیساتھ جنت میں داخل کر دے گا۔

عرض کیا گیا: یارسول اللہؐ وہ کیا ہیں؟

آپ نے فرمایا:

---

[۱] بحار الانوار، ج ۷، ص ۲۶۶ (حدیث ۲۷)۔

[۲] اصول کافی، ج ۱، ص ۱۱ (حدیث ۷)

تعطی، من حرمك، وتصل من قطعك، وتعفوا عمن ظلمك

جس نے تجھے محروم کیا ہے اُسے عطا کر، جس نے تجھ سے قطع تعلق کیا ہے اس سے صلہ رحمی کر اور جس نے تجھ پر ظلم کیا ہے اُسے معاف کر دے۔[١]

روایات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حسن اخلاق بھی حساب میں آسانی کا باعث بنتا ہے، رسول اکرمؐ کی ایک حدیث میں ہے:

"حسن خلقك يخفف الله حسابك"

اپنا اخلاق اچھا کرو، خدا تمہارے لئے حساب آسان کر دے گا۔[٢]

بہر حال ان اسلامی سرچشموں سے مجموعی طور پر یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ حساب الٰہی کے سلسلے میں لوگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، بعض لوگوں کے حساب کے سلسلے میں بہت سختی اور باریک بینی سے کام لیا جائے گا یہ وہ لوگ ہیں، جو دنیا میں بندگان خدا کے حساب کے سلسلے میں سختی سے کام لیتے تھے یا بد اخلاقی، ظالم اور ستم پیشہ تھے جب کہ دوسرے گروہ کا حساب بالکل آسان لیا جائے گا، یہ اُن کے نیک اعمال، خوش اخلاقی اور دنیا میں بندوں پر آسانی کی وجہ سے ہوگا، پھر اس لئے کہ وہ دنیا میں دولت اور منصب کی خرابیوں میں گرفتار نہیں ہوئے ہوں گے۔

لیکن ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہو جائے گا، جیسے پیغمبر اسلامؐ نے ایک حدیث کہ جو قیامت کے دن لوگوں کی مختلف جماعتوں میں تقسیم کے سلسلے میں ہے میں ارشاد فرمایا:

ومنهم الذين يدخلون الجنة بغير حساب لا نهم لم يلبسوا من امر الدنيا بشئي وانما الحساب هناك على من تلبس بها ههنا۔

بعض لوگ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے کیونکہ وہ دنیا کی کسی برائی سے آلودہ نہیں ہوئے، وہاں حساب اُن کے لئے ہے جو یہاں پر دنیاوی امور میں آلودہ رہے ہیں۔[٣]

دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جو کسی حساب کتاب کے بغیر جہنم میں جائیں گے، پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں ہے:

ان الله عزوجل يحاسب كل خلق الا من اشرك بالله عزوجل فانه لا يحاسب ويومر به الى النار۔

---

[١] نور الثقلین، ج ۵ ص ۵۳۷ (حدیث ۱۲)۔

[٢] بحار الانوار، ج ۶۸، ص ۳۸۳ (حدیث ۲۰)

[٣] میزان الحکمۃ، ج ۲ ص ۴۱۴۔

خدا تمام مخلوقات کا حساب لے گا سوائے اُس شخص کے کہ جس نے خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرایا ہوگا، اُسے بغیر حساب کے جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔[1]

امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث یوں مروی ہے:

واما الثلاثة الذین یدخلهم النار بغیر حساب فاما م جآئر، وتاجر کذوب وشیخ زان۔

تین گروہ بغیر حساب کے جہنم میں داخل ہوں گے، ظالم پیشوا، جھوٹا تاجر اور بوڑھا زانی۔[2]

اس گفتگو کو اسی سلسلے کی ایک اور حدیث پر ختم کرتے ہیں، رسول اکرمؐ کی ایک حدیث ہے:

ستة یدخلون النار بغیر حساب الامرآء بالجور، والعرب بالعصبیة، والدها قین بالکبر واتجار بالکذب، والعمآء بالحسد، والا غنیآء بالبخل۔

چھ طرح کے افراد بغیر حساب کے جہنم میں داخل ہوں گے۔(۱)۔حکمران ظلم کی وجہ سے، (۲)۔عرب تعصب کی وجہ سے، (۳)۔سردار تکبر کی وجہ سے، (۴)۔تاجر جھوٹ کی وجہ سے، (۵)۔علماء حسد کی وجہ سے، (۶)۔اور دولت مند کنجوسی کی وجہ سے۔[3]

خدایا! اپنے لطف وکرم سے ہمارے قیامت کے حساب کو آسان فرما، ہم پر رحم فرما، تو جانتا ہے کہ ہم خالی ہاتھ اور تاریک اعمال نامے کے ساتھ تیری بارگاہ میں آرہے ہیں۔

یا ارحم الرحمین ویا اکرم الا کرمین۔

---

[1] بحارالانوار، ج ۷ ص ۲۶۰ (حدیث ۷)۔

[2] بحارالانوار، ج ۷۲، ص ۳۳۷ (حدیث ۵)۔

[3] میزان الحکمة، ج ۲ ص ۴۱۹۔

صراط۔۔۔۔۔مرصاد

اشارہ

احادیث میں بالکل واضح طور پر ''صراط'' کا ذکر ہے جب کہ آیات میں مختلف استعاروں کی صورت میں ہے، یہ ایک پل ہے جو دوزخ کے اوپر بنا ہوگا، سب کو اس پر سے گذرنا ہوگا، اسی طرح ''مرصاد'' کی طرف بھی کئی اشارات کئے گئے ہیں یہ یا تو وہی پُل صراط ہے یا اُس پُل کا ایک خاص حصہ ہے۔

ان تمام تعبیرات سے واضح ہوتا ہے کہ رحمت الٰہی کے خزینے یعنی بہشت تک پہنچے کے لیے جہنم کے اوپر سے گزرنا پڑے گا، یہ کام نیک اور پاک لوگوں کے علاوہ کسی کے لئے آسان نہیں ہے۔

گنہگار، مجرم، ظالم اور فسادی لوگ اس پل پر سے گزرنے کی طاقت نہیں رکھتے، بلکہ وہ جہنم کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جائیں گے۔

ان دو لفظوں کی تفسیر اور اسی طرح ''صراط'' اور مرصاد'' کی حقیقت کے سلسلے میں بہت سی باتیں کی گئی ہیں کہ جن میں سے بعض احادیث سے متعلق ہیں اور بعض مفسرین کی گفتگو سے، اُن کی طرف توجہ نہ فقط یہ کہ معاد سے متعلق بہت سے مسائل کو حل کرتی ہے بلکہ بیدار دل لوگوں پر بہت تربیتی اثرات بھی چھوڑتی ہے۔

اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف پلٹتے ہیں اور مندرجہ ذیل آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

۱۔ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا (مریم: ۷۲،۷۱)

۲۔ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾ (الفجر: ۱۴)

۳۔ وَلَوْ نَشَاءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ۶۶

۳ یس: ۶۶

۴۔ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا (نبا: ۲۱۔۲۲)

ترجمہ:

۱۔ تم سب (بغیر استثناء کے) جہنم میں وارد ہوگے، یہ تمہارے رب کا حتمی اور قطعی حکم ہے، پھر ہم ان لوگوں کو

نجات دیں گے جو پرہیز گار ہوں گے اور ظالموں کو (ضعف و ذلت کے عالم میں) اس کے اندر زانو کے بل اوندھا گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔

۲۔ یقینا تیرا پروردگار گھات میں ہے۔

۳۔ اگر ہم چاہیں تو اُن کی آنکھوں کو زائل کر دیں، پھر وہ راستہ طے کرنے کے لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہیں گے لیکن دیکھیں گے کیسے؟

۴۔ یقینا دوزخ بہت بڑی گھات ہے اور سرکشوں کی واپسی کا ٹھکانا ہے۔

تفسیر

جنت کا راستہ دوزخ سے ہو کر جاتا ہے

پہلی آیت میں تمام انسانوں کو مخاطب قرار دیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: تم سب کے سب جہنم میں وارد ہو گے اور یہ تمہارے رب کا حتمی وقطعی فیصلہ ہے۔ (وان منکم الا واردھا کان علی ربك حتما مقضیا)۔

پھر ارشاد ہوتا ہے: پھر جو تو پرہیز گار ہوں گے انہیں ہم اس سے نجات دے دیں گے، اور ظالموں کو اس کے اندر زانو کے بل اوندھا گرا ہوا چھوڑ دیں گے (ثم ننجی الذین اتقوا ونذر الظلمین فیھا جثیا)۔

یہاں پر جہنم میں داخل ہونے سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے اس سلسلے میں مختلف باتیں کی ہیں اور کئی قسم کی تفاسیر ذکر کی ہیں۔

بعض کا تو یہ نظریہ ہے کہ یہاں پر ُورود'' ''دخول'' کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ یہ کلمہ حقیقت میں پانی کے لئے ارادہ کرنے کے معنی میں ہے، لہٰذا جب اونٹ کو پانی کی طرف لے جایا جاتا ہے تو ''اوردت الابل المآء'' کی تعبیر استعمال کی جاتی ہے، قرآن مجید میں بھی حضرت موسیٰؑ کے متعلق یہی کلمہ استعمال ہوا ہے۔ جب وہ شہر مدائن میں پانی کے کنویں پر پہنچتے تو اس کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ

جب موسیٰ مدین کے پانی پر وارد ہوئے (قصص، ۲۳)

اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ تمام لوگ جہنم کے نزدیک آئیں گے، یہ وہی چیز ہے جسے ''صراط'' قرار دیا گیا ہے یعنی وہ پل کہ جو جہنم کے اوپر ہوگا، تمام لوگوں کو اس پل پر سے گزرنا ہوگا، مجرم تو اس سے نہیں گذر سکیں گے اور جہنم میں گر جائیں گے، جب کہ مومن اس سے جلدی سے گزر کر جنت میں داخل ہو جائیں گے، مختصر بات یہ ہے کہ المیز ان کے بقول ''ورود کا معنی وہاں پر قصد کے ساتھ حاضر ہونا اور قریب آنا ہے'' یا

فخر رازی کے مطابق (جیسا کہ) ورود کا معنی نزدیک اور قریب آنا ہے، (انہوں نے دو تفسیریں میں سے ایک یہ ذکر کی ہے)۔

لیکن قرآن کی مختلف آیات کہ جن میں یہ کلمہ استعمال ہوا ہے، سے مجموعی طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ لفظ حاضر ہونے اور نزدیک ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور داخل ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، یعنی یہ ایک ایسے عام اور وسیع مفہوم پر مشتمل ہے جو ان دونوں معانی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، لہٰذا بت پرستوں کو مخاطب کر کے ارشاد ہوتا ہے:

انکم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم انتم لها واردون۔ لو کان هولآء الهة ما وردوها وکل فیها خلدون۔

تم اور خدا کے علاوہ جس چیز کی تم عبادت کرتے ہو سب جہنم کا ایندھن ہو اور اس میں داخل ہو گے، اگر یہ خدا ہوتے تو ہرگز جہنم میں وارد نہ ہوتے اور یہ تمام اس میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔(انبیاء: ۹۹،۹۸)

لہٰذا اس امر سے کوئی چیز مانع نہیں کہ زیرِ نظر آیت میں ورود قریب ہونے اور نزدیک ہونے کے معنی میں ہو اور پل صراط کی طرف اشارہ ہو، اس بات پر گواہ وہ حدیث ہے جو مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کے سلسلے میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

اما تسمع الرجل یقول۔ وردناماّء بنی فلان فهو الورود ولم یدخله.......

کیا تم نے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ میں فلاں قبیلے کے پانی پر وارد ہوا (یعنی پانی کے کنارے چلا گیا) تو یہ ورود ہے جب کہ وہ داخل نہیں ہوا ہوتا۔[۱]

اس سے بھی واضح تر وہ مختصر سی حدیث ہے جسے قرطبی نے پیغمبر اکرمؐ کی حدیث کے طور پر ذکر کیا ہے، جس کا مضمون یہ ہے:

الورود الممر علی الصراط

ورود، پُل صراط سے گزرنا ہے۔[۲]

دوسری تفسیر جس کی تائید بہت سے مفسرین نے کی ہے یہ ہے کہ حقیقت میں تمام انسان جہنم میں داخل ہوں گے، لیکن یہ جہنم مومنین کے لئے تو ٹھنڈی اور سلامتی کا باعث ہوگی، جیسا کہ آتش نمرود حضرت ابراہیمؑ کے لئے ٹھنڈی اور سلامتی والی ہوگئی تھی لیکن یہ کافروں اور گنہگاروں کے لئے دہکتی ہوئی اور جلانے والی ہوگی۔

---

[۱] تفسیر برہان، ج۳، ص۲۰۔

[۲] تفسیر قرطبی، ج۶، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

گویا مومن آگ کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہ ہونے کی وجہ سے بجھانے کا مادہ ہیں جب کہ کفار آگ کے ساتھ ہم تعلق ہونے کی وجہ سے اُسے اور زیادہ بھڑکانے کا وسیلہ ہیں۔ (غور کیجئے گا)

اس تفسیر کا ثبوت وہ روایت ہے جو جابرؓ بن عبداللہ انصاری سے منقول ہے، ایک شخص نے ان سے اس آیت کی تفسیر پوچھی، جابرؓ نے اپنے کانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

میں نے خود اپنے ان دو کانوں سے رسول اسلامؐ سے سنا ہے اور اگر جھوٹ بولوں تو میرے یہ کان بہرے ہو جائیں، آپ فرما رہے تھے:

ورود کا معنی داخل ہونا ہے، ہر نیک اور برا جہنم میں داخل ہوگا لیکن جہنم مومنین کے لئے ٹھنڈی اور سلامتی والی ہوگی جیسا کہ ابراہیمؑ کے لئے آگ ہوگئی تھی۔ [۱]

اگر ہم اس تفسیر کو قبول کریں تو پھر یہ آیت پل صراط کے لئے دلیل نہیں ہوگی۔

دوسری آیت میں فسادیوں پر نازل ہونے والے دنیوی عذاب اور انہیں سخت ترین سزا ملنے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد انہیں تنبیہ کے عنوان سے ارشاد ہوتا ہے:

یقیناً تیرا پروردگار گھات میں ہے ''ان ربك لبالمرصاد''

''مرصاد'' ''رصد'' (بروزن حسد) کے مادہ سے ہے جس کا معنی کسی چیز کی نگہبانی کے لئے آمادہ ہونا ہے، لہٰذا مرصاد کا معنی ''کمین گاہ'' یا ''گھات'' ہے۔

یہاں پر ''مرصاد'' سے کیا مراد ہے؟ بعض نے تو کہا ہے کہ خدا اس دنیا میں اُن لوگوں کی گھات میں ہے اور کسی مناسب موقع پر اُن سے نبٹ لے گا، دوسرے الفاظ میں جیسا کہ ''تفسیر المیزان'' نے کہا ہے:

خدا اپنے بندوں کے اعمال کی نگرانی کر رہا ہے، جب اُن کی سرکشی اور فساد حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو انہیں شدید عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ [۲]

اس صورت میں یہ آیت مسئلہ ''صراط'' کی طرف اشارہ نہیں ہے، لیکن امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث میں ہے:

المرصاد قنطرة على الصراط لا يجوزها عبد بمظلمة

---

[۱] تفسیر ابوالفتوح رازی، ج ۷، ص ۴۳۱ (اس حدیث کو بعض دوسری تفسیروں میں بھی ذکر کیا گیا ہے مثلاً نور الثقلین، تفسیر رازی وغیرہ میں۔

[۲] تفسیر المیزان، ج ۲۰، ص ۴۰۹ (ص ۴۸۱ بیروت ایڈیشن)۔

مرصادصراط پر ایک پل ہے، جس کے ذمے کسی مظلوم کا کوئی حق ہو وہ اس سے گذر نہیں سکے گا۔[1]

ایک اور حدیث روضہ کافی میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے، یہ حدیث امامؑ نے پیغمبرا کرمؐ سے روایت کی ہے، اس میں پل صراط کی خصوصیات ذکر کرنے کے بعد امامؑ نے فرمایا:

وهو قول الله تبارك و تعالى: ان ربك لبا لمرصاد

یہ وہی چیز ہے جس سے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ ''ان ربک لبا لمرصاد''[2]

یہ دو حدیثیں جن کا محور مذکورہ بالا آیت ہے واضح کرتی ہیں کہ یہ آیت قیامت اور پل صراط کے متعلق ہے۔

لیکن اس بات میں بھی کوئی اشکال نہیں کہ آیت دونوں چیزوں کی طرف اشارہ کر رہی ہو، یعنی خدا اس جہان میں بھی مجرموں کی گھات میں ہے اور اُس جہان میں بھی پل صراط کے کنارے کمین گاہ میں ہے۔

بہر حال یہ آیت مفہوم مکانی کی حامل نہیں ہے کیونکہ خدا کسی مکان کا محتاج نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا ان تمام امور پر احاطہ وجودی رکھتا ہے۔

ابن عباسؓ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ جہنم پر سات پل ہیں، پہلے پل پر ایمان سے متعلق سوال کیا جائے گا، جس نے پوری طرح ایمان ثابت کر دیا تو دوسرے پل پر پہنچ جائے گا، وہاں پر نماز کے متعلق پوچھا جائے گا، اگر نماز دکھا دی تو تیرے پل پر پہنچ جائے گا، وہاں پر ''زکوۃ'' کے متعلق سوال کیا جائے گا، اگر وہ دکھا دی تو چوتھے پل پر پہنچ جائے گا، وہاں پر رمضان کے روزے کے متعلق پوچھا جائے گا، اگر دکھا دیے تو پانچویں پُل پر پہنچ جائے گا، وہاں پر حج اور عمرے کے متعلق سوال ہوگا، اگر وہ دکھا دیے تو چھٹے پل پر پہنچ جائے گا، وہاں پر صلہ رحمی کے متعلق سوال ہوگا، اگر دکھا دیا تو ساتویں پل پر پہنچ جائے گا، وہاں پر بندوں کے حقوق اور اُن پر ظلم وستم کے متعلق باز پرس ہوگی۔۔۔۔۔اور یہی ہے خدا کے اس قول ''ان ربك لبا لمرصاد'' کا معنی[3]

یہ امر بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اتنی تفصیلات کے ساتھ یہ بات ابن عباسؓ کی ذاتی رائے ہو، اصولی طور پر انہوں نے یہ بات رسول اسلامؐ یا حضرت علیؑ سے ایک حدیث کی شکل میں سنی ہے۔

''مرصادؔ'' کی تعبیر سورہ نباء آیت ۲۱ میں بھی آئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] بحار الانوار، ج ۱۱ ص ۶۴ یہی روایت برہان، ج ۴، ص ۴۵۸ میں ''ان ربک لبالمرصادؔ'' کی تفسیر کے سلسلے میں امام جعفر صادقؑ سے ذکر ہوئی ہے۔

[2] نور الثقلین، ج ۵، ص ۵۷۲، تفسیر برہان، ج ۴، ص ۴۵۸۔

[3] تفسیر قرطبی، ج ۱۰، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

ان جهنم کانت مرصادا

یقیناً دوزخ (گنہگاروں کے لئے) گھات ہے۔

اس آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ خود دوزخ مجرموں اور گنہگاروں کے لئے گھات ہے، لیکن پہلے جو بات گزری ہے اس کے پیش نظر بعض مفسرین نے کہا کہ یہاں پر ''مرصاد'' سے مراد ایک پل ہے جو جہنم کے اوپر بنایا گیا ہے، یہ ان لوگوں کے لئے کمین گاہ ہے، چونکہ یہ لوگ اُسے پار کرنے کی طاقت نہیں رکھتے لہٰذا جہنم میں گر جائیں گے۔[1]

علاوہ ازیں میں کی تعبیر عموماً سڑکوں اور راستوں کے لئے استعمال ہوتی ہے اور جہنم جو کہ انجام کار اور آخری منزل ہے کمین کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی، یہ بھی مذکورہ بالا تفسیر پر ایک شاہد ہے۔

آخری آیت میں قیامت کے دن کفار اور مجرموں کی حالت بیان ہوئی ہے، اُس دن ان کے لبوں پر مہر لگا دی جائے گی، صرف اُن کے ہاتھ اور پاؤں بولیں گے، اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: اگر ہم چاہتے تو اُن کی آنکھوں کو زائل کر دیتے، پھر وہ پل صراط عبور کرنے کے لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے لیکن وہ کیسے دیکھ سکتے ہیں (''**ولو نشآء لطمسنا علی اعینهم فاستبقوا الصراط فانی یبصرون**)۔[2]

بہت سے مفسرین نے اس آیت کو اس دنیا میں اس گروہ کی حالت زار سے متعلق قرار دیا ہے اور صراط سے مراد ''حق کا راستہ لیا'' ہے، یعنی اُن کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ حق کے راستے یا نجات کے راستے کو پالیں، لیکن خدا اُن کے برے اعمال کی وجہ سے اُن کی آنکھوں کو بے نور کر دیتا ہے، لہٰذا وہ جادہ حق کے مشاہدے پر قدرت نہیں رکھتے۔

لیکن یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ آیت اس گروہ کی قیامت کے دن حالت کو بیان کرتی ہے جب وہ صراط (دوزخ کے پل) سے عبور کریں گے، وہاں پر اگر خدا ارادہ کر لے گا تو اُن کی آنکھیں بالکل بے نور ہو جائیں گی، پھر وہ لاکھ کوشش و جستجو کریں اس پل سے پار نہیں جا سکیں گے۔

تفسیر ''فی ظلال القرآن'' کی ظاہری عبارت بھی یہی تفسیر بیان کرتی ہے، تفسیر قرطبی میں بھی اسے ایک احتمال کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، علاوہ ازیں ''عبداللہؓ بن سلام'' نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے:

جب قیامت برپا ہوگی اور (جہنم کے اوپر) پُل صراط کھینچ دیا جائے گا تو ایک منادی آواز دے گا: محمدؐ اور اُن کی امت کھڑے ہو

---

[1] یہ تفسیر ''علامہ طباطبائی مرحوم'' نے ''المیزان میں''، ''فخر رازی'' نے ''تفسیر کبیر میں''، راغب نے ''مفردات'' میں اور ''قرطبی'' نے اپنی تفسیر میں سورہ نباء کی مذکورہ آیت کے ذیل میں فقط یہی تفسیر، یا کئی تفسیروں میں سے ایک تفسیر کے طور پر ذکر کی ہے۔

[2] ''طمسنا'' کا مادہ ''طمس'' (بروزن شمس) ہے جس کا معنیٰ ایک چیز کے اثرات کو پوری طرح ختم کر دینا ہے یہاں پر ممکن ہے آنکھ کو مکمل طور پر ختم کر دینے یا اس کے نور اور بینائی کو ختم کر دینے کے معنی میں ہو۔

جائیں، پوری امت کے لوگ، نیک اور برے سب کھڑے ہوجائیں گے اور آنحضرتؐ کے پیچھے چلنے لگیں گے تا کہ پل صراط کو عبور کریں، جب صراط کے کنارے آئیں گے تو گنہگاروں کو اندھا کر دیا جائے گا، وہ پل صراط سے گزرنا چاہیں گے، لیکن اُسے کیسے دیکھ سکیں گے؟[۱]

یہ بات مشکل معلوم ہوتی ہے کہ یہ عبداللہؓ بن سلام کی ذاتی رائے ہو، کیونکہ یہ غیب سے متعلق خبروں کا ایک حصہ ہے جسے معصومینؑ کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا، اس لئے اس بات کو رسول اسلامؐ کی حدیث سمجھنے میں کوئی اشکال نہیں۔[۲]

توضیحات

صراط کیا ہے؟

جیسا کہ پہلے بھی متعدد بار اس امر کا ذکر ہوا ہے کہ قیامت سے متعلق حقائق کے بارے میں تفصیلی معلومات کا جاننا اس دنیا کے لوگوں کے لئے ناممکن ہے کیونکہ وہ اس عالم سے آگے کی دنیا ہے لیکن یہ امر مانع نہیں ہے کہ اس سے متعلق کچھ اجمالی معلومات ہمیں حاصل ہوں۔

اسلامی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صراط جنت کی طرف جانے والے راستے پر ایک پل ہے، جو جہنم کے اوپر ہے، ہر اچھے اور برے کو اس پر سے گذرنا ہوگا، نیک لوگ تو تیزی کے ساتھ اسے عبور کر جائیں گے، اور خدا کی بیکراں نعمتوں تک پہنچ جائیں گے، جب کہ برے لوگ اس پر سے گر کر جہنم کا لقمہ بن جائیں گے، بعض احادیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پل صراط سے لوگوں کے تیزی سے گزرنے کا دارومدار اُن کے ایمان، اخلاص اور نیک اعمال پر ہے۔

امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث میں ہے:

منهم من يمر مثل البرق۔ ومنهم من يمر مثل عدوالفرس۔ ومنهم من يمر حبوا۔ ومنهم من يمر مشياء۔ ومنهم من يمر متعلقا قد تاخذ النار مينه شيئا وتترك شيئا۔

---

[۱] تفسیر قرطبی، ج۸، ص ۵۴۹۴ (زیر نظر آیت کے ذیل میں)۔

[۲] عبداللہ بن سلامؓ اہل کتاب کے علماء میں سے تھے، انہوں نے اسلام قبول کیا، ان کا نام ''الحصین'' تھا، اسلام لانے کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے ان کا نام عبداللہ رکھ دیا، بعض علمائے رجال نے انہیں مجہول الحال قرار دیا ہے اور کبھی ان کے کمزور راوی ہونے پر دلیلیں قائم کی ہیں، لیکن ابن داوٗد نے اپنی کتاب کے پہلے حصے میں کہ جو معتبر راویوں کے بارے میں ہے ان کا ذکر کیا ہے، بعض نے اس امر کو اُن کے حسن حال کے لئے قرینہ قرار دیا ہے۔

بعض لوگ تو بجلی کی مانند اس سے گزریں گے، بعض تیز گھوڑوں کی رفتار سے گزریں گے، بعض ہاتھ اور پاؤں کے پل، بعض پیدال لوگوں کی طرح، بعض لوگ اس پر معلق ہو یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعض روایات میں اس خطرناک راہ سے گذرنے کو ایک بہت مشکل کام قرار دیا گیا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث (کہ جو امام جعفر صادقؑ سے بھی) منقول ہے، میں ہے:

ان علی جهنم جسرا ادق من الشعر واحد من السیف۔

دوزخ پر بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز دھار ایک پل ہے۔[1]

صراط مستقیم، حقیقت ولایت اور عدالت بھی اس دنیا میں یوں ہی ہے، بال سے باریک تر اور تلوار سے تیز تر کیونکہ صراط مستقیم صرف ایک باریک راستہ ہے، اس کے علاوہ جو کچھ بھی دائیں یا بائیں خطوط ہیں، سب ٹیڑھے اور غیر مستقیم راستے ہیں، لہٰذا قیامت کے صراط کا کہ جو اسی صراط کی تجسیم شدہ صورت ہے، ایسا ہونا طبعی سے بات ہے، لیکن اس کے باوجود بعض لوگ ایمان اور اعمال صالح کے سائے میں اس خطرناک راستے کو تیزی سے طے کرلیں گے۔

یہ بات بھی یقینی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ اور اُن کے خاندان سے تعلق اس خوفناک راستے کو آسان کردیتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں ہے:

اذا کان یوم القیامة ونصب الصراط علی جهنم لم یجز علیه الا من کان معه جواز فیه ولایة علی بن ابی طالب۔

جب قیامت کے دن جہنم پر پل صراط کھینچ دیا جائے گا تو اس سے وہی لوگ پار جاسکیں گے جن کے پاس وہ پروانہ ہوگا، جس میں علیؑ کی ولایت لکھی ہوگی۔[2]

یہی معنی ایک اور عبارت کے ساتھ خاتون اسلام فاطمۃ زہراء سلام اللہ علیہا کے متعلق بھی آیا ہے، واضح ہے کہ علیؑ اور فاطمہؑ کی محبت و ولایت پیغمبر اسلامؐ قرآن، اسلام اور دیگر آئمہ معصومینؑ کی محبت سے الگ نہیں ہے، حقیقت میں جب تک ایمان، اخلاق اور عمل کے لحاظ سے ان عظیم ہستیوں کے ساتھ تعلق قائم نہ ہو، اس وقت تک صراط سے گزرنا ممکن نہیں ہے، اس سلسلے میں متعدد احادیث بھی آئی ہیں۔ (خواہشمند

---

[1] ا۔ میزان الحکمته، ج۵، ص۳۴۸، امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث ان علی جهنم جسرا میں ''جسرا'' کی جگہ پر ''الصراط'' کا کلمہ آیا ہے، (بحار، ج۸، ص۶۴، حدیث۱)۔

[2] بحارالانوار، ج۸، ص۶۸ (حدیث۱۱)۔

حضرات زیادہ معلومات کے لئے بحارالانوارج ۸ فصل صراط بالخصوص روایت ۱۲ تا ۱۷ کی طرف رجوع کریں)

اس سلسلے میں آخری بات اس پُل پر ایمان رکھنے کے تربیتی اثرات سے متعلق ہے۔

یہ ایک خوفناک، خطرناک، بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز راستہ ہے، اس گزرگاہ پر کئی جگہ ٹھہرنا پڑے گا، ہر جگہ پر ایک چیز کے متعلق سوال ہوگا، ایک جگہ پر نماز، دوسری جگہ پر امانت اور صلہ رحمی، تیسری جگہ پر عدالت اور اسی جیسی دوسری چیزوں کے متعلق سوال ہوگا، اس راستے سے پیغمبرؐ اور علیؑ کی محبت کے بغیر اور ان کے اعمال و اخلاق کی خلاف ورزی کر کے نہیں گذرا جا سکتا، یہ ایک ایسا پل ہے جس پر سے ہر شخص اپنے ایمان اور عمل صالح کے نور کی روشنی میں ہی گذر سکتا ہے، جو اس پل سے خیریت سے نہ گزر سکا اس کا جہنم میں گرنا یقینی ہے، وہ خدا کی روحانی اور مادی نعمتوں کے سرچشمے یعنی جنت سے محروم رہے گا۔

ان مطالب کی طرف توجہ اور ان پر ایمان انسان کے اعمال میں ایک انقلاب برپا کر سکتا ہے، یہ اُسے زندگی کے راستوں کے چناؤ میں اور زیادہ غور وفکر کرنے اور باطل کی حق سے جدائی کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی دعوت دے گا، یہ اُسے اولیاء اللہ کے اخلاق و اعمال کی پیروی کی طرف بلاتا ہے۔

جنت۔۔۔اور۔۔۔جنتی

اشارہ

معاد سے متعلق تمام ابحاث آخر کار ان دونکتوں میں سے کسی ایک پر ختم ہوتی ہیں:

''بہشت''اور''دوزخ''۔۔۔

بہشت یعنی خدا کی نعمتوں اور عطیوں کا سرچشمہ، جس میں ہر قسم کی مادہ اور روحانی نعمتیں ہوں گی، دوزخ یعنی دکھ درد، اذیتوں اور ہر قسم کی محرومیوں کی جگہ۔

جنت کی حقیقت کیا ہے؟ وہ کیسی ہے؟ وہ کہاں ہے؟ آیا وہ اب موجود ہے یا بعد میں خلق کی جائے گی؟ اس بارے میں گفتگو کے سلسلے بہت دراز ہیں، ان سوالات کے جواب حاصل کرنے کے لئے قرآن کی اُن آیات سے مدد لی جاسکتی ہے جو ان موضوعات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

جنت اور جنتیوں کی صفات، جنت کی مختلف نعمتوں، اس میں بہنے والے مختلف چشموں، نہروں اور باغوں اس کے پاک و پاکیزہ کھانوں، اس میں بہترین بیویوں، دوستوں اور خدمت گذاروں، فرشتوں کی طرف سے انتہائی احترام اور اسی طرح کی دوسری مادہ اور روحانی نعمات سے متعلق قرآن کی بہت سی آیات میں گفتگو کی گئی ہے، معاد سے مربوط بہت سی آیات انہی موضوعات کے بارے میں ہیں۔

ایک بار پھر اس نکتے کی یاددہانی ضروری ہے کہ ہم جنت سے متعلق جو تصویر اور خاکہ بھی اپنے ذہن میں بنائیں وہ اس دنیا کی نعمتوں کے معیار کے مطابق ہوگا، وہ جنت کی مکمل تصویر نہ ہوگا، وہ تو اس سے بڑھ کر ایک اور ہی عظیم چیز ہے، وہ ہماری تحریر اور مطالعے کی وسعت میں نہیں سما سکتی۔

لیکن اس کے باوجود ہم مختلف آیات و روایات کے مطالعے سے اس کا ایک اجمالی خاکہ پیش کر سکتے ہیں، ایک ایسی مبہم سی تصویر جو بہت زیادہ تربیتی اثرات کی حامل ہے۔

حقیقت میں ہر انسان جو کسی مادی یا روحانی نعمت کے حصول کا جذبہ رکھتا ہو، یہ اُسے اپنی طرف بلاتی ہے، یہ اُسے ان نعمات کے حصول کے لئے تہذیب نفس، تطہیر فکر، اعمال خیر اور پسندیدہ کردار و گفتار کی دعوت دیتی ہے۔

اس اشارے کے بعد ہم بہشت سے متعلق مختلف آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

جنت کے دروازوں کی تعداد کے مطابق ان آیات کو بھی آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

جنت میں داخلہ اور قرآن

اہل جناں کی صفات قرآن کی متعدد آیات میں بیان ہوئی ہیں، یہ اُن اعمال اور اوصاف کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں جو انسان کو اس بلند مقام تک پہنچا دیتے ہیں، انسانی کمال اور اُخروی نجات سے متعلق اسلامی نکتہ نظر کی وضاحت بھی ان آیات سے ہوتی ہے۔

یہ صفات مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ ایمان ۔۔۔۔ عمل صالح

سب سے پہلی چیز جسے نجات کے حقیقی سرمائے، سعادت کی بنیاد اور جنت کے دروازوں کی چابی کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے، وہ ایمان اور اچھے اعمال ہیں، کلام مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۸۲ ﴿البقرة: ۸۲﴾

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے اعمال انجام دیئے وہ اہل جنت ہیں، وہ اس میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔ (بقرہ، ۸۲)

بالکل یہی تعبیر یا اس سے ملتی جلتی کئی اور تعبیرات قرآن مجید کی متعدد آیات میں آئی ہیں، یہ سب اس موضوع کی اہمیت اور قرآن کے حوالے سے اس بات کی عظمت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔[1]

اس سے قرآن نے اس تو ہم پرستی کے نظریے کا خاتمہ کر دیا جو یہ تھا کہ نجات اور جنت میں داخلے کا مسئلہ ایمان اور اچھے اعمال سے ہٹ کر کسی اور امر سے وابستہ ہے، اس نظریے کا پرچار کرنے والے بعض اہل کتاب اور دوسری قوموں میں اُن جیسا نظریہ رکھنے والے افراد تھے، لیکن قرآن اس کے لئے عقیدہ اور عمل کے دو توانا بازوؤں کی موجودگی ضروری سمجھتا ہے، زیر نظر آیت بھی آیات کے اس سلسلے کے فوراً بعد آئی ہے جو یہودیوں کے بارے میں ہے وہ اپنے آپکو خدا کی پسندیدہ امت قرار دیتے تھے، اور بعض اوقات تو اپنے آپ کو خدا کے بیٹے سمجھتے تھے اور کہتے تھے:

''اگر ہم نے کبھی گناہ بھی کیا ہوگا تو پھر بھی چند ہی دن کے لئے جہنم میں جائیں گے''

گویا انہوں نے خدا سے اس بات کا عہد لے رکھا ہو۔

یہ بات واضح ہے کہ ایمان اور نیک اعمال کا آپس میں درخت اور پھل کا سا تعلق ہے، پھل کا ایک اچھا درخت پھل سے خالی نہیں ہوگا،

---

[1] آل عمران، ۱۳۶۔ نسائی، ۱۲۴۔ اعراف، ۴۲۔ حج، ۱۴، ۲۳، ۵۶۔ عنکبوت، ۵۸۔ زمر، ۷۴۔ احقاف، ۱۴۔ محمد، ۱۲ وغیرہ۔

اسی طرح ایمان بھی عمل صالح سے خالی نہیں ہوگا، مگر وہ ایمان کہ جو کمزور اور بے نور ہو وہ نفسانی خواہشات کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے، جب امام جعفر صادقؑ سے ایمان کے متعلق سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

الایمان ان یطاع اللہ فلا یعصی

ایمان یہ ہے کہ خدا کی اطاعت کی جائے اور اُس کی نافرمانی نہ کی جائے۔[1]

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ عمل صالح ایمان قلبی کی ہی تصویر ہے۔

البتہ اس سے یہ مراد نہیں کہ گنہگار یا کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والے لوگ کافر ہیں۔[2]

یہ عقیدہ تو خوارج کا ہے، مراد یہ ہے کہ پائیدار ایمان نیک اعمال سے جدا نہیں ہوتا اگر چہ کمزور ایمان کے ساتھ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب بھی ہوسکتا ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات میں ایمان عمل صالح سے پہلے ذکر کیا گیا ہے جب کہ واجبات کی انجام دہی اور محرمات سے بچنا ایمان سے مشکل کام ہے، لہٰذا اصولی طور پر اُسے پہلے آنا چاہیے تھا، ایسا اس لئے ہے کہ قرآن اس ترتیب اور بیان کے ذریعے یہ بتانا چاہتا ہے کہ اعمال صالح کی بنیاد اور جڑ ایمان ہی ہے۔

اس سلسلے کی گفتگو میں آخری بات یہ ہے کہ ایمان اور عمل صالح کی تعبیر بہت وسیع مفہوم کی حامل ہے، ایک طرف تو یہ خدا اور دین کی تمام بنیادی باتوں اور ایمان پر محیط ہے اور دوسری طرف ہر اچھا اجتماعی، انفرادی، عبادتی اور سیاسی کام اس میں آجاتا ہے، یہ جنت کی سب سے پہلی کنجی کا ذکر تھا۔

۲۔ تقویٰ

دوسرا عامل تقویٰ اور پرہیز گاری ہے قرآن کی بہت سی آیات میں اس کا ذکر آیا ہے، مثلاً سورہ مریم میں ''جنات عدن'' (بہشت کے جاودانی باغات) اور جنت کی بعض دوسری نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿٦٣﴾ (مریم: ۶۳)[3]

---

[1] اصول کافی، ج ۲، ص ۳۳، حدیث ۳۔

[2] خوارج کا ایک مسلم عقیدہ یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے (سفینۃ البحار، مادہ ''خرج'')

[3] ا۔ مندرجہ ذیل آیات بھی ''تقویٰ'' اور جنت میں داخلے کے رابطے کو بیان کرتی ہیں: (آل عمران۔ ۱۵، ۱۳۳، ۱۹۸)، (رعد، ۳۵)، (حجر، ۴۵)، (نحل، ۳۱) (فرقان، ۱۵)، (شعرائ، ۹۰)، (زمر، ۲۰، ۷۳)، (دخان، ۵۱)، (محمد، ۱۵)، (ق، ۳۱)، (ذاریات، ۱۵) وغیرہ۔

یہ وہی جنت ہے جو ہم اپنے پرہیز گار بندوں کو بطور میراث دیتے ہیں۔

اسلامی نکتہ نظر سے تقویٰ ایک بہت بلند و بالا مقام کا حامل ہے جیسا کہ سورہ حجرات کی آیت ۱۳ ایک اسلامی شعار کے عنوان سے مشہور ہے:

"ان اکرمکم عند اللہ اتقکم"

خدا کے نزدیک تم میں سے زیادہ باعزت زیادہ تقویٰ والا ہے۔

لہٰذا یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ قرآن کی متعدد آیات میں تقویٰ کو جنت کی کلید قرار دیا گیا ہے، تقویٰ کے معنی اپنے آپ کو روکنا، گناہوں سے بچنا، خدا کے ہر فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور حق وعدالت کو ملحوظ رکھنا ہے، دوسرے الفاظ میں تقویٰ خدا سے ڈرنے کی باطنی حالت اور اندرونی طور پر کنٹرول کا نام ہے، یہ حالت انسان کو ہر برائی سے روکتی ہے، اس کا ایک ایسا جامع مفہوم ہے جو تمام الٰہی، اخلاقی اور انسانی ذمہ داریوں کی ادائیگی پر محیط ہے۔

آیت کے شروع میں "تلک" کی تعبیر جو کہ دور کی طرف اشارہ ہے، یہاں پر حقیقت میں جنت کے عظیم اور بلند و بالا مقام کی طرف اشارہ ہے، گویا وہ اس قدر بلند ہے کہ ہماری فکر ونظر کی دسترس سے کوسوں دور ہے۔

"ارث" کی تعبیر ممکن ہے درج ذیل نکات میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ کر رہی ہو:

۱۔ ارث ہر پائیدار ملکیت کے معنی میں ہے کیونکہ ایسی ملکیت جو فسخ نہ ہو سکے اور واپس نہ لی جا سکے صرف وہی ہے جو انسان تک میراث کے ذریعے پہنچتی ہے، پرہیز گاروں کے لئے جنت بھی ایسی ہی ہے۔

۲۔ میراث ایک قانونی اور تشریعی پہلو کے ساتھ ساتھ ایک تکوینی اور طبیعی پہلو بھی رکھتی ہے، جس کے مطابق ماں باپ کی صفات اپنی اولاد کی طرف منتقل ہوتی ہیں، لہٰذا مذکورہ بالا آیت میں ارث سے مراد یہ ہے کہ تقویٰ اور بہشت کے درمیان ایک معنوی اور تکوینی رابطہ موجود ہے۔

۳۔ جو مال انسان کو میراث کے طور پر ملتا ہے معمولاً انسان اس کے لئے کوئی مشقت نہیں کرتا، بہشت کی نعمات اس قدر عظیم اور برتر ہیں کہ پرہیز گاروں کے اعمال اُن کے مقابلے میں بالکل معمولی ہیں، گویا انہیں بہشت بغیر کسی مشقت کے مفت میں دے دی گئی ہے، کیونکہ ان نعمتوں کے مقابلے میں اُن کی مشقت اور زحمات بالکل معمولی ہیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ یہ بات درست ہے کہ انسان کے اعمال اور اس کا تقویٰ بہشت کے استحقاق کی بنیاد ہیں، لیکن جنت کی نعمتیں اتنی عظیم ہیں کہ گویا پرہیز گاروں کو یہ مفت میں مل گئی ہوں۔

اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ خدا کی نعمتوں میں استحقاق کا پہلو ہونے کے ساتھ ساتھ تفضّل اور کرم کا پہلو بھی کار فرما ہے۔

۴۔ اس آیت کی تفسیر میں رسول اسلامؐ کی یہ حدیث بھی مروی ہے:

ما من احد الا وله منزل فی الجنة۔ ومنزل فی النار۔ فاما الکافر فیرث المومن منزله من النار والمومن یرث الکافر منزله من الجنة۔

ہر انسان جنت میں بھی ایک منزل رکھتا ہے اور جہنم میں بھی، کافر مومن کے جہنمی مقام کو بطور میراث لے لیتے ہیں اور مومن کافر کے جنتی مقام کو۔[1] یہ تعبیر واضح طور پر بتاتی ہے کہ تمام انسان آزاد پیدا کئے گئے ہیں، وہ جنت اور جہنم دونوں میں جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، یہ تو اُن کے انتخاب اور پسند پر منحصر ہے۔[2]

۳۔احسان اور بھلائی:

خدا کی نعمات کے اس عظیم ذخیرے میں داخل ہونے کا ایک اور عامل احسان اور بھلائی ہے، قرآن کی متعدد آیات میں اس کے وسیع مفہوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، سورہ مائدہ کی آیت ۸۵ میں اُن بعض عیسائی علماء کی حالت بیان کی گئی ہے جو قرآن کی آیات سن کر اتنے متاثر ہوتے تھے کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے اور وہ ایمان لا کر حق کا اعتراف کر لیتے تھے، اُن کی یہ حالت بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

فاثابهم الله بما قالو اجنات تجری من تحتها الانهار خلدین فیها و ذلك جزاء المحسنین[3]

خدا نے اُن کی اس بات کی وجہ سے انہیں جنت کے وہ باغات عطا کر دیئے جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور یہی ہے احسان کرنے والوں کی جزاء۔

درست ہے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ اُن کو یہ تمام نعمات قرآن کی عظمت اور اس پر ایمان لانے کی وجہ سے دی گئیں لیکن ہرگز یہ فقط ایک بات نہ تھی بلکہ ایسی بات تھی جو پورے ایمان کے ساتھ کہی جارہی تھی، اور یہ ایمان ان کے پورے وجود پر طاری تھا، لہٰذا اس سے پہلی آیات میں ہے:

---

[1] نور الثقلین، ج ۲ ص ۳۱، حدیث ۱۲۱۔ مجمع البیان آیت ۴۳، سورہ اعراف کے ذیل میں۔۔۔۔۔تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی یہی معنی دوسرے الفاظ میں امام جعفر صادقؑ سے سورہ مومنون آیت ۱۱ کے ذیل میں منقول ہے۔

[2] علامہ اقبال کا یہ معروف شعر اس مفہوم کی اپنے انداز سے ترجمان کرتا ہے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے (مترجم)

[3] (زمر، ۳۴) اور (مرسلات، ۴۴) میں بھی یہی بات آئی ہے۔

ترى اعينهم تفيض من الدمع مما عرفوا من الحق

تم اُن کی آنکھوں کو دیکھو گے کہ حق کو پالینے کے باعث وہ شدت شوق سے برس رہی ہیں۔

اُن کی بات احسان اور نیکی کی مصداق کیسے تھے؟اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے قرآن کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور تحقیق بھی کی، پھر اچھی طرح اعتراف اور اقرار بھی کیا اور اچھی طرح سے عمل بھی کیا۔

بعض احادیث میں ''احسان'' کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ یہ ایک ایسی عبادت اور بندگی سے عبارت ہے جو یقین کامل کے ساتھ ہو اور ہر حال میں خدا کی موجودگی کا احساس جس کے ہمراہ ہو، حضور اکرمؐ سے احسان کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا:

ان تعبد اله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك۔

خدا کی ایسی عبادت کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اُسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے۔[۱]

یہ بات واضح ہے کہ جو شخص اس بات کا احساس رکھے کہ خدا اُسے دیکھ رہا ہے تو نہ فقط یہ کہ اس کی عبادت حقیقی اور معنوی ہو جائے گی بلکہ اس احساس کے اثرات اس کے دیگر تمام اعمال، رفتار اور گفتار میں بھی ظاہر ہوں گے۔

۴۔ جہاد اور شہادت

جو شخص قرآن و اسلام سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہوُ اسے یہ معلوم ہے کہ اسلام میں مجاہدوں اور شہیدوں کا مقام بہت بلند ہے، قرآن نے واضح طور پر اس ایثار پیشہ جماعت کو جنت کی بشارت دی ہے، سورہ توبہ کی آیت ۱۱۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

ان الله اشترى من المومنين انفسهم واموالهم بأن لهم الجنة
يقاتلون فى سبيل الله فيقتلون و يقتلون وعدا عليه حقاً فى التورة
والانجيل والقران ومن اوفى بعهده من الله فاستبشروا ببيعكم الذى
بأيعتم به وذلك هو الفوز العظيم۔[۲]

خدا نے مومنوں سے اُن کی جانیں اور مال خرید لئے ہیں (جس کے بدلے میں) بہشت اُن کے لئے ہے، وہ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں، مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں، یہ اس کا سچا وعدہ ہے جو تورات، انجیل اور قرآن (تین

---

[۱] تفسیر نور الثقلین، ج۱، ص ۵۵۳ حدیث ۵۷۹ (نساء، ۱۲۵ کے ذیل میں)۔
[۲] (توبہ، ۲۰، ۲۱، ۸۸، ۸۹)، (صف، ۱۲) اور (آل عمران، ۱۴۲) میں بھی یہی مفہوم آیا ہے۔

بڑی کتابوں) میں آیا ہے، کون خدا سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرنے والا ہے؟ جب ایسا ہے تو تمہیں مبارک ہو اس معاملے پر جو تم نے خدا سے کیا ہے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

واقعاً یہ کتنی بے نظیر اور بے مثال تجارت ہے جس میں خریدار خدا اور بیچنے والے مجاہد مومنین ہیں، جس جنس کی خریداری ہو رہی ہے وہ جانیں اور مال ہیں، جو خود خدا نے ہی انہیں عطا کی ہیں، اس کی جو قیمت عطا کی جائے گی وہ جاوداں جنت کی صورت میں ہے، اس خرید و فروخت کی گواہ تین عظیم آسمانی کتابیں ہیں اور پھر اس کے بعد وہ مبارک باد ہے جو خریدار نے بیچنے والے کو دی ہے۔

کتنی خوبصورت اور دلنشین تعبیرات ہیں، کتنا نفع بخش معاملہ ہے! ایک کمزور اور ناپائیدار جنس کو کس بابرکت اور جاودانی قیمت پر خریدا گیا ہے، کس محبت کے ساتھ خدا کی طرف سے یہ کاروبار ہوا ہے۔

چنانچہ ایک حدیث شریف میں ہے کہ جب مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو آنحضرتؐ مسجد میں تشریف فرما تھے، آپؐ نے بلند آواز سے اس آیت کی تلاوت کی اور لوگوں نے نعرہ تکبیر بلند کیا، انصار میں سے ایک شخص آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا اور دریافت کیا! کیا واقعی یہی آیت تھی جو نازل ہوئی ہے؟ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: ہاں! تو اس شخص نے (خوشی سے چلا کر) کہا:

بیع ربیح لا نقیل ولا نستقیل

یہ ایسی تجارت ہے جو بہت فائدہ مند ہے نہ تو ہم اُسے رد کریں گے اور نہ ہی اس کے رد کو قبول کریں گے۔ [1]

بقول شاعرؔ

آں بیع را کہ روز ازل با تو کردہ ایم
ہرگز در آن حدیث اقالہ نمی رود

(یعنی وہ تجارت جو ہم نے تیرے ساتھ روز ازل کی ہے اس کو رد کرنے کا کوئی امکان نہیں)۔

ضمنی طور پر مذکورہ بالا آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تجارت نہ فقط شہیدان راہ حق سے کی گئی ہے بلکہ جہاد میں کامیاب و کامران ہونے والے لوگ بھی اس میں شامل ہیں، اسی بات پر کہ وہ اپنی جان کو خلوص کیساتھ ہتھیلی پر رکھ کر میدان جنگ میں آ گئے ہیں وہ بھی خدا کے ساتھ معاملے اور تجارت کے مصداق ہیں۔ یقتلون (دشمن کو مارتے ہیں) کو یقتلون (خود شہید ہو جاتے ہیں) سے پہلے لایا گیا ہے، یہ بھی اس بات پر دلیل ہے کہ اصلی ہدف دشمن کو ختم کرنا ہے نہ کہ شہادت کا حصول، شہادت تو ایک بلند مرتبہ ہے جو اس راہ کے سالکوں میں سے بعض سعادت مندوں کے نصیب میں آتا ہے، لیکن جہاد کبھی بھی شہادت کے حصول کے لئے نہیں کیا جاتا، واضح تر لفظوں میں یہ کہ شہادت ہدف اور منزل نہیں ہے بلکہ ہدف تک پہنچنے کا ایک راستہ ہے۔

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۹ ص ۴۲۹ بحوالہ تفسیر درمنثور۔

۵۔نفسانی خواہشات سے دستبرداری

ایک اور چیز جو جنت میں جانے کے اسباب میں سے ذکر ہوئی ہے وہ خدا سے ڈرنا اور نفسانی خواہشات کا مقابلہ کرنا ہے، سورہ نازعات کی آیت ۴۰ و ۴۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى

البتہ وہ جو اپنے رب کی عظمت سے ڈرا اور اس نے نفس کو خواہشات سے روکا تو اس کا ٹھکانا جنت ہے۔

خوف خدا کے اور ہوا پرستی سے روکنے کے درمیان ایک قریبی رابطہ ہے، ایک درخت کے مانند ہے تو دوسرا پھل کے مانند، جب خوف خدا انسانی روح کی اتھاہ گہرائیوں میں جاگزیں ہوجائے تو نفسانی خواہشات سے پوری طرح مقابلہ ہوسکتا ہے، یہ بھی واضح ہے کہ زمین پر ہونے والی تمام برائیوں اور گناہوں کا سرچشمہ نفسانی خواہشات ہیں، تو تمام بھلائیوں اور خوبیوں کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔

سورہ فرقان کی آیت ۴۳ ''ارایت من اتخذ الهه هویه'' کے ذیل میں ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

ما تحت ظل السمآء من اله يعبد من دون الله اعظم عند الله من هوى متبع۔

خدا کے نزدیک روئے زمین پر خواہشات نفسانی کی پیروی سے بڑھ کر بڑا بت کوئی نہیں۔[1]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان دو صفات (خوف خدا اور خواہشات نفسانی سے اجتناب) کے مدمقابل صفات کو بھی سورہ نازعات کی پہلی آیات میں ذکر کیا ہے اور وہ ہے سرکشی اور آخرت پر دنیا کو ترجیح دینا جن کا نتیجہ دوزخ ہے۔

فاما من طغى واثر الحيوة الدنيا فان الجحيم هى الماوى۔

(نازعات۔۳۷ تا ۳۹)

اور یہ سچ بھی ہے کہ تمام بدبختیوں اور برائیوں کا سرچشمہ، یہ دو صفات ہیں اور تمام سعادتوں کا منبع وہ پہلی دو صفات ہیں (غور کیجئے گا)۔

بعض مفسرین کے بقول سورہ آل عمران کی آیت ۱۴ میں گناہوں کے جن سات سرچشموں کی بات کی گئی ہے وہ سب کے سب نفسانی خواہشات کے زمرے میں آتے ہیں اور نفسانی خواہشات کا سرچشمہ خدا کی معرفت اور اس کا خوف نہ ہونا ہے، وہ سات سرچشمے یہ ہیں:

زين للناس حب الشهوت من النسآء والبنين والقنا طير المقنطرة

---

[1] تفسیر درمنثور۔ج۵ ص ۷۲

من الذهب والفضة والخیل المسومة والانعام والحرث۔

عورتوں، اولاد، سونے اور چاندی کے ذخیروں، ممتاز گھوڑوں، جانوروں اور کھیتی باڑی کی محبت کو لوگوں کی نظروں میں جلوہ گر کیا گیا ہے۔

سورہ نازعات کی زیرنظر آیت میں ''مقام رب'' سے کیا مراد ہے، مفسرین نے اس سلسلے میں متعدد تفسیریں بیان کی ہیں، بعض اسے قیامت کی منزلوں کی طرف اشارہ قرار دیتے ہیں جن میں سے ایک حساب کی منزل ہے، بعض دوسرے مفسرین اُسے خدا کے علم کی بلندی اور بندوں کے اعمال پر اس کی نظر کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، بعض اس سے مراد اُس کی عدالت لیتے ہیں، حقیقت میں ان سب تفاسیر کی برگشت اپنے گناہوں اور اعمال سے ڈرنے کی طرف ہے، کیونکہ خدا ''ارحم الراحمین'' ہے اُس کی ذات میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے انسان ڈرے، لیکن جیسا کہ مجرم ایک منصف قاضی کو دیکھ کر ڈرتے ہیں اور عدالت اور محاسبے کے نام سے گھبراتے ہیں اسی طرح گنہگار بھی خدا کے مقام عدل، حساب اور علم سے ڈرتے ہیں (غور کیجئے گا)۔ حقیقت میں اس دنیا میں بھی ایک دوزخ ہے جو کہ خواہشات کا دوزخ ہے، آخرت میں بھی ایک دوزخ ہے جو سزاؤں کا دوزخ ہے، اس دوزخ کا سرچشمہ وہی پہلے والا دوزخ ہے۔

اس گفتگو کو ہم حضرت امام جعفر صادقؑ کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

من علم ان الله یراه ویعمع ما یقول۔ ویعلم ما یعمله من خیر اوشر فیحجزه ذلك عن القبیح من الاعمال، فذلك الذی خاف مقام ربه ونهی النفس عن الهوی۔

جو یہ جانتا ہو کہ خدا اُسے دیکھ رہا ہے، جو کچھ وہ کہتا ہے وہ سن رہا ہے اور جو نیکی یا برائی وہ انجام دیتا ہے خدا اُسے جانتا ہے، اور یہ توجہ اُسے برے اعمال سے روک لے، تو یہ وہی شخص ہے جو اپنے رب کے مقام سے خوف زدہ ہے اور اپنے آپ کو نفسانی خواہشات سے روکتا ہے۔[1]

٦۔ ایمان میں سبقت

ہر نئے الٰہی مکتب کی پیدائش سے کئی فرسودہ روایات ٹوٹ جاتی ہیں، بالخصوص اسلام تو ایک ایسے معاشرے میں رونما ہوا جو برائیوں سے پر تھا اور جھوٹے امتیازات پر مبنی تھا، واضح ہے کہ ایسے دین کے پیغمبر پر پہلے ایمان لانا مشکل کام ہے، اس کے لئے بہت زیادہ دلیری اور ہمت کی ضرورت ہے، کیونکہ ہمیشہ ایمان میں سبقت لے جانے والے لوگوں پر ہی متعصب جاہل حملہ آوار ہوتے ہیں، چونکہ یہ لوگ اقلیت میں

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۵ ص ۱۹۷، حدیث ۴۸، (اصول کافی، ج ۲ ص ۷۰ باب الخوف والرجاء، حدیث ۱۰)۔

ہوتے ہیں اس لئے اُن کی جان اور مال کو ہمیشہ خطرہ رہتا ہے۔

علاوہ ازیں وہ دوسروں کے لئے بھی اسوہ عمل بن جاتے ہیں جس سے دنیا میں دین حق تیزی سے پھیلتا ہے، ان چار وجوہات کی بناء پر سابقین کا درجہ بہت بلند ہے، اسی لئے قرآن نے ان سے جنت کا یقینی وعدہ کیا ہے، سورہ واقعہ کی آیت ۱۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

والسابقون السابقون۔ اولٓئك المقربون۔ فی جنت النعیم۔ [۱]

اور آگے بڑھنے والے ہی سب سے آگے ہوں گے، وہی اللہ تعالیٰ کے مقرب ہوں گے۔ وہ نعمتوں والی جنت میں ہوں گے۔

یہ اس صورت میں ہے جب ہم ''سابقون'' کا معنی ایمان میں سبقت لے جانے والے کریں، لیکن بعض مفسرین نے اس کا معنی خدا کی اطاعت میں سبقت لے جانا کیا ہے، یا پنجگانہ نمازوں یا جہاد یا ہجرت یا توبہ میں سبقت لے جانا کیا ہے، یہ مفہوم بھی ہمارے مقصد کے لئے دلیل بن سکتا ہے کیونکہ ان اعمال میں سبقت لے جانے والے لوگ وہی ہیں جو دوسروں کے لئے اسوہ اور مثال ہیں، اسی طرح وہ لوگ جو ایثار پیشہ، شجاع اور خدا پر بھروسہ کرنے والے ہیں وہ جنت کی نعمات سے بہرہ مند ہونے کے سزاوار ہیں۔

روایات میں ''سابقون'' سے مراد حضرت علیؑ کو لیا گیا ہے کہ جو مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے تھے اور کبھی اس سے مراد چار حضرات ''ہابیل''، ''مومن آل فرعون''، ''حبیب نجار''، ''اور حضرت علیؑ لئے گئے ہیں، ان میں سے ہر ایک اپنے دور میں ایمان میں سبقت لے جانے اور جہاد اور اچھے اعمال کا روشن اور واضح ترین مصداق ہے۔ [۲]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات کے مطابق خدا نے سب سے پہلی نعمت جو انہیں عطا کی ہے وہ اپنے قرب کی نعمت ہے ''اولٓئک المقربون'' اور یہ نعمت عظیم نعمتوں اور جنات النعیم سے بڑھ کر ہے۔

''جنات'' (جنت کے باغات) کا ذکر بغیر ''نعیم'' کے کہ جو نعمت کی جمع ہے، مقصود سمجھانے کے لئے کافی ہے، لیکن ان دونوں لفظوں کو اکٹھا ذکر کیا گیا ہے جو جنت کی نعمتوں پر زیادہ تاکید اور اہمیت کے لئے ہے، یہ تعبیر ایک اور مطلب کی طرف اشارہ بھی ہو سکتی ہے کہ نعمت کا مرکز صرف جنتی باغات ہی ہیں، دنیاوی باغات کے خلاف کہ اُن کی حفاظت اور پرورش کے لئے بہت زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے اور ہر لمحے اُن کے تباہ اور خراب ہونے کا دھڑکا بھی لگا رہتا ہے۔

---

[۱] حدید، ۲۱۔ آل عمران، ۱۳۳ میں بھی یہی معنی آیا ہے۔

[۲] ان حدیثوں کے لئے احقاق الحق، ج ۳، ص ۱۱۴، ج ۱۵ ص ۳۴۵ کے بعد اور تفسیر نور الثقلین ج ۵، ص ۲۰۹ حدیث ۱۸، ۱۹، ۲۰ اور ۲۱ کو ملاحظہ کیا جائے۔

۷۔ہجرت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جہاد:

ہجرت سے مراد ''کفر، شرک، ظلم اور گناہ کے مرکز سے دور ہو جانا ہے، بہت سے مقامات پر مومنوں اور نیک و پاکیزہ لوگوں کی مشکلات کا حل صرف ہجرت میں پنہاں ہوتا ہے، وہ ایسے ماحول سے دور جا کر اپنے آپ کو بناتے ہیں، اپنی آبادی کو تیار کرتے ہیں، قوت جمع کرتے ہیں تا کہ شرک اور ظلم کے نمائندوں کے ساتھ جہاد و مبارزہ کر سکیں۔

یہ کام مسلمانوں نے دو مرتبہ انجام دیا ہے، مسلمانوں کی ایک مخصوص جماعت کی مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت اور پھر سب مسلمانوں کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت جو تاریخ اسلام میں ایک درخشاں باب کا اضافہ تھی۔

واضح ہے کہ گھر بار، پیاروں، دوستوں، کام اور وطن کو چھوڑنا بہت مشکل کام ہے اور پھر جہاد اور کفر و فساد کی سرزمین پر حملے کی تیاری اس سے بڑھ کر ایک اور مشکل کام ہے، اسی لئے قرآن نے مہاجرین کو واضح طور پر جنت کی نوید سنائی ہے، سورہ توبہ کی ۲۰ سے لے کر ۲۲ آیت تک میں ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ [1]

وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا اُن کا مرتبہ خدا کے نزدیک بلند ہے، وہی کامیاب ہیں، اُن کا رب انہیں اپنی رحمت، خوشنودی اور جنت کے اُن باغات کی خوشخبری دیتا ہے جن میں جاودانی نعمات ہیں۔

اس آیت میں ان لوگوں کے متعلق گفتگو ہے جو ''ایمان''، ''ہجرت'' اور ''جہاد'' جیسے اوصاف کے حامل ہیں، (البتہ ان میں سے ہر ایک صفت دوسری صفت کے ساتھ علت اور معلول کے رابطے کی حامل ہے یعنی اُن کا ایمان ہجرت کا سبب بنا اور اُن کی ہجرت جہاد کا پیش خیمہ ثابت ہوئی)، اُن کی جزا کے طور پر بھی تین چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، رحمت الٰہی، خوشنودی حق اور جنت کے پرنعمت باغات، اس لحاظ سے ہر نیک کام کے بدلے میں ایک عظیم نعمت اور صلے سے انہیں نوازا گیا، ایمان گناہوں کی بخشش کا باعث بنا، تو ہجرت رب کی خوشنودی کا موجب بنی، جب کہ مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد جنت کے پرنعمت باغات کے حصول کا سبب بنا۔

مفسرین کے درمیان مشہور ہے کہ ''شیبہ'' اور ''عباس'' دونوں ایک دوسرے پر برتری کا دعوے کر رہے تھے، ایک کہہ رہا تھا:

---

[1] یہی معنی توبہ، ۱۰۰ میں بھی آیا ہے۔

میں خانہ کعبہ کا کلید بردار اور مسجد الحرام کا متولی ہوں۔

جب کہ دوسرا کہہ رہا تھا:

حاجیوں کو پانی پلانے کا عظیم منصب میرے پاس ہے۔

اسی دوران میں حضرت علیؑ نے کہا:

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں ایمان لایا، ہجرت کی اور جہاد میں حصہ لیا۔

چنانچہ مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی جس نے باقی سب پر علیؑ کی برتری اور فضیلت کو ثابت کر دیا۔[۱]

مفسرین نے اس سلسلے میں کئی اقوال ذکر کئے ہیں کہ قرآن مجید نے مہاجر و مجاہد مومنین کا مقام دوسروں سے کیسے بلند قرار دیا ہے جب کہ جو لوگ مومن نہیں ہیں وہ اصلاً کسی مقام کے حامل نہیں ہیں، لیکن ایک مختصر سا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ ایک یہ کہ صفات تفضیلی میں ایسا اکثر ہوتا ہے کہ دوسری جانب کے لئے کسی قسم کی فضیلت نہیں ہوتی جیسے:

ولعبد مومن خیر من مشرك

بندہ مومن مشرک سے بہتر ہے۔ (بقرہ، ۲۲۱)

اس طرح کی تعبیرات قرآن، روایات اور روزمرہ کے محاورات میں بہت زیادہ استعمال ہوتی ہیں، دوسرا یہ کہ حاج کو پانی پلانا اور مسجد الحرام کو آباد کرنا بذات خود ایک فضیلت والا کام ہے، جو کوئی بھی اسے انجام دینے والا ہو، تاہم اگر یہ کام انجام دینے والے کافر اور بے ایمان ہوں تو اُن کا یہ نیک عمل حبط اور بے اثر ہو جاتا ہے۔

۸۔ مصیبتوں میں صبر و تحمل:

پامردی تمام مثبت کاموں کی بنیاد اور ہر اطاعت کی اساس ہے، اسی لئے جنت میں جانے کا ایک سبب استقامت اور پامردی کو قرار دیا گیا ہے، سورہ دہر کی آیت ۱۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

"وجزاھم بما صبروا جنۃ وحریرا "[۲]

---

[۱] شواہد التنزیل میں ابو القاسم حسکانی نے زیر نظر آیت کے ذیل میں ص ۲۴۴ اور اس کے بعد (البتہ خلاصے کے ساتھ) اسی مضمون کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ اہل سنت کی متعدد کتابوں سے ذکر کیا ہے۔ (مزید تفصیل کے لئے احقاق الحق ج ۳ ص ۱۲۲، ص ۱۲۷ کی طرف رجوع کیا جائے)۔

[۲] یہی معنی رعد ۲۱ تا ۲۴ اور فرقان ۷۵ میں بھی آیا ہے۔

خدا نے اُن (نیک بندوں) کو اُن کے صبر کی وجہ سے بہشت اور حریر کے لباس (بہشتی کپڑے) صلے کے طور پر دیئے ہیں۔

جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو فرشتے انہیں خوش آمدید کہیں گے جو ان صابر لوگوں کی عظمت اور بلندی کی دلیل ہوگی، ان سے کہیں گے:

"سلام علیکم بما صبرتم" (رعد: ۲۴)

تم پر سلامتی، اس صبر اور استقامت کی وجہ سے جس کا تم نے مظاہرہ کیا۔

زیر نظر آیت سورہ دھر کی آیات میں سے ہے، بہت سے شیعہ اور سنی مفسرین کے بقول یہ علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، اور حسینؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ انہوں نے صبر کے بہت بلند مرتبے کا مظاہرہ کیا، تین دن مسلسل پانی کے ساتھ روزہ افطار کیا اور اپنا کھانا مسکین، یتیم اور اسیر کو دے دیا، یہی اطاعت میں صبر ہے۔

واضح ہے کہ زندگی کے مصائب اور تکالیف کے مقابلے میں صبر اور مختلف مشکلات میں استقامت اور اسی طرح گناہ پر اُبھارنے والے عوامل کے مقابلے میں صبر و استقامت بھی جنت کی کنجی شمار ہوتے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں جنت کی تمام عظیم نعمتوں میں سے خوبصورت اور قیمتی لباسوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، یہ یا تو اس لئے ہے کہ صابرین کی یہ جماعت اپنا کھانا بھوکوں کو کھلانے کے ساتھ ساتھ اپنے لباس بھی انہیں عطا کر دیتے تھے یا اس لئے کہ انسان کا ظاہری جمال اور خوبصورتی لباس کے ساتھ ہے جیسا کہ انسان کے باطن کی خوبصورتی تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ ہے جسے قرآن میں ''لباس تقویٰ'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

۹۔ جادہ مستقیم پر ایمان اور بقاء

بعض دوسری آیات میں ایمان و اطاعت کے لئے سیدھے راستے پر گامزن رہنے کو جنت میں داخلے کا سبب قرار دیا گیا ہے، سورہ احقاف کی آیت ۱۳ اور ۱۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝۱۴

[۴۶:۱۴]

جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار خدا ہے، پھر انہوں نے استقامت کی تو اُن کے لئے خوف ہے اور نہ ہی غم، وہ اصحاب

جنت میں اور اُس میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے، یہ اُن اعمال کا صلہ ہے جو انہوں نے انجام دیئے۔ [۱]

''استقاموا'' کا مادہ ''استقامت'' ہے جس کا معنی سیدھے اور صحیح راستے پر ثابت قدم رہنا ہے، دوسرے الفاظ میں اس میں اعتدال اور انحراف سے دوری کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور اسی طرح ثابت قدم رہنے کا بھی، اگر بعض ارباب لغت نے اس کا معنی اعتدال اور میانہ روی کیا ہے تو وہ بھی اسی لحاظ سے ہے۔

راغب مفردات میں کہتے ہیں:

استقامت اس راہی کے لئے کہا جاتا ہے جو سیدھے راستہ پر گامزن ہو، اسی لئے راہ حق کو ''صراط مستقیم'' کہتے ہیں، انسان کی استقامت کا لازمہ صراط مستقیم پر ہونا ہی ہے۔ [۲]

لہٰذا استقامت کے مفہوم میں راستہ صاف ہونے کا معنی بھی پایا جاتا ہے اور اس کے پائیدار اور مضبوط ہونے کا بھی، لہٰذا جنت میں داخل ہونے کا ایک سبب حق اور سچ کے راستے پر گامزن اور ثابت قدم رہنا ہے۔

بعض روایات میں جو آئمہ معصومین سے اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں مروی ہیں اُن میں ہے کہ:

استقاموا علی ولایۃ امیر المومنین۔

یعنی مراد علیؑ کی ولایت پر ثابت قدم رہنا ہے (جو کہ حقیقی اسلام کا جادہ حق ہے) [۳]

پہلے جو ایمان کی بات کی گئی ہے اور کہا گیا ہے (قالو ربنا اللہ) اور پھر صحیح راستے پر استقامت کو ''ثم'' کے ذریعے عطف کیا گیا ہے جو کہ عموماً فاصلے کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسا عمل ایسے ایمان کا ہی نتیجہ ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ انسان کو پریشانی یا تو ان کاموں کی وجہ سے ہوتی ہے جو اس سے پہلے سرزد ہوئے ہیں، اُن پر وہ غمگین ہوتا ہے اور کبھی اُس کی پریشانی کا سبب آئندہ آنے والے امور ہوتے ہیں، اُن سے خوف زدہ ہوتا ہے، قرآن زیر نظر آیت میں کہتا ہے کہ ''جو ان دو صفات کے حامل ہیں نہ تو انہیں گزشتہ کا کوئی غم ہے اور نہ ہی آئندہ کا کوئی خوف''۔

لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون

گفتگو کے اس سلسلے کو پیغمبر اسلامؐ کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

---

[۱] آیات ۳۰، ۳۱ سورہ فصلت میں بھی اسی معنی کو بیان کیا گیا ہے۔

[۲] مفردات راغب، مادہ ''قوم''۔

[۳] تفسیر علی بن ابراہیم۔ سورہ حٰم سجدہ کی آیہ کے ذیل میں جو کہ مذکورہ بالا آیت سے ملتی جلتی ہے ج ۲، ص ۲۶۵ اسی طرح زیر نظر آیت کے ذیل میں، ص ۲۹۷۔

کسی نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کیا:

مجھے وہ عمل بتایئے جس کے باعث میں جنت میں داخل ہو جاؤں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا:

"قل ربی اللہ ثم استقم"

کہو میرا رب اللہ ہے اور پھر اس پر قائم رہو (کہ جنت میں داخل ہونے کا سرمایہ یہی ہے)۔

پھر اس نے سوال کیا:

سب سے خطرناک چیز کیا ہے جس سے مجھے بچنا چاہیے؟

آپؐ نے اپنی زبان کو پکڑا اور فرمایا: "یہ" [۱]

۱۰۔ خدا اور رسولؐ کی اطاعت

جنت میں داخلے کی ایک کنجی خدا اور رسول خداؐ کے فرمان کی اطاعت و فرمانبرداری ہے، سورہ نساء کی آیت ۱۳ میں ارشاد ہوتا ہے:

ومن یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنت تجری من تحتھا الانھر خلدین فیھا و ذلك الفوز العظیم۔

جو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اُسے جنت کے باغات میں داخل کیا جائے گا جن کے نیچے ہمیشہ نہریں جاری ہیں، اُس میں ہمیشہ کے لئے رہے گا اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ [۲]

"جنات" کی تعبیر جنت کے کئی باغات ہونے پر دلیل ہے جن میں عرفاء، صلحاء، نیک اور پاک لوگوں کا مقام ہوگا۔

"تجری من تحتھا الانھر" کی تعبیر اُن باغات کے سرسبز اور انتہائی خوبصورت ہونے کی دلیل ہے کیونکہ جو درخت نہروں کے کنارے پر ہوتے ہیں وہ ہمیشہ سرسبز اور شاداب ہوتے ہیں۔

"خلدین فیھا" کی تعبیر نعمتوں کے ایک ختم نہ ہونے والے سلسلے کی طرف اشارہ کر رہی ہے کیونکہ معمولاً نعمتوں کے ختم ہو جانے اور فنا ہونے کا خطرہ انسان کو پریشان رکھتا ہے، یہ تعبیر اس دھڑکے کو بھی ختم کر رہی ہے، یہاں پر صیغۂ جمع کو لانا اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ جنتی لوگ آپس میں مل جل کر رہنے اور پیار و محبت سے زندگی گذارنے کی نعمت سے بہرہ مند ہوں گے، جب کہ بعد والی آیت جس میں خدا اور رسول کی

---

[۱] تفسیر ابوالفتوح رازی، ج۱۰، ص ۲۲۔

[۲] فتح ۱۷ میں بھی یہی معنی آیا ہے۔

نافرمانی کر کے جہنم میں ہمیشہ کے لئے رہنے کا تذکرہ ہے وہاں پر ''خالدا'' کو ''مفرد'' کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ لوگ جہنم میں تنہائی کے عذاب سے بھی دوچار ہوں گے، گویا ہر ایک جہنم میں قید تنہائی کا شکار ہوگا۔

۱۱۔ اخلاص:

عقیدہ، عمل اور نیت میں خلوص سے کام لینا بھی جنت میں جانے کا ایک عامل ہے، سورہ صافات کی آیت ۳۹ تا ۴۳ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ فَوَاكِهُ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ

جو کچھ تم نے انجام دیا ہے تمہیں اسی کا بدلہ دیا جائے گا، مگر خدا کے مخلص بندے کہ جن کے لئے ایک معین اور مخصوص رزق ہے، مختلف میوے ہیں اور اُن کی تکریم کی جائے گی جنت کے نعمات سے بھرے ہوئے باغات ہیں۔

ان آیات میں جہنمیوں کے دردناک عذاب کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ''مخلصین'' کو جدا کر لیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ وہ ان تمام سزاؤں سے محفوظ ہیں۔ [1]

لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ مخلصین (لام پر زبر کے ساتھ) کون لوگ ہیں؟ کلام مجید کی آیات میں غور و فکر کے ساتھ یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ مخلِص (لام پر زیر کے ساتھ) وہ ہے جو اپنے آپ اپنے اعمال اور اپنی نیت کو خالص کر لے، یہ عموماً ایسے موارد پر استعمال ہوتا ہے جن میں انسان خودسازی کے مراحل طے کر رہا ہے جب کہ مخلَص (لام پر زبر کے ساتھ) وہ ہے جس کو خالص کر دیا گیا ہو، یہ گویا اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو ایمان، معرفت اور عمل کے لحاظ سے اس بلند و عظیم مرتبہ تک پہنچ چکا ہو جو شیطانی وسوسوں کے اثر انداز ہونے سے محفوظ ہو، ابلیس اس کے مقابلے میں شکست کھا چکا ہو، چنانچہ قرآن کریم ابلیس سے یہ بات ذکر کرتا ہے:

فبعزتك لا غوينهم اجمعين الا عبادك منهم المخلصين۔

تیری عزت کی قسم! میں اُن سب کو تیرے مخلص بندوں کے سوا گمراہ کروں گا۔ (ص، ۸۳)

حقیقت میں انسان کے وجود کی ناخالص باتیں دو طرح کی ہیں، بعض تو اُن میں سے قابل تشخیص اور قابل رفع ہیں جب کہ بعض اس قدر باریک اور مخفی ہیں کہ یا تو انسان پر پوشیدہ رہتی ہیں یا اگر آشکار ہو بھی جائیں تو انسان انہیں دور کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، جب انسان

---

[1] واضح ہے کہ اس صورت میں یہ استثناء منقطع ہے، بہت سے مفسرین نے بھی یہی کہا ہے لیکن اگر ''ما تجزون'' کا خطاب تمام انسانوں کے لئے ہو جس میں مومن اور کافر سب شامل ہیں تو اس صورت میں یہ استثناء متصل ہوگا، لیکن یہ مطلب کچھ بعید محسوس ہوتا ہے۔

جادہ اخلاص پر قدم رکھتا ہے اور پہلی قسم کی ناخالصیوں کو اپنی روح، جان اور اعمال سے دور کرتا ہے تو خدا اپنے لطف وکرم سے دوسری قسم کی نا خالص چیزوں کو اس سے دور کردیتا ہے، پھر ہی اُس کا نام مخلص (خالص کہا گیا) رکھا جاتا ہے۔

خدا نے اس جماعت کو اُن امتیازات سے نوازا ہے جو اس نے اپنے دوسرے بندوں میں سے کسی کو بھی عطا نہیں کئے۔

مثلاً زیرِ نظر آیات کے مطابق خدا انہیں اپنے مخفی الطاف کا مخصوص رزق عطا کرتا ہے، وہ اس کی ذات پاک کے جلوے سے سرور حاصل کرتے ہیں، اس کے باطن کے شہود سے مست ہو جاتے ہیں، اُن کا دل شوق خدا کے پیمانے سے لبریز ہوتا ہے، وہ سر سے لے کر پاؤں تک اس کے عشق اور وصال کے جذبے سے مخمور ہوتے ہیں یہ وہی ہے جسے ایک اشارے میں بیان کیا گیا ہے کہ:

اولٓئك لهم رزق معلوم

اُن کا ایک اور امتیاز شیطانی وسوسوں سے محفوظ رہنا ہے، اس کی طرف بھی اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔

ان کا تیسرا امتیاز عرفان کے بلند مقام تک پہنچ جانا ہے، اُن کی معرفت کا یہ مقام ہے کہ وہ خدا کی صحیح توصیف کر سکتے ہیں، وہ توصیف نہیں جس میں شرک جلی یا خفی ہو۔

صافات ۱۵۹، ۱۶۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِيۡنَ

خدا اس توصیف سے پاک ہے جو وہ کرتے ہیں مگر خدا کے مخلص بندے (کہ جو ہر عیب اور نقص سے پاک خدا کی توصیف کرتے ہیں)۔

اس لحاظ سے اُن کی معرفت سب سے بند، شیطان اور نفسانی خواہشات کے مقابلے میں اُن کا دفاع سب سے بہتر اور قیامت میں اُن کی پاداش سب سے بڑھ کر ہے اور یہی مخلصین کی جزا ہے۔

اللهم اجعلنا من المخلصين۔ بحق محمد واله الطاهرين۔

۱۲۔ صدق وسچائی

انسانی اعمال میں صدق وسچائی سے بڑھ کر کوئی اور عمل خوبصورت اور جاذب نظر نہیں ہے، روایات سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عمل کے ترازو میں بھی اس کا وزن بہت بھاری ہے کیونکہ اولیاء اللہ کی ایک بلند ترین صفت یہی صدق بیان کی گئی ہے، قرآن بھی اسے جنت میں جانے کی ایک اہم کنجی قرار دیتا ہے۔ مائدہ ۱۱۹ میں ارشاد ہوتا ہے:

هٰذَا يَوۡمُ يَنۡفَعُ الصّٰدِقِيۡنَ صِدۡقُهُمۡ ؕ لَهُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ

آج (قیامت کا دن) وہ دن ہے کہ سچوں کا سچ بولنا انہیں فائدہ پہنچائے گا، اُن کے لئے جنت کے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ اس میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔[1]

واضح ہے کہ اس سے مراد دنیا میں سچ بولنا ہے، عقیدے میں سچائی، گفتار میں سچائی اور عمل میں سچائی، ہر ایک تقویٰ کی ایک مسلم علامت ہے، وگرنہ آخرت میں تو صدق اور سچائی کا حکم نہیں دیا گیا، لہٰذا وہاں پر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، علاوہ ازیں اس دن حالات کچھ اس طرح کے ہوں گے کہ سچ بولنے کے علاوہ چارہ ہی نہیں ہوگا، اگر گنہگار بھی وقتی طور پر حقائق کا انکار کریں گے تو جلد ہی متوجہ ہوجائیں گے کہ اُن کی یہ کوشش فضول ہے، لہٰذا آخر کار اپنے تمام گناہوں کا اعتراف کرلیں گے۔

اس تعبیر سے یہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تمام نیک اعمال کا خلاصہ سچ اور صدق میں کیا جاسکتا ہے، تھوڑے سے منطقی غور وفکر سے بھی یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کیونکہ تمام گناہوں کی برگشت اسلام اور ایمان کے دعویٰ میں سچے نہ ہونے کی طرف ہے، وگرنہ جو شخص ایک آئین اور قانون کو باقاعدہ طور پر مانتا ہو، وہ عمل کے مقام پر اس کی خلاف ورزی کیسے کرسکتا ہے۔

صدق وسچائی کی اہمیت اس لیے ہے کہ اسے افراد کے امتحان اور آزمائش کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، رسول اسلامؐ کی ایک حدیث میں ہے کہ:

لا تنظروا الی کثرۃ صلاتھم و صومھم و کثرۃ الحج والمعروف وطنطنتھم باللیل ولکن انظروا الی صدق الحدیث واداء الامانۃ۔

ان کے نماز اور روزہ، حج، نیک کاموں اور رات میں ان کی (عبادت کی) آوازوں کی طرف نہ دیکھو بلکہ اُن کی بات کی سچائی اور امانت کی ادائیگی کی طرف دیکھو۔[2]

رسول اکرمؐ کی ایک حدیث ہے کہ:

ان الصدق یھدی الی البر والبر یھدی الی الجنۃ

صدق نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف۔[3]

---

[1] اس آیت میں ''ہذا'' مبتداء اور ''یوم'' اس کی خبر ہے اور ''ینفع''۔۔۔۔۔۔کا جملہ ''یوم'' کے لئے مضاف الیہ ہے۔

[2] بحار الانوار، ج ۶۸ ص ۹، حدیث ۱۳۔

[3] محجۃ البیضاء، ج ۸ ص ۱۴۰۔

اس لحاظ سے صدق وسچائی جنت کی ایک کلید اور کنجی ہے۔

۱۳۔خودسازی اور تزکیہ نفس:

بے شک جنت نیک اور پاک لوگوں کی جگہ ہے، اسی لئے قرآن میں ایسے لوگوں کی پاداش اور صلے کے سلسلے میں ہی جنت کا ذکر ہوا ہے، سورہ طٰہٰ آیت ۷۵،۷۶ میں دربار فرعون کے اُن جادوگروں کی بات ذکر کی جاتی ہے جو موسیٰ کے اُس معجزے پر ایمان لائے جو اُن کے جادو پر غالب آ گیا تھا، فرعون اور فرعون پرست لوگوں کی دھمکیوں کے جواب میں ہے:

وَمَنْ يَّأْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى

جو لوگ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ اپنے رب کے سامنے حاضر ہوتے ہیں، اُن کے لئے بلند درجات ہیں، یہ بلند درجات وہی جنت کے جاودانی باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ اُن میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے یہی جزاء ہے اس شخص کی جو اپنے آپ کو پاکیزہ کرے۔

''تزکیٰ'' کا مادہ ''تزکیہ'' ہے جس کا معنی پاک کرنا ہے، عقیدے، گفتار اور عمل کی پاکیزگی اس میں شامل ہے، حقیقت میں جنت ایک ایسی جگہ ہے جو ہر لحاظ سے پاک و پاکیزہ ہے، لہٰذا یہ بات بالکل فطری ہے کہ پاکیزگی سے تہی دست لوگ اس میں داخل نہیں ہوسکیں گے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں جنت کے بلند درجات اُن لوگوں کے لئے قرار دیئے گئے ہیں، جو ایمان، اچھے اعمال، اور تزکیہ نفس کے حامل ہوں گے، لہٰذا اس میں کوئی اشکال نہیں ہے کہ ''نیچے والے درجات'' اُن لوگوں کے لئے ہوں جو ایمان تو رکھتے ہیں لیکن کبھی اچھے کام انجام دیتے ہیں اور کبھی برے کاموں کا ارتکاب کرتے ہیں (لیکن جب تک وہ بھی پاک و پاکیزہ نہیں ہوجائیں گے اس وقت تک پاک لوگوں کی جگہ یعنی جنت میں داخل نہیں ہوسکیں گے)۔

اس نکتے کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ آیات دربار فرعون کے جادوگروں کی زبان سے نہ ہوں بلکہ بلاواسطہ خدا کی بات ہو، بہرحال ہر دو کا نتیجہ یہاں پر ایک ہی ہے۔

۱۴۔انفاق اور استغفار

گناہوں سے توبہ، خدا کی طرف رجوع، تنگدستی اور خوشحالی کے دوران خدا کی راہ میں خرچ کرنا، غصے کو ٹھنڈا کرنا اور عفو و درگذر سے کام لینا اور گناہ کا تکرار نہ کرنا، یہ سب ہی ایسی باتیں ہیں جن پر عمل کرنے سے انسان کو جنت کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ آل عمران (۱۳۳ تا ۱۳۶) میں ارشاد ہوتا ہے:

وسارعوا الی مغفرة من ربکم وجنة عرضها السموات والارض اعدت للمتقین۔

اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھو جس کا پھیلاؤ (سب) آسمانوں اور (ساری) زمین جتنا ہے اور جو پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

پھر ان لوگوں کا ذکر ہے جو فراخی اور تنگدستی دونوں حالتوں میں خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اپنے غصے کو روک لیتے ہیں، گنہگاروں سے درگذر کرتے ہیں، یہ نیک کام کرنے والے ہیں، یہ لوگ جب کوئی برا کام کریں یا اپنے آپ پر ظلم کریں تو خدا کی یاد میں مصروف ہو جاتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں:

الذین ینفقون فی اسرآء والضرآء والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین۔ والذین اذا فعلوا فاحشة اوظلموا انفسهم ذکرو اللہ فاستغفرو لذنوبهم........)

آخر میں انہیں ایک بار پھر جنت کی نوید دی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے:

اولٓئك جزآء هم مغفرة من ربهم وجنت تجری من تحتها الانهر.......

ان کی جزا ان کے پروردگار کی مغفرت اور جنت کے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔

مغفرت کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھنا اور جلدی کرنا اسباب مغفرت کی طرف جلدی سے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی طرف اشارہ ہے، لہٰذا بعض نے اس کی تفسیر اسلام کی ہے، بعض نے فرائض کی بجا آوری، بعض نے ہجرت، بعض نے پنجگانہ نمازیں، بعض نے جہاد اور بعض نے توبہ سے اس کی تفسیر کی ہے، ان میں سے ہر ایک امر خدا کی طرف سے مغفرت کا باعث بنتا ہے، یہ تمام امور مجموعی طور پر جنت کی تیزی سے بڑھنے کا وسیلہ ہیں، لہٰذا بعد کی آیات میں انفاق، استغفار، عفو و درگذر اور احسان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو مغفرت کے اسباب کا نمایاں عنوان ہیں اور جنت کے دروازوں کی کنجیاں ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہی معنی اس مختصر سے فرق کے ساتھ کہ ''سارعوا'' کے بجائے ''سابقوا'' آیا ہے، سورہ حدید، ۲۱ میں بیان ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

سابقوا الی مغفرة من ربکم و جنة عرضها کعرض السمآء والارض۔

''سارعوا'' جو کہ باب ''مفاعلہ'' میں سے ہے اور جس کا معنی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا ہے،

کالازمی نتیجہ مسابقہ اورایک دوسرے سے آگے نکلنا ہے (غور کیجئے گا)۔

لیکن بعض مفسرین نے ''سارعوا'' کوجلدی یا تیز رفتاری کے معنی میں لیا ہے، انہوں نے باب مفاعلہ کے معنی سے چشم پوشی کی ہے۔

بہرحال یہ تعبیرات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ دنیا مقابلے اور ایکدوسرے سے آگے بڑھنے کا میدان ہے، اس مقابلے کا آخری کنارہ خدا کی بخشش اور جنت تک پہنچنا ہے اور وہ جنت بہت وسیع اور بے نظیر ہے۔

جنت کی وسعت کے سلسلے میں اسی جلد میں گفتگو ہوگی۔

۱۵۔خوف خدا

خوف خدا یعنی اس کی عدالت، حساب وکتاب اور سزا سے ڈرنا مختلف گناہوں کے مقابلے میں ایک ڈھال کا کام دیتا ہے اور گناہوں سے روکنے کے لئے ایک موثر عامل ہے، اسی لئے اُسے جنت کی ایک کنجی شمار کیا گیا ہے، سورہ رحمن کی آیت ۴۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

ولمن خاف مقام ربه جنتان۔

جواپنے رب کے مقام سے ڈرے اس کے لئے جنت کے دوباغ ہیں۔

''مقامه ربه'' کی تفسیر میں دواحتمال ذکر کئے گئے ہیں، ایک تو یہ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد انسان کے تمام اعمال اور نیتوں پر خدا کا احاطہ علمی ہے اور دوسرا یہ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد انسان کا قیامت کے دن خدا کی عدالت میں کھڑا ہونا ہے، اس صورت میں آیت میں کچھ الفاظ کو محذوف سمجھنا پڑے گا، اور عبارت یوں ہوگی ''مقامه بین یدی ربه'' [۱]

بہرحال جس تفسیر کو بھی اختیار کیا جائے اس طرح کا خوف ہر قسم کے گناہ اور شہوات ترک کرنے کا سرچشمہ ہے، حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک حدیث یوں ہے:

من علم ان الله يراه ويسمع ما يقول من خير و شر فيحجزه ذلك عن القبيح من الاعمال فله جنتان۔

جو یہ جانتا ہو کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے اور جو اچھی یا بری (بات) وہ کہہ رہا ہے خدا اُسے سن رہا ہے اور یہ علم و آگاہی اُسے برے کاموں سے روک لے تو اس کے لئے جنت کے دوباغ ہیں۔ [۲]

---

[۱] دونوں احتمالوں کو تفسیر ''مجمع البیان'' اور ''المیزان'' میں ذکر کیا گیا ہے۔

[۲] مجمع البیان، ج۹و۱۰، ص۲۰۷۔

''جنتان''(دو جنتیں) کی بھی مختلف تفاسیر ذکر کی گئی ہیں۔ مثلا:

۱۔ اس سے مراد''مادی''اور''روحانی''بہشت ہے جس کی طرف سورہ آل عمران، ۱۵ میں بھی اشارہ ہوا ہے:

جنات تجری من تحتها الانهر .... ورضوان من الله

پہلی نعمت تو جنت کے وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور دوسری نعمت محبوب حقیقی یعنی خدا کی رضا ہے۔

۲۔ پہلی بہشت ایمان کے بدلے میں اور دوسری نیک اعمال کے بدلے میں ہے۔

۳۔ پہلی بہشت اطاعت پر اور دوسری گناہ کو ترک کردینے پر ہے۔

۴۔ پہلی بہشت تو عمل کا صلہ ہے اور دوسری خدا کی طرف سے فضل اور احسان کے طور پر ہے۔

البتہ ان میں سے کوئی تفسیر بھی خاص دلیل نہیں رکھتی، بہر حال پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، ان کے درمیان جمع کرنا بھی ممکن ہے۔

۱۶۔تولیٰ .... تبریٰ

خدا کے پیاروں سے محبت اور اس کے دشمنوں سے دشمنی یا دوسرے الفاظ میں پاک اور نیک لوگوں کے ساتھ ہم آہنگی اور برے لوگوں سے دوری جنت میں جانے کا ایک سبب ہے، اس کی طرف کلام مجید میں اشارہ ہوا ہے، سورہ مجادلہ کی آیت ۲۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ

تم کبھی نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی، خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا اُن کے بیٹے یا اُن کے بھائی یا اُن کے اہل خاندان۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

اولٓئك كتب فى قلوبهم الايمان وايدهم بروح منه ويدخلهم جنت تجرى من تحتها الانهر ....

یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے، اور اپنی طرف سے ایک روح کے ساتھ انہیں قوت

دی ہے، وہ انہیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔

آیت کے ذیل میں اُن کی روحانی جزاء کی طرف اشارہ ہے:

رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ

اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

اور آخر کار

اولٓئک حزب اللہ

کا نشان امتیاز انہیں عطا کیا گیا۔ (مجادلہ، ۲۲)

بن کہے یہ بات واضح ہے کہ ایک دل میں دو محبتیں جمع نہیں ہوسکتیں، یا تو خدا کی محبت یا اُس کے دشمنوں کی محبت، اسی لئے محبت کا وہ شدید ترین جذبہ جو انسان کا اپنے قریبیوں کے واسطے ہوتا ہے اگر وہ خدا کی محبت اور الفت کے مدمقابل آجائے تو وہ بھی پھیکا اور ماند پڑ جاتا ہے، علاوہ ازیں یہاں پر فقط محبتوں اور وابستگیوں کی بات نہیں ہے بلکہ یہ محبت تو ظالموں کے ظلم وفساد اور زندگی کے تمام پروگراموں میں ان کے ساتھ ہم آہنگی پر منتہی ہوتا ہے، خدا کا گروہ یہ کام کبھی بھی نہیں کرسکتا۔

"اولٓئک کتب فی قلوبہم الایمان" کی تعبیر بہت دقیق اور خوبصورت ہے کیونکہ لکھنا اور وہ بھی خدا کے قدرت مند ہاتھ سے اور پھر صفحہ دل پر، یہ سب کچھ اُن کے پورے وجود میں حقیقت ایمان کے پوری طرح رسوخ کر جانے کی طرف اشارہ ہے۔

ہاں! ایسے لوگ ہی جن کی تائید روح القدس کے ساتھ کی جاتی ہے اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اُن کو "حزب اللہ" کہا جائے، یہ تولیٰ اور تبریٰ کا کامل نمونہ ہیں۔

۱۷۔ نماز کو اہمیت دینا

سورہ معارج آیت ۲۲ تا ۳۴ میں چند صفات (نو صفات) کو ذکر کیا گیا ہے، اس کے بعد اُن کے حامل لوگوں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے، وہ صفات یہ ہیں:

نماز کی ادائیگی میں تسلسل، اپنے مال سے محروم لوگوں کیلئے حصہ مقرر کرنا، روز جزاء پر ایمان، خدا کے عذاب کا خوف، اپنے دامن عصمت کو آلودگی سے محفوظ رکھنا، امانت کی ادائیگی، ایفائے عہد، حق کی گواہی دینا اور نماز اور کی روح، شرائط اور آداب کا خیال رکھنا، اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

اولٓئک فی جنت مکرمون۔

اس باعظمت گروہ کی جنت کے باغات میں تکریم ہوگی۔

یہ تعبیر تمام مادی اور روحانی نعمات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ ۹ صفات نماز سے ہی شروع ہوتی ہیں اور نماز پر ہی ختم ہوتی ہیں، فرق یہ ہے کہ پہلے مرحلے میں نماز پر دوام کی بات کی گئی ہے اور آخری مرحلے میں اس کی حفاظت کا تذکرہ کیا گیا ہے، جس کی تفسیر نماز کی خصوصیات، آداب اور شرائط کا خیال رکھنے کے ساتھ کی گئی ہے، وہ آداب وشرائط کہ جو نماز کو ظاہری طور پر فاسد اور باطل ہوں سے بچاتے ہیں اور روح نماز جو کہ دل کی توجہ اور حضور قلب ہے اس کی بھی تقویت کرتے ہیں، اسی طرح یہ اُن موانع اور مشکلات کو دور کرتے ہیں جو نماز کی قبولیت کی راہ میں حائل ہوتے ہیں، مثلا مال حرام کھانا، شراب پینا، غیبت اور اسی طرح کی دوسری برائیوں کا خاتمہ کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے نیک اعمال کی ابتداء بھی نماز سے ہوتی ہے اور انتہاء بھی نماز پر، اتفاق کی بات ہے کہ زمانے کے لحاظ سے بھی انسان پر جو چیز سب سے پہلے واجب ہوتی ہے، وہ نماز ہے اور آخر عمر تک جو چیز اس کے ساتھ رہتی ہے وہ بھی نماز ہی ہے۔

نماز کی حفاظت کرنا ایک دوطرفہ معاملہ ہے، یعنی انسان اس کی حفاظت باطل ہونے سے کرتا ہے، اور نماز بھی انسان کو تباہی، بربادی اور فساد سے بچاتی ہے۔

ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشآء والمنکر

گفتگو کے اس سلسلے کو رسول اسلامؐ کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

من حافظ علیھا کانت لہ نورا وبرھانا ونجاۃ یوم القیامۃ

جو بھی اپنی نماز کی حفاظت کرے گا نماز اس کے لئے نور، روشنی اور علم وآگاہی کا سبب بنے گی اور قیامت کے دن اس کی نجات کا ذریعہ بنے گی۔[۱]

نتیجہ

اوپر جو کچھ سترہ عنوانات کے تحت بیان ہوا وہ ان اہم چیزوں کا تذکرہ تھا جو سرچشمہ نعمات یعنی جنت میں داخلے کی کلید اور سبب ہیں، یہ ایک طرف تو قیامت میں نجات کے اسباب کے سلسلے میں اسلامی نظام کی وضاحت کرتے ہیں اور دوسری طرف یہ قابل اہمیت انسانی، اخلاقی اور اجتماعی کاموں کی انجام دہی کے قدرت مند عوامل شمار ہوتے ہیں، ان سے پیغام لے کر انسان کمال، تربیت اور افتخار کی اعلیٰ منازل پر پہنچ سکتا ہے۔

خدایا! سعادت کے ان خزانوں کے حصول کے لئے ہماری توفیقات میں اضافہ فرما۔

---

[۱] تفسیر روح البیان، ج۱۰، ص۱۶۷۔

(۲) جنت کی جسمانی نعمات

اشارہ:

معاد جسمانی کی بحث میں اس حقیقت کی پوری طرح وضاحت ہو چکی ہے کہ قرآنی نکتہ نظر سے قیامت جسمانی پہلو بھی رکھتی ہے اور روحانی پہلو بھی، کیونکہ انسان میدان محشر میں جسم اور روح دونوں کے ساتھ حاضر ہوگا لہٰذا طبعی طور پر ہر دو خدا کی برکات اور نعمتوں سے فیض یاب بھی ہوں گے۔

جو لوگ جنت کی نعمات کو فقط روحانی اور معنوی سمجھتے ہیں اور جو آیات جسمانی نعمات کی طرف اشارہ کرتی ہیں انہیں کنایہ سمجھتے ہیں وہ اس نکتے سے غافل ہیں کہ جنت کی نعمات کو معنوی نعمتوں میں منحصر کر دینے سے جسمانی معاد کی نفی ہو جاتی ہے، جو کہ قرآن کی بالکل واضح آیات کی مخالفت ہے۔

اصولی طور پر جیسا کہ معاد جسمانی'' کے سلسلہ گفتگو میں بھی اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ ''جسم'' اور ''روح'' ایک دوسرے کے بالکل ساتھ ساتھ ایک قسم کے ہمزاد ہیں، جیسے اس دنیا میں وہ ایک دوسرے سے جدا ہو کر کمال اور ارتقاء کا راستہ طے نہیں کر سکتے، اسی طرح اُس دنیا میں بھی خدا کی عطا کردہ برکات اور نعمتوں سے فیض یاب ہونے کے لئے ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے (غور کیجئے گا)۔

بہر حال جنت کی جسمانی نعمتیں اُس کی روحانی نعمتوں کی طرف مختلف، وسیع، دل پذیر اور سرور بخش ہوں گی، قرآن نے اس پر بہت تاکید کی ہے تا کہ اس طریقے سے تمام لوگوں کو اُن صفات اور اعمال کی طرف متوجہ کرے جو ان تمام نعمتوں کا سرچشمہ ہیں (یہ بات بھی واضح ہے کہ انسان روحانی نعمتوں کی نسبت جسمانی نعمتوں کے متعلق زیادہ سوچتا ہے)۔

اس کے باوجود جیسا کہ بعد والے باب میں ہے، معنوی نعمات اور روحانی لذات کے بیان کے لئے ایک تفصیلی باب ذکر کیا گیا ہے، اگرچہ یہ وسعت بیان کے اعتبار سے مادی نعمتوں کے بیان کی حد تک نہیں ہے لیکن معنی اور کیفیت کے اعتبار سے اس سے بہت بلند مرتبے کا حامل ہے۔

اس اشارے کے بعد ہم جنت کی مادی نعمات کی ایک مختصر سی فہرست پیش کرتے ہیں اور انہیں مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت ذکر کرتے ہیں:

۱۔ بہشت کے باغات

۲۔ اس کے سرور آفریں سائے

۳۔ گھر اور محلات

۴۔ قالین، تکیے اور تخت

۵۔ کھانے اور برتن

۶۔ پاکیزہ شراب

۷۔ سب سے عمدہ شراب

۸۔ برتن۔ جام

۹۔ لباس۔ زینت

۱۰۔ ازواج بہشت

۱۱۔ غلام۔ ساقی

۱۲۔ استقبال کرنے والے

۱۳۔ ابتدائی پذیرائی

۱۴۔ نا قابل تصور نعمات

مذکورہ بالا موضوعات میں سے ہر ایک کے متعلق قرآن کی متعدد آیات ملتی ہیں، اب ہم اس چمنستان کی طرف جاتے ہیں اور مختلف پھولوں کو اپنے دامن میں سمیٹتے ہیں۔

۱۔ جنت کے باغات

اس سلسلے میں آنے والی متعدد آیات سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ بہشت مجموعی طور پر انتہائی خوبصورت اور بے نظیر باغوں پر مشتمل ہوگی، ان باغات کا اس دنیا کے باغات کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا، قرآن میں ان کے متعلق جو گفتگو کی گئی ہے وہ ان کی ایک اجمالی صورت ہے کہ جو ہم جیسے اس دنیا کے باسیوں کے لئے قابل فہم ہو سکتی ہے، وگرنہ اس کی پوری حقیقت ہماری فکر کی دسترس سے کوسوں دور ہے۔

قرآن کی ایک سو سے زیادہ آیات میں ''جنات'' (باغات) یا ''جنت'' (باغ) یا ''جنتان'' (دو باغ) کی تعبیر آئی ہے۔

سورہ نساء کی آیت ۱۳ میں ارشاد ہوتا ہے:

''ومن یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنت تجری من تحتہا الانہر''

جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اُسے جنت کے اُن باغات میں داخل کیا جائے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔

بقرہ، ۲۲۱ میں ہے:

واللہ یدعوا الی الجنة والمغفرة باذنہ

اللہ جنت کے باغ اور (گناہوں کی) مغفرت کی طرف بلاتا ہے، اپنے اذن کے ساتھ۔

رحمن، ۴۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

ولمن خاف مقام ربہ جنتان

جو اپنے رب کے مقام سے ڈرے اس کے لیے بہشت کے دو باغ ہیں۔

ان کلمات (جنات، جنتان، جنة) کا مادہ جن (بروزن فن) ہے جس کا معنی ڈھانپنا ہے، راغب کے بقول اس کا معنی ایک چیز کو ظاہری حس سے چھپانا ہے، اسی بنیاد پر اس کے کئی مشتقات ہیں۔

''جنة'' کا معنی باغ ہے کیونکہ اس کی زمین درختوں کے نیچے چھپ جاتی ہے، دوسرے لفظوں میں اس کی زمین کو درخت ڈھانپ لیتے ہیں، لیکن مقائیس اللغت کے مطابق بہشت کو اس وجہ سے جنت کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسی جزا ہے جو آج اہل ایمان کی نظروں سے چھپی ہوئی ہے، لیکن یہ معنی کچھ بعید محسوس ہوتا ہے کیونکہ دنیا کے باغات کو بھی جنت کہتے ہیں، یہ اسی لئے ہے کہ ان کی زمین ان کے درختوں کی وجہ سے چھپ جاتی ہے (غور کیجئے گا)۔

''جنین'' اس بچے کو کہتے ہیں جو شکم مادر میں ہو اور نظروں سے پوشیدہ ہو۔

''جنان'' (بروزن ''امان'') دل کو کہا جاتا ہے کیونکہ یہ سینے میں نظروں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔

''مجن'' (میم پر زیر، جیم پر زبر اور نون پر شد کے ساتھ) کا معنی ڈھال ہے، مقائیس اللغت کے بقول جنگ میں استعمال ہونے والے دفاعی اسلحے کو جنة (جیم پر پیش کے ساتھ) کہتے ہیں، دوسری طرف ''سلاح'' اس اسلحے کو کہتے ہیں جس سے حملہ کیا جائے۔

''جن'' اور ''جان'' اس زندہ موجود کو کہتے ہیں نظروں سے پنہاں ہو۔

بڑے بڑے سانپوں اور گھروں میں رہنے والے سانپوں کو بھی ''جن'' اور ''جان'' کہا جاتا ہے یہ اُن کے جنوں کے ساتھ مشابہ ہونے کی وجہ سے ہے (کیونکہ عام لوگوں کا تصور یہی تھا کہ جن ایک خطرناک اور مخفی موجود ہے، سانپ بھی ایسے ہی ہیں)۔

سینے کی ہڈیوں کے ڈھانچے کو بھی ''جنا جن'' کہتے ہیں (یہ شاید اس لئے ہو کہ یہ دل کی حفاظت کے لئے ایک ڈھال ہے)۔

''جنون'' کا معنی دیوانگی اور پاگل پن ہے کیونکہ یہ عقل اور ہوش کو ڈھانپ دیتا ہے۔

''جنون اللیل'' اور ''جنان اللیل'' کا معنی وہ لباس ہے جو رات کی تاریکی ہر چیز کو پہنا دیتی ہے، بہرحال یہاں پر جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ بہشت کے باغات ایسے ہیں جن میں درخت کثرت سے ہیں اور اُن کی زمین کو درختوں نے ڈھانپ دیا ہے۔

قرآن کی بہت سی آیات میں ''جنات'' (بہشت کے باغات) کا ذکر کرنے کے بعد ''تجری من تحتھا الانھر'' کا جملہ لایا گیا ہے، جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بہشت کے باغات کے نیچے پانی ہمیشہ جاری رہتا ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہ اس کے درختوں کی شاخیں

پانی پر سایہ فگن ہیں اور پانی اُن کے نیچے ہے (غور کیجئے گا)۔

یہ اس لئے ہے کہ ایک تو پانی اور درختوں کا ایک جگہ پر اکٹھا ہونا ایک بہت دلفریب منظر پیش کرتا ہے، جیسے ہر ایک دوسرے کے بغیر ادھورا ہو اور اس میں کسی قسم کا احساس ہو، دوسرا یہ کہ سبزی و شادابی ہمیشہ اُن باغات کے درختوں میں ہوتی ہے جن کے پاس سے ہمیشہ پانی گذرتا رہتا ہو، وہ درخت جن کے ساتھ ہمیشہ کا پانی نہیں ہوتا، بالکل کبھی کبھار کہیں اور سے اُن کے پاس آتا ہے ان میں وہ طراوت اور شادابی نہیں ہوتی، طبعی طور پر درخت کی زندگی تو پانی کے ساتھ ہے، لہٰذا اس مایہ وحیات کو ہمیشہ اس کے ساتھ ہونا چاہیے۔

یہ امر جاذب نظر ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ:

ان انهار الجنة ليست فى اخاديد۔ انما تجرى علىٰ سطح الجنة منضبطة بالقدرة حيث شآء اهلها۔

جنت کی نہریں سوراخوں یا گڑھوں میں نہیں بہہ رہی ہوں گی، بلکہ وہ سب کی سب زمین کی سطح پر ہوں گی، اہل بہشت جس طرف کا بھی ارادہ کریں گے وہ خدا کی قدرت کے ساتھ اس طرف بہنے لگیں گی۔[۱]

اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ نہ فقط بہشت کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی بلکہ بعض آیات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہشت کے مکانات بھی نہروں پر بنائے گئے ہوں گے اور ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔

عنکبوت۔ ۵۸ میں ارشاد ہوتا ہے:

والذين امنوا وعملو الصلحت لنبوئنهم من الجنة غرقفا تجرى من تحتها الانهار۔

جو لوگ ایمان لائے اور وہ نیک اعمال بجالائے ہم انہیں بہشت کے اُن بالاخانوں میں جگہ دیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔[۲]

۲۔ بہشت کے سائے

بہت سی آیات میں بہشت کے سایوں کی طرف اشارہ ہوا ہے، مثلاً سورہ واقعہ میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[۱] تفسیر قرطبی۔ ج ص ۲۰۶۔

[۲] یہی معنی زمر۔ ۲۰ میں بھی آیا ہے۔

واصحب الیمین مآ اصحب الیمین... فی سدر مخضود... وطلح منضود
وظل ممدود... ومآء مسکوب۔

اور اصحاب یمین اور کیا (شان ہے) اصحاب یمین کی، وہ بیری، بغیر کانٹوں کی جھکی ہوئی بیری، کے سائے میں ہوں گے اور تہ بہ تہ لگے ہوئے کیلے اور پھیلے ہوئے سائے آبشاروں کے کنارے پر۔ (واقعہ: ۲۷ تا ۳۱)

درختوں کا سایہ سب سے بڑھ کر خوبصورت اور لطیف ہوتا ہے یہ خیموں اور کمروں کے سایوں کی مانند تاریک نہیں ہوتا اور نہ ہی ہوا کی ٹھنڈک سے خالی ہوتا ہے، دوسری طرف پتوں کی ملائم تری سایے کو خوش گوار بنا دیتی ہے، درختوں، پنکھڑیوں اور پھولوں کی دل میں اتر جانے والی مہک اُسے کچھ اور بھی لذت بخش بنا دیتی ہے۔

بہشت کے سائے دائمی اور جاودانی ہیں، اس لئے یہ انسان کے آرام وسکون میں مخل نہیں ہوں گے۔

اکلها دآئم وظلها

اس کے میوے اور سائے دائمی ہیں۔ (رعد: ۳۵)

کبھی انہیں ''ظل ظلیل'' بھی کہا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وندخلهم ظلا ظلیلا

اور ہم انہیں ان سایوں میں داخل کریں گے جو کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ (نساء: ۵۷) [۱]

ان چیزوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جنت کی فضا، خوشگوار، دلربا اور پرکشش ہوگی۔

چنانچہ سورہ دھر کی آیت ۱۳ میں ارشاد ہوتا ہے:

لا یرون فیها شمسا ولا زمهریرا

(جنتی لوگ) نہ تو اس میں جلا دینے والے سورج کو دیکھیں گے اور نہ سردی کو۔ [۲]۔ [۳]

---

[۱] ''ظل ظلیل'' کا معنی سایہ دار کا سایہ ہے، یہ مجموعی طور پر ایک مکمل، دائمی اور بلند سائے کے لئے کنایہ ہے اور بھی متعدد آیات میں سایوں کے موضوع کی طرف اشارہ ہوا ہے، مثلاً رعد۔ ۳۵۔ یٰسین، ۵۶ اور مرسلات، ۴۱ میں بھی آیا ہے۔

[۲] ''زمهریر'' کا مادہ ''زمهر'' ہے جس کا معنی شدید سردی یا بہت زیادہ غضب ناک ہونا ہے، یہاں پر پہلا معنی مراد ہے۔

[۳] یہی مفہوم (واقعہ، ۳۰)، (یٰسین، ۵۶)، اور (مرسلات، ۴۱) میں بھی آیا ہے۔

۳۔ بہشت کے محلات

کلام مجید کی متعدد آیات میں بہشتیوں کے رہنے کی جگہ کی طرف ایک اجمالی سا اشارہ ہوا ہے، اس سلسلے میں مختلف تعبیرات لائی گئی ہیں۔

سورہ توبہ کی آیت ۷۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

ومساکن طیبة فی جنت عدن

اور پاکیزہ گھر بہشت کے جاودانی باغات ہیں۔

یہ تعبیر سورہ صف کی آیت ۱۲ میں بھی آئی ہے۔

لفظ ''طیبة'' ایک بہت جامع معنی کا حامل ہے، جو تمام خصوصیات اور فضائل پر مشتمل ہے، یہ حقیقت میں اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو بہت دل پسند اور دلربا ہو، جس سے انسان کو ''طیب نفس'' حاصل ہو یا اس میں زندگی ہر لحاظ سے پاک و پاکیزہ ہو، اس لحاظ سے گھر میں جن چیزوں کا تصور کیا جا سکتا ہے وہ اس لفظ میں جمع ہیں۔

لیکن سورہ فرقان کی آیت ۷۵ میں اُسے ''غرفة'' سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کا معنی ایک عمارت کی سب سے بلند و بالا منزل ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اولٓئك یجزون الغرفة بما صبروا۔

خدا پرہیز گاروں اور عباد الرحمن (خدا کے خاص بندوں) کو اُن کے صبر اور استقامت کی وجہ سے بہشت کے بالا خانے جزا کے طور پر دے گا۔

''غرفة'' کا مادہ ''غرف'' (بروزن ''برف'') ہے، جس کا معنی ایک چیز کو اٹھا کر کھا لینا ہے۔

''غرفة'' اس چیز کو کہتے ہیں جسے اٹھاتے ہیں اور پھر کھا لیتے ہیں (جیسے وہ پانی انسان پینے کے لئے چشمے سے اٹھاتا ہے)، بعد ازاں یہ لفظ عمارتوں کی سب سے اوپر والی منزل کے لیے بولا جانے لگا، گویا انہیں زمین سے اوپر کی طرف اٹھا لیا گیا ہے، یہاں پر ممکن ہے اس سے مراد بہشت کا سب سے بلند اور بڑا درجہ مراد ہو۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ایسے گھروں کی ہوا بہت خوشگوار اور اُن کا منظر زیادہ دلکش ہوتا ہے۔

رہنے کے لئے سب سے بہترین مکان ایسا ہی ہوتا ہے، اس لحاظ سے یہ پر کشش ہوتے ہیں ''غرفة'' کی تعبیر بھی انہی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتی ہے، لہٰذا سباء، ۳۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

وھم فی الغرفات امنون

اور وہ بالا خانوں میں امن وامان سے رہنے والے ہوں گے

زمر، ۲۰ میں اس سلسلے میں ایک اور تعبیر آئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

لھم غرف من فوقھا غرف مبنیة تجری من تحتھا الانھر

اُن (پرہیزگاروں) کے لئے بالا خانے ہیں، اُن کے اوپر اور بالا خانے بنے ہوئے ہیں، اُن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

دخان، ۵۱ و ۵۲ میں بہشتیوں کے مکانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

ان المتقین فی مقام امین فی جنت و عیون

پرہیزگار پرامن مقام میں ہوں گے، باغوں اور چشموں کے درمیان۔

یہاں پر دو نکتے قابل توجہ ہیں:

۱۔　بعض قرآنی آیات (مثلاً سورہ صف کی آیت ۱۲ جس کی طرف اوپر بھی اشارہ ہوا ہے) میں جنت کی تمام نعمتوں میں سے صرف "پاک و پاکیزہ مکانوں" کا ذکر ہوا ہے، یہ اس لئے ہے کہ انسان کی آسائش وسکون کا اہم ترین ذریعہ مکان ہے، وہ بھی پاک و پاکیزہ مکان جو ہر ظاہری اور باطنی آلودگی سے پاک ہو، جو امن امان کا گہوارہ ہو، جس میں انسان آرام وسکون سے رہ سکے (توجہ اس بات کی جانب بھی رہے کہ کلمہ "مسکن" کا مادہ بھی "سکون" ہے جس کا معنی آرام وسکون ہے)۔

۲۔　کلام مجید میں چند چیزوں کو آرام وسکون کا باعث قرار دیا گیا ہے۔

رہنے کے لئے مناسب مکانات، چاہے دنیا ہو چاہے آخرت:

واللہ جعل لکم من بیوتکم سکنا۔ (نحل:۸۰)

مناسب اور ہم مزاج بیوی:

ومن ایتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا۔ (روم:۲۱)

رات کو بھی چین اور آرام کا ایک ذریعہ قرار دیا گیا ہے:

وجعل اللیل سکنا۔ (انعام۔۹۶)

زکوہ ادا کرنے والے مومنین کے حق میں پیغمبرؐ کی دعا بھی سکون کا باعث ہے:

ان صلاتك سكن لهم

ایمان سے بھی سکون حاصل ہوتا ہے:

هو الذی انزل السکینة فی قلوب المومنین۔ (فتح:۴)

البتہ ان میں بعض امور مادی پہلو کے حامل ہیں اور بعض روحانی پہلو کے۔

۴۔قالین اور تخت:

بہشت کی ایک اور بہت ہی عمدہ نعمت خوبصورت اور نفیس قالین اور مختلف تخت ہیں، سورہ رحمن (کہ جس میں جنت کی مختلف نعمتوں کا تذکرہ آیا ہے) کی آیت ۵۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

متکئین علی فرش بطآئنها من استبرق

ایسے بچھونوں پر تکیہ لگائے ہوں گے جن کے استر دیبا کے ہوں گے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ دنیا کا قیمتی ترین کپڑا ان بچھونوں کا استر ہے، لہٰذا اس کے اوپر والا حصہ اس چیز سے بنا ہوا ہے جس کی خوبصورتی اور نرمی ناقابل بیان ہے۔

بعض مفسرین کے بقول یہ اُن چیزوں میں سے ہے قرآن نے جن کے بارے میں فرمایا ہے:

فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین۔ (سجدہ:۱۷)

کوئی نہیں جانتا کہ اُن کی آنکھوں کی ٹھنڈک سے کیا کیا چیزیں ان کے لئے چھپائی گئی ہیں۔

رسول اسلامؐ کی ایک حدیث ہے:

ظواهرها نور یتلالا [1]

اُن بچھونوں کا اوپر والا حصہ ایک چمکتا ہوا نور ہے۔

سورہ غاشیہ کی آیت ۱۶ میں اسی سلسلے میں ایک اور تعبیر آئی ہے، بہشت کی متنوع اور روح پرور نعمات کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

وزرابی مبثوثة

---

[1] تفسیر قرطبی، ج۹، ص۶۳۴۹

وہاں پر بہت خوبصورت اور آرام دہ قالین بچھے ہوئے ہوں گے۔

''زرابی'' جمع ہے زربیۃ (بروزن''شرقیۃ'') کی ،بعض ارباب لغت کے بقول یہ حقیقت میں فارسی کے لفظ''زربفت'' سے ماخوذ ہے، یہ وہ کپڑا ہوتا ہے جس میں دھاگے کے بجائے سونے کی تاریں استعمال کی جاتی ہیں ،بعض اوقات اس کی تفسیر بہت خوبصورت، آرام بخش اور قیمتی کپڑے سے کی جاتی ہے۔[۱]

بعض مفسیرین اور اہل لغت نے کہا ہے کہ''زرابی'' جمع ہے''زربی''(زا پر زیر کے ساتھ) کی اور''زرد ربیۃ'' اصل میں مختلف ایسی بوٹیوں کے معنی میں ہے کہ جن میں سرخ، زرد اور سبز رنگ کا امتزاج ہوتا ہے، اسی وجہ سے وہ کپڑے یا بچھونے جن کو مختلف رنگوں سے خوبصورت بنایا جاتا ہے اُن کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔[۲]، بعض نے اس کی تفسیر اُن بچھونوں کے ساتھ کی ہے جن پر سکون بخش نیند آتی ہے۔

ان بچھونوں کی توصیف''مبثوثۃ'' کے ساتھ کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ مختلف جگہ پر بچھے ہوئے یا پھیلے ہوئے ہوں گے۔

اسی سورت میں مذکورہ بالا آیت سے پہلی آیت میں تکیوں اور گدیوں کے متعلق تعبیر آئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ونمارق مصفوفۃ

وہاں تختوں پر ترتیب سے تکیے لگے ہوں گے۔

''نمارق'' جمع ہے''نمرقہ''(بروزن''غلغلۃ'') کی،''صحاح اللغت'' کے بقول اس کا معنی وہ چھوٹا تکیہ ہے جس پر ٹیک لگاتے ہیں۔

رحمن،۷۶ میں بہشتی بچھونوں کے سلسلے میں ایک اور تعبیر ملتی ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

متکین علی رفرف خر و عبقری حسان۔

وہ (جنتی لوگ) سبز قالینوں اور خوبصورت قیمتی بچھونوں پر تکیہ لگائے ہوں گے۔

راغب کے بقول''رفرف'' حقیقت میں درختوں کے پراگندہ پتوں کے معنی میں ہے، بعد ازاں یہ اُن رنگا رنگ کپڑوں کے لئے بولا جانے لگا جو باغ کا سا منظر پیش کرتے ہیں، بعض ارباب لغت نے''رفرف'' کا معنی خیمے کا وہ پردہ لیا ہے جو ہوا سے ہلتا ہے (پرندوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کو بھی''رفرفۃ'' کہتے ہیں)۔[۳]

---

[۱] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔ مادہ''زرب''۔

[۲] تفسیر مراغی، ج۳۰، ص۱۳۳۔ قاموس اللغت مادہ''زرب''۔

[۳] مقائیس اللغت۔

بعض نے اُسے سبز رنگ کے کپڑوں کے معنی میں بھی لیا ہے جس سے ایک طرح کا قالین (یا غالچہ) بناتے ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کلمہ باغات، سبزہ زار (یا سونے والے کپڑے) کے معنی میں ہو جو کہ ہوا چلنے سے ہلتے ہیں، کیونکہ "رفرف" لغت کی بہت سی کتابوں میں خیمے کے پچھلے پردے اور اُن کپڑوں کے معنی میں آیا ہے جو ہوا سے ہلتے ہیں، ابوالفتوح رازی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں:

"رفرف" جنت کے وہ سبزہ زار ہیں جو تازہ اور سبز گھاس سے بھرے ہوئے ہیں۔

"عبقری" کا مادہ "عبقر" (بروزن جعفر) ہے "صحاح اللغت" اور "مفردات" کے بقول یہ حقیقت میں ایک خاص جگہ کا نام ہے، عرب اسے پریوں اور جنوں کی سرزمین خیال کرتے تھے، بعدازاں یہ لفظ ہر عجیب اور نادرالوجود یا ہر پڑھے لکھے اور ماہر شخص کے لئے بولا جانے لگا جسے "عبقری" کہتے تھے، اس کی جمع "عباقرہ" [1] ہے، بہرحال اس کا بنیادی معنی آہستہ آہستہ ختم ہوگیا اور یہ انتہائی بلند مرتبت اشخاص اور بہت قیمتی اور نفیس چیزوں کے لئے استعمال ہونے لگا، مذکورہ بالا آیت میں بھی یہ جنت کے بہت خوبصورت اور زیب نظر کپڑوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "عبقری" ایک شہر کا نام تھا جس میں بہترین ریشمی کپڑے تیار ہوتے تھے، [2] وہ تخت جن پر بہشتی بیٹھیں گے اور محظوظ ہوں گے انہیں قرآن میں "سرر" بھی کہا گیا ہے، جو جمع ہے "سریر" کی۔ واقعہ، ۱۵، ۱۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

"علی سرر موضونة متكئين عليها متقابلين"

وہ سونے کی تاروں سے بنے ہوئے جڑاؤ تختوں پر ہوں گے، اُن پر (بیٹھے) آمنے سامنے تکیہ لگانے والے ہوں گے۔

یہ تعبیر قرآن کی پانچ آیات میں آئی ہے، ایک جگہ پر (جیسا مذکورہ بالا آیت) اس کی صفت "موضونة" لائی گئی ہے جو کہ "وضن" (بروزن "وزن") کے مادہ سے ہے جس کا معنی زرہ بنانا ہے، بعدازاں یہ ہر اُس بنی ہوئی چیز کے لئے بولا جانے لگا جس کے تانے مضبوط ہوں، یہاں پر ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ جنت کے تخت لولو، یاقوت اور جوہرات سے بنے ہوئے ہوں گے یا سونے اور چاندی کی تاروں سے اُن پر کام ہوا ہوگا یا اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ ایک خاص ترتیب سے ایک دوسرے کے ساتھ رکھے ہوں گے، مختلف مفسرین نے ان میں سے ایک ایک بات کی ہے۔

بعض آیات میں "مصفوفة" کی تعبیر لائی گئی ہے، جیسے:

---

[1] بعض ارباب لغت اور مفسرین نے اس جمع پر اعتراض کیا ہے کیونکہ جو کسی چیز کی طرف منسوب ہو اس کی جمع نہیں بنائی جاسکتی مگر یہ کہ نسبت دینے سے پہلے اس کلمے کی جمع بنالی جائے جیسے "عباقر" اس کے بعد نسبت دی جائے (عباقری) علاوہ ازیں منسوب کی جمع اور صیغہ جمع کو اکٹھا لانا اہل ادب اچھا نہیں سمجھتے۔

[2] تفسیر ابوالفتوح رازی، مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں۔

"متكئين على سرر مصفوفة" (طور:۲۰)

بعض میں "مرفوعة" کی تعبیر لائی گئی ہے، جیسے

"فيها سرر مرفوعة" (غاشيه: ۱۳)

پہلی تعبیر تو اُن تختوں کے ترتیب سے رکھے ہونے اور دوسری اُن کے بلند جگہ پر رکھے ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

ان تختوں کے بلندی پر ہونے کی وجہ یا تو یہ ہوگی یہ بہشتی اُن پر بیٹھ کر چاروں طرف کے حسین مناظر کو دیکھ سکیں یا پھر یہ اُن کے مقام کی بلندی کی طرف اشارہ ہے، جس سے اُن کی معنوی عظمت اور تقدس ظاہر ہوتا ہے۔

یا یہ دونوں باتیں ہی مراد ہیں۔

بہر حال جنت کے تخت مجموعی طور پر رکھے ہوں گے تا کہ بہشتی ایک دوسرے کے قرب اور محبت سے لطف اندوز ہو سکیں، جب کہ قرآن کی دو آیات میں صرف "علیٰ سرر متقابلین" کی تعبیر آئی ہے جس کا معنی آمنے سامنے ہونا ہے۔(حجر ۴۷ وصافات ۴۴)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ "سرر" جمع ہے "سریر" کی، جس کا مادہ "سرور" ہے جس کا معنی خوشحال ہونا ہے گویا تخت پر عمومی طور پر بیٹھنا اور بالخصوص جنت کے تخت پر بیٹھنا سرور اور لذت بخش ہے۔

علاوہ ازیں یہ پیار اور محبت کی محفلوں سے بھی متعلق ہے۔

کبھی "ارآئك" کی تعبیر آئی ہے، یہ تعبیر بھی قرآن کی پانچ آیات میں جنت کے تختوں کے متعلق آئی ہے۔

ایک جگہ پر ارشاد ہوتا ہے:

متكئين فيها على الارآئك۔

صالح مومنین جنت کے باغوں میں تختوں پر ٹیک لگائے ہوں گے۔ (کہف۔۳۱)

یہی تعبیر کچھ فرق کے ساتھ یٰسین، ۵۶ میں آئی ہے:

فی ظلال على الارآئك متكئون

سورہ دھر، ۱۳ اور مطففین ۲۳ و ۲۵ میں یہ تعبیر آئی ہے:

على الارآئك ينظرون

تختوں پر بیٹھ کر نظارہ کر رہے ہوں گے۔

"ارآئک" جمع ہے "اريكة" کی، بہت سے مفسرین کے بقول (جیسے مجمع البیان، قرطبی، فخر رازی اور روح المعانی) اس کا معنی وہ تخت ہے جو حجلہ عروسی میں رکھا جاتا ہے، بعض نے اس کی تفسیر اس تخت کے ساتھ کی ہے جس پر سایہ ہو۔ "مفردات" میں "راغب" کے

بقول حقیقت میں یہ ''اراک'' سے ماخوذ ہے جوایک مشہور درخت ہے، عرب اس سے سائبان بناتے تھے، یا یہ ''اروک'' سے ہے جس کا معنی ٹھہرنا اور توقف کرنا ہے۔

ابوالفتوح رازی نے سورہ دھر کی آیت ۱۳ کے ذیل میں یہ بات بالکل واضح طور پر کہی ہے کہ: ''سریر'' اور ''اریکه'' دو الگ الگ معانی رکھتے ہیں، ایک سے سائبان والا اور دوسرے سے بغیر سائبان کے تخت مراد ہے۔

آیات میں آنے والی تعبیرات بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہیں کیونکہ ''سرر'' کی بات اس جگہ کی گئی ہے جہاں پر جنتی ایک دوسرے کے ساتھ پیار و محبت کی محفل سجائے ہوئے ہیں، ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہیں اور باتیں کر رہے ہیں جب کہ ''ارائک'' اُن کی خصوصی محفلوں سے متعلق ہے، اس وقت جب وہ اپنی بیویوں کے ساتھ تنہائی میں ہوں گے، چنانچہ یٰسین، ۵۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

هم وازواجهم فی ظلال علی الارآئك متكئون۔

وہ اور اُن کی بیویاں سایوں میں مخصوص تختوں پر ٹیک لگائے ہوئے ہوں گے۔

یہاں سے ہی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اگر قرآن یہ کہتا ہے کہ:

متكئين فيها علی الارآئك لا يرون فيها شمسا ولا زمهريرا۔

بہشتی وہاں پر سایہ دار تختوں پر ٹیک لگا کر بیٹھے ہوں گے وہاں پر نہ تو وہ جلتے ہوئے سورج کو اور نہ ہی سردی کو۔

(سورہ دھر)

تو ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ سورج کا چمکنا اس زمانے سے متعلق ہو جس میں وہ ان مخصوص تختوں پر جلوہ افروز ہوں، اگر چہ اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی بیان کی گئی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن کی پانچ آیات میں جنت کے تختوں اور پانچ میں جنت کی چار پائیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یہ آیات بہشتیوں کی خصوصی اور عمومی زندگی کی طرف ایک جیسے اشارات کی حامل ہیں نا چار پائیوں اور تختوں کے اوصاف اور اُن کی حیران کن خوبصورتی سے متعلق احادیث میں بہت سے مطالب ذکر کئے گئے ہیں، اختصار کے پیش نظر اُن سے گریز کیا گیا ہے۔

۵۔ جنتی کھانے

قرآن مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنتیوں کی جسمانی غذائیں متنوع اور رنگارنگ ہیں، لیکن آیات سے مجموعی طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جنتیوں کی بہترین خوراک پھل ہوں گے، یہ بات 'فاکهة'' فواکه'' ''ثمرة'' ''ثمرات'' اور ''اکل'' کے عناوین کے تحت بہت سے آیات میں بیان کی گئی ہے۔

بعض آیات میں ارشاد ہوتا ہے:

فیہا من کل فاکھة زوجان

بہشت کے ان دو باغوں میں جو خدا سے ڈرنے والوں کے لئے مخصوص ہیں، دو دو قسم کے پھل ہوں گے۔ (رحمن، ۵۲)

مقائیس اللغت کے بقول ''فاکھة'' حقیقت میں ''فکه'' کے مادہ سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے ''دل پسند''، پھلوں کو عموماً ''فاکھه'' کہا جاتا ہے کیونکہ یہ دل کی شادابی کا موجب بنتے ہیں، ''مفاکھه'' کا معنی مزاحیہ کلام ہے۔ ''فاکه'' کا معنی خوش خوراک اور مزاحیہ آدمی ہے۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ''فاکھه'' پھلوں کی تمام اقسام کے لئے ہے، راغب نے بھی مفردات میں اسی معنی کی تائید کی ہے جب کہ بعض نے یہ کہا ہے کہ ''فاکھه'' انگور اور انار کے علاوہ سب پھلوں کے لئے ہے (یا یہ کھجور اور انار کے علاوہ باقی پھلوں کے لئے ہے) یہ اس لئے ہے کہ سورہ رحمن، ۶۸ میں ان دو قسم کے پھلوں کا ''فاکھه'' پر عطف کیا گیا ہے، لہٰذا اُن کے خیال میں یہ دو پھل ''فاکھه'' کے مفہوم سے خارج ہیں جب کہ آیت اس طرح کے کسی معنی پر دلالت نہیں کر رہی، بلکہ ایسا بہت ہوتا ہے کہ ایک عام کے بعد اس کے خاص افراد کو اُن کی اہمیت کے پیش نظر صراحت کے ساتھ بیان کر کے اُن کا عام پر عطف کر دیتے ہیں۔

بعض کے نظریے کے مطابق جنت کے پھلوں کے متعلق ''زوجان'' کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہ سب کے سب پھل دو قسم کے ہوں گے، اُن کی ایک قسم تو دنیا میں بھی تھی اور دوسری وہ ہے جس کی نظیر آج تک کسی نے نہیں دیکھی، بعض نے کہا ہے کہ یہ تعبیر جنت کے پھلوں کے متنوع اور رنگا رنگ ہونے کی طرف اشارہ ہے جن میں سے ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر لذیذ اور ذائقہ دار ہوگا۔

سورہ واقعہ کی آیت، ۲۰ میں ان پھلوں کا متنوع ہونا یوں بیان کیا گیا ہے:

وفاکھة مما یتخیرون

جس پھل کو بھی چاہیں وہ انہیں پیش کیا جائے گا۔

مرسلات، ۴۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

وفواکه مما یشتھون

اور مختلف پھل جن کی وہ خواہش کریں گے۔

بعض آیات میں خاص قسم کے پھلوں کو جنت کے پھلوں کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

فیہما فاکھة ونخل ورمان

اُن دو باغوں میں بہشتی پھل کھجور اور انار ہیں۔ (رحمن، ٦٨)

بعض مفسرین نے یہاں پر بہت غور وفکر سے کام لیا ہے اور کہا ہے کہ ان دو پھلوں کا ذکر اُس فرق کی وجہ سے ہے جو ان میں مختلف جہات سے پایا جاتا ہے، ایک میٹھا ہے دوسرا ایسا نہیں ہے، ایک گرم اور ایک ٹھنڈا، ایک غذائی مواد کا حامل اور دوسرا اس سے خالی، ایک ٹھنڈے علاقوں کا پھل ہے اور ایک گرم علاقوں کا، ایک کا درخت بہت اونچا ہے اور دوسرے کا چھوٹا، گویا قرآن اس بیان کے ذریعے ان تمام پھلوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے جو ان دو مختلف صفات کے حامل ہیں۔[1]

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

حدآئق واعنابا

خدا نے پرہیزگاروں کے لئے (پھلوں سے بھرے ہوئے) سرسبز باغات اور انگور قرار دیئے ہیں۔ (نباء۔ ٣٢)

ایک اور آیت میں ہے:

فی سدر مخضود طلح منضود

وہ بغیر کانٹوں کی جھکی ہوئی بیریوں میں ہوں گے اور تہ بہ تہ لگے ہوئے کیلے کے درختوں میں۔ (واقعہ: ٢٨، ٢٩)

اکثر مفسرین نے ''طلح'' کو کیلے کے درخت کے معنی میں لیا ہے جس کے پتے بہت سرسبز، خوبصورت اور بڑے بڑے ہوتے ہیں اور اس کا پھل بہت لذیز ہوتا ہے، ''منضود'' کا مادہ ''نضد'' ہے جس کا معنی ''تہ بہ تہ'' ہونا ہے یہ کیلے کے ان گچھوں کی طرف اشارہ ہے جو ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں۔

بعض نے ''منضود'' کو اس درخت کے پتوں کے تہ در تہ ہونے کی طرف اشارہ قرار دیا ہے اس بات کے پیش نظر کہ بیری کے پتے بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور کیلے کے بہت بڑے، ان دونوں درختوں کا ایک ساتھ ذکر جنت میں درختوں کے تنوع کی طرف ایک لطیف اور خوبصورت اشارہ ہے۔[2]

کلام مجید میں پھلوں کی مختلف اقسام کو بہشتی کھانوں کے عنوان سے ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ایک عمومی اشارہ گوشت کی طرف بھی کیا گیا ہے، اور ''لحم طیر'' (پرندوں کے گوشت) کی طرف خصوصی طور پر اشارہ کیا گیا ہے۔

ایک جگہ پر جنت کی اہم ترین نعمات کا ذکر کرنے کے بعد اشارہ ہوتا ہے:

وامددنٰہم بجا کھۃ ولھم مما یشتھون۔

---

[1] تفسیر فخر رازی، ج ٢٩، ص ١٣٤۔

[2] تفسیر فخر رازی، ج ٢٩، ص ١٦٢۔

اور ہم انہیں پھلوں سے اور گوشت سے جو کچھ وہ چاہیں گے دیں گے۔[1] (طور:۲۲)

''مما یشتھون'' (جس قسم کی بھی چاہیں) کا جملہ ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے جو ہر قسم اور ہر طرح کے کھانے کے لئے ہے۔

ایک اور جگہ پر جنت کی مختلف نعمتوں اور متنوع پھلوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

ولحم طیر مما یشتھون۔

اور پرندوں کا گوشت جس طرح کا بھی چاہیں۔(واقعہ،۲۱)

دونوں جگہوں پر پھلوں کا ذکر پہلے اس لئے ہے کہ پھل ایک بہترین، لذیذ اور عمدہ غذا ہے، بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ انسان کی طبعی غذا پھل ہی ہے، وہ انسان کو ''پھل خور'' موجود سمجھتے ہیں، اسی لئے انسان طبعی طور پر گوشت کو استعمال نہیں کر سکتا بلکہ گوشت میں چند ایک تبدیلیاں کر کے یا اس کے ساتھ کسی اور چیز کو ملا کر استعمال کر سکتا ہے، جب کہ پھلوں کو اُن کی طبعی حالت اور بغیر کسی تبدیلی کے استعمال کر سکتا ہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ گوشت والا کھانا کھانے سے پہلے پھل کھانا ایک خاص ہی لطف اور مزہ رکھتا ہے۔

۶۔ پاکیزہ شراب

بہشت میں پینے والی چیزیں بھی اس کے کھانوں کی طرح بڑی متنوع اور نشاط افریں ہیں، قرآن نے مختلف تعبیرات سے کے ساتھ انہیں بیان فرمایا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض تو نہروں کی شکل میں ہیں جن کی چار قسموں کو سورہ محمد کی آیت ۱۵ میں بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

مثل الجنة التی وعد المتقون فیھا انھا ر من مآء غیر اسن وانھار من لبن لم یتغیر طعمه وانھار من خمر لذه للشار بین وانھار من عسل مصفی۔

وہ جنت جس کا وعدہ پرہیز گاروں سے کیا گیا ہے وہ یوں ہے کہ اس میں صاف اور خالص پانی کی نہریں ہیں جن کی خوشبو ختم نہیں ہوتی اور دودھ کی نہریں ہیں جس کا ذائقہ تبدیل نہیں ہوتا اور (پاک) شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لئے لذت بخش ہے اور صاف شہد کی نہریں ہیں۔

---

[1] ''امددنھم'' کا مادہ ''امداد'' ہے جس کا معنی مسلسل اور جاری عطا ہے، یہ حقیقت میں مدد پہنچانے کے معنی میں آتا ہے، بعض ارباب لغت مثلا صاحب قاموس نے اسے موت کے موخر ہونے اور زندگی کے جاری رہنے کے معنی میں بیان کیا ہے، یہ پہلے معنی سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

یہ چار قسم کی پینے والی چیزیں ہیں جو کہ جنت کی چار نہروں میں ہوں گی، (نہ یہ کہ ایک نہر میں بلکہ ہر ایک کی کئی نہریں جاری ہوں گی)، اُن میں پینے کی مختلف چیزوں کو بیان کیا گیا ہے، پانی پیاس بجھانے کے لئے، دودھ غذائیت کے لئے، شہد توانائی اور لذت کے لئے اور پاک و پاکیزہ شراب سرور کے لئے۔

یہ چیزیں ایسی خلق کی گئی ہیں کہ زمانے کی تبدیلی ان میں کسی قسم کی خرابی پیدا نہیں کرسکتی، یہ ہمیشہ تازہ اور مزے دار رہیں گی، گویا جنت کا ماحول ایسا ہے کہ بیماری اور خرابی پھیلانے والا کوئی جراثیم اس میں نہیں ہوتا، وہ ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک ماحول ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس دنیا کا پانی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدبودار ہو جاتا ہے یا اس کی رنگت تبدیل ہو جاتی ہے، لیکن جنت کے پانی کی نہریں ایسی ہیں کہ وہ ہمیشہ کی طرح صاف اور خوشبودار رہیں گی۔

اس دنیا میں جو دودھ ہوتا ہے وہ تھوڑا سا وقت گزرنے کے ساتھ تبدیل ہو جاتا ہے، اس کی مٹھاس ترشی میں تبدیل ہو جاتی ہے جو اس کے خراب ہو جانے کی دلیل ہوتی ہے لیکن جنت کا دودھ ہمیشہ تازہ، خوشگوار اور میٹھا ہی رہے گا۔

اس دنیا کی شراب کا پینا لذت بخش نہیں ہے چونکہ سب لوگ اسے تلخ اور بدذائقہ کہتے ہیں جو لوگ اسے پیتے ہیں وہ بھی اُس کے نشے کی وجہ سے پیتے ہیں لیکن بہشت کی پاک شرابوں کا پینا لذت بخش بھی ہے اور سرور آفرین بھی، اس کا سرور روحانی ہے نہ کہ شیطانی۔

اس دنیا کا شہد بھی اکثر اوقات ناخالص ہوتا ہے، لیکن جنت کا شہد ہر لحاظ سے خالص اور صاف ہے، یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن نے شہد کو پینے والی چیزوں میں سے شمار کیا ہے، سورہ نحل میں جو شہد کی مکھیوں کے متعلق گفتگو ہے اس میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

یخرج من بطونها شراب مختلف الوانه

اُن کے پیٹ میں سے ایک خاص قسم کی پینے والی چیز نکلتی ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ (نحل، ٦٩)

یہ تعبیر شاید اس لئے ہو کہ اگر شہد کو پینے کے طور پر استعمال کیا جائے (شہد کا شربت) تو وہ زیادہ خوش ذائقہ، مفید اور قوت بخش ہوتا ہے۔

''سورہ دھر'' کی آیات میں جہاں نیک لوگوں کے لئے مختلف نعمات بہشت کا ذکر ہوا ہے وہاں جنت میں پینے کی چند اور چیزوں کو بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ان الابرار یشربون من کاس کان مزاجها کافورا۔ عینا یشرب بها عباد الله یفجرونها تفجیرا۔

یقینا نیک لوگ اس پیالے میں سے پئیں گے جس میں کافور ملا ہوگا، وہ ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے خاص بندے پئیں گے اور وہ اسے جہاں چاہیں بہالے جائیں گے۔ (دھر، ٥و٦)

چند آیات کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

ویسقون فیھا کاسا کان مزاجھا زنجبیلا ۔ عینا فیھا تسمی سلسبیلا

اور بہشت میں انہیں ایسا جام پلایا جائے گا جو شراب طہور سے لبریز ہوگا، جس میں سونٹھ کی ملاوت ہوگی، بہشت کے ایک چشمے سے جس کا نام سلسبیل ہے۔ (دھر، ۱۷و۱۸)

پھر چند آیات کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

وسقاھم ربھم شرابا طھورا

اُن کا رب انہیں شراب طہور پلائے گا (ایسی شراب جس کا ساقی خدا ہے جو خود پاک ہوگی اور جو تمام برائیوں اور پلیدیوں سے پاک کردے گا)۔ (دھر۔۲۱)

ان آیات میں بھی جنت کی چند پاکیزہ شرابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

پہلے تو وہ خاص شراب جو سکون بخش ہے کیونکہ کافور لغت میں متعدد معانی رکھتا ہے، اُن میں سے ایک خوشبو، دوسرا وہ سفید رنگ کا مادہ جو ٹھنڈک اور سفیدی میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے اور بہت تیز قسم کی خوشبو رکھتا ہے اور سکون بخش ہے، یہ بالکل زنجبیل کے مدمقابل ہے جو بہت گرم ہوتی ہے (زنجبیل وہ خوشبودار جڑیں ہیں جو دوائیوں، کھانوں اور بعض اوقات بوتلوں میں استعمال ہوتی ہیں)۔

معلوم ہوتا ہے کہ لوگ دو مختلف طرح کی شرابیں بناتے تھے، ایک تو نشاط آور اور ہشاش بشاش کر دینے والی ہوتی جب کہ دوسری سستی پیدا کر کے ایک سکون کی سی کیفیت طاری کر دیتی۔

پہلی میں زنجبیل ملا ہوا ہوتا تھا جب کہ دوسری میں کافور، چونکہ دوسری دنیا کے حقائق ہماری دنیا کے محدود لفظوں میں سمٹ نہیں سکتے اس لئے مجبوراً ان الفاظ کو وسیع اور بلند معانی کیلئے استعمال کرتے ہیں تا کہ اُن بلند مرتبہ حقائق کو بیان کیا جا سکے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ کافور بہشت کا ایک چشمہ ہے جس کی سفیدی، ٹھنڈک اور خوشبو اسی کافور کی مانند ہے، لیکن اس کا ذائقہ ایسا نہیں اور نہ اس کا کوئی نقصان ہے (یہ بات معلوم ہونا چاہیے کہ عام کافور ایک طرح کی گوند ہے جسے چین کے جنوبی حصے یا ہندوستان میں پائے جانے والے ایک درخت سے لیتے ہیں، یہ طبی مقاصد کے لئے استعمال ہوتا ہے) لیکن پہلے جو تفسیر بیان کی گئی ہے وہ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے کیونکہ شراب کافور کو شراب زنجبیل کے مدمقابل ذکر کیا گیا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے قرآن کہتا ہے کہ زنجبیل کی شراب بہشت میں واقع ایک چشمے سے بنائی گئی ہے جس کا نام ''سلسبیل'' ہے، بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ سلسبیل کو ''سلاسته'' سے بنایا گیا ہے جس کا معنی رواں ہونا ہے، یہ ایک خاص قسم کی پینے والی چیز کی طرف اشارہ ہے جو

بہت لذیذ ہے اور گلے اور منہ میں سے آسانی سے چلی جاتی ہے اور بہت خوشگوار ہے۔

بعض نے اُسے ''تسلسل'' کا مرکب جانا ہے جس کا معنی راستہ طلب کرنا ہے، یہ بھی رواں اور خوشگوار ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

بعض نے اسے ''سال'' اور ''سبیل'' کا مرکب جانا ہے جس کا معنی راستہ طلب کرنا ہے، یہ بھی رواں اور خوشگوار ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

بہرحال تمام تفاسیر سے مجموعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ''سلسبیل'' کے چشمے کی شراب بہت خوشگوار اور لذیذ ہے۔

بہشت کی تیسری پینے والی چیز جس کی طرف مذکورہ بالا آیات میں اشارہ ہوا ہے ''شراب طہور'' ہے جس کا ساقی خدا ہے، اس کی تاثیر یہ ہے کہ وہ جسم اور روح کو تمام نجاستوں سے پاک کر دیتی ہے (یہ شراب بھی پہلی دو شرابوں کی طرح نیک لوگوں کے لئے مخصوص ہے) یہ شراب دنیا کے بالکل برعکس ہے جو نجس اور ناپاک بھی ہے اور جسم و روح کو بھی آلودہ کر دیتی ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ شراب بھی پینے کی ایک چیز ہے جسے بہشتی کھانوں کے بعد پیا جائے گا، یہ تمام اندرونی فضلات کو پاک کر دے گی، صرف ایک چیز خوشبودار پسینے کی صورت میں جلد سے ٹپکے گی، تفسیر فخر رازی، میں یہ بات ایک حدیث کے عنوان سے ذکر ہوئی ہے، تفسیر المیز ان میں اس ''شراب طہور'' کی روحانی طہارت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ یہ شراب خدا سے غفلت اور اس کی طرف توجہ کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو ختم کر دے گی۔

تفسیر ''منہاج الصادقین'' میں امام جعفر صادقؑ سے یہ حدیث نقل کی گئی ہے:

''جب مومن شراب طہور پی لے گا تو اللہ کے سوا سب کو فراموش کر دے گا اور پوری طرح خدا کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔[1]

سورہ مطففین میں نیک لوگوں کو ملنے والی جنتی نعمات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

''يسقون من رحيق مختوم''

انہیں سربمہر شراب ناب پلائی جائے گی۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

ختمه مسك وفى ذٰلك فليتنافس المتنافسون

جو اس پر مہر لگائی گئی ہے وہ کستوری کی ہے۔خواہش کرنے والوں کو اس کی خواہش کرنا چاہیے۔

آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

''ومزاجه من تسنيم عينا يشرب بها المقربون''

---

[1] منہاج الصادقین۔ج۱۰ص۱۱۰ ''تفسیر اثنیٰ عشر کے مطابق زیر نظر آیت کے ذیل میں''

اس شراب میں آب تسنیم ملا ہوگا اور یہ وہ چشمہ ہے کہ جس سے مقربین سیراب ہوں گے۔

بہت سے مفسرین کے بقول ''رحیق'' کا معنی وہ خالص شراب ہے جو ہر قسم کی ملاوٹ اور آلودگی سے پاک ہو،بعض نے اس بات کا بھی اضافہ کیا ہے کہ وہ صاف ستھری، درخشاں اور چمک دار بھی ہوتی ہے۔

''مختوم'' کا معنی ہے''مہر لگا ہوا'' آج کل اس کے لئے لاک لگانے کی تعبیر استعمال کی جاتی ہے، یہ بھی اس کے پاکیزہ، خالص اور نئی ہونے پر تاکید ہے۔

''ختمه مسک'' کی تعبیر اس چیز کی طرف اشارہ ہے جو پہلے زمانے میں اور موجودہ زمانے میں بھی رائج ہے وہ یہ کہ کسی چیز کو محفوظ اور نئی رکھنے کے لئے اُسے ایک برتن یا کسی اور چیز میں رکھ کر اس کا منہ کسی رسی وغیرہ کے ساتھ باندھ دیتے ہیں پھر اسے گرہ لگا دیتے ہیں، پھر گرہ کے اوپر کچھ سخت مٹی یا آٹا یا لاک اور کبھی سیسہ لگا دیتے ہیں، اس کے بعد اس پر ایک مخصوص مہر لگا دیتے ہیں، اس برتن میں موجود چیز تک پہنچنے کے لئے اس مہر کو توڑنے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں ہوتا، لہٰذا ایسی چیز کو وصول کرنے کے بعد سب سے پہلے اُس کی مہر کو دیکھتے ہیں کہ وہ محفوظ ہے یا نہیں، عرب اس کیلئے''مختوم''(مہر لگا ہوا) کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں ارشاد ہوتا ہے کہ ان محفوظ اور نئے ظروف پر کستوری کی مہر لگی ہوگی، جو ایک بہت مشہور خوشبودار مادہ ہے، جب بہشتی اس مہر کو توڑیں گے تو کستوری کی خوشبو پوری فضا میں پھیل جائے گی۔

اس آیت کی کئی اور تفسیریں بھی بیان کی گئی ہیں جن میں سے کوئی بھی آیت کے ظاہر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

''تسنيم'' کا مادہ''سنم''(بروزن''صنم'') ہے، مقائیس اللغت کے بقول اس کا معنی ارتفاع اور بلندی ہے''سنام بعیر'' کا معنی اونٹ کی کوہان ہے، اسی وجہ سے زمین پر سے آگ کے شعلوں کے بلند ہونے، بادلوں کے بلند ہونے، دھوئیں کے بلند ہونے اور پودوں کے خوشوں کے لئے بھی یہ کلمہ استعمال ہوتا ہے، لہٰذا''چشمه تسنيم'' کا معنی وہ چشمہ ہے جو اوپر لے جانے اور بلندی کی طرف پہنچانے کا سبب ہے، یہ شاید اس لحاظ سے ہو کر مقربان یہ شراب پی کر قرب الٰہی کے مقام تک پہنچ کر حق کے نور میں فنا ہو جائیں گے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ''چشمه تسنيم'' ایسا چشمہ ہے جو بہشت کے اونچے درجے پر واقع ہے، وہ وہاں سے بہتا ہے، کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایسی شراب ہے جو آسمان بہشت سے برستی ہے،''مقربان'' اسے بالکل خالص حالت میں پئیں گے،''ابرار'' کے لئے اُسے ایک اور شراب سے ملایا جائے گا جس کا نام''رحیق مختوم'' ہے۔

ان معانی کے درمیان جمع شاید یوں ہو سکے کہ یہ چشمہ مکان کے اعتبار سے بھی ایک بلند جگہ پر واقع ہے اور وہاں سے بہتا ہوا آتا ہے اور اسی طرح معنوی اور روحانی تاثیر کے اعتبار سے بھی یہ روح کو ایک بہت بلند اور اونچے مقام تک پہنچا دیتا ہے، یہ خدا کے قرب کا مقام ہے۔

۷۔ بہشت کی سب سے اعلیٰ شراب

مذکورہ بالا آیات میں سات قسم کی بہشتی شرابوں کا ذکر ہوا ہے۔ ان سے مجموعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بہشت میں پینے والی

چیزوں کی مختلف اقسام ہوں گی۔ بعض کی تو نہریں بہہ رہی ہوں گی، دودھ، شہد، پانی اور شراب کی نہریں۔ بعض بند منہ والے برتنوں میں ہوں گی۔ بعض چشمے ہوں گے جو بہت کے آسمان یا کسی اور بلندی سے گر رہے ہوں گے۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ بہشت کی سب سے اعلیٰ شراب یہی ہے جس کا نام "شراب تسنیم" ہے یہ مقربین کیلئے مخصوص ہوگی۔

تفسیر علی ابن ابراہیم میں ہے:

اشرف شراب اهل الجنة یاتیهم فی عالی تسنیم وهی عین یشرب بهاالمقربون والمقربون اٰل محمدٍ......والمقربون یشربون من تسنیم بحتًا صرفًاوسآئر المومنین ممروجًا

اہل بہشت کیلئے سب سے اعلیٰ شراب ایک خاص قسم کی ہوگی جو اوپر سے (آبشار کے مانند) ان کی طرف آئے گی۔ وہ ایک چشمہ ہے جس سے مقربین پئیں گے، مقربین آلِ محمدؐ ہیں......وہ خالص شرابِ تسنیم پئیں گے اور دوسرے مومنین اسے (شراب طہور کے ساتھ) ملا کر پئیں گے۔[1]

اس کے بعد "شراب طہور" مرحلہ ہے۔ سورہ دہر کی آیت ۲۱ میں اس کی طرف اشارہ ہوا تھا۔ خدا جس شراب کا ساقی ہوگا وہ صرف یہی شراب طہور ہے۔

یہ بات مدنظر رہے کہ یہ تمام کے تمام اوصاف ہیں جو ہم نے سنے ہیں یا پڑھے ہیں۔ جو کچھ اس بلند مقام پر ہوگا یہ تو فقط اس کی ایک معمولی سی جھلک ہے جو ہمارے ذہنوں میں منعکس ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہشت کی نعمات اور پاک شرابوں کی تعریف ہماری قدرت سے باہر ہے۔ اس کا صحیح تصور مادی دنیا کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لوگوں کیلئے محال ہے۔

فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین

کوئی نہیں جانتا کہ وہ پوشیدہ نعمات جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا ذریعہ ہیں، کیسی ہوں گی۔ (الم سجدہ۔ ۱۷)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن نے اس دنیا کی آلودہ شراب اور اس جہان کی پاک و پاکیزہ شراب کے درمیان فرق کو مختلف تعبیرات کے ساتھ بیان کیا ہے ایک جگہ پر ارشاد ہوتا ہے:

بیضآء لذةٍ للشاربین

وہ ایک چمکدار، سفید اور لذت بخش شراب ہے پینے والوں کیلئے۔ (صافات۔ ۴۶)

---

[1] تفسیر علی ابن ابراہیم جلد ۲ ص ۴۱۲

وہ اس دنیا کی شراب کی طرح کڑوی، بد بودار اور بری نہیں ہوگی بلکہ وہ ایک ایسی شراب ہوگی جو شروع سے ہی لذت پہنچائے گی۔ اس کے پینے سے جو روحانی اور معنوی سرور آئے گا وہ بیان کی حدوں میں نہیں سما سکتا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے:

لا فیھا غول ولا ھم عنھا ینزفون

اس سے نہ تو عقل زائل ہوگی اور نہ بدن سست ہوگا۔ (صافات۔ ۴۷)

اس دنیا کی شراب تو عقل کو زائل کر دیتی ہے اس کا نشہ بدن کو اس طرح سست اور کمزور کر دیتا ہے کہ انسان چلنے اور بدن کا توازن قائم رکھنے پر قادر نہیں رہتا۔ لیکن بہشت کی پاکیزہ شرابیں عقل و شعور کو جلا بخشیں گی یہ جذبہ عشق کو شعلہ ور کریں گی اور جسم و روح کو معنوی اور مادی لذتوں سے فائدہ اٹھانے کیلئے آمادہ کریں گی۔ [1]

ایک اور جگہ پر بہشت کی شرابوں کا ذکر کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

لا یصدعون عنھا ولا ینزفون

جس سے نہ تو انہیں سر درد ہوگا اور نہ وہ بہکیں گے۔ (واقعہ۔ ۱۹)

''یصدعون'' کا مادہ ''صداع'' (بروزن غبار) ہے، جس کا معنی سر درد ہے اس کی بنیاد ''صدع'' ہے، جس کا معنی ''پھاڑنا'' ہے، جب انسان شدید سر درد میں مبتلا ہوتا ہے تو گویا چاہتا ہے کہ اپنے سر کو پھاڑ ڈالے، لہٰذا یہ لفظ شدید قسم کے سر درد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ دنیا کی شرابیں بد بودار، بد ذائقہ، سر درد لانے والی، عقل کو زائل کر دینے والی اور مختلف قسم کی جسمانی اور روحانی بیماریوں کا باعث بنتی ہیں، بعض اوقات ان کے پینے سے جی متلانے لگتا ہے اور دل میں درد شروع ہو جاتا ہے جب کہ جنت کی شرابیں لذیذ، عقل آفریں، نشاط انگیز اور جسم و جان کی پرورش کا باعث بنتی ہیں، یہ خدا کی جانب توجہ مبذول کروا کے روحانی اور معنوی نشے کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

۸۔ برتن اور جام

بے شک کھانے اور پینے کے وقت حقیقی مطلوب کھانا یا پینا ہی ہوتا ہے نہ کہ برتن، لیکن یہ بات بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ کھانے کو پیش کرنے کا انداز اور کھانے کے برتن بھی اس کی لذت میں بہت اثر انداز ہوتے ہیں، بعض اوقات تو یہ کھانے اور پینے کی لذت کو کئی گنا بڑھا

---

[1] ''غول'' (بروزن ''قول'') حقیقت میں غافل کر دینے کے معنی میں ہے (اسی لئے ''غیلہ'' قتل کر دینے کے معنی میں آتا ہے) یہ کلمہ اس مخفی اور پوشیدہ برائی کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے جو کسی چیز میں نفوذ کر جائے۔ ''ینزفون'' کا مادہ ''نزف'' (بروزن ''حذف'') ہے جس کا معنی کسی چیز کو آہستہ آہستہ کر کے ختم کر دینا ہوتا ہے۔ اسی لئے رگوں سے خون بہنے کو ''نزوف الدم'' کہتے ہیں۔ اس دنیا کی شراب بھی انسانی وجود کے ساتھ یہی کچھ کرتی ہے اسے آہستہ آہستہ تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔

دیتے ہیں، اسی وجہ سے قرآن مجید کی متعدد آیات میں بہشت کے خوبصورت برتنوں کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں کھانے کے برتن بھی شامل ہیں اور شراب طہور پینے کے بھی، بہت مختصر اور معنی خیز تعبیروں میں اُن کی تصویر کشی کی گئی ہے، یہ باتیں قطعی طور پر وہاں کی صورت حال کا ایک اجمالی سا خاکہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں، وگرنہ وہاں کی تو ہر چیز ہمارے تصورات کی حدوں سے کہیں دور ہے، ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"یطاف علیھم بصحاف من ذھب و اکواب"

بہشتی کھانے اور شراب طہور سونے کے برتنوں اور جاموں میں ان کے ارد گرد پھرائے جائیں گے۔(ازخرف۔۷۱)

''صحاف'' جمع ہے ''صحفہ'' (بروزن ''صفحہ'') کی جس کا معنی ہے بہت کھلا اور بڑا برتن، (کیونکہ حقیقت میں یہ مادہ پھیلانے کے معنی میں ہے)۔

''اکواب'' جمع ہے ''کوب'' (بروزن ''قوم'') کی جس کا معنی وہ جام ہے جو دستے کے بغیر ہو (اس کے اور معانی بھی ذکر کئے گئے ہیں لیکن مشہور معنی یہی ہے جو بیان کیا گیا ہے)۔

اگرچہ ذھب (سونے) کا وصف فقط کھانے کے برتنوں کے لئے استعمال ہوا ہے لیکن جام اور پیالوں کا ان پر عطف اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ بھی سونے کے ہوں گے۔[1]

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"باکواب واباریق وکاس من معین"

بہشتی غلام اُن کے ارد گرد بہشت کی نہروں سے جام لے لے کر گردش کریں گے۔(واقعہ۔۱۸)

''اباریق'' جمع ہے ''ابریق'' کی، بعض ارباب لغت کے بقول یہ حقیقت میں فارسی کلمے ''آبریز'' سے ماخوذ ہے، جو حقیقت میں اس ظرف کے معنی میں ہے جو دستہ بھی رکھتا ہو اور مائع چیز کے نکلنے کے لئے ٹونٹی بھی رکھتا ہو۔

''جوالیقی'' نے ''المعرب من الکلام الاعجمی'' میں کہا ہے کہ یہ کلمہ فارسی میں یا تو پانی سے گزرنے کے راستے کے معنی میں ہے یا پانی گرنے کے معنی ہیں، بعض نے تو اس بات کی صراحت کی ہے کہ یہ کلمہ عربی کے مادہ ''برق'' سے ماخوذ نہیں ہے۔[2]

لہٰذا تفسیر مجمع البیان اور تفسیر قرطبی میں اس آیت کے ذیل میں جو یہ کہا گیا ہے کہ ''ابریق'' کا یہ نام اس کی چمک اور روشنائی کی وجہ سے

---

[1] حقیقت میں یہ جملہ ''اکواب من ذھب'' تھا، تکرار سے بچنے کے لیے ''من ذھب'' کو حذف کر دیا گیا ہے ''الذاکرین اللہ کثیرا والذاکروت''

[2] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم

ہے، درست نہیں ہے۔

''کاس'' کا معنی شریں پانی سے لبریز جام ہے، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جیسا کہ اس دنیا کے مشروبات کو پہلے بڑے بڑے برتنوں میں ڈالتے ہیں اور پھر اس سے جام بھر لیتے ہیں، یہی تربیت بہشت کی شراب کے سلسلے کی آیت میں بھی ملحوظ خاطر رکھی گئی ہے، پہلے ''اکواب'' کا ذکر ہے، پھر ''اباریق'' کا اور آخر میں ''کائس'' کا۔[۱]

قدیم شعراء کے کلام میں بھی اس کے لئے ''ساغر''، ''صراحی'' اور جام کی تعبیرات پائی جاتی ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بہشتی برتنوں کی انواع اور اقسام مختلف ہوں گی، بعض سونے کے ہوں گے، بعض چاندی کے اور بعض بلور کے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"ويطاف عليهم بآنية من فضة واكواب كانت قواريرا"

ان کے اردگرد چاندی کے برتنوں اور بلوریں جاموں کو پھرایا جائے گا، (جو بہترین کھانوں اور شرابوں سے لبریز ہوں گے)۔ (دھر۔۱۵)

قابل غور بات یہ ہے کہ اس کے فوراً بعد ارشاد ہوتا ہے:

"قواريرا من فضة قدروها تقديرا"

چاندی کے بلورین برتن جنہیں ضروری تعداد میں تیار کیا گیا ہے۔

یہ بھی جنت کی خصوصیات میں سے ہے کیونکہ دنیا میں کوئی ایسا بلوریں برتن نہیں ہے جو چاندی سے بنایا گیا ہو، بلور تو شیشے کے ایک مخصوص پتھر سے بنایا جاتا ہے جب کہ چاندی ایک دھات ہے، لیکن یہ بات قابل تعجب نہیں ہے کہ خدا ایک شفاف قسم کی چاندی پیدا کردے، حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

ينفذ البصر فی فضة الجنة كما ينفذ فی الزجاج

آنکھوں کی روشنی بہشت کی چاندی میں یوں سرایت کر جائے گی جیسے اس دنیا کا شیشہ اور بلور۔[۲]

یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز نرالی ہوگی، بہر حال جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے بہشت کے برتن اتنے خوبصورت اور جاذب نظر ہوں گے کہ کھانے اور پینے کی لذت کو دوبالا کردیں گے۔

---

[۱] تفسیر فخر رازی، زیر نظر آیت کے ذیل میں

[۲] مجمع البیان۔ ج۱۰۔ ص۴۱۰

۹۔لباس اور سنگھار

اس دنیا کی زندگی میں لباس ایک خاص اہمیت کا حامل ہے، ایک تو یہ جسم کو گرمی، سردی اور مختلف نقصانات سے بچا تا ہے، دوسرے یہ کہ یہ انسان کے لئے ایک زینت کا کام بھی دیتا ہے، اکثر اوقات کپڑے پہننے کا انداز، کپڑے کا رنگ اور سلائی انسان کی فکر اور خیالات کی ترجمان بن جاتی ہے۔

انسانی تاریخ میں لباس ایک زینت کے طور پر انسان کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے، اب بھی اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

جنت کا لباس یقینی طور پر سردی، گرمی یا دوسری تکالیف سے محفوظ رہنے کے لئے نہیں ہے، کیونکہ وہاں پر تو ہر چیز حداعتدال پر ہے، وہاں پر کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی، لہٰذا وہاں پر لباس کا پہننا فقط زیبائش کا پہلو رکھتا ہے، شاید اسی لئے قرآن کی آیات میں لباس کے آرائشی پہلو کو زیادہ بیان کیا گیا ہے، اس سلسلے میں مختلف تعبیرات لائی گئی ہیں، جو بہشتی لباسوں کے خوبصورت اور جاذب نظر ہونے کی حکایت کرتی ہیں، ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

ویلبسون ثیابا خضرا من سندس واستبرق

وہ (خوبصورت اور قیمتی) ریشم کے باریک سبز اور موٹے لباس پہنیں گے۔(کہف۔۳۱)

اسی عبارت سے ملتی جلتی عبارت سوہ دخان کی آیت ۵۳ اور سورہ دہر کی آیت ۲۱ میں بھی آئی ہے، پہلی آیت یوں ہے:

یلبسون من سندس واستبرق

دوسری یوں ہے:

عالیھم ثیاب سندس خضر واستبرق

ان کے جسموں پر ریشم کے باریک سبز اور دیبا کے موٹے کپڑے ہوں گے۔[1]

ایک اور جگہ پر ارشاد ہوتا ہے:

ولباسھم فیھا حریر

بہشت میں اُن کے کپڑے ریشم کے ہوں گے۔(حج،۲۳)

بالکل یہی تعبیر سورہ فاطر آیت ۳۳ میں آئی ہے اور اسی سے ملتی جلتی تعبیر سورہ دہر کی آیت ۱۲ میں آئی ہے، کلمہ ''سندس'' مفسرین اور

---

[1] ''عالیھم'' کا مادہ ''علو'' ہے، اس کا معنی ہے ''ان کے اوپر''۔۔۔۔۔۔۔اعراب کے لحاظ سے اس میں دو احتمال ذکر کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ یہ ''ظرف'' ہے کیونکہ یہ ''فوق'' والا معنی رکھتا ہے، دوسرا یہ کہ یہ ''حال'' ہے اُس ''ھم'' کی ضمیر کے لئے جو اس سے پہلی آیت میں آئی ہے۔

علماء لغت کی متفقہ رائے کے مطابق باریک ریشم کے کپڑے کے معنی میں ہے جو بہت قیمتی ہوتا ہے، اس کلمے کی بنیاد عربی نہیں ہے (بعض کتابوں میں اس کی بنیاد فارسی یا رومن کو قرار دیا گیا ہے [1] اگرچہ فارسی میں اس معنی کا لفظ موجود نہیں ہے۔

بعض نے اس کی بنیاد یونانی کو سمجھا ہے۔[2] بعض نے اس کا معنی وہ ریشمی کپڑا کیا ہے جو سونے کی تاروں سے بنا جائے۔

''استبرق'' علماء لغت اور مفسرین کے بقول موٹے ریشمی کپڑے کے لئے استعمال ہوتا ہے، یہ فارسی کے کلمے ''استبر'' یا ''ستبر'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی موٹا اور بھاری ہونا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''دیبا'' اور ''حریر'' ایسے کپڑے کو کہتے ہیں جو ریشم سے بنا جائے، یہ ایک بہت وسیع مفہوم کا حامل ہے، اگر یہ کپڑا بہت باریک ہو تو اُسے ''سندس'' کہتے ہیں، اگر بھاری ہو تو اسے ''استبرق'' کہتے ہیں، یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جنتیوں کے کپڑے خالص ریشم کے بنے ہوئے ہوں گے، یہ لباس طرح طرح کے ہوں گے۔

شاید یہ بات کہنے کی ضرورت نہ ہو کہ ریشمی کپڑے اپنی نرمی، لطافت، جاذبیت اور مختلف رنگوں کی اثر پذیری کے سلسلے میں سب سے عمدہ اور اعلیٰ ہوتے ہیں، چونکہ اس دنیا کے باسیوں کی زندگی میں ان سے بڑھ کر کوئی کپڑا قیمتی اور خوبصورت نہیں ہوتا اس لئے بہشتی لباسوں کے لئے بھی یہی تعبیر استعمال کی گئی ہے ورنہ بہشت کی تو ہر چیز ہمارے تصور کی حدوں سے بہت آگے ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بہشتی لباسوں کے سلسلے میں فقط سبز رنگ کی بات کی گئی ہے، یہ شاید اس لئے ہو کہ عالم طبیعت میں پائے جانے والے رنگوں میں سے یہ رنگ سب سے خوبصورت اور جاذب نظر ہے، پودے عموماً سبز ہوتے ہیں، دریاں اور دوسری جگہوں کا پانی کبھی نیلگوں دکھائی دیتا ہے اور کبھی سبز، اسی وجہ سے انسانی طبیعت اس رنگ کے ساتھ زیادہ مانوس ہے، یہ رنگ دل کو بھاتا ہے، بعض سائنسدانوں نے سبز رنگ کو باعث تسکین اور آرام بخش قرار دیا ہے۔

ایک کتاب جو ''صحت اور لباس'' کے سلسلے میں لکھی گئی ہے اُس میں ہے:

سبز رنگ نفسیاتی اور اعصابی بیماریوں کے لئے نیز ہسٹریا (HYSTERIA) کے لئے بطور علاج بہت اچھا ہے تھکاوٹ دور کرنے، خوش مزاجی اور اعتدال کے لئے بھی سبز رنگ بہت اچھا ہے، بے خوابی دور کرنے، بلڈ پریشر کے خاتمے اور اعصابی درد کی تسکین کے لئے بھی سبز رنگ بہت کارآمد ہے، جو لوگ سبز رنگ انتخاب کرتے ہیں، یہ اُن کی طبیعت کی نرمی، مزاج کے اعتدال اور روح کی سرشاری کی علامت ہے۔

ایک جگہ پر مزدوروں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا، ایک گروپ کو سبز رنگ کے صندوق دئے گئے، دوسرے کو سیاہ رنگ کے اور تیسرے کو سرمئی رنگ کے، ان میں سے ہسپتالوں کی طرف رجوع کرنے والے زیادہ افراد کا تعلق دوسرے یا تیسرے گروپ سے تھا، یہ لوگ کمر درد یا کسی اور درد کا شکار ہوئے۔

لندن میں ایک سیاہ رنگ کا پل تھا، اس پر خودکشی کے بہت سے واقعات رونما ہوئے، لیکن جب اس پر سبز رنگ کر دیا گیا تو ایسے

---

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم

[2] لغت نامہ دھخدا

واقعات کم ہو گئے۔[۱]

بہت پہلے سے یہ بات مشہور ہے کہ تین چیزیں غم اور پریشانی کو ختم کر دیتی ہیں:

پانی، سبزہ، اور خوبصورت چہرہ

کلام کے اس سلسلے کو ایک مفسر کی اس بات پر ختم کرتے ہیں کہ وہ کہتا ہے کہ بہشت کے لباس اس قدر خوبصورت ہیں کہ اگر اُن میں سے ایک کو اس دنیا کے سامنے پھیلا دیا جائے تو پوری دنیا مدہوش ہو جائے۔[۲]

بہشتی سنگھار

اہل بہشت کے کپڑوں کی بات تو ہو گئی، ان کے سنگھار کے متعلق بھی کچھ گفتگو ہو جائے۔

مناسب حد تک بناؤ سنگھار ایک قسم کا نفسیاتی اثر رکھتا ہے، یہ انسانی روح کو خوش اور تر و تازہ کر دیتا ہے، اگر یہ اعتدال کی حد سے خارج نہ ہو تو ایک پسندیدہ کام ہے، اسی لئے قرآن اور اسلامی روایات میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ مسلمان عبادت کی حالت میں بھی جائز سنگھار کو نہ بھولیں، مثلاً پاک لباس، مناسب رنگ، بالوں میں کنگھی کرنا، عطر اور خوشبو لگانا، اور مختلف قسم کی انگھوٹھیاں پہننا۔

قرآن کی متعدد آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہشتی بھی اپنے آپ کو مختلف چیزوں سے آراستہ کریں گے، وہ اس سے نفسیاتی خوشی محسوس کریں گے۔

قرآن کی تین آیات میں یوں آیا ہے:

یحلون فیہا من اساور من ذھب

انہیں بہشت میں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔[۳]

''اساور'' جمع ہے ''اسورۃ'' (بروزن ''تجربہ'') کی، جو جمع ہے ''سوار'' (بروزن ''غبار'') کی، اس کا معنی ہے کنگن، یہ فارسی کے کلمے ''دستوار'' سے ماخوذ ہے۔

ان تین آیات میں سے دو میں ''ذھب'' (سونا) کے علاوہ لؤ لؤ (مروارید) کا بھی ذکر کیا گیا ہے، بعض مفسرین کے بقول یہ جواہرات اور مروارید کے کنگنوں کی طرف اشارہ ہے لیکن اس بات کے پیش نظر کہ لؤلؤ کا عطف محلی ''من اساور'' پر ہے اور یہ منصوب ہے لہٰذا یہ ''یحلون'' کے لئے مفعول کے مانند ہے۔

---

[۱] اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر'' از ڈاکٹر پاک نژاد شہید۔ ج ۱۸ ص ۱۳۴۔ ص ۱۳۳

[۲] روح المعانی۔ ج ۱۵۔ ص ۲۴۹

[۳] سورہ کہف۔ ۳۱)، (حج۔ ۲۳) اور (فاطر۔ ۳۳)

مجموعی طور پر آیت کا معنی یوں ہوگا، وہ بہشت میں سونے کے کنگنوں اور مروارید سے آراستہ ہوں گے، لہٰذا اس بات کا امکان ہے کہ مروارید سے آراستگی کنگنوں کے علاوہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بھی کنگنوں کا ہی ایک حصہ ہو۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ وہ سونے کے کنگنوں کے علاوہ خالص مروارید کے کنگن بھی پہنے ہوئے ہوں گے۔

قرآن کی ایک آیت میں چاندی کے کنگنوں کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وحلو اساور من فضة

وہ چاندی کے کنگنوں سے آراستہ ہوں گے۔ (دھر۔۲۱)

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کنگن چاہے سونے کے ہوں یا چاندی کے یا کسی اور چیز کے، ہمارے معاشرے میں تو یہ عورت کا سنگھار شمار ہوتے ہیں، کیا بہشت میں معاملہ اور طرح کا ہوگا؟

لیکن اس بات کی طرف توجہ رہے کہ اولا تو اس دنیا میں ہی بہت سے معاشروں میں کنگن عورت اور مرد دونوں کے لئے زینت سمجھے جاتے ہیں، فرعون نے موسیٰؑ بن عمران پر اعتراض کیا تھا:

فلو لا القي عليه اسورة من ذهب

موسیٰ علیہ السلام کو سونے کے کنگن کیوں نہیں دیئے گئے۔ (زخرف۔ ۵۳)

اس آیت سے واضح طور پر اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ مصر کے معاشرے میں یہ بات عام تھی، کنگن مردوں کے لئے زینت اور ان کی شخصیت اور عظمت کی علامت تھے۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ ہم نے کئی بار یہ بات ذکر کی ہے کہ قرآن ان مسائل میں ہماری زبان میں گفتگو کرتا ہے اور اہل بہشت کی زینت کا سامان قطعی طور پر ہمارے ادراک کی وسعتوں سے بالاتر ہے۔

۱۰۔ بہشتی ازواج

زندگی میں آرام، سکون اور چین کے لئے ایک مناسب ساتھی کا ہونا بہت ضروری ہے جو ہر اعتبار سے کمالات کا حامل ہو، انسان کی زندگی میں ایسے ساتھی کا وجود، چاہے وہ مرد ہو یا عورت مشکلات کو آسان کر دیتا ہے، یہ اُس کی زندگی کو لذت، سرور اور سکھ چین بخشتا ہے، اس کے برعکس کسی ایسے ساتھی کا نہ ہونا (یا غیر مناسب ساتھی کا ہونا) انسانی زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے، اگرچہ ایسے انسان کو زندگی کی باقی ساری سہولیات میسر ہوں پھر بھی زندگی اس کے لئے زہر کا ایک پیالہ بن جاتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں مناسب، کامل اور مہربان ساتھی کا ہونا فقط جسمانی لذت کے لئے ہی نہیں ہے بلکہ یہ روحانی لذت کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔

قرآن نے بہشت کی نعمات کو بیان کرنے کے سلسلے میں اس مسئلہ کی طرف بھی کافی توجہ دی ہے، اس سلسلے میں بڑی مناسب اور خوبصورت تعبیرات لائی گئی ہیں، ایک جگہ پر جنت کی دوسری نعمتوں کے ذکر کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

ولهم فيها ازواج مطهرة

بہشتیوں کے لئے وہاں پر پاک و پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ (بقرہ۔ ۲۵)

اُن کا پاک ہونا ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے، جسمانی اور اخلاقی نقائص سے دوری کے ساتھ ساتھ یہ روحانی اور معنوی برائیوں سے دوری پر بھی محیط ہے، حقیقت میں ایک بہترین ساتھی کے لئے بنیادی شرط اس کا پاکیزہ ہونا ہے۔

''مطهرة'' کی تعبیر ''طاهرة'' کی تعبیر سے زیادہ گویا اور بلند ہے، کیونکہ یہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ خدا نے انہیں پاکیزہ قرار دیا ہے، جسے خدا پاکیزہ کردے اور اس کی طہارت کی گواہی دے اس کی کیفیت بالکل واضح ہے۔

ایک حدیث میں بھی یہی مفہوم آیا ہے کہ:

وہ ہر عیب اور بری چیز سے پاک ہیں۔ [1]

قرآن مجید کی بعض آیات میں بہشتی بیویوں کے لئے ''حور العين'' کی تعبیر لائی گئی ہے، سورہ دخان آیت ۵۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

وزوجنهم بحور عين

ہم اُن کی شادی حورالعین سے کریں گے۔

سورہ طور کی آیت ۲۲ میں بھی یہی تعبیر آئی ہے، سورہ واقعہ کی آیت ۲۲، ۲۳ میں اس سے بڑھ کر ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وحور عين كامثال اللولو المكنون

حورالعین کی مثال ایسے گوہر کی سی ہے جو صدف میں پنہاں ہوتا ہے۔ [2]

سورہ رحمن کی آیت ۷۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] تفسیر المیزان ج ۱، زیر نظر آیت کے ذیل میں، علامہ مجلسی نے اس حدیث کو بحار الانوار ج ۸۔ ص ۱۴۰ پر ذکر کیا ہے ''ازواج مطهرة من انواع الاقذار والمكاره''

[2] ''حور عين'' کے محل اعراب کے سلسلے میں کئی احتمالات ذکر کئے گئے ہیں، مثلاً یہ کہ یہ ایک خبر محذوف کے لئے مبتداء ہے (لهم حور عين) یا ولدان مخلدون پر عطف ہے، لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ حورالعین خدمت کے لئے نہیں ہیں

حور مقصورات فی الخیام

جنتی عورتیں ایسی حوریں ہیں جو بہشتی خیموں میں پردہ نشین ہوں گی۔

سورۃ رحمن کی آیت ۵٦و۵۸ میں ارشاد ہوتا ہے:

فیھن قصرات الطرف لم یطمثھن انس قلھم ولا جآن......کانھن لیاقوت والمرجان

بہشت کے باغات میں ایسی عورتیں ہیں جو اپنے شوہر کے علاوہ کسی سے عشق نہیں کرتیں، انہیں ان سے پہلے نہ تو کسی انسان نے چھوا تھا اور نہ کسی جن نے۔۔۔۔۔۔۔گو یا کہ وہ یاقوت اور مونگے کی طرح ہیں۔

''حور'' کی جمع ''حوراِئ'' اور ''احور'' ہے، بہت سے علمائے لغت کے بقول اس سے مراد ہے کہ وہ جس کی آنکھ کی سیاہی مکمل طور پر سیاہ اور سفیدی پوری طرح صاف شفاف اور چمک دار ہو اور یہ آنکھ خوبصورتی کی آخری حد ہے۔

قرآن میں اُن کی آنکھوں کی خوبصورتی کو اس لئے زیادہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان کی زیادہ خوبصورتی اُس کی آنکھوں کے حسن سے وابستہ ہوتی ہے۔

بعض نے اس کا معنی پورے بدن کی سفیدی کیا ہے، اسی لئے ''تحویر'' کپڑے دھونے اور انہیں پاک اور سفید کرنے کے معنی ہیں۔

ان دونوں معانی کے درمیان جمع شاید یوں ہو کہ وہ سفید بدن اور خوبصورت آنکھوں والی ہوں گی، ''حواریون'' کا لفظ بھی حضرت عیسیٰؑ کے اُن خاص ساتھیوں کے لئے بولا جاتا ہے جو سفید لباس زیب تن کرتے تھے۔

کلمہ ''عین'' کی جمع ''اعین'' (بروزن ''افضل'') اور ''عیناء'' ہے، جس کا معنی ہے بڑی آنکھ، یہ اس عورت یا مرد کے لئے بولا جاتا ہے جس کی آنکھیں بڑی بڑی اور خوبصورت ہوں۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ''حور'' اور ''عین'' کے کلمے مذکر اور مونث دونوں کے لئے بولے جاتے ہیں، لہٰذا یہ ایک وسیع مفہوم کے حامل ہیں جو سب بہشتی ساتھیوں کے لئے ہیں، مومن مردوں کے لئے بیویاں اور مومن عورتوں کے لئے شوہر (اس سلسلے میں آگے چل کر بھی کچھ گفتگو ہوگی) اُن کی آنکھ کی خوبصورتی کا تذکرہ اس لئے ہے کہ انسان کا حسن پہلے اُس کی آنکھوں میں ہے، حقیقت میں یہ تعبیر پورے جسم کی خوبصورتی کے لئے علامت کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔

''لولو'' کا معنیٰ ہے موتی اور ''مکنون'' کا معنی ہے صدف میں پوشیدہ ہونا، جب وہ سیپ سے باہر آتا ہے تو انتہائی خوبصورتی، جاذبیت اور زیبائی کا حامل ہوتا ہے، ''حور العین'' کو ''لولو مکنون'' سے تشبیہ دینا ان کی بہت خوبصورتی اور زیبائی کی طرف اشارہ ہے، ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ دوسرے لوگوں کی نظروں سے بالکل پوشیدہ ہیں، نہ تو ان تک کوئی ہاتھ پہنچا ہے اور نہ کوئی

نظران پر پڑی ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''حور'' کو ''حیرت'' کے مادہ سے بنایا گیا ہے، لہٰذا اس کا مفہوم یہ ہے کہ جنتی بیویاں اس قدر خوبصورت ہوں گی کہ آنکھ ان کو دیکھ کر حیران رہ جائے گی۔[1]

''حوران بہشتی'' کی تعریف میں اُن نیک اور خوبصورت بیویوں کے طور پر بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

حور مقصورات فی الخیام

وہ خیموں میں پردہ نشین ہوں گی۔

''مقصور'' کا معنی مستور اور پردہ نشین کیا گیا ہے، بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی اُن کا دوسروں کی نظروں سے محفوظ رہنا ہے، جوان کی پاکیزگی کی طرف اشارہ ہے، بعض نے یہ تفسیر کی ہے کہ وہ فقط اپنے شوہروں پر آنکھیں لگائے بیٹھی ہوں گی، وہ ان کے علاوہ کسی اور سے عشق نہیں کریں گے یہ وہی بات ہے جو ''قاصرات الطرف'' کی تفسیر میں بھی ذکر کی گئی ہے۔

کیونکہ طرف (بروزن حرف) کا معنی آنکھ کی پلک ہے، چونکہ دیکھنے کے وقت پلکیں حرکت کرتی ہیں اس لئے یہ لفظ آنکھوں کی حرکت کے لئے استعمال ہونے لگا، لہذا ''قاصرات الطرف'' ان عورتوں کی طرف اشارہ ہے جن کی نظریں جھکی ہوئی ہیں، یعنی اُن کی محبت اور نظر اپنے شوہروں کے لئے مخصوص ہے، اور یہ بیوی کی سب سے بڑھ کر فضیلت ہے، کہ وہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی کے متعلق نہ سوچے، اس کی محبت کا مرکز اس کا شوہر ہی ہو۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ عربی زبان میں ''خیمہ'' صرف کپڑے کے خیمے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ہر گول عمارت کو خیمہ کہتے ہیں، یہاں تک کہ بعض علماء لغت نے تو یہ کہا ہے کہ ہر وہ عمارت جو پتھر اور اینٹوں وغیرہ سے بنی ہوُ اسے خیمہ کہتے ہیں، ''مقائیس اللغت'' کے بقول اس کی بنیاد مضبوطی اور ثبات سے ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بہشت کے خیمے باقی چیزوں کی مانند اس دنیا کے خیموں کے ساتھ کسی قسم کی مشابہت نہیں رکھتے، ان میں سے بعض تو صرف مروارید اور موتیوں کے ہیں۔

بہشتی عورتوں کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ یاقوت اور مرجان کی طرح ہیں۔

کانھن الیاقوت والمرجان (رحمن ۔۵۸)

یعنی سرخی، درخشندگی اور جلا میں یاقوت جب کی سفیدی اور خوبصورتی میں مرجان یہ بھی واضح ہے کہ جب یہ دو رنگ یعنی ''سفید'' اور ''سرخ'' آپس میں مل جائیں تو خوبصورت ترین رنگ میں تبدیل ہوجاتے ہیں،

---

[1] ابوالفتوح رازی نے اپنی تفسیر میں اسے بعض گذشتہ مفسرین کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ ج ۱۱۔ ص ۱۳

''یاقوت'' ایک معدنی پتھر ہے جو بہت شفاف اور عموماً سرخ رنگ کا ہوتا ہے جب کہ مرجان درخت کی ڈالی کی مانند ہوتا ہے، یہ سمندر میں پایا جاتا ہے، اس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، یہاں پر ظاہراً سفید رنگ والا مراد ہے، بعض نے اس کا معنی چھوٹے چھوٹے موتی کیا ہے [1]۔ کیونکہ اس طرح کے موتی سفید، خوبصورت اور بہت شفاف ہوتے ہیں۔

لیکن موجودہ سائنسدان ''مرجان'' کو ایک زندہ موجود سمجھتے ہیں جو درخت کی چھوٹی ڈالیوں کے مانند ہے، یہ سمندر کی تہ میں پایا جاتا ہے، بہت عرصے تک سائنسدان اسے ایک قسم کا پودا سمجھتے رہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ حیوانی خصوصیات کا حامل ہے اگرچہ یہ سمندر کی تہ میں موجود بڑے بڑے پتھروں سے چمٹا ہوتا ہے۔

ایک اور بیان میں انہیں ''ابکار'' اور پھر ''عرب'' اور ''اتراب'' کی صفات کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔

فجعلنهن ابكارا، عربا اترابا (واقعه۔۳۶و ۳۷)

''ابکار'' جمع ہے ''بکر'' کی جس کا معنی ہے ''کنواری''، بعض احادیث اور مفسرین کے کلمات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہشتی بیویوں میں یہ حالت ہمیشہ کے لئے رہے گی۔ ملاپ کے ساتھ یہ حالت ختم نہیں ہوگی۔

''عرب'' (بروزن ''کتب'') جمع ''عروب'' (بروزن ''صبور'') ہے، یہ اس عورت کے معنی میں ہے جو شیریں سخن اور فصیح ہو، جو اپنی میٹھی میٹھی باتوں کے ساتھ اپنے شوہر سے اظہار محبت کرے، حقیقت میں یہ ''اعراب'' کے مادہ سے لیا گیا ہے جو اظہار کے معنی میں ہے، بعض اوقات اس کا معنی یہ کیا گیا ہے کہ وہ عورت جس کی ظاہری حالت ہی اُس کی عفت اور پاک دامنی کی حکایت کر رہی ہو۔

بعض نے اس کا معنی ناز و ادا کیا ہے، یہ مذکورہ بالا معنی سے زیادہ فرق نہیں رکھتا، کلمۂ ''اتراب'' بھی قرآن کی تین آیات میں بہشتی بیویوں کی صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔[2]

یہ کلمہ جمع ہے ''ترب'' (بروزن ''حزب'') کی، جس کا معنی ہم عمر افراد ہیں، عموماً یہ کلمہ عورتوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بعض کے بقول یہ ''ترائب'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی سینے کی پسلیاں ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔

بعض نے اُسے ''تُراب'' (مٹی) کے مادہ سے سمجھا ہے گویا سب اکٹھے پیدا ہوئے ہیں اور زمین پر انہوں نے اکٹھے قدم رکھا ہے۔

بہر حال بہشتی بیویوں کا ہم عمر ہونا ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ اپنے شوہروں کی ہمعمر ہوں گی، کیونکہ ہم عمر ساتھی ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، یا ممکن ہے کہ ان کا ہم عمر ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ جوانی، اچھائی، ظاہری اور باطنی حسن میں ایک جیسے ہوں گے، بالکل اس مشہور تعبیر کی طرح کہ آنہا ہمہ خوبند یک بہ یک از ہمہ بہتر (وہ سب اچھے ہیں اور ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں)۔

---

[1] راغب نے یہ معنی ''مفردات'' میں بیان کیا ہے، بعض دوسرے مفسرین نے بھی یہی معنی ذکر کیا ہے۔

[2] راغب نے یہ معنی ''مفردات'' میں بیان کیا ہے، بعض دوسرے مفسرین نے بھی یہی معنی ذکر کیا ہے۔

لیکن اس کو ''عرب''، ''کواعب'' اور ''قاصرات الطرف'' جیسے اوراوصاف کے ساتھ ذکر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلا زیادہ مناسب ہے۔

کلمہ ''کواعب'' جو کہ سورہ نباء میں بہشتی عورتوں کی توصیف کے لئے لایا گیا ہے، جمع ہے ''کاعب'' کی، جس کا معنیٰ کم عمر کی باکرہ لڑکی ہے، یہ ''کعب'' کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی پاؤں کا اُبھار ہے، یہاں پر یہ اس عورت کی طرف اشارہ ہے جس کے سینے کا اُبھارا بھی بھی نمایاں ہوا ہو، ایسا جوانی کی ابتداء میں ہوتا ہے، یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ جسمانی بلوغ کی طرف اشارہ ہے جس وقت پورا بدن تیزی سے نشوونما پانے لگتا ہے۔

اس طرح سے بہشتی بیویاں ہر لحاظ سے ممتاز، خوبصورت، ظاہری اور باطنی حسن کی حامل اور جسمانی، اخلاقی اور روحانی کمالات کی حامل ہیں، جو حسن تمام حسینوں میں مل کر ہوتا ہے وہ ان میں اکیلی اکیلی میں ہوگا۔

ایک بار پھر اس بات کی یاددہانی کراتے چلیں کہ یہ کچھ اُس عالم بالا کی طرف ایک اشارے کے طور پر ہی ہے اس کی تفصیل اور توضیح تو ہماری بساط سے باہر ہے۔

۱۱۔غلام اور ساقی

خدا نے بہشتیوں پر نعمات کو کمال کی حد تک پہنچا دیا ہے، انہیں ہر چیز عطا کی گئی ہے وہ ایسی خدمت گزار ہیں کہ بہت خدمت کریں گی، اہل بہشت کے اردگرد ساقی گھوم رہے ہوں گے، جو انہیں بہشتی شراب پلائیں گے۔

اُن کا ظاہری اور باطنی حسن، ان کی نیک عادات اور خصائل اہل بہشت کی توجہ اپنی طرف یوں مبذول کر لیں گے کہ وہ دنیا کا ہر غم اور دکھ بھول جائیں گے، وہ تکالیف جو انہوں نے خدا کی اطاعت کے سلسلے میں جھیلی ہوں گی سب محو ہو جائیں گی۔

قرآن کی متعدد آیات میں اُن کا ذکر ہوا ہے، ان کی تعریف اس انداز میں کی گئی ہے جس سے ہر پڑھنے والا متاثر ہو جاتا ہے، جیسا کہ بہشت کی باقی نعمات کے سلسلے میں ہے ویسا ہی یہاں قرآن نے مختلف تعبیرات استعمال کی ہیں، ایک جگہ پر ''غلمان'' کی تعبیر لائی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ویطوف علیهم غلمان لهم کانهم لؤلؤ مکنون۔

اُن کے اردگرد غلام ان کی (خدمت کے لئے) پھریں گے جو سیپ میں چھپائے ہوئے موتیوں کی مانند ہوں گے۔(طور۔۲۴)

یطوف کی تعبیر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ہمیشہ بہشتیوں کے اردگرد محوطواف ہوں گے (کیونکہ فعل مضارع عموما استمرار اور ہمیشگی کے معنی پر دلالت کرتا ہے)

"لو لو مکنون" (صدف میں موتی) اس قدر شفاف، خوبصورا اور انوکھا ہوتا ہے جس کی کوئی حد نہیں، جس وقت اسے سیپ سے باہر نکالا جاتا ہے اس وقت وہ ایک عجیب نکھار کا حامل ہوتا ہے، بہشتی خدمت گزار بھی اس قدر حسین، سفید رنگ اور پاکیزہ ہوں گے گویا وہ سیپ میں بند ایک موتی کی مانند ہیں یا جس موتی کو ابھی ابھی باہر نکالا گیا ہو اس کی طرح۔

یہ بات صحیح ہے کہ آیات اور روایات کی تعبیرات کے مطابق بہشت میں کسی خدمت گزار کی ضرورت نہیں، بہشتی جو بھی چاہیں گے فوراً انہیں مل جائے گا لیکن ان غلاموں کا خدمت کے لئے ہونا بھی بذات خود ایک بہت بڑی عزت افزائی ہے۔

اگرچہ اس آیت میں یہ بات واضح طور پر نہیں آئی کہ وہ کس کام کے لئے ان کے اردگرد طواف کریں گے لیکن دوسری آیات سے جن کو آگے ذکر کیا جائے گا ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا کام بہشتیوں کی خدمت میں مختلف کھانے اور پینے کی چیزیں پیش کرنا ہے۔

"لھم" کی تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر بہشتی کے لئے مخصوص خدمت گزار ہوں گے، چونکہ جنت غم و اندوہ کی جگہ نہیں ہے لہٰذا وہ غلام بھی خدا کے ان خاص بندوں کی خدمت سے خوشی اور لذت محسوس کریں گے۔

یہ بات قابل توجہ ہے، بہت سے مفسرین نے پیغمبر گرامی اسلامؐ سے نقل کیا ہے کہ

آپؐ سے پوچھا گیا کہ جب خدمت گزار سیپ کے موتیوں جیسے ہوں گے تو مخدوم (یعنی بہشتی مومنین) کیسے ہوں گے؟

آپ نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ ان فضل المخدوم علی الخادم کفضل القمر لیلة البدر علیٰ سآئر الکواکب۔

اس کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، وہاں پر "مخدوم" کی خادم پر برتری ایسے ہی ہے جیسے چودھویں کے چاند کی دوسرے ستاروں پر۔[1]

اس نکتہ کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ "غلمان" جمع ہے "غلام" کی جس کا لغت میں معنی نوجوان ہے، یہ نوکر اور خدمت کے لئے غلام کے معنی میں نہیں ہے۔[2]

یہ بات واضح ہے کہ جو لوگ جوانی کی عمر میں ہوتے ہیں وہ تیز، مضبوط، فعال اور پرجوش ہوتے ہیں، قرآن ایک جگہ پر ان کو "ولدان" (نوجوان) کے عنوان سے یاد کرتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] مجمع البیان، ابوالفتوح رازی، روح البیان، قرطبی، تفسیر کشاف، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

[2] بہت سے علمائے لغت نے اس کی تفسیر میں یوں لکھا ہے "الغلام ھو الطار الشارب" یعنی جس کی مسیں تازہ بھیگی ہوں، مقائیس، مفردات، لسان العرب۔

يطوف علیهم ولدان ...... مخلدون .... باكواب واباريق .... وكاس من معين

اُن کے اردگرد ہمیشہ تازہ دم اور باوقار رہنے والے نوجوان بہشت کی جاری نہروں سے پیالوں، صراحیوں اور جاموں کے ساتھ گردش کریں گے۔ (واقعہ۔۱۷و۱۸)

''ولدان'' جمع ہے ''ولید'' کی جو ''مولود'' (بچے) کے معنی میں ہوتا ہے، یہاں پر یہ نوجوان کے معنی میں ہے، یہ جو بعض نے ذکر کیا ہے کہ یہ مومنین کے بچوں کی طرف اشارہ ہے جو اپنے والدین کی خدمت کریں گے کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا[1]۔ کیونکہ اگر وہ خود مومن ہوئے تو ان کی خدمت کی جائے گی نہ یہ کہ ان سے خدمت لی جائے گی، اگر وہ مومن نہیں تو جنت میں ان کا داخلہ ممنوع ہوگا۔

''مخلدون'' کی تعبیر اُن کی خوبصورتی اور تازگی کے دائمی ہونے کے لئے ہے۔

ایک اور آیت میں یہی تعبیر کچھ زیادہ وضاحت اور خوبصورتی کے ساتھ آئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ويطوف عليهم ولدان مخلدون اذا رايتهم حسبتهم لؤ لؤا منثورا۔

اور ان کے اردگرد ہمیشہ رہنے والے نوجوان (خدمت کے لئے) گردش میں رہیں گے، جب تو انہیں دیکھے گا تو انہیں بکھرے ہوئے موتی خیال کرے گا۔ (دھر۔۱۹)

یہ بھی اسی امر کی تائید کرتا ہے کہ ''ولدان'' سے مراد ''غلمان'' ہی ہیں جنہیں پہلی آیات میں ''لؤ لؤ مکنون'' کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے، یہاں پر انہیں ''لو لو منثور'' کہا گیا ہے۔

البتہ بہت سے مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ نوجوان مشرکین کے بچے ہیں یا اُن مومنین کے جنہوں نے کوئی نیکی انجام نہیں دی، خدا ان بچوں کو ان کے والدین کی وجہ سے سزا نہیں دے گا، بلکہ انہیں خدمت گزاروں کی صورت میں جنت میں لے آئے گا، یہ مومنین کی خدمت کریں گے، اس خدمت سے وہ بھی خوشی اور سرور محسوس کریں گے۔

لیکن ہم نے جو کچھ اوپر ذکر کیا ہے اس کے پیش نظر یہ بات کچھ بے وزن محسوس ہوتی ہے جو روایت بھی اس سلسلے میں ذکر کی گئی ہے وہ بھی مرسلہ ہے۔

ایک اور جگہ پر اجمالی طور پر (فعل مجہول کی صورت میں) خدمت گزاروں کا تذکرہ کیا گیا ہے،۔

ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] فخر رازی نے اپنی تفسیر میں یہ احتمال ذکر کیا گیا ہے اور اُسے بعید سمجھا ہے۔ (ج۲۹۔ص۱۴۹)

يطاف عليهم بكاس من معين

ان کے اردگرد شراب طہور سے بھرے ہوئے جام گھمائے جائیں گے۔ (صافات۔ ۴۵)

اس سے ملتا جلتا مفہوم سورہ دھر کی آیت ۱۵ میں بھی آیا ہے جو خدمت کے مختلف اندازوں پر دلیل ہے۔

ويطاف عليهم بانية من فضة واكواب كانت قواريرا

اوران کے اردگرد چاندی کے برتن اور بلوریں جام (بہترین کھانوں اورشرابوں سے بھرے ہوئے) کو گھمایا جائے گا۔

سورہ زخرف آیت ۷۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

يطاف عليهم بصحاف من ذهب واكواب

ان کے اردگرد سونے کے برتن (بہشتی کھانوں سے بھرے ہوئے) اور جام (شراب طہور سے لبریز) گردش دیئے جائیں گے۔

''صحاف'' جمع ہے ''صحفه'' کی، زمخشری کے بقول (بحوالہ مصباح اللغت) اس کا معنی بڑا مستطیل نما برتن ہے، اس کے اصلی مادے کا معنی پھیلاؤ اور ہموار ہونا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ برتن طشت کے مانند ہو گا، ''اکواب'' جمع ہے ''کوب'' (بروزن ''خوب'') کی، جس کا معنی پینے کے لئے استعمال ہونے والا وہ برتن ہے جو دستہ نہ رکھتا ہو، اس کے لئے کبھی ''قدح'' کی تعبیر بھی لائی جاتی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعض مفسرین کے بقول ''صحاف'' جمع کثرت کا صیغہ ہے اور ''اکواب'' جمع قلت کا، یعنی پہلا زیادہ تعداد پر دلالت کر رہا ہے، یہ اس لئے ہے کہ کھانے اور اس کے لئے برتن ہمیشہ پینے والی اشیاء اور ان کے برتنوں سے تعداد اور انواع و اقسام میں زیادہ ہوتے ہیں۔[1] قرآنی فصاحت و بلاغت کا تقاضا یہی ہے کہ اس طرح کی باریک بینیوں کو بھی مدنظر رکھے (غور کیجئے گا)۔

یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ ان آخری آیات میں اگرچہ خدمت گزاروں کی خصوصیات کو بیان نہیں کیا گیا تاہم گزشتہ آیات ان کی تفسیر کر سکتی ہیں، وہ اس بات کی وضاحت کر سکتی ہیں کہ وہ کون ہیں اور اُن کی خصوصیات کیا ہیں۔

۱۲۔ استقبال کرنے والے

دعوتوں کی تکمیل اور مہمانوں کے احترام کے لئے دعوتوں میں ایک یا کئی معزز افراد موجود ہوتے ہیں جو مہمانوں کو کھانے پینے کی

---

[1] تفسیر روح المعانی ج ۲۵ ص ۹۰

دعوت دیتے ہیں، یہ لوگ خدمت گزاروں کے علاوہ ہوتے ہیں اس سے نہ فقط یہ کہ دعوت پر لطف ہو جاتی ہے بلکہ مہمانوں کی بھی عزت افزائی ہوتی ہے، قرآن کی آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہشتیوں کے لئے یہ کام فرشتے اور خازنان جنت انجام دیں گے، وہ مہمانوں کو بہشتی نعمات سے محظوظ ہونے کی دعوت دیں گے۔

سورہ طور کی آیت ۱۹ میں بغیر اس کے کہ یہ بتایا گیا ہو کہ اس بات کا کہنے والا کون ہے، بہشتیوں کو مخاطب کر کے ارشاد ہوتا ہے:

كلوا واشربوا هنيا ،بما كنتم تعملون

کھاؤ، پیو تمہارے لئے خوشگوار ہو ان نیک اعمال کے صلے میں جو تم نے انجام دیئے، بالکل یہی تعبیر سورہ مرسلات کی آیت ۴۳ میں بھی آئی ہے۔

کیا یہ بات کہنے والا خدا ہے جو اپنے لطف و کرم اور جنتیوں کی عزت افزائی کے لئے اس طرح انہیں بلا رہا ہے، یا جنت کے فرشتے اور خزانہ دار ہیں؟ بہر حال جنت کی تمام نعمتیں خوشگوار ہیں، البتہ یہ جو انہیں کہا گیا ہے تمہارے لئے خوشگوار ہو یہ اس کے لطف اور مزاج کے ساتھ موافقت کو اور افزوں کر دیتا ہے۔

اسی سے ملتی جلتی تعبیر تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورہ حاقہ آیت نمبر ۲۴ میں آئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

كلوا واشربوا هنيئا بما اسلفتم فى الايام الخالية

کھاؤ اور پیو خوشگوار، اُن (نیک) اعمال کے بدلے میں جو تم نے گزشتہ ایام میں انجام دیئے۔[1]

یہاں پر یہ بھی اس بات کے متکلم کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہوا، یہاں بھی وہی بات ہے جو اس سے پہلی آیت میں ذکر کی گئی ہے۔

۱۳۔ابتدائی خدمت

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن کی چند آیات میں ایک بہت ہی معنی خیز تعبیر نظر آتی ہے جو کئی پہلوؤں سے پردہ اٹھاتی ہے اور وہ ''نزول'' کی تعبیر ہے، یہ سب سے پہلے سورہ آل عمران کی آیت ۱۸ میں آئی ہے:

لهم جنت تجرى من تحتها الانهر خلدين فيها نزلا من عند الله وما عند

[1] یہاں پر ''هنيئا'' محل اعراب کے اعتبار سے کیا ہے! اس سلسلے میں بہت کچھ کہا گیا ہے! بعض اسے ''مفعول مطلق'' کی جگہ پر ''وصف'' قرار دیتے ہیں، گویا پوری عبارت یوں ہے ''كلوا اكلا هنيئا''، بعض نے اسے ''مفعول بہ'' کے لئے وصف شمار کیا ہے گویا عبارت یوں ہے: ''كلوا واشربوا ما كولا ومشروبا هنيئا'' حقیقت میں خوشگوار وہی ماکول و مشروب ہے، بہر حال کھانے اور پینے کے خوشگوار ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ انسان پر کوئی مضر اثر مرتب نہ کرے بلکہ آسانی کے ساتھ ہضم ہو جائے۔)

الله خیر للابرار۔

اُن کے لئے جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہ اللہ کی طرف سے مہمانی ہوگی، اور جو اللہ کے پاس ہے وہ نیکوں کے لئے بہتر ہے۔

اسی سے ملتی جلتی تعبیر سورہ کہف کی آیت ۱۰۷، سورہ سجدہ کی آیت ۱۹، سورہ صافات کی آیت ۶۲ اور سورہ حم سجدہ کی آیت ۳۲ میں بھی آئی ہے۔

ان آیات کے حقیقی معنی کی وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ ''نزول'' کا دقیق مفہوم سمجھا جائے ''راغب'' مفردات میں کہتے ہیں:

"النزل ما یعد للنازل من الزاد"

یعنی ''نزل وہ چیز ہے جو آنے والے مہمان کی خدمت کے لئے تیار کی جاتی ہے'' اس تفسیر کے مطابق وہ تمام نعمتیں جو مہمان کی پذیرائی کے لئے تیار کی جائیں ''نزول'' کا مصداق ہیں۔ ''صحاح اللغت'' اور ''مقائیس'' میں بھی یہی معنی ذکر کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''نزل'' کا معنی بادشاہ کا ان افراد کی خاطر تواضع کرنا ہوتا ہے جو اس کے پاس آتے ہیں، اُن کا وظیفہ یا مشاہرہ مقرر کرنے سے پہلے۔[1]

لیکن بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ ''نزل'' وہ سب سے پہلی چیز ہے جو مہمان کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے (جیسے شربت یا پھل وغیرہ کہ ہمارے دور میں مہمان کو یہ پیش کئے جاتے ہیں)۔[2]

یہ معنی ''نزول'' (یعنی اترنا) کے مفہوم کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے، بالخصوص اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ قرآن کہتا ہے کہ بہشت کے باغات (اپنی تمام نعمتوں اور عطیوں کے ساتھ) اس عظیم دعوت خانے میں ابتدائی دعوت کے طور پر ہیں، اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر نعمات بھی ان کے انتظار میں ہیں، شاید یہ اُن معنوی نعمات اور ذات حق کے جلوؤں کی طرف اشارہ ہو، اسی لئے سورہ آل عمران آیت ۱۹۸ میں ''نزلا من عندالله'' کے بعد ارشاد ہوتا ہے ''وما عند الله خیر للابرار''، جو خدا کے پاس ہے وہ نیکوں کے لئے بہتر ہے (غور کیجئے گا)۔ حتیٰ کہ اگر نزل اس پورے کھانے کے لئے جو مہمان کے لئے تیار کیا جاتا ہے (جیسا کہ بعض علمائے لغت کے کلمات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے) بھی بولا جائے پھر بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کریم اور عظیم ہستی کی مہمان نوازی فقط کھانے کی حد تک محدود نہیں ہوگی، بلکہ اس کے علاوہ وہ اپنے مہمانوں کو خلعتوں، نعمتوں اور دوسرے گراں بہا تحفوں سے بھی نوازے گا، لہذا ''نزل'' کا جو معنی بھی کریں یہ بہشت کی روحانی اور معنوی نعمات کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ ہے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی ج ۲۵ ص ۱۸۲

[2] تفسیر المنار ج ۴۔ ص ۳۱۴ اس طرح سے ''نزل'' کے لئے تین مختلف لیکن قریب الافق معانی بیان کئے گئے ہیں

۱۴۔ نا قابل تصور نعمات

بے شک جنت کی نعمات فقط ان چیزوں میں منحصر نہیں ہیں جن کا تذکرہ کیا گیا ہے، اگر چہ یہ بھی بہت اہم نعمات ہیں، اس مادی جہان کی محدود فکر اتنی پرواز نہیں کر سکتی کہ وہ آخرت کی مادی اور معنوی نعمات کا ادراک کر سکے، دوسری طرف انسان کی تنوع طلب طبیعت مختلف اور قسم قسم کی نعمات کا تقاضا کرتی ہے، لہٰذا قرآن نے اس مسئلے کی طرف خاصی توجہ دی ہے، وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ وہاں جس بھی مادی یا روحانی نعمت کا تقاضا کرو گے وہ تمہیں ملے گی، ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ

اور بہشت میں وہ چیزیں ہوں گی جو دل چاہیں گے اور آنکھیں لذت پائیں گی۔ (زخرف۔۷۱)

بہشتی نعمات کے بارے میں امکان کی حد تک یہ تعبیر سب سے بڑھ کر ہے، ''مجمع البیان'' میں طبرسی مرحوم کے بقول اگر پورے عالم کی مخلوقات جمع ہو جائیں اور بہشتی نعمات کی تعریف کرنا چاہیں تو وہ اس چیز پر ہرگز قادر نہیں ہو سکیں گی، اس آیت پر وہ کسی چیز کا اضافہ کر سکتیں۔[1]

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مذکور جملے کو بہشت کی نعمات کے ایک قابل توجہ حصہ کے ذکر کے بعد لایا گیا ہے تا کہ اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ بہشتی نعمات فقط ان میں منحصر نہیں ہیں، آنکھ کی لذت کا ذکر دل کی لذت کے بعد کیوں ہے؟ اس سلسلے میں چند احتمالات ذکر کئے گئے ہیں:

ایک یہ کہ ''تشتهیه الانفس'' تمام لذتوں کو شامل ہے لیکن آنکھوں کی لذت چونکہ انتہائی اہمیت کی حامل ہے اس لئے اسے بعد میں الگ سے ذکر کر دیا گیا ہے، اسے اصلاح میں ''ذکر خاص بعد از عام'' کہتے ہیں۔

دوسرا یہ کہ پہلا جملہ حِس شنوائی، لامسہ، ذائقہ اور شامہ کی لذت پر مشتمل ہے جب کہ '' تلذ الاعین '' کا جملہ فقط لذت بینائی کو بیان کرتا ہے، یہ لذت یا تو اُن کے برابر ہے یا اُن سے بڑھ کر ہے۔

تیسرا یہ کہ پہلا جملہ تمام مادی لذتوں کی طرف اشارہ ہے جب کہ دوسرا جملہ روحانی اور معنوی لذتوں کو بیان کرتا ہے، یعنی دل کی آنکھ کے ساتھ خدا کے بے مثال جمال کا نظارہ اور اس کی جلالی اور جمالی صفات کے باطنی مشاہدے کا ایک لحہ بھی بہشت کی تمام مادی نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔

البتہ یہ بات واضح ہے کہ پاکیزہ ماحول میں بہشتیوں کی روح اور جان بھی ان پاک لذتوں کا تقاضا کرے گی جو ایک پاکیزہ انسان کے شایان شان ہیں، لہٰذا آیت کی عمومیت کسی قسم کا استثناء نہیں رکھتی، اس کے لئے کسی تاویل کی بھی ضرورت نہیں کہ کیا یہ آیت نفس کے ناپسندیدہ

---

[1] تفسیر مجمع البیان۔ ج۹۔ ص۵۶

تقاضوں پر بھی حاوی ہے یا نہیں۔

بہر حال اسی معنی کی مانند سورہ حم سجدہ آیت ۳۱ میں بھی ارشاد ہوتا ہے:

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيَ أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ

جنت میں جو کچھ چاہو گے اور جو کچھ مانگو گے تمہیں دیا جائے گا۔[1]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ پہلا جملہ بہشت کی تمام مادی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جب کہ دوسرا جملہ روحانی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے، سورہ یونس کی آیت ۱۰ بھی اسی کی تائید کرتی ہے:

دعواهم فيها سبحنك اللهم و تحيتهم فيها سلام واٰخر دعواهم ان الحمد لله رب العلمين۔

بہشت میں اُن کی بات اور دعا یہ ہوگی ''اے اللہ تو پاک ہے'' اور اُن کی تحیت اس میں سلام ہوگی اور اُن کی دعا کا اخیر یہ ہوگا: ہر حمد تمام جہانوں کے پروردگار اللہ کے لئے ہی ہے۔

یہ تفسیر اس بات کے پیش نظر کہ نفس کی خواہش عموماً مادی امور میں ہوتی ہے اور دعا معنوی امور میں زیادہ استعمال ہوتی ہے، زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

سورہ انبیاء آیت نمبر ۱۰۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

وهم فی ما اشتهت انفسهم خلدون

وہ ان چیزوں میں جن کو اُن کا دل چاہے گا ہمیشہ رہیں گے۔

مذکورہ بالا آیات کے علاوہ بھی قرآن میں اس سلسلے کی کئی آیات نازل ہوئی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

لهم فيها ما يشآءون

وہ جو بھی چاہیں گے وہاں پر ہے۔ (نحل۔۳۱)

سورہ فرقان آیت ۱۶ میں یہی تعبیر آئی ہے، تھوڑے سے فرق کے ساتھ قرآن کی دیگر تین آیات میں بھی یہ تعبیر آئی ہے۔(زمر۔۳۴، شوریٰ۔۲۲ اور ق۔۳۵)۔

اب تک جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے مجموعی طور پر اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ بہشت کی نعمات کی کوئی حد نہیں، نہ مقدار کے

---

[1] ''یدعون'' ''ادعاء'' کے مادہ سے ہے (اختصال از دعا) جس کا معنی ہے کوئی چیز مانگنا اور طلب کرنا

لحاظ سے، نہ کیفیت کے لحاظ سے، نہ نوع کے لحاظ سے، نہ زمانے کے لحاظ سے اور نہ مکان کے لحاظ سے، لہٰذا گزشتہ ابواب میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے یہ اُن نعمات کی ایک جھلک ہے جو ہم مادی انسانوں کے لئے ممکن ہے جو اس سے بڑھ کر ہے اور ہمارے ادراک کی وسعتوں سے بھی آگے ہے وہ مذکورہ آیات میں عمومی اور جامع انداز میں بیان ہوا ہے۔

حقیقت میں جنت اور اس کی نعمات خدا کے لطف اور قدرت کا ایک مکمل شاہکار ہیں چونکہ اس کی قدرت اور لطف وکرم لامحدود ہے، لہٰذا جنت کی نعمات بھی لامحدود اور بے انتہا ہیں (غور کیجئے گا)۔

(۳) روحانی لذتیں

اس بات کے پیش نظر کہ معاد روحانی پہلو بھی رکھتی ہے اور جسمانی بھی، نیز یہ کہ روح کا مقام اور مرتبہ جسم سے بلند ہے، اس بات میں کسی قسم کی تردید نہیں رہتی کہ بہشت کی معنوی اور روحانی نعمات وہاں کی مادی نعمات سے بلند و بالا اور زیادہ پرشکوہ ہوں گے۔

چونکہ معمولاً ان نعمتوں کا بیان اور تعریف نہ ہی کی جاسکتی ہے اور نہ ہی سنی جاسکتی ہے (البتہ دل کی آنکھوں کے ساتھ انہیں دیکھا جاسکتا ہے) لہٰذا نعمات کے اس سلسلے سے متعلق قرآن میں اجمالی طور سے اشارے ملتے ہیں، جس جگہ پر وضاحت کی ضرورت تھی وہاں قرآن نے وضاحت بھی کردی ہے۔

دوسرے لفظوں میں معرفت خدا کے ادراک کی لذت، اُس کے جمال اور جلال کی تڑپ، اس کے الطاف خفیہ کی جھلک اور اس کی ذات سے عشق کے جام کا سرور اس طرح ہے کہ وہاں کا ایک لحظہ بھی دنیا کی تمام مادی نعمتوں سے بڑھ کے ہے۔

بعض اوقات ہم اس سلسلے کے بہت کم ترین مرحلے کا نظارہ کرتے ہیں، جب خدا کی عبادت اور اس سے خلوت کی گھڑی نصیب ہو جائے اور انسان اس حاجت روا سے ملاقات کرے تو وہ پوری دنیا کو بھلا دیتا ہے، چند لمحات کے لئے وہ اس کے بے مثال جمال کے نظاروں میں کھوجاتا ہے، بالخصوص اگر یہ کسی قابل اہمیت جگہ پر ہو مثلاً خانہ کعبہ، عرفات یا مشعر وغیرہ میں جو مراکز خدا کی عبادت کے لئے مختص ہیں، انسان وہ سکون اور لذت محسوس کرتا ہے کہ کوئی قلم یا زبان اسے بیان نہیں کرسکتے۔

غور کیجئے اگر یہ حالت ہزاروں مرتبہ اور ہر بار پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ کئی گھنٹوں، راتوں، دنوں، مہینوں، اور سالوں تک جاری رہے تو کیا مزہ ہوگا؟ خصوصاً اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے بہشت میں خدا کی یاد سے غافل کردینے والی بھی کوئی چیز نہیں ہوگی، جو حضور دل کو ختم کرسے، معرفت کی راہ میں حائل پردے دل کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائیں گے، انسانی شعور اور فکر کئی گنا بلند ہوجائے گی، وہاں شیطانی وساوس کا کوئی پتہ ہی نہیں ہوگا جو کہ ہمیشہ اس راہ کے سالکوں کے لئے رکاوٹ بنتا ہے۔

اب اس بات کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہاں کیا ہوگا؟ وہاں معنوی نعمات کی کیسی بہار آئی ہوگی! وہ کیسے تند و تیز جذبات ہوں گے جو روح کو خدا کے قرب کی طرف کھینچیں گے، جو روح کو ذات حق کے نور میں مدہوش کردیں گے، انسان اپنے آپ کو بھول جائے گا، محبوب کے علاوہ کسی چیز کو نہیں دیکھے گا، اُس کے علاوہ کسی چیز کی طلب اور خواہش نہیں کرے گا، جو کچھ اُس کا دل چاہے گا وہی کچھ دیکھے گا اور جو کچھ وہ دیکھے گا وہی اس کے دل کی چاہت ہوگی، ان مختصر سے اشارات کے ساتھ ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں، ان نعمات کی تفصیل قرآن کی زبانی سنتے ہیں، ان مواہب اور نعمات کا خلاصہ چند عناوین کے تحت کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ خصوصی احترام

بہشتیوں کا خصوصی احترام بہشت میں داخل ہوتے ہی شروع ہوجائے گا، بہشت کے نگہبان انہیں خوش آمدید کہیں گے، چنانچہ ارشاد

ہوتا ہے:

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا• حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ

جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا انہیں بہشت کی طرف گروہوں کی صورت میں بھیجا جائے گا، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئیں گے اور اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اُن سے ان کے نگہبان کہیں گے تم پر سلامتی ہو، یہ نعمتیں تمہارے لئے خوشگوار ہوں اور تم اس میں ہمیشہ رہنے والے ہو کر داخل ہو جاؤ۔

(زمر۔ ۷۳)

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے نگہبان ان پرہیزگاروں کا بڑی شدت سے انتظار کر رہے ہیں، ان کے آنے سے پہلے ہی جنت کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں، جب یہ لوگ بہشت میں داخل ہوں گے تو اُن کا پُرتپاک استقبال کیا جائے گا، نگہبان انہیں خوش آمدید کہیں گے، وہ بہت خوبصورت الفاظ کے ساتھ انہیں جنت اور اُس کی جاوداں زندگی کی طرف بلا رہے ہوں گے۔ [1]

ہاں! اسی طرح ہی کسی معزز اور محترم مہمان کا استقبال کیا جاتا ہے، پہلے دروازے کھولے جاتے ہیں، میزبان بڑی شدت سے مہمان کا انتظار کرتے ہیں، مہمان کے آتے ہی اُسے خوش آمدید کہتے ہیں، یہ ایک بہت اہم روحانی لذت ہے۔

''خزنہ'' جمع ہے ''خازن'' کی جس کے معنی نگہبان اور رکھوالا کے ہیں، یہاں پر اُن فرشتوں کی طرف اشارہ ہے جو جنت کے نگہبان اور اس کا نظام چلاتے ہیں۔

جب یہ لوگ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو فرشتوں کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ جنت کے ہر دروازے سے داخل ہو کر انہیں خوش آمدید کہیں، اور تبریک پیش کریں۔

سورہ رعد کی آیت ۲۳۔ ۲۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

والملئکته یدخلون علیهم من کل باب۔ سلام علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار۔

---

[1] قابل توجہ یہ ہے کہ قرآن نے بہشت کے سلسلے میں ''واو'' حالیہ کو استعمال کیا ہے ''وفتحت ابوابها'' کا جملہ یہ بتاتا ہے کہ یہ دروازے پہلے سے ہی کھول دیئے جائیں گے (جیسا کہ سورہ ص آیت ۵۰ میں آیا ہے ''جنات عدن مفتحة لهم الابواب'' لیکن جہنم کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے جب دوزخی پہنچیں گے تو دروازے کھولے جائیں گے۔ ''حتی اذا جآءوها فتحت ابوابها'' یہ واوَ حالیہ کے بغیر ہے۔

فرشتے اُن پر ہر دروازے سے داخل ہوں گے اور اُن سے کہیں گے! تم پر سلام ہو تمہارا صبر اور استقامت کی وجہ سے، دنیا کے بعد تمہیں کیسی اچھی عاقبت نصیب ہوئی ہے۔[۱]

اس آیت سے واضح طور پر اس مطلب کو سمجھا جا سکتا ہے کہ فرشتوں کے مختلف گروہ ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے، اس بات کے پیش نظر کہ بہشت کا ہر دروازہ کسی ایک عمل صالح کی علامت کے طور پر ہے (باب الصلوٰۃ، باب الجهاد، باب الحج) معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کا ہر گروہ ان کے کسی نیک عمل کی وجہ سے اُن کے پاس آئے گا، ان تمام اعمال کا خلاصہ ''صبر'' میں کر دیا گیا ہے، صبر اپنے تمام شعبوں کے ساتھ، اطاعت پر صبر، مصیبت پر صبر، گناہ پر صبر۔

اس سے زیادہ اہم وہ سلام و رحمت ہے جو خدا بہشتیوں پر نازل کرے گا، لطف و رحمت اور محبت سے بھرپور سلام، سورہ یٰسین کی آیت ۵۸ میں ارشاد ہوتا ہے:

سلام قولا من رب رحيم

بہت رحم کرنے والے پروردگار کی طرف سے انہیں سلام کہا جائے گا۔

یہ الٰہی درود و سلام، یہ روح پرور، نشاط آفرین اور لطف و احسان سے معمور صدا بہشتیوں کو یوں مدہوش کر دے گی اور اُن پر سرور کی وہ کیفیت طاری ہو جائے گی جس کا مقابلہ کوئی نعمت نہیں کر سکتی۔

ہاں! محبوب کی پیار اور لطف سے بھری آواز کو ایک بار ہی سننا دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے بڑھ کے ہے۔

بقول شاعر!

پیام دوست شنیدن سعادت است و سلامت
فدای خاک در دوست باد جان گرامی

دوست کی چوکھٹ کی مٹی پر ہی میری جان قربان ہو۔

یا دوسرے شاعر کے بقول!

سلامت من دل خستہ در سلام تو باشد
زہی سعادت اگر دولت سلام تو یام [۲]

محبوب سے وصال کا جذبہ، دوست کے دیدار کی تڑپ اور محبوب کا وہ سلام جو تمام حجابوں کو ختم کر دے گا اس قدر لذت بخش اور روح

---

[۱] یہاں پر کچھ محذوف ہے جو یوں ہے: ''فنعم عاقبة الدنيا الجنة

[۲] مجھ دل شکستہ کی سلامتی تو تیرا سلام ہے، اگر تیرے سلام کی دولت مجھ تک پہنچے تو زہے نصیب۔

پرور ہوگا کہ اگر عاشق اس معنوی فیضان سے دور رہ جائیں تو بے حال ہو جائیں، بعض اہل سنت مفسرین نے حضرت علیؑ سے یہ معنی خیز جملہ نقل کیا ہے: آپؑ نے فرمایا:

"لو حجبت عنه ساعة لمت"

اگر ایک لمحے کے لئے بھی اس کے دیدار سے محروم ہو جاؤں تو مر جاؤں۔[1]

بہشتیوں کی آخری آرزو ہوگی، یہ اُن کے لئے عظیم ترین افتخار ہوگا اور دل پذیر ترین گھڑی کہ جب رحیم و مہربان خدا ان پر سلام و درود بھیجے گا۔

قرآن کی متعدد آیات میں بہشتیوں پر درود و سلام کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ان میں سلام کہنے والے کا ذکر نہیں کیا گیا۔ (جیسے سورہ حجر۔ ۴۶، فرقان۔ ۷۵ اور ق۔ ۳۴)۔

ممکن ہے ان سلاموں کے کہنے والے فرشتے ہوں، بعض آیات میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ یہ سلام کرنے والے بہشتی ہی ہوں جو ایک دوسرے کو سلام کہیں گے، یا ان سب سے بلند اور اعلیٰ ہستی یعنی خدا کی طرف سے اُن پر یہ سلام ہو۔

۲۔ پرسکون ماحول

زندگی میں انسانی روح کو جو چیز سب سے زیادہ مضطرب کرتی ہے وہ امن و سکون کا نہ ہونا ہے، اس دنیا کی زندگی کا عموماً تلخ ہونا اس بات کی بناء پر ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ اس پر راضی نہیں اور نہ ہی اُسے مستقبل کے بارے میں کوئی اطمینان ہے اور نہ ہی اپنے جیسے دوسرے لوگوں کی طرف سے اُسے امن حاصل ہے، بالخصوص اگر کسی دوسرے کے پاس کوئی نعمت زیادہ ہے تو یہ شخص کینے، حسد اور رقابت کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔

بہشت کی ایک معنوی نعمت یہ ہے کہ وہاں ہر طرف امن و سکون کا راج ہوگا، وہاں نہ تو جنگ کا خطرہ ہے اور نہ لڑائی جھگڑے کا خوف، وہاں نہ تو کینہ ہوگا اور نہ ہی حسد، ہر جگہ عشق و وفا کا دور دورہ ہوگا، ہر طرف محبت اور بھائی چارے کی حکمرانی ہوگی۔

قرآن مجید کی دو آیات میں بہشت کے متعلق ایک بہت خوبصورت اور معنی خیز تعبیر ملتی ہے، بہشت کو دارالسلام (امن و سکون کا گھر) کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔ سورہ انعام کی آیت ۱۲۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۱۲۷

اہل بہشت کے لئے ان کے رب کے پاس پُر امن گھر ہے وہ ان کا ولی اور مددگار ہے، اُن (نیک) اعمال کی وجہ

---

[1] تفسیر روح البیان۔ ج ۷ ص ۴۱۶)

سے جوانہوں نے انجام دیئے۔

سورہ یونس آیت ۲۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

واللہ یدعوآ الیٰ دار السلام

خدا امن وسکون کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

مفسرین نے ''دار اسلام'' کی تفسیر میں دو بیان ذکر کئے ہیں۔

اوّل یہ کہ ''سلام'' جوکہ ہر طرح کی مصیبت اور بلا سے سلامتی کے معنی میں ہے، یہ ''دار'' (بہشت) کے اوصاف میں سے ہے، وہاں نہ تو اس مادی دنیا کے لٹیروں کا کوئی وجود ہوگا اور نہ ہی خدا سے نا آگاہ دولت کے پجاریوں کی احمقانہ مزاحمت، نہ وہاں جنگ وجدال ہوگا اور نہ ہی استعمار اور استحصال، ہاں! وہاں تو صلح وصفائی اور امن وسکون کا راج ہوگا۔[۱]

دوسرا یہ کہ ''سلام'' خدا کے ناموں میں سے ایک نام ہے، لہٰذا دار السلام ''مضاف اور مضاف الیہ ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہشت خدا کا مکان ہے، دونوں معانی ہی ٹھیک ہیں، اگر چہ پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کلمے کی اصلی بنیاد ہر طرح کی ظاہری اور باطنی مصیبت سے محفوظ ہونا ہے، راغب نے مفردات میں یہی ذکر کیا ہے، اس کلمے کا اطلاق خدا کی ذات پر ایک صفت کے لحاظ سے ہے، یعنی اس کی ذات پاک تمام عیبوں اور برائیوں سے محفوظ ہے۔

''لھم دار السلام عند ربھم'' کا جملہ بھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ''داالسلام'' وہی پہلے معنی میں ہے (غور کیجئے گا)۔

ابن عباسؓ سے مروی ایک حدیث میں یوں آیا ہے کہ:

دار السلام وہی بہشت ہے جس کے رہنے والے تمام مصیبتوں، بیماریوں اور بلاؤں سے محفوظ رہیں گے، اسی طرح بڑھاپے، موت اور حالات کی تبدیلی سے بھی محفوظ رہیں گے، ان کا عزت واحترام ہمیشہ ہوتا رہے گا، وہ ہمیشہ غنی اور بے نیاز رہیں گے، ہمیشہ کے خوش نصیب اور سعادت مند رہیں گے، نہ تو انہیں کوئی غم واندوہ ہوگا اور نہ ہی موت کا خطرہ۔[۲]

سورہ حجر آیت ۴۷، ۴۸ میں اسی بیان کو مکمل کرنے کے لئے ارشاد ہوتا ہے۔

وَنَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ اِخۡوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیۡنَ لَا یَمَسُّهُمۡ فِیۡهَا

---

[۱] یہ سطریں جس وقت رشتہ تحریر میں لائی جارہی تھیں اسی وقت یہ خبر ملی کہ چند گھنٹے پہلے طاغوت کا حملہ امریکہ کی زیر قیادت عراق پر شروع ہو چکا ہے، ہزاروں طیاروں نے اس ملک کے اہم اور حساس مراکز پر مسلسل بمباری کی۔ (۳۰/ جمادی الثانی ۱۴۱۱ھ)

[۲] بحار الانوار، ج ۸ ص ۱۹۴ حدیث ۱۷۶

نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ

ہم ہر طرح کے حسد، دشمنی اور عداوت کو بہشتیوں کے سینے سے نکال دیں گے، وہ ایک دوسرے کے سامنے بھائیوں کی حیثیت سے تختوں پر بیٹھے ہوں گے، اس میں نہ تو انہیں کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ ہی وہ بہشت سے نکالے جائیں گے۔[۱]

اس بات کے پیش نظر کہ ''غلل'' ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو ان تمام اندرونی برائیوں پر حاوی ہے جو روح اور جسم اور گھر اور معاشرے کے آرام وسکون کو ختم کر دیتی ہیں اس آیت سے یہ نتیجہ واضح طور پر اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بہشتیوں کا سینہ دشمنی اور عداوت سے خالی ہوگا، ان کے دل میں کسی قسم کا حسد اور تکبر یا کینہ نہیں رہے گا، خدا یہ تمام بری صفات ان کے دل سے نکال دے گا، اسی وجہ سے برادری اور بھائی چارے کی روح اُن میں پروان چڑھے گی، کیسا خوبصورت اور روح پرور وہ معاشرہ ہوگا جس میں اس طرح کی بری صفات نہ ہوں گی، ہر جگہ پر مہر ومحبت اور صلح وصفائی کی بات ہوگی، اس دنیا میں کسی معاشرے سے یہ صفات جتنی زیادہ ختم ہوتی جائیں اتنا ہی وہاں چین وسکون بڑھتا جائے گا، اس کے برعکس کسی بھی گھرانے یا معاشرے میں ان صفات کا وجود آرام وسکون کا قاتل اور افسوس ناک اور سنگین دشمنیوں کا باعث بنتا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن اس اندرونی امن وسکون کی تکمیل بیرونی سکھ اور چین کے ساتھ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بہشت میں کوئی تکلیف اور تھکاوٹ نہیں ہوگی، نعمتوں کے ختم ہو جانے کا خوف نہیں ہوگا جو کہ انسان کو ہمیشہ ہراساں رکھتا ہے، یہ پورا ماحول بہشتی نعمتوں کو اور زیادہ خوشگوار بنا دے گا۔[۲]

۳۔امن وامان۔۔۔۔۔۔۔خوف کا زائل ہونا

امن وامان ان بنیادی باتوں سے قطع نظر ہو کر جن کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، بذات خود ایک بہت بڑی معنوی نعمت ہے، ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا فقدان بہت تکلیف دہ امر ہے، اس حقیقت کو اچھی طرح تو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو پر خطر جگہوں یا جنگ زدہ علاقوں میں پھنسے ہوئے ہوں، جہاں پر ہر وقت بمباری اور میزائل گرنے کا خوف دامن گیر رہتا ہے، زندگی کی مٹھاس وہاں پر ختم ہو جاتی ہے، ایک ایک لمحہ عذاب بن جاتا ہے، لیکن امن وامان سے بھرپور ماحول میں اس کے برعکس ہوتا ہے۔[۳]

---

[۱] غل کا مادہ غلل (بروزن ضرر) ہے جس کا معنی کسی چیز کا آہستہ آہستہ اثر انداز ہونا ہے، لہٰذا وہ پانی جو درختوں کے ارد گرد ہوتا ہے اسے ''غلل'' کہتے ہیں، کینہ اور عداوت کو بھی ''غلل'' کہتے ہیں کیونکہ یہ بھی دل میں آہستہ آہستہ نفوذ کرتے ہیں اسی وجہ سے خیانت کو بھی ''غلل'' کہتے ہیں

[۲] یہی مفہوم تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورہ اعراف آیت ۴۳ اور سورہ فاطر آیت ۳۵ میں بھی آیا ہے

[۳] بہشتیوں کے لئے'' اٰمنین '' کی تعبیر (دخان۔۵۵)، (حجر۔۴۶) اور ''امنون'' کی تعبیر (سبا۔۳۷) میں آئی ہے جہاں پر'' وھم فی الغرفات امنون'' کہا ہے وہ بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

قرآن پرہیز گاروں کے متعلق کہتا ہے:

ان المتقین فی مقام امین

پرہیز گار امن وامان والی جگہ پر ہیں (دخان۔۵۱)

نہ تو وہاں شیطان کے حملوں کا خوف ہے اور نہ ہی ظالموں کی حکمرانی کا، نہ مصیبتوں اور بلاؤں کا خوف نہ ہی غم واندوہ کا خطرہ۔

اسی وجہ سے ایک اور جگہ پر ارشاد ہوتا ہے:

ادخلو الجنة لا خوف علیکم ولا انتم تحزنون

بہشت میں داخل ہو جاؤ! نہ تمہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم۔ (اعراف ۴۹)

بعض اوقات یہ بات تجربے میں بھی آئی ہے کہ کبھی ایک شخص کی خدمت اور آسائش کے لئے تمام مادی نعمتیں موجود ہیں لیکن اس کے دل پر غم واندوہ کا جو پہاڑ ہے یا اُسے اندرونی طور پر جو خوف یا خطرہ محسوس ہوتا ہے اس کی وجہ سے وہ ان نعمتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، وہ ان کی طرف بالکل اعتناء نہیں کرتا، اس بات سے آپ بہشت کے متعلق قرآنی تعبیرات کی دقت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

بہشتی لوگ تو اپنے ایمان کے طفیل اس دنیا میں بھی ایک طرح کا امن وسکون محسوس کرتے ہیں، توکل، رضائے خدا اور اس کے ارادے کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے سے وہ زندگی کے مشکل ترین لمحات میں بھی ایک خاص قسم کا سکون وآرام محسوس کرتے ہیں:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ

آگاہ رہو کہ خدا کے دوستوں کے لئے نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ غم۔۔۔۔ان کے لئے دنیا اور آخرت کی زندگی میں خوشی اور سرور ہے۔ (یونس، ٦٢۔٦٤)

۴۔ ہمدرد اور باوفا دوست

ایک بہت بڑی معنوی اور روحانی خوشی یہ ہوتی ہے کہ انسان کے باوفا اور پُرخلوص دوست ہوں، ایسے دوست جو ایمان اور انسانی خصائل سے آراستہ ہوں، جو پیکر مہر ووفا ہوں، ان کی ہمراہی اتنی پرنشاط ہوتی ہے جو بیان نہیں کی جاسکتی، قرآنی آیات سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ بہشتی اس خصوصی نعمت سے بھی بہرہ مند ہوں گے، وہ پرخلوص ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کریں گے، وہ کیا باتیں کریں گے اس کے متعلق پوری طرح کچھ نہیں کہا جاسکتا، شاید وہ ایسے موضوعات پر گفتگو کر رہے ہوں گے جن کا سمجھنا ہمارے لئے اس دنیا میں ممکن نہیں ہے، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ ان کی گفتگو ان کی روح اور حیات کے لئے شادمانی کے اسباب فراہم کرے گی۔

سورہ نساء کی آیت ۶۹ اور ۷۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا [۱]

جو خدا اور رسول کی اطاعت کرے (قیامت کے دن) وہ ان کے ہمراہ ہوگا جن پر خدا نے اپنی نعمتوں کو کمال کی حد تک پہنچا دیا ہے، پیغمبروں، صدیقین، شہداء اور صالحین میں سے، وہ کتنے اچھے ساتھی ہیں، یہ خدا کی طرف سے فضل ہے اور کافی ہے کہ خدا (اپنے بندوں کے حال) سے آگاہ ہے۔

ہاں! بہشت کے ساتھ تو دنیا کے افضل ترین لوگ ہیں! عظیم انبیائے خدا، ان کے خاص خاص فرمانبردار، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

اگر ہم اس کا موازنہ اس دنیا سے کریں تو اس وقت ہی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ بہشت کی دنیا کیسی ہوگی، اس دنیا میں تو انسان برے لوگوں کے ساتھ وقت گذارنے پر مجبور ہوتا ہے جو اس کے لئے باعث زحمت ہوتے ہیں۔

اس آیت کی شان نزول کے متعلق بہت سے مفسرین نے ایک حدیث نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے (البتہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ جو مفسرین کے درمیان ہے)۔

ایک دن پیغمبر اسلامؐ کا ایک صحابی جو آپؐ کی زیارت کا شیدا تھا، آپ کی خدمت میں آیا، وہ پریشان دکھائی دے رہا تھا، پیغمبر اکرمؐ نے اس سے اس پریشانی کے متعلق دریافت کیا، اس نے عرض کی، جب میں آپ سے دور ہو جاتا ہوں تو بہت رنجیدہ ہوتا ہوں، آج مجھے یہ خیال آیا کہ کل قیامت کے دن اگر میں بہشت میں بھی چلا گیا تو پھر بھی یقینی طور پر آپ والے مقام پر نہیں پہنچ سکوں گا جس کی وجہ سے آپ کے دیدار سے ہمیشہ کے لئے محروم رہوں گا، (اگر دوزخ میں چلا گیا پھر تو بات اور واضح ہے) لہٰذا مجھے پریشانی ہو رہی ہے، مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اُسے اور اس جیسے دوسرے لوگوں کو بشارت دی گئی کہ مومن اور خدا اور رسولؐ کے مطیع افراد بہشت میں اولیاء اللہ اور انبیاءؑ کے ہمنشین ہوں گے۔ [۲]

''ذلک'' کی تعبیر جو کہ عموماً دور کی طرف اشارہ کے لئے ہوتی ہے ایسی جگہ پر اس نعمت الٰہی کی عظمت اور بلندی کے پیش نظر لائی گئی ہے، گویا یہ نعمت اس قدر بلند اور باعظمت ہے کہ ہماری دسترس اور پہنچ سے دور ہے، نیز ''الفضل من اللہ'' کی تعبیر بھی اسی معنی پر تاکید کے لئے

---

[۱] بعض کا یہ نظریہ ہے کہ ''رفیقا'' یہاں پر ''تمیز'' ہے اس لیے مفرد آیا ہے، بعض کہتے ہیں کہ یہ ''حال'' ہے اور اس کا مفرد آنا (جب کہ ذوالحال جمع ہے) یا تو اس لئے ہے کہ ''رفیق'' واحد کے معنی میں بھی ہوتا ہے اور جمع کے معنی میں بھی یا اس لئے ہے کہ یہ ''جنس'' کا معنیٰ رکھتا ہے۔

[۲] تفسیر مجمع البیان، فخر رازی، قرطبی، مراغی، روح المعانی اور فی ظلال القرآن میں زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

ہے جواس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ نعمت فقط عمل کے ذریعے سے ہی حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہ تو خدا کے فضل وہ کرم کا ہی عطیہ ہے، صرف اس کی نظر کرم سے ہی اس نعمت تک پہنچا جا سکتا ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آیت میں یہ چار طرح کے افراد بالترتیب بہشتی ساتھیوں کے طور پر ذکر ہوئے ہیں، ''انبیاء'' ''صدیقین'' ''شہداء'' اور ''صالحین'' یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ترتیب اُن کے درجات پر دلالت کرتی ہے، بعض نے یہ کہا ہے کہ انبیاء اس لئے پہلے ذکر کئے گئے ہیں چونکہ یہ معرفت خدا میں اُس مقام تک پہنچ چکے ہیں کہ دل کی آنکھوں سے خدا کو اپنے نزدیک دیکھ رہے ہیں۔ ''صدیقین'' وہ ہیں جو معرفت کے دوسرے درجے پر ہیں، یہ اس شخص کی مانند ہیں جو ایک چیز کو دور سے آنکھوں کے ذریعے دیکھتا ہے، شہداء تیسرے درجے پر ہیں، یہ اس کی مانند ہیں جو عقلی دلائل کے ساتھ کسی چیز تک پہنچے اور ''صالحین'' چوتھے درجے پر ہیں، یہ اس شخص کے مانند ہیں جو کسی علم کے بڑے لوگوں کی تقلید اور پیروی سے کسی چیز کو قبول کرتا ہے۔[1]

البتہ بعض اوقات انبیاء پر بھی ''شہداء'' اور ''صالحین'' کا لفظ بولا جاتا ہے، بہر حال یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب یہ چار اوصاف اکٹھے ذکر ہوں تو اس وقت وہی مذکورہ معنی سمجھا جاتا ہے۔

ان چار اوصاف کے لئے ایک بہتر تفسیر یہ ہے کہ انسانی معاشرے کی ہدایت اور راہنمائی کے لئے پہلے انبیاء (ہادیان الٰہی) کا آنا ضروری ہے، اس کے بعد صدیقین کا جو اپنے قول و فعل کے ساتھ انبیاء کی دعوت کو آگے پہنچاتے ہیں، اس کے بعد جب راستے میں کوئی رکاوٹ آئے تو ایسے افراد کا ہونا ضروری ہے جو اپنی جان کی قربانی دے کر اس دعوت اور تبلیغ کا دفاع کریں تا کہ آخر کار اس معاشرے پر نیک اور صالح لوگوں کی حکمرانی قائم ہو سکے۔

اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے ان چار طرح کے گرہوں کا ایک ساتھ ہونا ان کے مقام کے برابر ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے درمیان ایک تعلق اور واسطہ ہے، جیسا کہ ایک شاگرد کا استاد سے یا ایک سپاہی کا اپنے کمانڈر سے رابطہ ہوتا ہے۔

یہی مفہوم البتہ ایک اور پیرائے میں سورہ حجر آیت ۴۷ میں آیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَنَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ اِخۡوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیۡنَ

ہم ہر طرح کے حسد اور کینہ کو ان کے دلوں سے نکال دیں گے، وہ سب بھائیوں کی طرح ہوں گے اور تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

(اس آیت کی تفسیر و تشریح پہلے گزر چکی ہے)

سورہ کہف آیت ۳۱ میں بھی اسی مفہوم کی طرف کچھ اشارات ملتے ہیں، بہر حال ان سراپا خلوص، باعظمت اور نیک دوستوں کی موجودگی بہشت کی بہت بڑی معنوی لذتوں میں سے ہے۔

---

[1] تفسیر روح المعانی، ج ۵، ص ۶۸ سے اقتباس۔

سورہ کہف آیت ۳۱ میں بھی اسی مفہوم کی طرف کچھ اشارات ملتے ہیں، بہر حال ان سراپا خلوص، باعظمت اور نیک دوستوں کی موجودگی بہشت کی بہت بڑی معنوی لذتوں میں سے ہے۔

۵۔محبت بھرا سلوک

زندگی کو جو چیز خوشگوار اور فرحت آمیز بنا دیتی ہے وہ ان پیار بھرے جملات کا تبادلہ ہے جو انسانوں کے درمیان ہوتا ہے، اگر سب لوگ سچ بولیں، صحیح سوچیں، انصاف کا دامن تھامے رکھیں، ہمدردی کریں اور ایک دوسرے کا احترام کریں تو ہر طرف سکون اور مسرت ہوگی، لیکن جب بری اور جھوٹی باتوں، تہمت، دغابازی، دھوکہ، فراڈ، سرزنش، بے ادبی اور غصے والی گفتگو رواج پا جائے تو ایسے ماحول میں شخصیت دار افراد کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، ان کے لئے زندگی کا ایک ایک لحہ طاقت فرسا ہو جاتا ہے۔

بہشت کی ایک خصوصیت یہی ہے کہ بہشتی پوری زندگی میں نہ جھوٹ سنیں گے اور نہ ہی کوئی بری بات، یہ ایک بہت بڑی معنوی نعمت ہے۔

کلام خدا میں ارشاد ہوتا ہے:

لا یسمعون فیھا لغوا ولا تاثیما الا قیلا سلاما سلاما

بہشت میں نہ تو کوئی فضول اور بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ گناہ آمیز گفتگو۔(وہ تو صرف) سلامتی سلامتی کی صدائیں سنیں گے۔(واقعہ۔۲۵۔۲۶)

ان کا ایک دوسرے پر درود وسلام، فرشتوں کا ان پر درود وسلام، ان سب سے بڑھ کر خدا کی طرف سے اُن پر سلامتی اور رحمت کا پیغام، یہ سلام پیار، محبت اور خلوص سے معمور ہوں گے۔

ہاں! بہشتیوں کی محفل میں تو ہر طرف صلح وصفا اور خلوص کا دور دورہ ہوگا، جس جگہ پر بھی یوں ہو وہ بہشت کا ایک نمونہ ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"لا یسمعون فیھا لغوا ولا کذبا"

وہ وہاں پر نہ تو کوئی فضول بات سنیں گے اور نہ جھوٹ۔(نبا۔۳۵)

''لغو''لغت میں فضول گفتگو کے معنی میں ہے، دوسرے الفاظ میں یوں کہ یہ ایسی گفتگو ہے جو بغیر سوچے سمجھے کی جاتی ہے، یہ حقیقت میں ''لغا'' سے ماخوذ ہے جو چڑیوں کے شور کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

بہت سے مفسرین نے ''فیھا'' کی ضمیر کے مرجع سے متعلق دو احتمال ذکر کئے ہیں:

۱۔ یہ کہ ضمیر ''بہشت'' کی طرف لوٹ رہی ہے۔

۲۔ یہ کہ یہ ''کاس'' (جام) کی طرف لوٹ رہی ہے، جو اس سے پہلی آیت میں آیا ہے۔

پہلی صورت میں اس کا معنی واضح ہے، دوسری صورت میں اس کا معنی یہ ہے کہ بہشت کی شراب مستی اور نشہ نہیں لائی گی اور اُس کے پینے سے کوئی فضول اور بے ہودہ گفتگو بھی نہیں کی جائے گی، لیکن پہلی تفسیر ''فی'' کے معنی اور اس سے ملتی جلتی دیگر آیات سے زیادہ ہم آہنگ ہے، یہی معنیٰ ایک بہت مختصر اور واضح عبارت میں آیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

فی جنة عالیة.........لا تسمع فیھا لا غیة

(مومن) شاداب چہروں کے ساتھ عالی شان بہشت میں ہوں گے، اس میں کوئی فضول (بے ہودہ) بات نہیں سنیں گے۔ (غاشیہ۔ ۱۰۔۱۱)[۱]

علاوہ ازیں بہشتی آپس میں پیار و محبت کی نشستیں رکھیں گے، دوسری مسرت آمیز تفریحات کریں گے، خوبصورت مزاح کریں گے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

ان اصحاب الجنة الیوم فی شغل فا کھون

یقیناً اس دن جنت والے کسی شغل میں خوشحال ہوں گے۔ (یسین۔ ۵۵)

''شغل'' (بروزن شتر) ہے جس کا معنی ہر وہ واقعہ یا حالت ہے جو انسان کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالے، لیکن یہاں پر یہ مسرت بخش تفریحات کے معنی میں ہے۔ ''فاکھون'' جو جمع ہے ''فاکہ'' کی، یہ بھی مسرور اور خوشحال انسان کی طرف اشارہ ہے، یہ ''فکاھه'' کے مادہ سے ہے جس کا معنی مزاح ہے، ''فاکہ'' لسان العرب کے بقول خوش مزاج اور شیریں سخن آدمی کو کہتے ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ ہمیں اس بات کا کوئی علم نہیں کہ وہاں پر بہشتیوں کی تفریحات اور مصروفیات کیا ہوں گی کیونکہ ہم ہر چیز کو اپنی اس مادی دنیا کے معیار کے مطابق سوچتے ہیں، وہ وہاں ایسی نعمات میں کھوئے ہوں گے کہ اس جہان میں جن کا تصور بھی ہمارے لئے ممکن نہیں ہے۔

بہر حال یہ مصروفیات اس بات کا باعث بنیں گی کہ اس جہان کے مصائب، میدان محشر کی مصیبتیں یا بعض دوسرے عزیز وا قارب کا ان سے دور ہو جانا انہیں بالکل بھول جائے، مفسرین نے بہشتیوں کی مصروفیات کو جو دس یا سات حصوں میں تقسیم کیا ہے یہ ان مفسرین کے اس جہان کی سرگرمیوں کے تصورات کی وجہ سے ہے، وگرنہ اُس دنیا کا نقشہ تو کچھ اور ہی ہوگا۔[۲]

---

[۱] قرآن کی اور آیات بھی اسی معنی پر تاکید کرتی ہیں جیسے (مریم۔ ۶۲ اور یونس۔ ۱۰

[۲] یہی مضمون سورہ طور آیت ۱۸ میں بھی آیا ہے

۶۔ بے انتہا خوشی

کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان کو بہت خوبصور باغات کی سیر کرنے کی دعوت دی جاتی ہے، اس کی خدمت اور تفریح کے پورے سامان مہیا کر دیئے جاتے ہیں، لیکن وہ کسی چیز سے بھی لطف واندوز نہیں ہو پاتا کیونکہ اس کی روح پریشان ہوتی ہے، انسان اس وقت ہی خدا کی نعمات سے لطف اٹھا پاتا ہے جب اس کی روح پرسکون اور پرنشاط ہو۔

قرآن کی متعدد آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہشتی خوشی وسرور میں یوں ڈوبے ہوئے ہوں گے کہ خوشی اُن کے چہروں سے چھلکتی ہوگی اس سلسلے میں قرآن نے جو جملات استعمال کئے ہیں وہ بہت خوبصورت اور قابل توجہ ہیں، ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

ادخلوا الجنة انتم وازوجکم تحبرون

(اُن سے کہا جائے گا) جنت میں داخل ہو جاؤ تم اور تمہاری بیویاں جب کہ خوشی کے آثار تمہارے چہرے پر نمایاں ہیں۔(زخرف۔۷۰)

'' تحبرون '' کا مادہ ''حَبرَ'' (بروزن فکر) ہے ''مقائیس اللغت'' کے بقول یہ اصل میں خوبصورت اثرات کے معنی میں ہے، اسی لئے سجائی ہوئی چیزوں کو ''محبر'' کہتے ہیں، لکھنے والی سیاہی کو بھی ''حبر'' کہتے ہیں چونکہ یہ ایک خوبصورت اثر چھوڑتی ہے، علما کو ''احبار'' کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی بہت مفید اثرات چھوڑتے ہیں، یہ کلمہ اُس خوشی اور سرور کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جس کے اثرات چہرے پر نمایاں ہوں، یہاں یہی معنی مراد ہے:[۱]

یہی بات سورہ مطففین آیت ۲۴ میں دوسرے لفظوں میں آئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

تعرف فی وجوههم نضرة النعیم

ان کے چہروں پر نعمت کی خوشی اور چمک کو دیکھو گے۔

''نضرة'' حقیقت میں خوبصورتی کے معنی میں ہے ''نضرة النعیم'' سے مراد وہ خاص شادابی اور رونق ہے جو نعمت اور پرسکون زندگی کی وجہ سے انسان کے چہرے پر نمایاں ہوتی ہے، یہ انسان کے اندرونی طور پر پرسکون اور خوش ہونے کی حکایت کرتی ہے، بقول شاعر:

''رنگ رخسارہ خبرمی دهد از سر درون''[۲]

---

[۱] سورہ روم آیت ۱۵ میں بھی یہ مفہوم آیا ہے۔

[۲] اسی سے ملتی جلتی تعبیر سورہ قیامت آیت ۲۲ اور سورہ دہر آیت ۱۱ میں آئی ہے۔

دل کی لو دیکھ رہا ہوں تیرے رخساروں میں

بعض مفسرین نے اس کلمے کو خوش حال ہونے اور ہنسنے کے معنی میں لیا ہے، جیسا کہ سورہ عبس آیت ۳۹ میں آیا ہے:

وجوہ یومئذ مسفرۃ ضاحکۃ مستبشرۃ

اس دن ان کے چہرے کھلے ہوئے، نورانی، مسکراتے ہوئے اور مسرور ہوں گے۔[1]

لیکن اس سے پہلی آیات یہ بتاتی ہیں کہ یہ آیت میدان حشر میں مومنین کی حالت کو بیان کر رہی ہے، نہ کہ بہشت میں بعض نے اس کو ناقابل بیان نورانیت، خوبصورتی اور چمک کے معنی میں لیا ہے۔[2]

بعض نے اسے اس بشاشت اور تازگی کے معنی میں لیا ہے جو محبوب یعنی خدا کی رضا کے احساس سے ان کے چہروں پر نمایاں ہو گی۔[3]

سورہ غاشیہ آیت ۸ میں ایک اور تعبیر ہے:

وجوہ یومئذ ناعمۃ لسعیھا راضیۃ

اُس دن چہرے شاداب اور روشن ہوں گے (کیونکہ) وہ اپنی کوشش اور جدوجہد سے راضی ہوں گے۔

''ناعمۃ'' کا مادہ نعمت ہے، یہاں پر نعمت میں غرق ہونے کے معنی میں ہے، اس طرح کہ اس خوشی اور سرور کے آثار اُن کے چہروں پر نمایاں ہوں گے، بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ ''نعومت'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی نرم اور آرام دہ ہے، ایسا بھی مختلف نعمات کے نتیجے میں ہی ہوتا ہے۔[4]

بعض مفسرین کے بقول یہ شاداب و پررونق نورانی چہرے چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہے ہوں گے۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ صرف مادی نعمات کی وجہ سے نہیں ہوگا کیونکہ صرف مادی نعمات اس طرح کے اثرات نہیں چھوڑ سکتیں بلکہ یہ تو ایک بہت بڑی روحانی خوشی کی وجہ سے ہوگا، جس نے ان کے پورے وجود کا احاطہ کر رکھا ہوگا، آیت کا ذیل بھی اسی معنی کی تائید کرتا ہے۔

۷۔ خدا کی رضایت کا احساس

جس انسان کو یہ احساس ہو کہ اس کا پیارا محبوب اس سے راضی ہے اس کے لئے یہ خوشی سب خوشیوں سے بڑھ کے ہوتی ہے، محبوب کی

---

[1] تفسیر فخر رازی۔ ج ۲۶، ص ۹۸ (ایک قول کے طور پر ذکر ہوا ہے
[2] تفسیر فخر رازی۔ ج ۲۶۔ ص ۹۹
[3] روح البیان۔ ج ۱۰۔ ص ۲۷۱
[4] تفسیر المیزان۔ ج ۲۰۔ ص ۲۷۴

رضایت کا یہ احساس انسان کو وہ سکون اور نشاط بخشتا ہے جس کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کرسکتی۔

ہاں! محبوب کی مرضی پالینے کی لذت ایک سب سے بڑی معنوی لذت ہے، یہ ایسی لذت ہے جو شخصیت اور اپنے وجود کی اہمیت کے احساس کے ساتھ ہوتی ہے، کیونکہ اگر اس کا وجود کوئی اہمیت نہ رکھتا ہوتا تو اسے محبوب قبول ہی نہ کرتا۔

قرآن نے متعدد مرتبہ اس لطیف نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے، سورہ آل عمران آیت ۱۵ میں بہشت کے سبز باغات اور پاک و پاکیزہ ساتھیوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

"ورضوان من الله"

پرہیز گاروں کے لئے خدا کی خوشنودی ہے۔

یہ تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے جسے ایک چھوٹے سے جملے میں بیان کیا گیا ہے۔

سورہ توبہ آیت ۷۲ میں اس موضوع کی کچھ وضاحت کی گئی ہے، بہشت کی مادی نعمات کی ایک جھلک اور اس کے اُن سرسبز وشاداب باغات کا ذکر کرنے، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور اسی طرح بہشتیوں کے پاک و پاکیزہ مکانوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

ورضوان من الله اکبر

خدا کی رضا اور خوشنودی ان تمام سے بڑھ کر ہے۔

پھر آیت اس جملے پر ختم ہوتی ہے:

ذلك هو الفوز العظيم

سب سے بڑی کامیابی یہی ہے۔

''اکبر'' کی تعبیر اور اسی طرح ''ذلك الفوز العظيم'' کی تعبیر واضح طور پر یہ بتاتی ہے کہ خدا کی کوئی نعمت بھی اس نعمت کا مقابلہ نہیں کرسکتی، آخری جملہ جو کہ ''حصر'' کا مفہوم ادا کررہا ہے کہتا ہے:

''بس سب سے بڑی کامیابی یہی ہے''

ہم نے متعدد بار یہ بات ذکر کی ہے کہ ہم اُس جہان کی کسی مادی نعمت کے متعلق بھی اس محدود دنیا میں نہیں سوچ سکتے، اس عظیم معنوی نعمت ''رضوان اللہ'' کا تو اور ہی عالم ہے۔

البتہ مادی اور معنوی نعمات اور اُن سے ملنے والی لذت کے فرق کو اجمالی طور پر سمجھ سکتے ہیں، مثلاً ہمیں یہ معلوم ہے کہ کسی پیارے محبوب کی لمبی جدائی کے بعد اس کے وصال کی لذت، یا کسی مشکل علمی مسئلے کے حل ہونے سے حاصل شدہ لذت یا اس سے بڑھ کر وہ روحانی خوشی اور سکون جو عبادت یا خدا سے اس راز و نیاز کے وقت حاصل ہوتی ہے جو حضور قلب کے ساتھ انجام پائے، ان چیزوں کا موازنہ ہم ہرگز کھانے،

پینے، لباس یا باقی مادی لذتوں کے ساتھ نہیں کر سکتے۔

''ابوسعید خدریؓ'' نے رسول اکرمؐ سے یہ حدیث ذکر کی ہے:

خدا اہل بہشت کو مخاطت کر کے کہے گا! کیا تمہیں جو نعمتیں میں نے دی ہیں ان پر راضی ہو؟

وہ عرض کریں گے! ہم کیوں راضی نہ ہوں! آپ نے ہمیں ایسی ایسی نعمتیں عطا کی ہیں جو کسی مخلوق کو عطا نہیں کی گئیں۔

ارشاد ہوگا! کیا تمہیں وہ چیز عطا کروں جو ان سب سے بڑھ کر ہے؟

عرض کریں گے! پروردگار! اس سے اچھا اور کیا ہوگا۔

ارشاد ہوگا! میں نے تمہیں اپنی رضا اور خوشنودی عطا کی، اس کے بعد میں کبھی بھی تم پر غضب ناک نہیں ہوں گا۔[۱]

یہی مفہوم حضرت امام زین العابدینؑ نے دوسرے الفاظ میں بیان کیا ہے:

فیقول تبارك وتعالیٰ: رضاق عنکم و محبتی لکم خیر واعظم مماَ انتم فیه۔

میری خوشنودی اور محبت تمہارے لئے اُن نعمتوں سے بڑھ کے ہے جن میں تم ہو، وہ بھی سب کے سب اس حقیقت کی تائید کریں گے۔[۲]

''رضوان'' مصدری معنی رکھتا ہے یعنی راضی ہونا، چونکہ یہاں پر یہ ''نکرہ'' کی صورت میں آیا ہے اس لئے عظمت اور بلندی پر دلالت کرتا ہے، یعنی خدا کی عظیم خوشنودی سب چیزوں سے بڑھ کے ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں پر نکرہ ہونا قلت اور کمی کے معنی میں ہے، یعنی خدا کی تھوڑی سی رضایت بھی بہشت کی تمام مادی نعمات سے بڑھ کے ہے۔

بہرحال کوئی شخص بھی اس لذت اور روحانی خوشی کو بیان نہیں کر سکتا جو خدا کی رضایت اور خوشنودی کے احساس سے انسان کو حاصل ہوگی۔

ہاں! اس روحانی لذت کا ایک تھوڑا سا حصہ ہی بہشت کی تمام نعمات سے بڑھ کے ہوگا، قابل توجہ بات یہ ہے کہ سورہ مائدہ آیت ۱۱۹ میں بہشت کی مادی نعمات ذکر کرنے کے بعد خالق اور مخلوق دونوں کے ایک دوسرے سے راضی ہونے کی بات کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

''رضی اللہ عنھم و رضوا عنه ذٰلك الفوز العظیم''

---

[۱] تفسیر ابوالفتوح رازی۔ ج۶۔ ص ۷۰، روح المعانی۔ ج۱۰، ص ۱۲۲

[۲] تفسیر عیاشی زیر نظر آیت کے ذیل میں بحوالہ تفسیر المیزان ۔ ج۹

خدا بھی اُن سے راضی ہوگا اور وہ بھی خدا سے، اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

کتنا اچھا ہوگا کہ یہ خوشنودی دونوں طرف سے ہوگی، وہ بندوں کو اس قدر عطا کرے گا کہ سراپا رضا میں ڈوب جائیں گے اور ان سے اتنی محبت کرے گا جس سے اس کی مکمل مرضی اور رضا کا اعلان ہوگا، خلاصۂ کلام یہ کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی کامیابی نہیں کہ انسان یہ محسوس کرے کہ اُس کا محبوب اور معبود اس سے راضی ہے، اس خوشنودی کی علامت یہ ہے کہ جتنی نعمات بھی ہوں گی، چاہے وہ اس کے تصور میں ہوں یا نہ ہوں، اسے عطا کی جائیں گی۔

''راضية مرضية'' کی تعبیر جو کہ سورہ فجر آیت ۲۸ میں آئی ہے جو خدا کے مخلص بندوں کی روح مطمئنہ کو بیان کرتی ہے جو محبوب کے جوار اور قرب میں پہنچ جائے گی، یہ تعبیر بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اے نفس مطمئنہ! خدا کی طرف لوٹ آ، جب کہ وہ بھی خدا سے راضی ہے اور خدا بھی اس سے، اس کے بعد

''فادخلی فی عبادی'' ''میرے بندوں میں داخل ہوجا''

کا انعام ایک کرامت اور عظمت کے تاج کے طور پر اس کے سر پر سجایا جاتا ہے اس سے بڑھ کے اور کیا اعزاز ہوسکتا ہے کہ انسان کو ''عبادی'' (مرا خاص بندہ) کہہ کر خطاب کیا جائے گا۔

ہاں! یہی انعام ہے اُن لوگوں کے لئے جو نفس ''امارہ'' اور ''لوامہ'' کے مراحل سے گزر کر ''نفس مطمئنہ'' کے مرحلے تک پہنچ جائیں، اپنی خواہشات کو مٹا دیں، شیطان کو شکست دے دیں اور تقویٰ و پرہیزگاری کی سواری پر سوار ہوجائیں۔

قیامت کے دن خدا کی رضا اور خوشنودی سے متعلق آیات فقط وہی نہیں ہیں جنہیں اوپر ذکر کیا گیا ہے بلکہ یہ معنی اور بھی کئی آیات میں آیا ہے، یہ سب کچھ اس امر کی حد درجہ اہمیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔[1]

۸۔ خدا کا انہیں دیکھنا اور اُن کا خدا کو دیکھنا:

ان کے لئے ایک اور بہت بڑی معنوی لذت ان کے محبوب کا اُن کی طرف نظر کرم کرنا ہے، محبوب سے ہم کلامی کی نعمت کتنی عظیم نعمت ہے، بلکہ اس سے بڑھ کے یہ کہ انسان اس کی ذات پاک کے مشاہدے سے ہم کنار ہو، یعنی دل کی آنکھوں سے اس کی زیارت کرے، اس کے جمال کی رعنائیوں میں ڈوب جائے۔

قرآن نے اس معنوی نعمت کا تذکرہ بھی کئی بار کیا ہے، ایک جگہ پر خدا کی آیات کو چھپانیوالوں پر دردناک عذاب کے نازل ہونے کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَکِّیْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ

[1] (قارعہ۔۷)، (توبہ۔۲۱)، (حدید۔۲۰)، اور (بینہ۔۸) کی طرف رجوع کیا جائے۔

خدا قیامت کے دن ان سے بات نہیں کرے گا اور انہیں پاک بھی نہیں کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔(بقرہ۔۱۷۴)

ایک اور جگہ پر اس سے زیادہ سختی کا اظہار کیا گیا ہے، انہی جیسے دوسرے لوگ کہ جو پیمان الٰہی کو بہت کم قیمت پر بیچ دیتے ہیں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

ولا یکلمهم الله ولا ینظر الیهم یوم القیامة ولا یز کیهم ولهم عذاب الیم۔

خدا قیامت کے دن نہ تو اُن سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ہی ان کو پاک کرے گا، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔(آل عمران۔۷۷)

ہاں! وہ خدا سے بات کرنے کی لذت اور اس کی نگاہ لطف ورحمت سے محروم رہیں گے، اسی وجہ سے پاک نہیں ہوسکیں گے، چونکہ بہشت بھی پاک لوگوں کی جگہ ہے وہ اس میں نہیں جاسکیں گے بلکہ وہ ایک دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

ان دونوں آیتوں سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ یہ نعمتیں فقط مومنین اور اہل بہشت کو ہی ملیں گی، خدا ان سے اپنے لطف کے ساتھ گفتگو کرے گا، یعنی وہی عظیم مقام جو اس دنیا میں پیغمبروں کو ملا ہوا تھا، اور جس سے وہ لذت محسوس کرتے ہیں قیامت کے دن مومنین کو بھی اس مقام پر فائز کیا جائے گا، اس سے بڑھ کے اور کون سی لذت ہوسکتی ہے؟ بات کرنے کے علاوہ خدا اُن کی طرف اپنی نظر رحمت اور کرم بھی کرے گا، اس سے بڑی نعمت اور کون سی ہوسکتی ہے، کہ وہ محبت اور رحمت سے معمور نظریں اپنے بے قرار عاشق کی طرف کرے اور اپنے سچے چاہنے والے کو دیکھے۔

یہ بات واضح ہے کہ نہ تو وہ گفتگو زبان کے ذریعے ہے اور نہ وہ دیکھنا آنکھ کے ذریعے کیونکہ خدا جسم اور اس کے تقاضوں سے بلند و برتر ہے۔

کبھی انسان اپنے بیٹے سے ناراض ہوتا ہے، اس وقت نہ تو وہ اس سے بات کرتا ہے اور نہ ہی اس کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر بیٹا سمجھدار ہو تو باپ کی یہ بے اعتنائی اس کے لئے سب سے بڑی روحانی تکلیف ہوتی ہے، لیکن جب باپ بیٹے سے راضی ہوتا ہے تو اس کی طرف توجہ کرتا ہے، اُسے پوری طرح دیکھتا ہے اور اس سے محبت وشفقت کے ساتھ گفتگو کرتا ہے، بیٹے کے لئے یہ ہی سب سے بڑا اعزاز ہے۔

البتہ اس مادی اور جسم وصورت کی دنیا میں اسی طرح ہوتا ہے یہی بات البتہ بعض بلند درجے کے ساتھ اس معنوی دنیا میں مولا اور اس کے بندوں کے درمیان بھی ہے۔

سورہ قیامت میں اُس بے نظیر محبوب کے جمال کی طرف ایک نظر کی لذت کو بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وجوہ یومئذ ناضرة الیٰ ربها ناظرة

اس دن اُن کے چہرے خوش اور مسرور دیکھائی دیں گے، اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

(قیامت۔ ۲۲۔ ۲۳)

قابل توجہ یہ ہے کہ ''الیٰ ربها'' کی تعبیر جو کہ حصر پر دلالت کرتی ہے اس کا پہلے آنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اس دن فقط اُس کی ذات پاک کا نظارہ کریں گے نہ کہ اس کے غیر کا، اگر اس کے علاوہ وہ کسی چیز کی طرف دیکھیں گے بھی تو وہ بھی ایک طائرانہ سی نظر ہوگی، بلکہ دوسری چیزوں میں بھی اس کی جھلک ہی دیکھیں گے کیونکہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ اس کی ذات کا جلوہ ہی ہے، اُس کی رحمت اور لطف کی علامت ہی ہے، اثر کا دیکھنا حقیقت میں موثر کا دیکھنا ہی ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ''الیٰ ربها ناظرة'' کا جملہ اس انتظار کی طرف اشارہ ہے جو لوگ خدا کی رحمت اور کرم کے متعلق کر رہے ہیں، اسی لئے بعض اوقات یہ تعبیر لائی جاتی ہے کہ فلاں شخص کی نظریں صرف تیری طرف ہی ہیں یعنی تیرے کرم کا منتظر ہے یا یہ کہ ہماری اُمید کا محور تم ہی ہو۔

اس میں کسی قسم کا اشکال نہیں کہ آیت ایک وسیع مفہوم کی حامل ہو جو ان دونوں معانی پر محیط ہو، اکثر اہلسنت مفسرین جب اس آیت پر آتے ہیں تو بعض ضعیف اور کمزور احادیث کا سہارا لے کر قیامت کے دن خدا کے ان ظاہری آنکھوں کے ساتھ دکھائی دینے کو ثابت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اہل بہشت کے لئے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ قیامت کے دن وہ خدا کو انہی معمولی آنکھوں سے دیکھیں، بعض تو یہ کہتے ہیں کہ خدا ایک نور کی صورت میں آسمان پر نمودار ہوگا، وہ اوپر دیکھیں گے خدا کو وہ انہی آنکھوں سے دیکھیں گے اور لذت محسوس کریں گے۔

ہم نے اسی تفسیر کی چوتھی جلد میں اس طرح کے شرک آلود نظریات کے متعلق تفصیلی بحث کی ہے جو خدا کو ایک جسم کی حد تک محدود کر دیتے ہیں، اس سلسلے میں آنے والی روایات کے کمزور ہونے کے متعلق بھی گفتگو کی گئی ہے اس کو دوبارہ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، ہم ان غلطیوں اور اشتباہات کو اہل بیتؑ کی تعلیمات سے دوری اور تواتر سے ثابت شدہ حدیث ثقلین کو بھلانے کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ [1]

جو کچھ قطعی طور پر ثابت ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی عظمت اور بلندی کے آثار اُس دن دنیا کی نسبت زیادہ آشکارا ہوں گے، اسی طرح اس جہان کے تاریک پردے بھی مومنین کے دلوں سے ہٹا دیئے جائیں گے، گویا وہ دلی مشاہدے اور روحانی ادراک کے ساتھ اس کی ذات پاک کا نظارہ کریں گے۔

اور کبھی تو اُس کا شہود کا فیض اس حد تک انہیں حاصل ہوگا اور وہ اس کے جمال اور دیدار میں اس طرح محو ہوں گے کہ بہشت کی باقی ساری نعمات کو بھلا دیں گے۔

ہم گفتگو کے اس سلسلے کو ایک آیت کے ساتھ ختم کرتے ہیں جو ایک نئی تعبیر کے ذریعے مذکورہ بالا مفہوم ادا کرتی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] اس کی مکمل تفصیل اور وضاحت کے لئے ''پیام قرآن''، ج ۴۔ ص ۲۳۲ تا ص ۲۵۴ (فارسی) کی طرف رجوع کیا جائے

كَلَّآ إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ

(جیسا کہ کافر سوچتے ہیں نہیں ہوگا) بلکہ وہ اس دن اپنے پروردگار (کا دیدار کرنے سے) روک دیئے جائیں گے۔(مطففین۔۱۵)

اس سے بڑی سزا اور کیا ہوسکتی ہے کہ انہیں خدا کے قرب اور اس کی بارگاہ میں حاضری سے روک دیا جائے، اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ مومنین اس دن حجاب میں نہیں ہوں گے، وہ جمال حق کے مشاہدے سے لطف اندوز ہوں گے، وہ اس بے مثل محبوب کے دیدار سے فیض یاب ہوں گے، اگر کوئی عذاب الیم کا حجاب ہے تو وہ کافروں کے لئے ہی ہے، مومنین کے لئے یہ دیدار ہی سب سے بڑی لذت ہے۔

۹۔ جو چاہیں گے ملے گا

بعض اوقات میزبان اپنے پیارے مہمان کی خدمت کے لے تمام نعمتوں کو مہیا کرتا ہے، لیکن عموماً یہ نعمات محدود اور معین ہوتی ہیں، لیکن جب اُس سے یہ وعدہ کرلیا جائے کہ تم جو کچھ بھی چاہو گے وہ تمہیں ملے گا تو اس سے اس کی روح خوشی میں ڈوب جاتی ہے کیونکہ اُسے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ کسی قسم کی محدودیت یا کمی نہیں ہوگی۔

یہ بات جس طرح بہشت کی مادی نعمات کے متعلق سچ ہے اسی طرح اس کی معنوی نعمات کے متعلق بھی درست ہے بلکہ بعض آیات کی تعبیرات تو معنوی نعمات سے زیادہ ہم آہنگ ہیں، مثلاً سورہ شوریٰ آیت ۲۲ میں بہشتی باغات کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

لهم ما يشآء ون عند ربهم ذلك هو الفضل الكبير

وہ جو کچھ بھی چاہیں گے اُن کے پروردگار کے پاس مہیا ہے اور یہ بہت بڑا فضل ہے۔

"عند ربهم" کی تعبیر اور "ذلک هو الفضل الكبير" کی تعبیر معنوی نعمات سے زیادہ ہم آہنگ ہے جو کہ مادی نعمات کے بعد ذکر کی گئی ہیں۔

سورہ زمر آیت ۳۴ میں مادی نعمات کا ذکر کئے بغیر ارشاد ہوتا ہے:

لهم ما يشآء ون عند ربهم ذلك جزآء المحسنين۔

وہ جو کچھ بھی چاہیں اُن کے پروردگار کے پاس ہے اور نیک کام کرنے والوں کا انعام یہی ہے۔

اس لحاظ سے بہشتی نعمات کے سلسلے میں کسی قسم کی محدودیت نہیں ہوگی، بالخصوص مادی اور معنوی اعتبار سے، یہ تعبیرات اس بات کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ کہ بہشت کی نعمات فقط مادی نعمات میں منحصر نہیں ہیں، اس حقیقت کی وضاحت بھی کرتی ہیں کہ یہ نعمات لامتناہی اور لا محدود ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہ خدا وہاں پر انسان کو اتنی قدرت عطا کردے گا کہ اس کا ارادہ کرنا ہی ہر قسم کی نعمت کی پیدائش کا سبب بن جائے گا، اس دنیا کے بالکل برعکس کہ یہاں پر انسان کا ارادہ مختلف اسباب کی موجودگی اور حالات کے سازگار ہونے کے تابع ہوتا ہے، انسان اس وقت ہی باغ یا صحرا کی سیر کا ارادہ کرسکتا ہے جب ہوا معتدل ہو، درخت سرسبز وشاداب ہوں، انسان کا ارادہ کبھی بھی بہار آفرین نہیں ہوتا، لیکن قیامت کے دن صرف کسی چیز کے چاہنے اور مانگنے سے وہ چیز خدا کے حکم سے فوراً حاضر ہو جائے گی، یہ ایک عجیب اعزاز ہے۔[۱]

بعض مفسرین جو "خدا کو دیکھنے" کے عقیدے پر زیادہ تاکید کرتے ہیں یہاں پر بھی انہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت خدا کو ان آنکھوں کے ساتھ دیکھے جانے کی طرف اشارہ کرتی ہے، کون ہے جو خدا کو دیکھنا نہیں چاہتا۔[۲]

لیکن اُن کی سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ وہ اس بات کو قبول نہیں کرنا چاہتے کہ خدا کے متعلق "حسی مشاہدہ" ناممکن اور محال ہے، کیونکہ جسم، مکان اور جہت رکھنا مخلوقات کی خصوصیات میں سے ہے، اور یہ خدا کے لئے محال ہیں اور اہل بہشت کبھی بھی محال چیز کا تقاضا نہیں کریں گے، لیکن قلبی اور باطنی مشاہدہ اس دنیا میں بھی ممکن ہے اور اس دنیا میں بھی۔

سورہ ق آیت ۳۵ میں اسی سلسلے کی ایک اور تعبیر آئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

لهم ما يشآء ون فيها ولدينا مزيد

جو کچھ وہ چاہیں ان کے لئے بہشت میں ہے اور ہمارے پاس تو اس سے بڑھ کے ہے۔

یہ تعبیر بتاتی ہے کہ "لهم ما يشاء ون فيها" کے جملے میں اتنی وسعت بھی ہے جس کا بھی وہ ارادہ کریں گے وہ اس کا مصداق ہے، خدا کے پاس اس سے بڑھ کر نعمات ہیں جہاں تک کوئی انسانی عقل نہیں پہنچ سکتی، کوئی اسے سمجھ نہیں سکتا، جو کچھ ان کے لئے فراہم کیا جائے گا وہ کسی تصور میں بھی نہیں ہوگا، وہ اپنے بیکراں الطاف وعنایات کے دروازے ان پر اس طرح سے کھول دے گا کہ جس کی حقیقت کسی طور پر بھی بیان نہیں کی جاسکتی۔

بعض احادیث میں یہ ملتا ہے کہ "ولدینا مزید" کا جملہ اہل بہشت کے جمعہ کے دن کی طرف اشارہ ہے اس دن اُن پر کرامات اور خصوصی عنایات کا دروازہ کھولا جائے گا، جو کچھ ان کے پاس ہے اُس سے ستر گنا اور ستر مرتبہ زیادہ انہیں دیا جائے گا۔[۳]

قرآن میں اور بھی آیات ہیں جو مذکورہ بالا آیات سے ہم آہنگ ہیں۔[۴]

---

[۱] تفسیر المیزان ج ۱۷۔ ص ۲۹۰ سے اقتباس

[۲] تفسیر فخر رازی ج ۲۶۔ ص ۲۸۰

[۳] بحار الانوار، ج ۸۔ ص ۱۲۶ حدیث ۲۷

[۴] مثلاً (یٰسین۔ ۵۷) اور (حٰم سجدہ۔ ۳۱) ہے ان میں و لهم ما يدعون (اُن کے لئے جو کچھ وہ مانگیں ان کے لئے ہے) یا "ولكم فيها ماتدعون" (تمہارے لئے جو کچھ مانگو گے وہاں پر ہے) کی تعبیر ہے، یہ مختلف اور طرح طرح کی معنوی نعمات کو شامل ہے۔

۱۰۔ ناقابل تصور نعمات

قرآن میں بعض تعبیرات ایسی نظر آتی ہیں جو گذشتہ تمام تعبیرات سے وسیع تر اور بڑھ کے ہیں یہ ایک ایسے مرحلے میں لے جارہی ہیں جو تمام انسانوں کی فکر اور دائرہ سوچ سے باہر ہے، جو کچھ ہم نے پڑھا ہے اور لکھا ہے اس تمام سے بڑھ کے ہے!

قرآن نے ان عظیم نعمات الٰہی کو بیان کیا ہے (جن کی تشریح ہماری بساط سے باہر ہے) یہ قرآن کی تعجب خیز آیات میں سے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

کیسی کیسی جزائیں کہ جو ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث ہوں گی، ان کے لئے چھپا رکھی گئی ہیں۔ (سجدہ۔ ۱۷)

پیغمبر اسلامؐ کی ایک مشہور حدیث ہے:

ان اللّٰہ یقول اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رات، ولا اذن سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشرٍ۔

خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ انعامات رکھے ہیں جنہیں کسی آنکھ نے نہیں دیکھا، کسی کان نے نہیں سنا اور کسی کے ذہن میں ان کا تصور تک بھی نہیں آیا۔ [۱]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن میں یہ بہت بڑی خوش خبری مومنین کا ذکر کرنے کے بعد دی گئی ہے مومنین کی تعریف راتوں میں اٹھ کر خدا سے راز و نیاز کرنے (نماز تہجد) اور خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ خرچ کر دینے کے ساتھ کی گئی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان اطاعتوں، عبادتوں اور نیک اعمال میں ''نماز تہجد'' اور ''خدا کی راہ میں انفاق'' سب سے بڑھ کر ہیں، نماز شب بھی ایک پوشیدہ عبادت ہے اور خدا کی راہ میں خلوص سے خرچ کرنا بھی اکثر ایک پوشیدہ عمل ہوتا ہے، خدا نے ان کا بدلہ اور جزاء بھی اس طرح پوشیدہ رکھی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ''قرۃ اعین'' کی تعبیر اصل میں آنکھوں کی ٹھنڈک کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ [۲] کیونکہ عرب میں یہ مشہور تھا کہ بہت زیادہ خوشی کے وقت جو آنسو آنکھوں سے نکلتے ہیں وہ ٹھنڈے ہوتے ہیں جب کہ غم اور مصیبت کے وقت جو آنسو نکلتے ہیں وہ بہت گرم ہوتے ہیں، چنانچہ جب عرب یہ کہنا چاہتے کہ فلاں بات فلاں واقعہ بہت زیادہ خوشی اور مسرت کا باعث ہے تو ''قرۃ العین'' یا ''قرۃ

---

[۱] اس حدیث کو بہت سے مسلم مفسرین نے ذکر کیا ہے، مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں، آلوسی نے روح المعانی میں، قرطبی نے اپنی تفسیر میں، علامہ طباطبائی نے المیزان میں، نیز ''بخاری'' اور ''مسلم'' نے بھی اس کو اپنی حدیث کی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔

[۲] قر (بروزن حر) لغت میں سردی اور خنکی کے معنی میں ہے (

اعین'' کی عبارت لاتے، چونکہ یہ تعبیر فارسی میں موجود نہیں ہے اس کے مترادف تعبیر استعمال کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے ''آنکھوں کے نور کا سبب'' ہے۔

بہر حال بعض کلمات اور آیات ایسی ہیں کہ انسانی فکر جتنی بھی پرواز کر لے ان کی گرد تک نہیں پا سکتی، وہ اس کے متعلق جتنا بھی غور کرے آخر کار اس بات کا اعتراف کر لیتی ہے کہ وہ اس مفہوم کی روح اور گہرائی تک نہیں پہنچ سکتی، زیر نظر آیت بھی جو بہت معنی خیز عبارت لیے ہوئے ہے، جو بہت ہی پر معنی اور مزید انداز کی حامل ہے بہشتیوں کے لئے عظیم روحانی اور معنوی نعمات کی طرف اشارہ کر رہی ہے، کیونکہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ انبیاء رسل، فرشتے تک بھی اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے کہ خدا نے اپنے خاص بندوں کے لئے کیا انعام رکھا ہوا ہے جو یقینی طور پر وہ اُس کی ذات کے قرب اور وصال کے اس مرتبے پر پہنچ جائیں گے جسے صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو اس درجے تک پہنچ گیا ہے۔

ایک شاعر نے کیا خوبصورت کہا ہے:

روزی که روم همره جانان به چمن
نه لاله و گل بینم و نه سرو سمن
رازی که میان من واد گفته شود
من دانم واو داند واد داند ومن [1]

۱۱۔ بہشتی نعمات کا ابدی ہونا

جو بات بہشتی نعمات کی اہمیت کو غیر معمولی کر دیتی ہے اور انہیں اس دنیا کی نعمات سے پوری طرح جدا کر دیتی ہے وہ اُن نعمات کا ابدی اور دائمی ہونا ہے، اُن پر فنا اور خاتمے کا سایہ تک نہیں پڑے گا، وہاں پر نعمتوں کے ختم ہو جانے کا خطرہ نہیں ہوگا، اُن کے کم ہو جانے کا خوف نہیں ہوگا، اس لحاظ سے انسان پوری طرح آسودہ خاطر رہے گا، یہ امن وسکون کا احسان اُن نعمات کے لطف کو دوبالا کر دے گا۔

اس حقیقت کو تو وہی لوگ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جن کے پاس کوئی بہت بڑی نعمت ہو اور پھر انہیں اس نعمت کے زائل ہو جانے کا خوف دامن گیر ہو جائے، نعمت کی مٹھاس کڑواہٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

قرآن کی متعدد آیات اسی حقیقت کو بیان کرتی ہیں وہ انسان کو اس بات کی بشارت اور نوید دیتی ہیں کہ خدا کے لطف وکرم کا یہ دریا بیکراں ہے، خوش رہو اور ہنسی خوشی زندگی بسر کرو اور ان نعمات سے لطف اٹھاؤ۔

سورہ رعد کی آیت ۳۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] جس دن میں محبوب کے ہمراہ چمن کو جاؤں تو نہ لالہ وگل پہ نگاہ ڈالوں اور نہ سرو سمن پر، راز کی جو بات میرے اور اس کے مابین ہو، میں جانوں اور وہ جانے، وہ جانے اور میں جانوں۔)

"اكلها دآئم وظلها"

اس کے میوے دائمی اور سائے جاودانی ہیں۔

چونکہ یہ امر ''خلود'' کے ساتھ ایک نزدیکی رابطہ رکھتا ہے اس لئے ہم اُسے ایک الگ باب کے تحت زیر بحث قرار دیں گے۔

(۴) بہشت کے دروازے

اشارہ:

عموماً ہر گھر، عمارت اور باغ میں داخل ہونے کا راستہ ان کے دروازے سے ہوتا ہے، اس لئے جنت کے دروازے بھی اُس میں داخلے کے راستے کو متعین کرتے ہیں، دروازے میں کبھی تو ایسا تالا لگا ہوتا ہے جسے اُس کی مخصوص چابی کے ساتھ ہی کھولا جا سکتا ہے، عرب اسے ''مفتاح'' کہتے ہیں جس کی جمع ''مفاتیح'' ہے (یا مقلید و مقالید کہتے ہیں)۔

لیکن بہشت کے دروازے اور چابیاں ایک دوسرے مفہوم کے حامل ہیں، یہ اُن مفید اور مخلصانہ اعمال کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو بہشت میں داخلے کا سبب بنتے ہیں، البتہ قرآن کی آیات میں بہشت کے دروازے کی طرف بھی اجمالی سا اشارہ ہوا ہے، لیکن احادیث میں جو کچھ آیا ہے وہ اُن اعمال کے متعلق تفصیلی گفتگو ہے جو اس عظیم سرچشمہ رحمت یعنی جنت میں داخلے کا سبب ہیں، اس مختصر سے اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف آتے ہیں اور اس سلسلے میں آنے والی مختلف آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

۱۔ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ﴿الزمر: ۷۳﴾

۲۔ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ۞ ﴿ص: ۵۰﴾

۳۔ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ (رعد: ۲۳،۲۴)

ترجمہ:

۱۔ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے اور جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے، جنت کے نگہبان ان سے کہیں گے! تم پر سلامتی ہو۔

۲۔ بہشت کے جاوداں باغات جن کے دروازے اُن کے لئے کھلے ہوئے ہوں گے۔

۳۔ ہر دروازے سے فرشتے ان کے پاس آئیں گے (اور اُن سے کہیں گے) تم پر تمہارے صبر اور استقامت

کی وجہ سے سلامتی ہو۔

تفسیر

بہشت انتظار کر رہی ہے

پہلی آیت میں بہشتیوں کے اکٹھے ہو کر اور گروہ گروہ کی صورت میں جنت کی طرف جانے کا ذکر ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''حتیٰ اذا جآء وھا وفتحت ابوابھا وقال لھم خزنتھا سلم علیکم '''' جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے اور جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے، جنت کے نگہبان ان سے کہیں گے! تم پر سلامتی ہو''۔

اس تعبیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب اہل بہشت نزدیک پہنچیں گے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے گویا بہشت اُن کا انتظار کر رہی ہے، وہ اپنی آغوش پھیلائے گی اور انہیں اندر آنے کی دعوت دے گی، اُن کے لئے خود دروازے کھولنے تک کی زحمت بھی نہیں ہوگی۔

دوسری آیت میں یہی بات اور انداز میں بیان کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''جنت عدن مفتحة لھم الابواب''ہمیشہ رہنے والے باغات کہ جن کے دروازے اُن کے لئے پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔

''مفتحة'' کی تعبیر چونکہ باب ''تفعیل'' سے ہے یہ ایسی جگہ پر کثرت اور تاکید کا مفہوم عطا کرتی ہے یہ ممکن ہے اس معنی میں ہو کہ نہ صرف ایک دروازہ بلکہ تمام دروازے اور وہ بھی ادھ کھلے نہیں بلکہ پوری طرح کھلے ہوئے ہوں گے۔

کیا یہ دروازے خود بخود کھل جائیں گے جیسے یہ زندگی اور روح رکھتے ہوں اور اہل بہشت کے نزدیک آنے کے ساتھ ہی اُن کے احترام کے طور پر کھل جائیں گے یا یہ کہ صرف ارادے، قصد اور حکم کے ساتھ ہی کھل جائیں گے کسی اور ذریعے کی ضرورت نہیں پڑے گی؟

یا یہ کہ فرشتوں اور بہشت کے محافظوں نے احترام کے طور پر انہیں پہلے ہی کھول رکھا ہوگا اور دروازے پر کھڑے ہو کر وہ خوش آمدید کہیں گے، جیسا کہ ہم بہت ہی معزز مہمانوں کے لئے کرتے ہیں؟

پہلی بات زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔''صیغہ مجہول'' لانا بھی شاید اسی کی طرف اشارہ ہو۔

فرشتوں اور جنت کے نگہبانوں کا دروازے پر کھڑے ہو کر انتظار کرنا بھی پہلی آیت کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔

تیسری اور آخری آیت میں فرشتوں کے مختلف دروازوں سے آنے کا ذکر ہے، یہ اہل بہشت کے بہشت میں داخلے کے بعد ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''والملئکة یدخلون علیھم من کل باب ۔ سلم علیکم بما صبر تم '''' ہر دروازے سے فرشتے ان کے پاس آئیں گے اور اُن سے کہیں گے تم پر تمہارے صبر اور استقامت کی وجہ سے سلامتی ہو''۔

کیا اس کا یہ معنی نہیں کہ تمام نیک اعمال جو کہ حقیقت میں بہشت کے دروازے ہیں ان کا خلاصہ صبر واستقامت میں کیا جا سکتا ہے؟ (غور کیجئے گا)۔

توضیحات:

ا۔احادیث۔۔۔۔۔اورجنت کے دروازے:

قرآن کی کسی آیت میں بھی یہ نہیں آیا کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں، صرف دوزخ کے متعلق ہے کہ:

"لها سبعة ابواب"

اس کے لئے سات دروازے ہیں۔ (حجر۔۴۴)

لیکن روایات میں کئی جگہ اس بات کا ذکر ہے کہ بہشت کے آٹھ دروازے ہیں، یہ شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ بدبختی اور گمراہی کے سرچشمے یعنی جہنم میں گرنے کے لئے کم راستے ہیں لیکن سعادت اور خوش بختی کے سرچشمے تک پہنچنے کے لئے زیادہ راہیں ہیں، خدا کی رحمت واسعہ اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

"سبقت رحمته غضبه"

امیرالمومنین حضرت علیؑ سے ایک حدیث منقول ہے:

"ان للجنة ثمانية ابواب"

بہشت کے آٹھ دروازے ہیں۔

پھر ان دروازوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا:

بعض دروازوں سے تو "صدیقین" داخل ہوں گے اور بعض سے "شہداء" اور "صالحین" اور بعض سے محمدؐ وآل محمدؐ کے پیروکار اور چاہنے والے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔[1]

امام محمد باقرؑ سے ایک حدیث یوں منقول ہے:

احسنو الظن بالله واعلموا ان للجنة ثمانية ابواب۔ عرض کل باب منها مسيرة اربعين سنة۔

---

[1] بحارالانوار۔ج۸۔ص۱۲۱۔حدیث ۱۲

خدا کے متعلق نیک گمان رکھو اور جان لو کہ بہشت کے آٹھ دروازے ہیں، ہر ایک دروازے کی چوڑائی چالیس سال کی مسافت جتنی ہے۔[1]

بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہشت کے دروازوں کی تعداد اکہتر (۷۱) ہے، امیر المومنین حضرت علیؑ سے مروی ایک حدیث میں بھی اس طرح ہے۔[2]

ممکن ہے کہ یہ تعداد اُن کی کثرت کی طرف اشارہ ہو، یعنی جنت کے دروازوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، البتہ ایک جگہ پر جہنم کے ساتھ موازنے کے وقت اس کے آٹھ دروازوں کا ذکر کیا گیا ہے تا کہ یہ بتایا جائے کہ سعادت اور نیکی تک پہنچنے کی راہیں گمراہی اور ضلالت تک پہنچنے کی راہوں سے زیادہ ہیں، دوسری جگہ پر قوموں کے زیادہ ہونے کی طرف اشارہ ہے جن میں سے ہر ایک ایک راستے سے خدا کی رحمت کے اس سرچشمے میں داخل ہوگی۔

ان روایات کی مختلف تعبیرات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جنت کے یہ دروازے ان اعمال سے پوری طرح ہم آہنگ اور موزوں ہیں جو نیک اور پاک لوگ انجام دیتے ہیں، مثلاً حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک حدیث یوں ہے:

للجنة باب يقال باب المجاهدين ،يمضون اليه فاذا هوا مفتوح وهم متقلدون بسيوفهم....... والملئكة ترحب بهم

بہشت کا ایک دروازہ ہے جسے ''مجاہدین کا دروازہ'' کہا جائے گا، جب وہ اس کی طرف چلیں گے تو وہ دروازہ کھل جائے گا، اُن کی تلواریں اُن کی کمر کے ساتھ لٹک رہی ہوں گی، فرشتے انہیں خوش آمدید کہیں گے۔[3]

یہی بات نہج البلاغہ میں ایک اور انداز میں آئی ہے:

ان الجهاد باب من ابواب الجنة فتحه الله لخاصة اوليآئه

جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جسے خدا اپنے خاص بندوں کے لئے کھولتا ہے۔[4]

نبی اسلامؐ سے منقول ایک حدیث ہے:

---

[1] بحار الانوار۔ج ۸۔ص ۱۳۱۔حدیث ۳۲

[2] بحار الانوار۔ج ۸۔ص ۱۳۹۔حدیث ۵۵

[3] اصول کافی۔ج ۵۔ص ۲۔حدیث ۲

[4] نہج البلاغہ۔خطبہ نمبر ۲۷

"ان للجنة بابا يدعى الريان لا يدخله الا الصآئمون"

بہشت کا ایک دروازہ ہے جسے"سیراب کرنے والا" کہا جاتا ہے، اُس دروازے سے صرف روزہ دار داخل ہوں گے۔[1]

نبی رحمتؐ کی ہی ایک اور حدیث ہے:

ان للجنة باب تقال له باب المعروف لا يدخله الا اهل المعروف

بہشت کے ایک دروازے کا نام"نیکی کا دروازہ" ہے اس سے فقط نیک لوگ ہی داخل ہوسکیں گے۔[2]

اسی طرح دوسری احادیث میں"باب الصبر""باب الشکر" اور"باب البلاء" کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، بعض جگہ پر تو یہ ہے کہ جنت کے دروازے شمشیروں کے سائے میں ہیں۔

ان ابواب الجنة تحت ظلال السيوف [3] (جہاد کی طرف اشارہ ہے)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بعض احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہشت کے دروازے خدا کے عظیم بندے ہیں، چنانچہ اصول کافی میں حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے ایک حدیث میں ہے:

"ان عليا باب من ابواب الجنة"

علیؑ بہشت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہیں۔[4]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو بھی اپنے اخلاق، اطوار، ایمان اور عمل میں حضرت علیؑ کی پیروی کرے اور ان کے راستے پر چلے تو وہ بہشت میں داخل ہوگا۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے بہشتی دروازوں کا معنی و مفہوم اور ان کی کیفیت بالکل واضح ہوگئی۔

۶۔ بہشتی دروازوں پر لکھی ہوئی عبارات

ہر عمارت پر لکھی ہوئی عبارات عموماً اس عمارت کے حقیقی اہداف اور مقصد کی ترجمانی کرتی ہیں، احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ

---

[1] بحارالانوار۔ج ۹۳۔ص ۲۵۲۔حدیث ۱۷

[2] بحارالانوار۔ج ۷۱۔ص ۴۰۸۔حدیث ۳

[3] میزان الحکمہ۔ج ۲۔ص ۱۰۴ (بحوالہ درالمنثور۔ج ۱۰ص ۲۴۸

[4] کافی۔ج ۶۔ص ۳۸۹۔حدیث ۲۱

بہشت کے دروازوں پر مختلف عبارات تحریر ہوں گی، ان روایات میں غور وفکر سے کچھ نکات کی وضاحت ہوتی ہے، بہشتی دروازوں کے متعلق جو تفسیر کی گئی ہے یہ اُس میں بھی کئی ظریف حقائق کا اضافہ کرتی ہیں۔

''جابرؓ بن عبداللہ'' نے پیغمبر اسلامؐ کی یہ حدیث بیان کی ہے:

مکتوب علیٰ باب الجنة لآ اله الا الله محمد رسول الله علی اخو رسول الله۔

جنت کے دروازے پر یہ لکھا ہوگا کہ خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں، محمدؐ خدا کے رسول ہے اور علیؑ رسول اللہؐ کے بھائی ہیں۔[۱]

اس بات کے پیش نظر کہ مذکورہ حدیث شیعہ اور اہل سنت کی بہت سی کتابوں میں مختلف عبارات کے ساتھ ذکر ہوئی ہے اس سے اسلام کے تین بنیادی اور اساسی اصولوں کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث منقول ہے:

علی باب الجنة مکتوب: الصدقة بعشرة والقرض بثمانية عشر

جنت کے دروازے پر لکھا ہوگا کہ خدا کی راہ میں صدقہ دینا دس گنا نیکیاں رکھتا ہے اور قرض دینا اٹھارہ گنا نیکیوں کا حامل ہے[۲]۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہشت میں داخل ہونے کی ایک بنیاد معاشرے میں کمزور اور غریب لوگوں کی مالی مشکلات کی طرف توجہ اور ان کی مدد ہے۔

ایک بہت تفصیلی حدیث ہے جس میں رسول اکرمؐ کی معراج کا واقعہ اور اس سفر میں اُن کا بہشت اور درزخ کو دیکھنا ہے، حدیث یوں ہے۔

---

[۱] بحارالانوار ج۸ ص۱۳۱ حدیث ۳۴۔ یہ حدیث یا اس سے ملتی جلتی حدیث اہل سنت کی بہت سی کتابوں میں بھی آئی ہے۔ مثلاً حافظ ابونعیم اصفہانی نے حلیة اولیاء (ج ۷ ص ۲۵٦)، حافظ ابوبکر بغدادی نے تاریخ بغدادی (ج ۷ ص ۳۸۷)، ابن معازلی نے کتاب مناقب امیرالمومنین (قلمی نسخہ)، حافظ سمعانی نیشاپوری نے مناقب الصحابہ، طبری نے ذخائر العقبیٰ (ص٦٦) اور ابن حجر عسقلانی نے لسان المیز ان (۴ ص۸۱) پر اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور بہت سے علماء نے اس حدیث کو ذکر کیا ہے (مزید وضاحت کیلئے ''احقاق الحق'' ج ۴ ص ۱۹۹ اور ص ۳۸۷ کی طرف رجوع کیا جائے)

[۲] بحارالانوار۔ ج۸۔ ص۱۸۱۔ حدیث ۱۴۰۔ ممکن ہے اٹھارہ گنا کی تعبیر اس لئے ہو کہ قرض دینے میں دو نیک کام ہیں ''مومن کی حاجت دور کرنا'' اور اس کے ''مقام اور آبرو کی حفاظت'' ہر ایک دس گنا نیکیاں رکھتا ہے، چونکہ جب وہ قرض واپس لیتا ہے تو دہ نیکیاں کم ہو جاتی ہیں۔ باقی اٹھارہ نیکیاں رہ جاتی ہیں)۔

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

بہشت کے آٹھ دروازے ہیں، ہر دروازے پر چار کلمات لکھے ہوئے تھے، جو بھی اُن پر عمل کرے یہ اُس کے لئے دنیا اور اس کی تمام چیزوں سے بہتر ہے۔

پھر آپؐ نے ہر دروازے پر لکھے ہوئے چار کلمات بیان فرمائے، ہر دروازے پر ان چار کلمات سے پہلے یہ جملہ تحریر تھا:

لا اله الا الله محمد رسول الله علی ولی الله

پہلے دروازے پر لکھا تھا!

ایک صحیح زندگی کے وسائل:

۱۔ قناعت۔

۲۔ حق شناسی۔

۳۔ عداوت سے دوری۔

۴۔ اور نیک لوگوں کی ہم نشینی ہے۔

دوسرے دروازے پر لکھا تھا!

آخرت کی خوشی کے چار ذریعے ہیں:

۱۔ یتیموں پر دست شفقت رکھنا۔

۲۔ غریب اور بیوہ عورتوں کے ساتھ ہمدردی۔

۳۔ مومنین کی حاجتیں پوری کرنے کے لئے کوشش کرنا۔

۴۔ فقراء اور مساکین پر مہربانی۔

تیسرے دروازے پر لکھا تھا!

دنیا میں تندرست اور سالم رہنے کے اسباب چار ہیں:

۱۔ کم بولنا۔

۲۔ کم سونا۔

۳۔ کم پھرنا۔

۴۔ کم کھانا۔

چوتھے دروازے پر لکھا تھا!

جو خدا اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہے اُسے چاہیے کہ وہ

۱۔ مہمان کا احترام کرے۔

۲۔ ہمسائے کا خیال رکھے۔

۳۔ ماں باپ کی عزت کرے۔

۴۔ اچھی بات کرے یا پھر چپ رہے۔

پانچویں دروازے پر تحریر تھا!

۱۔ جو چاہے کہ اُس پر ظلم نہ ہو وہ کسی پر ظلم نہ کرے۔

۲۔ جو چاہے کہ اُسے گالی نہ دی جائے وہ دوسرے کو گالی نہ دے۔

۳۔ جو چاہے ذلیل نہ ہو وہ دوسروں کو ذلیل وخوار نہ کرے۔

۴۔ جو چاہے کہ وہ دنیا اور آخرت میں کسی محکم رسی کو پکڑ لے تو یہ کہے:

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی ولی اللہ

چھٹے دروازے پر لکھا تھا!

۱۔ جو بھی چاہے کہ اُس کی قبر کھلی ہو وہ مسجد بنوائے۔

۲۔ جو بھی چاہے کہ اُس کا بدن زمین کے حشرات کا لقمہ نہ بنے وہ مسجد میں زیادہ دیر ٹھہرا کرے۔

۳۔ جو بھی چاہے کہ اُس کا بدن (قبر میں) صحیح وسالم رہے تو وہ مسجد کی صفائی کیا کرے۔

۴۔ جو بھی چاہے کہ اُس کا مکان بہشت میں ہو تو وہ مسجد میں فرش اور چٹائی بچھائے۔

ساتویں دروازے پر لکھا تھا!

دل کی نورانیت چار چیزوں سے ہے:

۱۔ بیماروں کی عیادت۔

۲۔ تشیع جنازہ۔

۳۔ کفن خریدنا۔

۴۔ قرضے کی ادائیگی۔

آٹھویں دروازے پر لکھا تھا!

جو بھی ان دروازوں سے جنت میں داخل ہونا چاہے، چار چیزیں اختیار کرے:

۱۔ سخاوت۔

۲۔ نیک اخلاق۔

۳۔ صدقہ۔

۴۔ بندگان خدا کو تکلیف نہ پہنچائے۔[1]

اس حدیث کے تربیتی اور اخلاقی پہلو بہت زیادہ ہیں، یہ واضح طور پر بتاتی ہے کہ خدا کی رحمت کے اس مخزن یعنی بہشت جاوید میں داخل ہونے کے لئے کن اعمال اور اوصاف کی ضرورت ہے۔

[1] بحار الانوار، ج ۸ ص ۱۴۵، حدیث ۶۷ ''کچھ اختصار کے ساتھ''

(۵) بہشت کی وُسعت

اشارہ:

ہم نے کئی بار اس بات کا ذکر کیا ہے کہ یہ دنیا جس میں ہم بس رہے ہیں یہ اُس دوسری دنیا کی نسبت بہت محدود اور حقیر ہے، آخرت کی زندگی کا وسعت کے لحاظ سے ہماری زندگی کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا، اسلامی احادیث میں اہل بہشت کے مکانوں اور ان کی وسعت کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ بھی ہمارے اس دعویٰ کی تائید کرتا ہے، یقیناوہ عظیم نعمتیں اور بے پایاں عطا و کرم ایک بہت عظیم اور وسیع دنیا میں ہوگا، ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اور اس وسعت کا حال قرآن کی زبانی سنتے ہیں:

۱۔ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ (حدید:۲۱)

۲۔ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۱۳۳﴿آل عمران: ۱۳۳﴾

۳۔ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا (دھر:۲۰)

ترجمہ

۱۔ اپنے رب کی مغفرت کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں جلدی کرو اور اس بہشت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کے برابر ہے، جو ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

۲۔ اپنے پروردگار کی مغفرت کے لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں جلدی کرو اور اس بہشت کی طرف جس کی وسعت آسمانوں اور زمین میں جتنی ہے، جو متقین کے لئے تیار کی گئی ہے۔

۳۔ اور اگر تو اس جگہ کو دیکھے تو تجھ کو بڑی نعمت اور سلطنت دکھائی دے۔

تفسیر

آسمان وزمین جتنی وسیع

پہلی آیت بہشت کی وسعت کو زمین وآسمان کی وسعت کے برابر قرار دیتی ہے، ارشاد هوتا هے "سابقوا الی مغفرة من ربکم وجنة عرضها کعرض السمآء والارض اعدت للذین اٰمنوا باللہ ورسله "

''اپنے رب کی مغفرت اور س جنت کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں جلدی کرو اور اس بہشت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کے برابر ہے، جو ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں''۔

واضح ہو کہ یہاں پر لفظ ''عرض'' کلمہ ''طول'' کے مقابل نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہی اس کا لغوی معنی ہے یعنی وسعت [1] بعض مفسرین نے یہاں سے بہشت کے لمبائی کا اندازہ کرنے کے سلسلے میں ایسے ہی تکلیف کی ہے۔ ایسا ''عرض'' کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ عبارت ایک کنایہ ہے کیونکہ سب سے بڑی وسعت جو انسان کے ذہن میں آسکتی ہے وہ زمین وآسمان کی وسعت ہے، وگرنہ حقیقت میں تو بہشت کی وسعت ان سے کہیں زیادہ ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ پہلے خدا کی مغفرت اور بخشش کی بات کی گئی ہے، اس کے بعد بہشت اور اس کی وسعت کا تذکرہ ہے، کیونکہ مغفرت یعنی گناہوں سے پاک ہو جانا خدا کے قرب کا باعث بنتا ہے جو کہ بہشت سے بھی بڑی نعمت ہے، دوسرا یہ کہ جب تک وہ پاکیزگی اور بخشش ومغفرت حاصل نہ ہو اُس وقت تک جنت میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

''سابقو'' جو کہ ''مسابقۃ'' کے مادہ سے ہے، اس طرف اشارہ ہے کہ بہشت اور مغفرت اس قدر اہم ہیں کہ مومنین ان کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں جیسا کہ ایک ہدف اور مقصد تک پہنچنے کے لئے باہمت لوگ آپس میں مقابلہ کرتے ہیں۔

یہ تعبیر اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ یہ دنیا تو ایک مقابلے کا میدان ہے، مقصد اور ہدف وہ دوسری دنیا ہی ہے۔

کس چیز میں آگے بڑھیں؟ بہت سے مفسرین نے اس کے مصادیق کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے، جیسے ''اسلام'' ''ہجرت''،

---

[1] بہت سے علمائے لغت نے ''عرض'' کو ''طول'' کے مقابل شمار کیا ہے، لیکن انہوں نے اس بات کا بھی انکار نہیں کیا کہ ''عرض'' ایک وسیع معنی بھی رکھتا ہے، ''التحقیق فی کلمات القرآن الکریم'' کے بقول ''عرض'' کا اصلی معنیٰ کسی چیز کو آنکھوں کے سامنے رکھنا ہے، چونکہ انسان بھی چیزیں دیکھتے وقت معمولاً ان کی ''چوڑائی'' کو دیکھتا ہے نہ کہ لمبائی کو، اس لئے یہ کلمہ مذکورہ معنی میں استعمال ہونے لگا، اس بناء پر زمین وآسمان کی چوڑائی سے مراد اُن کا وہ پورا وجود اور وسعت ہے جو دیکھا جا سکے۔

پنجگانہ نماز"، "جہاد" یا "توبہ" کی طرف بڑھیں، لیکن یہ بات واضح ہے کہ یہ آیت ایک وسیع مفہوم کی حامل ہے جو تمام نیک اعمال اور اطاعتوں کو شامل ہے، ان مفسرین کے کلمات میں جو کچھ آیا ہے حقیقت میں اس وسیع مفہوم کا مصداق ہی ہے۔

دوسری آیت میں اسی موضوع کو اور الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، وہاں پر آگے بڑھنے کی بات تھی اور یہاں پر تیزی کرنے کی بات ہے، وہاں پر تو یہ کہا گیا تھا کہ بہشت کی وسعت زمین و آسمان کی وسعت کے برابر ہے، یہاں پر برابر کے کلمے کو بھی حذف کر دیا گیا ہے، وہاں آسمان کی بات تھی اور یہاں آسمانوں کی، وہاں یہ کہا گیا کہ بہشت اُن لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور یہاں پر یہ کہا گیا ہے کہ بہشت پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

وسارعوٓا الیٰ مغفرة من ربکم وجنة عرضها السموت والارض اعدت للمتقین۔

یہ بات واضح ہے کہ آگے بڑھنے کے لئے بھی تیزی کی ضرورت ہوتی ہے اور پرہیزگار بھی وہی ہیں جو خدا اور اس کے رسولوں پر حقیقی ایمان رکھتے ہیں کیونکہ تقویٰ بھی ایمان کا ہی اثر ہے، "سما" بھی جنس اور عمومیت کے معنی کا حامل ہے جو تمام آسمانوں کو شامل ہے، پس دونوں آیات ایک ہی حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔

یہاں پر مفسرین کے سامنے ایک اور سوال بھی آیا ہے وہ یہ کہ اگر بہشت کی وسعت تمام آسمانوں اور زمین کی وسعت کے برابر ہے تو دوزخ کے لئے تو کوئی جگہ باقی نہ رہی؟

اس سوال کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ اس دن یہ کائنات آج کی کائنات سے وسیع تر ہوگی کیونکہ وہ عظیم اور مکمل دنیا ہوگی، اس دن بہشت آج کے آسمانوں اور زمین کے برابر ہوگی، دوزخ اس سے الگ ہوگی کیونکہ وہ دنیا تو اس دنیا سے ہر لحاظ سے وسیع تر ہے۔

یہاں اور بھی جواب ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس دنیا میں نور اور ظلمت، نعمت اور عذاب آپس میں مخالف ہیں، لہٰذا طبعی طور پر ایک جگہ پر یہ دونوں اکٹھے نہیں ہو سکتے، لیکن اُس دنیا میں ان کے درمیان کسی قسم کی مخالفت نہیں، لہٰذا ممکن ہے کہ دونوں ہی پوری دنیا پر چھائے ہوئے ہوں لیکن چونکہ یہ وجود اور ہستی کے دو الگ الگ مرحلے ہیں اس لئے ایک دوسرے کے مزاحم نہیں ہوں گے۔

اس معنی کو ذہن کے قریب کرنے کے لئے یہ سادہ سی مثال پیش کی جا سکتی ہے کہ ممکن ہے کہ ایک بہت خوبصورت، دلنواز اور پیاری آواز ایک ریڈیائی ٹرانسمیشن (RADIO TRANSMISSION) سے کسی خاص میٹر بینڈ کے ذریعے پوری دنیا میں نشر ہو لیکن اسی وقت ہی ایک بہت بری اور بھدی آواز وحشت ناک سازوں سے دوسرے ریڈیائی ٹرانسمیشن سے سنائی دے، ممکن ہے ان دونوں لہروں کی پہنچ پورے کرہ ارض پر حاوی ہو، اس کے باوجود یہ عام لوگوں کے لئے قابل فہم نہیں، جن لوگوں نے اپنے ریڈیو کی سوئی پہلے اسٹیشن پر سیٹ کی ہوگی وہ اس خوبصورت نغمے سے لطف اندوز ہوں گے اور جنہوں نے دوسرا اسٹیشن لگایا ہوا ہوگا وہ عذاب اور ناراحتی کا شکار ہوں گے، پہلے لوگ گویا بہشت میں ہیں اور دوسری طرح کے لوگ گویا جہنم میں۔

اس گفتگو کی تفصیل انشاء اللہ آگے جلد آئے گی۔

تیسری آیت میں بہشت کی عظمت سے متعلق ایک بہت معنی خیز اور سربستہ تعبیر آئی ہے، رسول اللہؐ کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: واذا رایت ثم رایت نعیما وملکا کبیرا۔[1]

''جب تم وہاں دیکھو گے تو تم بہت بڑی نعمتیں اور مملکت دیکھو گے۔''

''ملک کبیر'' کی تفسیر میں بہت کچھ کہا گیا ہے، ان تفسیروں کا اصلی محور دو باتیں ہیں:

۱۔ بعض مفسرین نے ''ملک کبیر'' کو بہشت، اس کے مکانات، محلات اور باغات کی وسعت کی طرف اشارہ قرار دیا ہے، ایک تفسیر میں یوں آیا ہے:

بہشت کے سب سے نچلے افراد کی مملکت کی حدود بھی اتنی وسیع ہیں کہ جب ان کو دیکھو تو ہزار سال کے راستے جتنا فاصلہ نظر آئے گا، بعض احادیث میں دو ہزار سال کے فاصلے جتنا ذکر ہوا ہے[2]

۲۔ بعض مفسرین نے اسے بہشت کے معنوی مقام کی بلندی اور اہل بہشت کے مقامات کی عظمت کی طرف اشارہ سمجھا ہے اُن کی عظمت ایک یہ ہوگی کہ فرشتے ان کی اجازت کے بغیر ان کے پاس نہیں آسکیں گے وہ ہمیشہ انہیں سلام کریں گے، یا یہ کہ وہاں پر فنا اور زوال نہیں ہوگا، یا یہ کہ اُن میں سے ہر ایک کے لئے ستر دربان ہوں گے۔[3]

بعض نے ملک کا معنی ''مالکیت'' اور بعض نے ''حاکمیت'' بھی کیا ہے۔

بعض مفسرین نے ''ملک کبیر'' کو ''قرب الی اللہ'' اور اس کے جلال و جمال کے معنوی مشاہدے کے معنی میں لیا ہے (ان تمام معانی کو باہم جمع کرنا بھی ممکن ہے کیونکہ ان کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے)

ان آیات سے مجموعی طور پر جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جیسا کہ جنت کی نعمات اہمیت تنوع اور رنگا رنگ ہونے کے اعتبار سے نا قابل بیان ہیں اس طرح اس کی عظمت اور وسعت بھی نا قابل بیان ہے، اس سلسلے میں جتنی گفتگو بھی کی جائے پھر بھی اس کی حقیقی تصویر کشی نہیں ہوسکتی۔

---

[1] ''ثم'' یہاں پر ''ظرف مکان'' ہے اور ''رأیت'' فعل لازم ہے، لہٰذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ: جب تم وہاں دیکھو گے تو فراوان نعمات اور ایک عظیم مملکت کو دیکھو گے،'' ایک دوسری تفسیر کے مطابق ''رأیت'' فعل متعدی ہے اور ''ثم'' دور کے لئے اسم اشارہ ہے اور مفعول بہ ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہوگا ''واذا رأیت المکان ایت نعیما وملکا کبیرا''

[2] تفسیر ابوالفتوح رازی۔ ج ۱۱ ص ۳۵۲، قرطبی۔ ج ۱۰ ص ۶۹۲۹، روح المعانی۔ ج ۲۹ ص ۱۶۱۔ مجمع البیان۔ ج ۹، ۱۰۔ ص ۴۱۱

[3] تفسیر برہان۔ ج ۴ ص ۴۱۵ تفسیر مجمع البیان۔ ج ۹، ۱۰۔ ص ۴۱۴

(۴) کیا بہشت بنائی جا چکی ہے؟

اشارہ:

وعدہ الٰہی تو حق ہے، وعدہ خلافی کا تو اصلاً امکان ہی نہیں ہے، مومنین کو جن انعامات اور مجرمین کو جس عذاب اور سزا کا وعدہ سنایا گیا ہے وہ یقینی طور پر پورا ہوگا کیونکہ وعدہ خلافی یا کمزوری اور عجز و ناتوانی کی وجہ سے ہوتی ہے یا جہالت اور نادانی یا پشیمانی کی وجہ سے، ان چیزوں کا یقینی طور پر اس کی ذات پاک کے متعلق تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اسی لئے سب لوگ اس کے انعام کے وعدے پر خوش اور سزا کے وعدے پر خوف زدہ ہو سکتے ہیں، اس کے باوجود قرآن اس بات پر بہت تاکید کرتا ہے کہ بہشت اور جہنم اب بھی موجود ہیں، یہ مستحق لوگوں کے لئے بالکل تیار ہیں۔ مختلف احادیث سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسانوں کے نیک اعمال بہشت بناتے ہیں، یہ بھی اس بات پر دلیل ہے کہ بہشت اب بھی موجود ہے یہ تاکید اس لئے ہے تاکہ جزاء اور سزا کا موضوع زیادہ جاگزیں ہو جائے، نیک لوگ اپنے اعمال کی جزاء اپنے ساتھ محسوس کریں اور برے لوگ بھی سزا کی سختی کو محسوس کرنا شروع کر دیں۔

اس مختصر سے اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اور اس سلسلے میں آنے والی آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

۱۔ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۱۳۳

[۱] آل عمران: ۱۳۳

۲۔ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (الحدید: ۲۱)

۳۔ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۲۴

[۲] البقرة: ۲٤

۴۔ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۱۳۱ ﴿آل عمران: ۱۳۱﴾

۵۔ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى

(النجم: ۱۳ تا ۱۵)

۶۔ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۵۴

[۳] العنكبوت: ٥٤

۷۔ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ یَّصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ (انفطار: ۱۳ تا ۱۶)

۸۔ کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِیْمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَیْنَ الْیَقِیْنِ (التکاثر: ۵ تا ۷)

ترجمہ

۱۔ بہشت جس کی وسعت آسمان اور زمین ہیں، جو متقین کے لئے تیار کی گئی ہے۔

۲۔ وہ بہشت جس کی وسعت آسمان اور زمین جتنی ہے ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔

۳۔ اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن لوگ (گنہگار) اور پتھر ہیں وہ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

۴۔ اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

۵۔ دوبارہ (رسول اللہؐ) نے اُسے دیکھا، سدرۃ المنتہٰی کے نزدیک جنۃ الماوے وہاں پر ہے۔

۶۔ یہ لوگ آپ سے عذاب کے جلدی آنے کا تقاضا کرتے ہیں جب کہ جہنم تو کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔

۷۔ یقینا نیک لوگ بہت نعمات میں ہیں اور برے لوگ جہنم میں۔ روز جزا کو اس میں داخل ہوں گے اور جلیں گے وہ کسی وقت بھی اس سے غائب اور دور نہیں ہیں۔

۸۔ جیسے تم خیال کرتے ہو ویسے نہیں ہے، اگر تم ''علم الیقین'' رکھتے ہوتے تو یقینا جہنم کو دیکھتے، پھر تم لوگ ''عین الیقین'' کے ساتھ اُسے دیکھو گے۔

تفسیر

پرہیزگاروں کے لئے تیار:

پہلی اور دوسری آیت میں بہشت کی وسعت اور عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی وسعت تمام آسمانوں اور زمین

کے برابر ہے، اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ''اعدت للمتقین '' یہ پرہیز گاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

بہت سے مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں یہ بات صراحت سے بیان کی ہے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہشت اب بھی تیار اور موجود ہے۔[1]

قابل توجہ یہ ہے کہ قرطبی زیرنظر آیت کے ذیل میں کہتا ہے:

علمائے اسلام کی اکثریت کا یہ عقیدہ ہے کہ بہشت اب بھی موجود ہے اور خلق کی جا چکی ہے، ''معراج'' سے متعلق صریح روایات اور دوسری روایات جو ''صحیحین'' وغیرہ میں آئی ہیں وہ بھی اسی بات کی تائید کرتی ہیں، اگر چہ معتزلہ نے اس نظریے کو قبول نہیں کیا، ان کا یہ خیال ہے کہ اس دنیا کے ختم ہونے کے بعد اُسے پیدا کیا جائے گا کیونکہ وہ جزاء اور بدلہ دینے کی دنیا ہے، اور یہ تکلیف اور ذمہ داری کی دنیا ہے، یہ دونوں آپس میں اکٹھے نہیں ہو سکتے[2]

البتہ معتزلہ کی یہ دلیل ایک مغالطہ ہے کیونکہ گفتگو تو بہشت کے اس وقت موجود ہونے کے بارے میں ہے نہ کہ بہشت میں داخلے سے متعلق۔

تیسری اور چوتھی آیت میں ''دوزخ'' کے ابھی موجود ہونے کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

"فاتقوا النار التی وقودها الناس والحجارۃ۔ اعدت للکفرین" اُس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

یہ آیات بھی ایک دہکتی ہوئی جہنم کی ابھی موجودگی کا پتہ دے رہی ہیں، بعض مفسرین نے بھی اسی بات کی تصریح کی ہے، جو تفسیر کی گئی ہے کہ ''اعدت'' (تیار کی گئی ہے) کی تعبیر اگر چہ فعل ماضی ہے لیکن یہ مستقبل کا معنی دیتی ہے کیونکہ کبھی یقینی مستقبل کے لئے فعل ماضی کی تعبیر لے آتے ہیں، یہ تفسیر آیت کے ظاہر کے خلاف ہے اور ایسی تفسیر کے لئے کسی قرینے اور موید کی ضرورت ہوتی ہے۔

پانچویں آیت نبی رحمتؐ کی معراج کا واقعہ بیان کرتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''ولقد راہ نزلة اخری۔ عند سدرة المنتھی۔ عندھا جنة الماوی ''رسول اللہؐ نے اُسے دوبارہ دیکھا، سدرۃ المنتہیٰ (ایک بہت سائے اور پتوں والا درخت ہے آسمان کی بلندیوں تک) کے پاس، اس کے قریب ہی جنۃ الماویٰ اور بہشت ہے۔

کیا ''جنة الماوی '' سے مراد برزخ والا بہشت ہے یا وہ بہشت جو دائمی اور ہمیشہ رہنے والا ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے

---

[1] مجمع البیان، ج ۲ ص ۵۰۴۔ فخر رازی، ج ۹ ص ۴۔ روح البیان، ج ۲ ص ۹۴۔ ابوالفتوح رازی، ج ۳ ص ۱۸۸۔ قرطبی، ج ۲ ص ۱۴۶، روح المعانی، ج ۴ ص ۵۱۔ المنار، ج ۴ ص ۱۳۲

[2] قرطبی، ج ۲ ص ۱۴۴۷

درمیان اختلاف ہے، ممکن ہے ''ماوٰی '' کی تعبیر سے دائمی بہشت کا تصور ذہن میں آئے، اگرچہ اس بہشت کے بعض آسمانوں پر ہونے سے برزخ والی بہشت ذہن میں آتی ہے کیونکہ جاوداں بہشت تو پوری زمین اور آسمانوں کی وسعت کے برابر ہوگی۔

اس آیت سے بہشت کے پہلے سے موجود ہونے پر استدلال کرنا صرف پہلی تفسیر کے مطابق ہی درست ہے، بعض مفسرین نے بھی اسی تفسیر کا انتخاب کیا ہے، مثلاً ''طبرسی'' نے ''مجمع البیان ''میں اور علامہ ''طباطبائی'' نے ''المیز ان'' میں۔

بعد والی آیت میں جہنم کے کافروں پر چھائے ہونے کے متعلق گفتگو ہے یہ اُن کی اُس ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے جس کا وہ مظاہرہ کرتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے: ''يستعجلونك بالعذاب وان جهنم محيطة بالكفرين'' وہ تجھ سے عذاب کی جلدی کا تقاضا کرتے ہیں جب کہ جہنم تو اس وقت بھی کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔

انہوں نے اپنے گناہ، ظلم وستم اور شرک کی وجہ سے نہ فقط اس دنیا کو اپنے لئے جہنم بنالیا ہے بلکہ آخرت کی جہنم بھی اب ہی ان کو گھیرے ہوئے ہے، بالخصوص اس بات کے پیش نظر کہ آیت کی ابتدا میں کافروں کی جلدی سے متعلق گفتگو کی گئی ہے، اس لئے مناسب یہی تھا کہ ان سے کہا جائے! اتنی جلدی کیوں کرتے ہو؟ تم اب بھی دوزخ میں ہی ہو، البتہ اس دنیا کے پردوں اور حجابوں نے تمہیں اس کے بلا واسطہ اثر سے محفوظ رکھا ہوا ہے، لیکن قیامت کے دن جب یہ پردے ہٹا دیئے جائیں گے تو اس وقت اپنی آنکھوں سے اس گھیراؤ کو دیکھ لوگے۔[1]

آیت کی تفسیر کے سلسلے میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ آیت قیامت سے متعلق ہے اور اس کے بعد والی آیت جو کہتی ہے ''يوم يغشهم العذاب من فوقهم'' یہ جہنم کے گھیرا کرنے کے لئے قید کے طور پر ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہ یہ آیت ایک یقینی اور قطعی مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ عربی ادب میں یقینی مستقبل (مضارع محقق الوقوع) کو کبھی تو حال اور کبھی ماضی کی صورت میں بھی بیان کیا جاتا ہے۔

لیکن سورہ انفطار کی آیات سے پہلی تفسیر کی تائید کے لئے مدد لی جا سکتی ہے، اُن میں یوں ارشاد ہوتا ہے: ''ان الابرار لفي نعيم۔ وان الفجار لفي جحيم۔ يصلونها يوم الدين۔ وما هم عنها بغآئبين'' یقینا نیک لوگ (بہشت) کی نعمات میں ہیں، اور برے دوزخ میں، جزاء کے دن اس میں جلیں گے، وہ یقینا اس سے دور نہیں ہیں۔

یہ تعبیر بھی بتاتی ہے کہ ''صلی'' (آگ میں جلنا) قیامت کے دن ہے، لیکن اب بھی دوزخ نے برے لوگوں کو گھیرے میں لیا ہوا ہے اگرچہ اس دنیا میں اُن کے جلنے سے کچھ پردے حائل ہیں، بالخصوص ''وما هم عنها بغائبين'' کا جملہ پھر دوبارہ بھی اسی معنی پر تاکید کرتا ہے۔ (ذرا غور کیجئے گا)

آخری آیت میں قیامت کا انکار کرنے والے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے ''كلا لو تعلمون علم اليقين۔ لترون الجحيم'' جیسے تم سوچتے ہو اس طرح نہیں ہے، اگر تم علم الیقین رکھتے ہوتے تو دوزخ کو یقینا دیکھتے۔

---

[1] علامہ شعرانی مرحوم نے تفسیر ابوالفتوح رازی، ج۹ ص ۳۰ کے حاشیے پر اسی معنی کو اختیار کیا ہے

اس کے بعد دوبارہ ارشاد ہوتا ہے: ''ثم لترونها عین الیقین ''پھر (قیامت میں) اسے عین الیقین کے ساتھ دیکھو گے۔

اگر آیت کا ظاہری معنی ہی کریں (یعنی''لو'' شرط کے لئے ہو اور لترون الجحیم''اس کی جزاء ہو) تو مفہوم یہ ہو گا:''علم الیقین'' کے حامل لوگ اسی دنیا میں ہی جہنم کو دیکھ لیتے ہیں، اس کا لازمہ یہ ہے کہ دوزخ اب بھی موجود ہے۔

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں ایک طوفان وغوغا بلند کیا ہوا ہے، ہر کسی نے ایک الگ راہ اختیار کی ہے، گویا بیشتر اس بات کو ہضم نہیں کر سکے کہ ممکن ہے یہ آیات اس دنیا میں ہی شہود دوزخ کی طرف اشارہ ہوں، اس کے بعد آخرت میں بھی اس کا مشاہدہ ہوگا۔

ایک طرف تو وہ یہ دیکھتے ہیں کہ آیت کو صرف آخرت میں منحصر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تمام کافر اور مجرم قیامت کے دن درزخ دیکھیں گے اس کے لئے شرط کی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا بعض مفسرین نے یہ نظریہ اپنا لیا ہے کہ شرط کی جزاء یہاں پر محذوف ہے، بلکہ فخر رازی نے تو اس بات پر مفسرین کے اتفاق کا دعویٰ کیا ہے۔[1]

لیکن یہ بات یقنی طور پر مبالغہ ہے ایسا نہیں ہے کہ اس موضوع پر اتفاق رائے ہو۔

بہر حال انہوں نے آیت کا مفہوم یہ بیان کیا ہے:''لو تعلمون علم الیقین لما الھا کم التکاثر ''اگر تم علم الیقین رکھتے ہوتے تو ایک دوسرے پر فخر ومباہات تمہیں اپنے آپ میں مصروف نہ کر لیتا اور تمہیں خدا اور قیامت سے غافل نہ کر دیتا۔[2]

بعض دوسرے مفسرین جن کے نزدیک جزا کا حذف کرنا درست نہیں ہے، انہوں نے اس دیکھنے اور مشاہدے کو دل اور علم کے ساتھ دیکھنے کے معنی میں لیا ہے، اس تفسیر کے مطابق آیت کا معنیٰ یہ ہوگا! اگر تم علم الیقین رکھتے ہوتے تو دوزخ پر ایمان لے آتے۔

یہ بات واضح ہے کہ پہلی اور دوسری دونوں تفسیریں آیت کے ظاہر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں کیونکہ جزاء کا محذوف ہونا بھی قواعد کے مخالف ہے اور اسی طرح رویت کو علم کے معنی میں لینا بھی خلاف قاعدہ ہے۔[3]

لہٰذا اگر آیت کو واضح طور پر، بغیر کچھ حذف کئے معنی کریں اور اسی طرح اس کے الفاظ کا حقیقی معنیٰ کریں تو نتیجہ وہی تفسیر نکلے گی جو ہم نے پہلے بیان کی ہے، بعض مفسرین نے بھی اسے قبول کیا ہے اگر چہ ایک احتمال کے طور پر۔

اسلامی احادیث میں بہت سی واضح عبارات ہیں جو اس تفسیر سے ہم آہنگ ہیں! مثلاً اس مومن نوجوان کا واقعہ جو کہ اصول کافی میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے، امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

ایک دن رسول اسلامؐ نے صبح کی نماز لوگوں کے ساتھ پڑھی، اچانک آپؐ کی نظر ایک ایسے نوجوان پر پڑی جو مسجد میں خواب آلود

---

[1] فخر رازی، ف ۳۲ ص ۷۸

[2] مجمع البیان، ج ۱۰ ص ۵۳۰

[3] البتہ رویت (دیکھنا) علم کے معنی میں آتا ہے، لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب اس کے لئے دو مفعول ذکر کئے جائیں، آیت میں بھی ایسا نہیں ہے اس بات کی بھی توجہ رہے کہ بعد والی آیت''ثم لترونھا عین الیقین ''قیامت کی طرف اشارہ ہو سکتی ہے

حالت میں پڑا ہوا تھا، اُس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا، بدن کمزور اور لاغر دکھائی دے رہا تھا، آپ نے اُس کا نام لیا اور فرمایا:

اے جوان کیسے ہو؟

اس نے عرض کی!

میں نے یقین کی حالت میں صبح کی ہے!

پیغمبرؐ (اس بات سے خوش ہوئے اور) فرمایا:

یقین کی کچھ علامات ہوتی ہیں، تیرے یقین کی نشانی کیا ہے؟

اُس نے عرض کی!

اے خدا کے رسولؐ! میرا یقین وہی ہے جس نے مجھے بہت غمگین کر دیا ہے، راتوں کو مجھے عبادت میں مصروف رکھتا ہے، دنوں کو روزے میں، دنیا اور اس کی تمام چیزوں سے اس نے مجھے بے نیاز کر دیا ہے، گویا میں خدا کے عرش کو دیکھ رہا ہوں! میدان محشر برپا ہے! لوگ حساب کے لئے اُٹھ اُٹھ کر آ رہے ہیں، میں بھی اُن کے درمیان ہوں! گویا میں بہشت کو دیکھ رہا ہوں جس کے رہنے والے نعمتوں میں ہیں، وہ تختوں پر ٹیک لگائے بیٹھے ہیں!

گویا میں اہل جہنم کو بھی دیکھ رہا ہوں، وہ آگ میں جل رہے ہیں اور چیخ و پکار کر رہے ہیں! گویا میں ابھی جہنم کی شعلہ ور آگ کی آواز سن رہا ہوں یہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

رسول اللہؐ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا:

هذا عبد نور الله قلبه بالا يمان

اس بندے کا دل خدا نے نور ایمان سے روشن کر دیا ہے۔

پھر آپؐ نے اس سے فرمایا:

الزم ما آنت عليه

جس حالت پر اب ہو اس پر باقی رہو اور اس کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔

اس نوجوان نے عرض کی:

ادع الله لى يا رسول الله ان ارزق الشهادة معك

یارسول اللہؐ! میرے لئے خدا سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے آپ کی ہمراہی میں شہادت کا درجہ عطا فرمائے:

پیغمبرؐ نے اس کے حق میں دعا فرمائی۔

چند دنوں کے بعد ہی وہ پیغمبر اسلامؐ کے ہمراہ ایک جنگ پر گیا اور نومسلمانوں کے شہید ہونے کے بعد شہید ہو گیا اور اپنی آرزو پالی۔ [1]

''کانی الا ان اسمع زفیر النار یدور فی مسامعی ''(گویا میں ابھی سن رہا ہوں کہ جہنم کی آگ کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے) کا جملہ بھی اسی بات پر دلیل ہے کہ دوزخ اب بھی موجود ہے، ایمان جب شہود کی منزل پر پہنچ جائے تو اُسے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات سے مجموعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بہشت اور جہنم اب بھی موجود ہیں اگر ان آیات میں سے بعض کی دلالت میں کوئی تردد ہو تو پھر بھی سب کو ملا کر مجموعی طور پر کوئی تردد باقی نہیں رہتا، بالخصوص ان آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے جن میں اعدت (تیار کی گئی ہے) کی تعبیر ہے۔

توضیحات

ا۔ جنت اور جہنم کی موجودگی کے متعلق مسلم علماء کے نظریات:

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے مسلمان علماء کی اکثریت کا یہ نظریہ ہے کہ بہشت اور دوزخ اب بھی موجود ہیں، اس عقیدے کے اثبات کے لئے بعض گذشتہ آیات سے استدلال بھی کیا گیا ہے، لیکن بعض قدیم متکلمین جیسے ابوہاشم اور عبدالجبار کا نظریہ یہ ہے کہ بہشت اور دوزخ ابھی موجود نہیں ہیں، بلکہ انہیں بعد میں پیدا کیا جائے گا، انہوں نے اپنے نظرئے کے ثبوت کے لئے اس آیت کو پیش کیا ہے:

"کل شیءٍ ھالك الا وجھه"

اس کی ذات کے علاوہ ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ (قصص:۸۸)

انہوں نے یوں استدلال کیا ہے کہ اگر وہ اب موجود ہوں تو اس دنیا کے خاتمے پر وہ بھی فنا ہو جائیں گی اس صورت میں یہ ایک اور آیت کے ساتھ جو یہ کہتی ہے''اکلھا دائم''[2] بہشت کے میوے دائمی اور جاوداں ہیں) سے متضاد ہو جائے گی۔

علامہ حلی مرحوم نے اس استدلال کا جواب یوں دیا ہے کہ آیت میں جو''ہلاک اور فنا'' آیا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اُن چیزوں میں فائدہ پہنچانے کی صلاحیت ختم ہو جائے گی اور یہ بات قطعی ہے کہ جب انسان اور باقی مخلوقات فنا ہو جائیں گی تو بہشت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکے گا۔

---

[1] اصول کافی، ج ۲ ص ۵۳، باب حقیقة الایمان حدیث ۲ (کچھ اختصار کے ساتھ)

[2] رعد۔ ۳۵

اس سوال کا جواب اور بھی دیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ بہشت اور دوزخ اس دنیا میں ظاہری طور پر موجود نہیں ہیں بلکہ اس دنیا کے باطن میں وہ پوشیدہ ہیں جب کہ فنا اور ہلاکت اس دنیا کے ظاہر سے مربوط ہیں (اس سلسلے کی زیادہ وضاحت آئندہ آئے گی)۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ''کل شيءٍ هالك الا وجهه'' کی آیت یہ کہتی ہے کہ خدا اور وہ چیز جو کسی مادی عامل کے بغیر خدا کی عنایت سے خلق ہوتی ہے وہ جاودانی ہوگی۔ ''وجه الله'' کا کلمہ ان تمام پر محیط ہے جس میں بہشت اور دوزخ بھی ہیں، جو کچھ فانی اور ہلاک ہونا ہے وہ یہ مادی دنیا ہے جو مادی عوامل کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔ (غور کیجئے گا)۔

۲۔ احادیث اور بہشت و دوزخ کی موجودگی

بہت سی احادیث بھی اس بات کی تائید اور تاکید کرتی ہیں کہ بہشت اور جہنم اب بھی موجود ہیں، حضرت امام علی بن موسیٰ الرضاؑ سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے کہ آپ کے ایک صحابی نے آپؑ سے بہشت اور دوزخ کے متعلق پوچھا کہ کیا وہ پیدا کی جا چکی ہیں یا نہیں؟ امام نے فرمایا:

وان رسول الله قد دخل الجنة ورای النار لما عرج به الیٰ السمآء

ہاں! وہ پیدا ہو چکی ہیں! پیغمبرؐ معراج کے وقت بہشت میں گئے تھے اور دوزخ کو بھی دیکھا تھا۔

راوی کہتا ہے میں نے عرض کی: بعض لوگ کہتے ہیں وہ ابھی پیدا نہیں کی گئیں، امامؑ نے فرمایا:

مآ أُولٓئك منا ولا نحن منهم ، من انكر خلق الجنة والنار فقد كذاب النبی و كذبنا....

وہ ہم میں سے نہیں ہیں اور ہم اُن میں سے نہیں ہیں! جو بہشت اور درزخ کی خلقت کا انکار کرے اُس نے رسول اللہؐ کو جھٹلایا ہے اور ہمیں بھی جھٹلایا ہے۔[1]

نبیؐ کی معراج سے متعلق بہت سی روایات میں بہشت اور جہنم کے خلق شدہ ہونے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

حقیقت میں یہ اس بات کی تاکید ہیں جو ہم نے مذکورہ بالا آیات میں بیان کی ہے، قرآن نے سورہ نجم میں نبی اکرمؐ کی معراج کی طرف اشارہ کیا ہے، تفسیر علی بن ابراہیم میں ''ولقد راه نزلت عند سدرة المنتهیٰ'' کی آیت کی تشریح یوں کی گئی ہے۔

واما الرد علیٰ من انكر خلق الجنة والنار فقوله عندها جنة الماوی ای عند سدرة المنتهیٰ فسدرة المنتهیٰ فی السمآء السابعة وجنة الماوی

[1] بحار الانوار، ج ۸ ص ۱۱۹، حدیث ٦

عندھا۔

جو بہشت اور دوزخ کی تخلیق کا انکار کرتے ہیں ان کا جواب ''عند ھا جنة الماوی'' کی آیت ہے یعنی سدرة المنتہیٰ جو کہ ساتویں آسمان میں ہے، کے پاس دائمی بہشت ہے [1]

حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی ولادت باسعادت سے متعلق جو روایات شیعہ اور اہل سنت کی کتابوں میں آئی ہیں وہ بھی اسی معنی تائید کرتی ہیں، وہ روایات یوں ہیں!

پیغمبر اسلامؐ معراج کی رات بہشت میں گئے، آپؐ نے بہشتی درختوں کا پھل کھایا، اُسی پھل سے جناب فاطمہ زہراؑ کا نطفہ قرار پایا، لہٰذا پیغمبرؐ انہیں چومتے تھے اور کہتے تھے ''اس سے جنت کی خوشبو آتی ہے'' [2]

سورہ آل عمران کی آیت ۳۷-------- كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ۔ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ---------جب بھی زکریاؑ مریمؑ کے محراب میں آتے تو وہاں پر ایک مخصوص کھانا دیکھتے---------اور جب وہ پوچھتے کہ یہ کہاں سے لائی ہو تو وہ کہتیں کہ خدا کی طرف سے ہے۔

اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں بہت سی شیعہ اور سنی کتب میں یوں آیا ہے کہ یہ کھانا جنت کے پھل ہوتے تھے جن کا موسم نہیں ہوتا تھا، لیکن خدا یہ مریمؑ کو عطا کرتا۔ [3]

حضرت فاطمہ زہراؑ کے متعلق بھی روایات میں ہے کہ خدا بہشتی کھانے اُن کے لئے بھیجتا، پیغمبر اسلامؐ حضرت علیؑ اور آنحضرتؐ کی بعض بیویاں اور ہمسائے انہیں کھاتے، پیغمبرؐ انہیں مریمؑ کے واقعے کے ساتھ تشبیہ دیتے اور فرماتے:

الحمد الله الذی جعلك شبيهة بسيدة نسآء بنی اسرآئيل!

میں اُس خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے تمہیں بنی اسرائیل کی عورتوں کی سردار حضرت مریمؑ جیسا قرار دیا۔ [4]

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم، ج ۲ ص ۳۳۸

[2] اس حدیث کے مضمون کو شیعہ کتب کے علاوہ بہت سی اہل سنت کتب میں بھی ذکر کیا گیا ہے، مثلا ذخائر العقبیٰ ص ۳۶،ص ۴۴ ''مستدرک الصحیحن'' ج ۶ ص ۱۵۶، الدرالمنثور سیوطی آیہ ''سبحان الذی اسری بعبدہ'' کی تفسیر کے ذیل میں -----اور دوسری بہت سی کتب میں)۔

[3] تفسیر عیاشی، تفسیر برہان، نور الثقلین، درالمنثور، سورہ آل عمران آیت ۳۷ کے ذیل ہیں)۔

[4] اس حدیث کو زمخشری نے کشاف میں، سیوطی نے درالمنثور میں (آل عمران۔ ۳۷) کے ذیل میں، اسی طرح ثعلبی نے قصص الانبیاء ص ۵۱۳ پر ذکر کیا ہے

ممکن ہے یہ بات کہی جائے کہ یہ تو برزخ والی بہشت سے متعلق ہیں، وہی جنت جس میں شہداء کی روحیں شہادت کے بعد اور قیامت سے پہلے ٹھہریں گی، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ برزخ والی بہشت مادی نہیں بلکہ وہ ''مثالی'' پہلو کی حامل ہے، ارواح مثالی شکلوں میں اس بہشت کی نعمت سے فائدہ اٹھائیں گے، لہٰذا وہ بہشت جو مادی اور عنصری پہلو نہیں رکھتی اُس کے پھل اور کھانے اس مادی جسم کے کام یقیناً نہیں آسکتے، بلکہ یہ تو ایک لحاظ سے اس خواب کی طرح ہوگی جسے انسان دیکھتا ہے اور لطف اندوز ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں متعدد روایات میں بھی یہ ہے کہ بہشت اب بھی تشکیل پا رہی ہے، اُس کی وسعت انسانوں کے اعمال کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی ہے، بعض اعمال تو جنت میں نئے درخت لگنے کا موجب بنتے ہیں، اس طرح کی روایات صرف اس وقت ہی بامعنی ہوسکتی ہیں جب بہشت اب بھی موجود ہو، چند سبق آموز احادیث ملاحظہ کریں۔

۱۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے پیغمبر اسلامؐ سے روایت کی ہے!

معراج کی رات ابراہیم خلیل اللہ میرے پاس سے گزرے اور فرمایا:

مر امتك ان يكثروا من غرس الجنة، فان ارضها واسعة، وتربتها طيبة قلت، وما غرس الجنة؟ قال: لا حول ولا قوة الا بالله۔

اپنی امت کو یہ حکم دو کہ وہ بہشت میں زیادہ درخت لگائیں کیونکہ اس کی زمین وسیع، مٹی پاک اور زرخیز ہے!

میں نے کہا:

بہشت میں کیسے درخت لگائے جاتے ہیں؟

انہوں نے کہا:

یہ ذکر کرنا!

لا حول ولا قوة الا بالله [۱]

۲۔ پیغمبر رحمتؐ کی ہی ایک اور حدیث ہے:

من قال لا اله الا الله غرست له شجرة فی الجنة

جو بھی ''لا الہ الا اللہ'' کہے اس کے لئے بہشت میں ایک درخت لگا دیا جاتا ہے۔ [۲]

۳۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے اپنے آباؤ اجداد سے اور انہوں نے نبی اکرمؐ سے یہ روایت کی ہے:

---

[۱] بحار الانوار، ج ۸ ص ۱۴۹ (حدیث ۸۳)

[۲] یہ حدیث بہت سی کتابوں میں ذکر ہوئی ہے جیسے محاسن، ثواب الاعمال، بحار الانوار، اصول کافی ج ۲ ص ۵۱۷، حدیث ۲)

من قال سبحان الله، غرس الله له بها شجرة فی الجنة

من قال الحمد لله، غرس الله له بها شجرة فی الجنة

من قال لا اله الا الله، غرس الله له بها شجرة فی الجنة

من قال الله اکبر، غرس الله له بها شجرة فی الجنة

جو ''سبحان اللہ'' کہے خدا اس کے لئے جنت میں ایک درخت لگا دیتا ہے۔

جو ''الحمد للہ'' کہے خدا اس کے لئے جنت میں ایک درخت لگا دیتا ہے۔

جو ''لا الہ الا اللہ'' کہے خدا اس کے لئے جنت میں ایک درخت لگا دیتا ہے۔

جو ''اللہ اکبر'' کہے خدا اس کے لئے جنت میں ایک درخت لگا دیتا ہے۔

قریش کا ایک آدمی وہاں بیٹھا تھا، اُس نے عرض کی! یارسول اللہ! اس طرح جنت میں ہمارے لئے بہت درخت ہیں۔

آپؐ نے جواب میں فرمایا:

نعم، ولکن ایاکم ان ترسلوا علیها نیرانا فتحرقوها

ہاں! لیکن اس بات سے بچو کہ کہیں اُن کی طرف آگ نہ بھیج دینا جو انہیں جلا ڈالے۔[1]

۴۔ پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں اس سلسلے میں بڑی خوبصورت تعبیر آئی ہے، آپ نے فرمایا:

جب میں معراج پر گیا تو بہشت میں گیا، وہاں میں نے ایسے فرشتے دیکھے جو محلات تعمیر کر رہے تھے، کبھی وہ رک جاتے، میں نے اُن سے اس کی وجہ دریافت کی، انہوں نے کہا کہ ہم سامان تعمیر کا انتظار کر رہے ہیں میں نے پوچھا! وہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا:

''سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اکبر'' کا ذکر جو مومن کرتا ہے، جب وہ یہ ذکر کرتا ہے تو ہم محل بناتے رہتے ہیں اور جب وہ رک جاتا ہے تو ہم بھی اپنے ہاتھ روک لیتے ہیں۔[2]

گفتگو کے اس سلسلے کو علامہ مجلسی کی بات پر ختم کرتے ہیں، انہوں نے ''بحار الانوار'' میں جنت اور جہنم سے متعلق احادیث کے ذیل میں یوں کہا ہے:

اس بات کو جان لو کہ بہشت اور دوزخ پر اس طرح بلا تاویل ایمان رکھنا جیسا کہ آیات اور روایات میں آیا ہے، دین کی

---

[1] بحار الانوار۔ج۸ ص۱۸۶، حدیث ۱۵۴)

[2] بحار الانوار۔ج۱۸ ص۴۰۷، حدیث۸ (کچھ اختصار کے ساتھ)

ضروریات میں سے ہے۔

۔۔۔۔البتہ یہ کہ آیا وہ اب بھی پیدا ہو چکی ہیں یا نہیں اس سلسلے میں اکثر علمائے اسلام کا یہ نظریہ ہے کہ وہ اب بھی موجود ہیں، صرف چند معتزلی علماء نے اس کا انکار کیا ہے، آیات اور تواتر سے ثابت احادیث ان کی بات کو جھٹلاتی ہیں اور ان کے عقیدے کو جھوٹا ثابت کرتی ہیں، کوئی بھی شیعہ عالم اس غلط نظریے کا قائل نہیں ہے، صرف سید رضی کی طرف اس کی نسبت دی گئی ہے۔[1]

۲۔ دو اعتراض۔۔۔۔۔۔۔اور ان کے جوابات

بہشت اور دوزخ کے ابھی موجود گی کے منکر ممکن ہے عقلی اور نقلی طور پر دو اشکال کریں۔

اشکال عقلی یہ ہے کہ قیامت سے پہلے ان کو پیدا کرنا فضول ہے کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ روز قیامت کے حساب سے پہلے نہ تو کوئی جنت میں داخل ہو سکے گا اور نہ جہنم میں، یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ ہزار سال بعد آنے والے لوگوں کے لئے ہزار سال پہلے ہی گھر بنا دیا جائے، کیا یہ فضول اور بیکار سی بات نہیں ہے؟

اس اعتراض کا جواب بالکل واضح ہے، وہ یہ ہے جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ یہ مسئلہ حد درجہ نفسیاتی اور تربیتی اثرات کا حامل ہے، خدا اس کام کے ذریعے انسان کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ نہ وہ عظیم انعام قرض رہے گا اور نہ ہی وہ بہت بڑی سزا، بلکہ دونوں اب بھی بالکل آمادہ اور تیار ہیں یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ ہم سال کی ابتداء میں ہی انعامات مہیا کر دیں اور کہہ دیں کہ جو طالب علم سال کے آخر میں سب سے زیادہ نمبر لے گا اسے یہ انعامات دئے دیئے جائیں گے، یہاں تک کہ سکول کے دفتر میں یہ طلباء کے سامنے رہیں، یہ کہیں کہ یہ اُن کا انعام ہے جو سال کے دوران سب سے زیادہ محنت کریں یا یہ کہ جیل اور پھانسی کا پھندا قاتلوں اور مجرموں کے لئے پہلے سے تیار کر کے رکھ دیں۔

یہ کام یقینی طور پر نہ فقط یہ کہ فضول نہیں ہے بلکہ حد درجہ موثر بھی ہے، البتہ جنت اور دوزخ اس دنیا کے باشندوں کے لئے چند پردوں کی وجہ سے قابل مشاہدہ نہیں ہیں، لہٰذا خدا اور معصوم وصادق انبیاء کا کہنا بھی اُسی اثر کا حامل ہوگا۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس دنیا کے خاتمے پر ہر چیز فنا ہو جائے گی، خود قرآن کہتا ہے:

کل شیءٍ ھالك الا وجھه

اُس کی ذات پاک کے علاوہ سب چیزوں نے فنا ہو جانا ہے۔

اس اعتراض کے بھی چند جواب دیئے جا سکتے ہیں:

ا۔ ''کل شیءٍ'' سے مراد پوری دنیا ہے اور جو کچھ اس فانی دنیا سے متعلق ہے، لیکن بہشت اور دوزخ کہ جو اُس ابدی دنیا کا ایک حصہ ہیں اُن کے لئے ''فنا یا نابود ہونا'' کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ وہ اس فانی دنیا کی حدود سے باہر ہیں۔

---

[1] بحار الانوار۔ ج ۸ ص ۲۰۵ (حدیث ۶۲ کے ذیل میں)

۲۔ ’’وجه‘‘ (خدا کی ذات پاک) اُن تمام چیزوں کو شامل ہے جو اس عظیم ذات سے منسوب ہیں، چونکہ بہشت اور درزخ بھی اس کی رحمت اور غضب کے دو مظہر ہیں اس لئے یہ بھی ’’وجه‘‘ میں شامل ہیں۔

۳۔ ’’هلاك‘‘ کا معنی ان لوگوں کا نہ ہونا ہے جو اس چیز سے فائدہ اٹھا سکیں، جیسے ایک آبادی کے تمام باشندے مرجائیں اور وہ بغیر کسی مالک کے رہ جائے تو اس ے لئے ’’هلاك‘‘ کی تعبیر استعمال ہوتی ہے۔

۴۔ بہشت کہاں ہے؟

ان دو نکتوں کی طرف توجہ کرنے سے کہ ایک تو یہ کہ بہشت اب بھی موجود ہے (جیسا کہ بہت سی آیات اور روایات سے اس کو ثابت کیا گیا)، دوسرا یہ کہ بہشت کی وسعت آسمان و زمین جتنی ہے (اس سلسلے میں بھی پہلے آیات کو ذکر کیا گیا ہے) مذکورہ بالا سوال پوری طرح سامنے آتا ہے۔

ممکن ہے کوئی یہ سوال کرے کہ اس طرح کی چیز جس کی وسعت پورے آسمان اور زمین جتنی ہے اس وقت کہاں ہے؟ اصولا یہ بات کیسے ممکن ہے کہ اس طرح کی چیز موجود ہو اور ہمارے محسوسات سے باہر ہو۔

بعض لوگوں نے اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ قرآنی آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہشت آسمانوں پر ہے کیونکہ سورہ نجم کی آیت ۱۵ میں نبی اکرمؐ کے آسمانوں پر معراج سے متعلق ہے، ارشاد ہوتا ہے:

’’عندها جنة الماوی‘‘

دائمی بہشت سدرۃ المنتہٰی کے نزدیک ہے۔ (وہی جگہ جو آسمان کی سب سے بلندتر اور برتر جگہ ہے)[1]

بعض لوگوں نے اسے برزخ والی جنت سمجھا ہے، جس میں شہداء کی روحیں ہوں گی، اور بعض نے اس کو حضرت آدمؑ والی جنت سے مربوط سمجھا ہے لیکن یہ دونوں تفسیریں ’’جنة الماویٰ‘‘ کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہیں۔

اسی طرح سورہ ذاریات کی آیت ۲۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

’’وفی السمآء رزقکم وما توعدون‘‘

تمہارا رزق (اور اسی طرح) جس کا تم سے وعدہ کیا جائے گا، آسمان میں ہے۔

بہت سے مفسرین کی یہ رائے ہے کہ ’’ماتوعدون‘‘ سے مراد وہی جاودانی بہشت ہے جس کا وعدہ خدا نے اپنے

---

[1] طبرسی نے مجمع البیان میں فخر رازی نے تفسیر کبیر میں، علامہ طباطبائی نے المیزان میں اور صاحب روح البیان نے اپنی تفسیر میں سورہ ذاریات کی آیت ۲۲ یا سورہ نجم کی آیت ۱۵ کے ذیل میں یا دونوں کے ذیل میں اس معنی کو ذکر کیا ہے)۔

بندوں سے کیا ہے[1] بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ جنت اور دوزخ دونوں کے بارے میں ہے، بعض نے اُسے دنیوی عذاب کی طرف اشارہ قرار دیا ہے جو آسمان سے کافروں اور ظالموں پر نازل ہوتا ہے اور ہوگا (جیسے قوم نوحؑ اور قوم لوطؑ پر نازل ہونے والا عذاب)۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی جاودانی بہشت اس دنیا کے آسمان سے بھی ماروا ہے، اس کی وسعت زمین اور اس دنیا کی وسعت کے برابر یا اس سے بھی زیادہ ہے، کیونکہ اس سے زیادہ کسی وسعت کا تصور نہ تھا جسے قرآن نے بہشت کے متعلق ذکر کیا ہے، اس لحاظ سے وہ موجود بھی ہے اور آسمان پر بھی ہے اور اس کی وسعت بھی زمین اور اس دنیا کے آسمان جتنی ہے۔

بعض نے اس نظریئے پر اعتراض کیا ہے کہ اگر بہشت نویں آسمان سے بھی اوپر ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لا مکان اور لا جہت جگہ پر ہے اور اگر وہ آسمانوں کے طبقات یا ان افلاک میں سے دو فلکوں کے درمیان ہو تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ ایک دوسرے میں داخل ہو یا افلاک ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں، یہ سب باتیں محال اور ناممکن ہیں اور یہ قرآن کی تعبیرات کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں جو یہ کہتا ہے کہ جنت کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ مذکورہ بالا اعتراض بطلیموس کی ہیئت اور افلاک کو تعداد کے لحاظ سے نو سمجھنے کی بنیاد پر ہے، بطلیموس کے نظریئے کے مطابق فلک نو ہیں اور پیاز کے چھلکے کی مانند وہ ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے ہیں، ان کے درمیان ذرا سا فاصلہ بھی نہیں ہے۔

آج جب کہ محکم دلائل کے ساتھ نظریہ رد ہو چکا ہے تو اس طرح کے اعتراضات کی کوئی بنیاد نہیں رہتی، اس میں کسی قسم کا اشکال نہیں کہ ان ثابت اور سیار ستاروں اور کہکشاؤں سے اوپر بھی بہت بڑی دنیا ہو جو ہماری زمین اور آسمان سے کئی گنا وسیع ہو، اس طرح سے مذکورہ بالا آیت کے ساتھ بھی کوئی تضاد نہیں ہوگا، ایک اور نظریہ بعض فلاسفہ کا ہے، انہوں نے بہشت اور جہنم کے مادی ہونے کا انکار کیا ہے، اس نظریئے کے مطابق بہشت کے لئے کسی مادی جگہ اور مکان کی ضرورت نہیں بلکہ حس اور مادہ سے بلند تر ایک عالم اس کا مقام ہے، صدر المتالہین شیرازی اپنی کتاب اسفار میں یہ کہتے ہیں:

جان لو کہ ہر سعادت مند نفس (ذات) کے لئے آخرت کی دنیا میں ایک وسیع ملک ہوگا، ایک ایسا عالم کہ جو تمام زمینوں اور آسمانوں سے عظیم تر اور کشادہ تر ہوگا، لیکن یہ ملک خود اُن کی ذات سے باہر نہیں ہے، بلکہ یہ تمام ملک، خدمت گزار، خادم، باغات، درخت، حور و قصور اور غلمان خود اس کی ذات کے اندر ہیں، اسی سے قائم ہیں، وہ ہی خدا کے حکم اور اذن سے انہیں ایجاد کرنے والا ہے۔

پھر وہ کہتے ہیں:

اُس دنیا کی چیزوں کا وجود اگرچہ اُن صورتوں کے ساتھ ملتا جلتا ہے جو انسان خواب یا آئینے میں دیکھتا ہے، لیکن ذاتاً یا حقیقتاً اُن سے

---

[1] طبرسی نے مجمع البیان میں فخر رازی نے تفسیر کبیر میں، علامہ طباطبائی نے المیزان میں اور صاحب روح البیان نے اپنی تفسیر میں سورہ ذاریات کی آیت ۲۲ یا سورہ نجم کی آیت ۱۵ کے ذیل میں یا دونوں کے ذیل میں اس معنیٰ کو ذکر کیا ہے)۔

مختلف ہے، یہ صحیح ہے کہ اس لحاظ سے وہ ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی ہیولا (جسمانی مادی) کے موضوع میں نہیں ہیں، اوراسی طرح یہ مواد جس مکان یا جہت کے محتاج ہوتے ہیں یہ ان میں نہیں ہیں۔۔۔۔۔۔۔لیکن ان دونوں کا آپس میں فرق یہ ہے کہ آخرت کی دنیا اوراس میں جو صورتیں ہیں وہ جوہری لحاظ سے قوی تر، وجودی لحاظ سے شدید تر اور لذت اور درد کے اعتبار سے زیادہ اثر انگیز ہیں، وہ تو اس دنیا کی موجودات سے ہی خوب تر، محکم تر اور شدید تر ہیں، وہ صورتیں، جو انسان خواب یا آئینے میں دیکھتا ہے اُن کا ان کے ساتھ کیا موازنہ ،آخرت کی نسبت اس دنیا کی طرف ایسے ہی ہے جیسے کہ بیداری کی نسبت نیند کی طرف ہوتی ہے۔[1]

اگرچہ معاد کے سلسلے میں وہ مختلف عبارتیں لائے ہیں اور صرف اسی عبارت کے ساتھ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بات واضح ہے کہ معاد کی یہ تفسیر ظاہر قرآن بلکہ قرآن کی واضح آیات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے، یہ فقط ان لوگوں کی بات سے ہم آہنگ ہے جو معاد کو فقط روحانی سمجھتے ہیں کیونکہ مذکورہ بالا بیان میں انہوں نے یہ بات واضح لفظوں میں کہی ہے کہ بہشت خود انسان کے اندر موجود ہے، اس کی روح اور نفس میں ہے، وہاں پر سب چیزیں شکل مثالی رکھتی ہے، تمام چیزیں روحانی ہیں، بلکہ انہیں پیدا کرنے والی بھی انسانی روح ہی ہے۔

ہم نے پہلے سینکڑوں ایسی آیات ذکر کی ہیں جو ''معاد جسمانی'' پر شاہد ہیں، ان کو ہم نے مختلف عنوانوں کے تحت ذکر کیا ہے، ہر عنوان اس طرح کے نظریات کا جواب بن سکتا ہے۔

اس سلسلے میں جو تیسرا نظریہ بیان کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ بہشت اور دوزخ دونوں اس دنیا کے باطن میں موجود ہیں، اس دنیا کے حجابات انہیں دیکھنے کی راہ میں حائل ہوگئے ہیں، اولیاء اللہ انہیں دیکھ سکتے ہیں، پیغمبر اسلامؐ بھی جب معراج پر اس دنیا کے لوگوں کے شور و غل سے دور ہوئے تو انہوں نے بھی اپنی آنکھوں سے اس جنت کے کچھ حصے کا عالم بالا میں مشاہدہ کیا، بلکہ خدا کے خاص بندوں کے لئے تو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی خاص معنوی طاقت کے ذریعے اس زمین پر بیٹھے ہوئے کبھی کبھی اس کا نظارہ کر سکیں، درج ذیل تعبیرات بھی ممکن ہے اسی معنی کی طرف اشارہ کر رہی ہوں:

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيۡطَةٌ ۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ ۵۴ ﴿العنکبوت: ۵۴﴾

بے شک دوزخ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ (عنکبوت۔ ۵۴)

اور

اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِىۡ نَعِيۡمٍ وَاِنَّ الۡفُجَّارَ لَفِىۡ جَحِيۡمٍ

نیک لوگ بہشت میں اور برے لوگ دوزخ میں ہیں۔ (انفطار ۱۳۔ ۱۴)

اور

---

[1] اسفار، ج ۹ ص ۱۷۶، فصل دہم

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ (التكاثر: ٥ تا ٦)

اگرتم علم الیقین رکھتے ہوتے تو دوزخ کو دیکھ لیتے۔ (تکاثر۔ ۶،۵)

اس دنیا کے باطن میں بہشت کی موجودگی کو اس مٹی میں گلاب کی موجودگی کے ساتھ تشبیہہ دی جاسکتی ہے، یہ بات صحیح ہے کہ گلاب بھی مادی اور مٹی بھی، لیکن اس میں کوئی چیز مانع نہیں کہ ایک دوسرے میں پہناں اور پوشیدہ ہو جسے کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

اس مطلب کو ذہن کے نزدیک کرنے کے لئے ایک اور مثال بھی دی جاسکتی ہے جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ:

اسی مادی دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو عام حالات میں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، ان میں بہت سی چیزیں اس دنیا کے مادی باطن میں پوشیدہ ہیں، مثلاً ایک ہی وقت میں دنیا کے ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشنوں سے مختلف لہریں اس فضا میں بھیجی جاتی ہیں۔

بلکہ بعض اوقات تو سیاروں کے ذریعے انہیں پوری دنیا تک پہنچایا جاتا ہے، ہر گھر میں ان لہروں کی مختلف قسمیں موجود ہوتی ہیں، لیکن انہیں کوئی بھی محسوس نہیں کرتا، ممکن ہے بعض اسٹیشنوں سے خوبصورت اور روح پرآوازیں نشر ہو رہی ہوں اور بعض سے ہولناک اور نفرت انگیز، اسی طرح بعض ٹیلی ویژن اسٹیشن بہت خوبصورت، روح پرور اور نشاط آمیز مناظر دکھا رہا ہو، جب کہ دوسری طرف جنگ، خونریزی، آگ اور جرائم کے مناظر دکھائے جارہے ہوں، یہ تمام مناظر، تصویریں اور آوازیں اسی مادی دنیا میں ہمارے اردگرد کی فضا میں پھیلی ہوئی ہیں، انہوں نے اس دنیا کے اندر ہی ایک چھوٹی سی جنت اور دوزخ بنادی ہے۔

بعض سامعین تو اپنے ریڈیو کی سوئی اس سٹیشن پر لگاتے ہیں جہاں سے خوبصورت آوازیں، پیارے پیارے نغمات اُبھر رہے ہوں جب کہ بعض سوئیوں کو اپنی مرضی اور اختیار سے اس جگہ لگاتے ہیں جہاں اس کے برعکس ہوتے ہیں، پہلی طرح کے لوگ ایک لذت بخش دنیا میں جب کہ دوسری طرح کے ایک تکلیف دہ دنیا میں آجاتے ہیں، اس جہان کے مادی ہونے کے باوجود یہ سب کچھ ہے، یہ تمام چیزیں بھی اسی مادی دنیا کے اندر پوشیدہ اور پنہاں ہیں۔

یہ بات ذہن میں نہ آئے کہ بہشت اور دوزخ بالکل اسی طرح ہوں گے، بلکہ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس میں کسی قسم کی مشکل نہیں کہ اس دنیا کے باطن میں اور اندر ہی کئی اور دنیا اور جہان آباد ہوں، ہم موجودہ حالات میں جنہیں نہیں دیکھ سکتے، کیونکہ ہمارے اور ان کے درمیان کئی رکاوٹیں ہیں، لیکن جو لوگ ان پردوں اور رکاوٹوں کو ہٹا سکتے ہیں وہ اس دنیا میں ان دوسرے جہانوں کا نظارہ کر سکتے ہیں (غور کیجئے گا)۔

پیغمبر اسلامؐ نے اپنے آسمانی سفر پر ہی جہاں پر اس مادی دنیا کا شور و غل کم تھا اور جہاں ایسے عوامل کم تھے کہ جن میں انسان کھو جائے اور خدا کے جمال وجلال کے جلوئے بہت زیادہ تھے ان پردوں کو ہٹادیا، آپ نے وہاں پر ہی ان دو دنیا (بہشت، دوزخ) کے بعض حصوں کو دیکھا، جو اس دنیا کے اندر ہی پوشیدہ اور پنہاں ہیں۔

اس کا یہ معنی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ یا خدا کے خاص بندے اس دنیا پر بہشت یا دوزخ کا مشاہدہ نہیں کر سکتے، بلکہ جیسا کہ روایات میں بھی

آیا ہے، ایسا بعض اوقات اسی دنیا میں بھی ہوا ہے، ''راوندی'' نے ''خرائج'' میں یہ روایت ذکر کی ہے:

عاشور کی شب جب امام حسینؑ کے ساتھیوں نے آپؑ کے ساتھ پوری وفاداری کا اعلان کیا اور میدان کربلا چھوڑنے اور آپؑ کی بیعت توڑنے سے انکار کیا تو

دعالهم بالخير و كشف عن ابصارهم فراوا ماحباهم الله من نعيم الجنان وعرفهم منازلهم فيها۔

امامؑ نے اُن کے حق میں دعا کی، اُن کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹا دیئے، خدا نے جنت کی جو نعمتیں انہیں عطا کی تھیں انہوں نے اپنی آنکھوں سے اُن نعمتوں کو دیکھا، امامؑ نے ان کے گھر اور مقامات انہیں بتائے۔ [1]

''مقتل الحسین'' کا مصنف یہ روایت ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے:

یہ خدا کی قدرت کے سامنے بے مثال نہیں لگتا اور امامؑ کی کرامات کے پیش نظر بھی یہ عجیب نہیں لگتا کیونکہ جب فرعون کے جادوگر حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آئے اور فرعون نے انہیں قتل کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت موسیٰؑ نے انہیں بہشت میں ان کے مکانات دکھائے۔ [2]

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ:

حضرت امام جعفر صادقؑ نے اپنے بعض ساتھیوں کو حوض کوثر دکھایا۔ [3]

بہشت کس جگہ پر ہے، اس موضوع کے متعلق نظریہ بہشت کی وسعت کے موضوع کو بھی حل کر دیتا ہے، بعض متکلمین نے اس پر جو بے بنیاد اعتراضات کئے ہیں وہ بھی حل ہو جاتے ہیں۔

بہر حال اس دنیا کے اندر اور باطن میں بہشت اور وزخ کی موجودگی کے متعلق ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ایک نظریے کے طور پر ہے، اس پر عقیدہ اور ایمان قائم کرنے کے لئے اس سے زیادہ کوشش، شواہد اور استدلالات کی ضرورت ہے۔

---

[1] خرائج راوندی بحوالہ ''مقتل الحسین مقدمہ'' ص ۲۶۱، بحار الانوار ج ۴۴ ص ۲۹۸

[2] اخبار الزمان مسعودی، ص ۲۴۷، بحوالہ مقتل الحسین ص ۲۶۱

[3] بحار الانوار، ج ۶ ص ۲۸۷، حدیث ۹

(۷) بہشت کے درجات

اشارہ:

قران مجید کی مختلف آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ بہشت کے باغات متعدد اور مختلف طرح کے ہوں گے، ان آیات کی تفسیر کے سلسلے میں جو احادیث موجود ہیں اُن سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ یہ اہل بہشت کے درجات کی طرف اشارہ ہیں، ہر ایک اپنی لیاقت کی بنیاد پر ان بہشتی باغات میں ہوگا جو ایک دوسرے سے برتر اور اعلیٰ ہوں گے۔

سورہ رحمٰن کی تفسیر میں بہشتی باغات کے متعلق رسول اکرمؐ کی ایک حدیث یوں ہے:

"جنتان من ذهب للمقربين. وجنتان من ورق لاصحب اليمين"

جنت میں دو سونے کے باغ مقربین کے لئے اور دو چاندی کے باغ اصحاب الیمین کے لئے ہیں۔[۱]

یہ بات واضح ہے کہ سونے اور چاندی کی تعبیر بہشت کے درجات کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ دونوں بھی ایک درجے کے نہیں ہیں۔

اس مختصر سے اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اور بہشتی باغات کے متعدد ہونے سے متعلق آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

۱۔ قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۚ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً وَّمَصِيْرًا ۱۵ ﴿الفرقان: ۱۵﴾

۲۔ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ (کهف: ۳۱)

۳۔ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۡ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۱۹ ﴿السجدة: ۱۹﴾

۴۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۱۰۷ ﴿الکهف: ۱۰۷﴾

۵۔ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰۗىِٕكَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ

---

[۱] تفسیر در المنثور، ج ۶ ص ۱۴۶

(واقعہ:۱۰ تا ۱۲)

۶۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ .....وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ....مُدْهَآمَّتٰنِ (رحمن:۴۶۔۴۸۔۶۲۔۶۴)

ترجمہ

۱۔ کہہ دیجئے! کیا یہ بہتر ہے یا جاودانی بہشت جس کا پرہیز گاروں سے وعدہ کیا گیا ہے، وہ بہشت جو اُن کے اعمال کا صلہ اور اُن کا ٹھکانا ہے؟

۲۔ وہ ایسے لوگ ہیں جن کے لئے ہمیشہ رہنے والی جنت ہے، جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔

۳۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دئے تو ان کے لئے ہمیشہ رہنے والی بہشت کے باغات ہیں، یہ خدا کی طرف سے اُن کی پذیرائی ہے اُن اعمال کے بدلے میں جو انہوں نے انجام دیئے۔

۴۔ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل انجام دیئے فردوس (جنت) کے باغ اُن کی منزل ہوں گے۔

۵۔ اور آگے بڑھنے والے ہی سب سے آگے ہوں گے، وہی اللہ تعالیٰ کے مقرب ہوں گے، وہ نعمتوں والی جنتوں میں ہوں گے۔

۶۔ جو اپنے رب کے مقام سے ڈرے اس کے لئے بہشت کے دو باغ ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ دو باغ جو کہ مختلف نعمتوں اور سرسبز وشاداب درختوں سے بھرئے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ان سے نیچے دو اور باغ بھی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دونوں بڑے شاداب اور سرسبز ہیں۔

تفسیر

ایک بہشت یا کئی بہشت:

پہلی آیت میں دوزخیوں پر دردناک عذاب کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے ساتھ اہل بہشت کی قدر ومنزلت کا موازنہ کیا گیا ہے،

ارشاد ہوتا ہے:

"قل اذلك خير ام جنة الخلد التي وعد المتقون كانت لهم جزآء ومصيرا"

کیا وہ (دردناک عذاب) بہتر ہے یا جنۃ الخلد (ہمیشہ رہنے والی جنت) جس کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے؟ یہ اُن کی جزا بھی ہے اور ٹھکانا بھی۔

''جنۃ الخلد'' کی تعبیر قرآن کی صرف ایک آیت میں ہی ہے، یہ بہشت کے ہمیشہ اور جاوداں رہنے کی طرف اشارہ ہے۔

''راغب'' ''مفردات'' میں کہتے ہیں کہ ''خلود'' کا معنی ایک چیز کا خراب ہونے سے محفوظ رہنا اور اپنی حالت پر برقرار رہنا ہے۔''مقائیس اللغت'' نے اسے ثبات اور دوام کے معنی میں پالیا ہے،''مصباح اللغت'' نے اس کا معنی ایک حال اور جگہ پر ٹھہرنا کیا ہے،'' جنۃ الخلد'' کی تعبیر اگرچہ اضافے کی حالت میں ذکر ہوئی ہے لیکن یہ وصفی اور صفتی معنی کی حامل ہے، ظاہری طور پر یہ بہشت کی مجموعی صفت ہے، کیونکہ بہشت کی تمام نعمات جاودانی ہیں، اہل بہشت کا اس میں رہنا بھی ہمیشہ کے لئے ہے، اس وجہ سے یہ بہشت کے کسی ایک حصے سے مختص نہیں ہے، بلکہ بہشت کے تمام باغات ہی اسی طرح ہیں۔

بعض علمائے لغت جیسے''ابن منظور'' نے''لسان العرب'' میں''خلد'' کو بہشت کا ایک نام قرار دیا ہے، لیکن اس بات کا امکان ہے کہ ان کی مراد ایک دائمی صفت کا بیان ہو جو کہ آہستہ آہستہ بہشت کا ایک نام بن گئی۔

دوسری آیت میں اور تعبیر نظر آتی ہے، نیک وصالح مومنین کی پاداش ضائع نہیں جائے گی، اس کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:''اولٓئک لھم جنت عدن تجری من تحتھم الانھر'' ''اُن کے لئے عدن کے باغات ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔

''جنات عدن'' کی تعبیر قرآن کی گیارہ آیات میں آئی ہے [1] یہ تکرار اور تاکید ان صفات کی اہمیت کی دلیل ہیں جو ان میں ذکر کی گئی ہیں۔

''جنات'' جمع ہے''جنت'' کی، یہ بہشت کے متعدد باغات کی طرف اشارہ ہے، عدن (بروزن عدل)''مقائیس اللغت'' کے بقول حقیقت میں ثبات کے معنی میں ہے یا''مفردات'' میں''راغب'' کے بقول دوام اور پائیداری کے معنی میں ہے، اس لئے قیمتی دھاتوں اور فولاد وغیرہ کی جگہ کو''معدن'' (کان) کہتے ہیں، یہ یہاں پر بہشت کے جاوداں ہونے کی طرف اشارہ ہے، دنیا کے باغات کی طرح اس میں خزاں کا گزر نہیں ہوگا، دنیا کے باغات تو کچھ عرصے بعد سوکھ جاتے ہیں، ان کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں، کبھی ان کے پھلوں کو کوئی چیز خراب کر

---

[1] توبہ:۷۲)،(رعد:۲۳)،(نحل:۳۱)،(کہف:۳۱)،(مریم:۶۱)،(طٰہ:۷۶)،(فاطر: ۳۳)،(ص:۵۰)،(مومن:۸)،(صف:۱۲) ،(بینہ:۸)۔

دیتی ہے اتنے اندر سے کھوکھلے ہوجاتے ہیں، زیادہ گرم اور ٹھنڈی ہوائیں بھی ان کو خشک کردیتی ہیں، کبھی ان پر بجلی گر کر راکھ میں تبدیلی کر دیتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اس دنیا کے باغوں پر تو ہزاروں طرح کی مصیبتیں ٹوٹ سکتی ہیں جب کہ بہشت کے باغات ایسے ہیں جو ہمیشہ سرسبز و شاداب اور قائم ودائم رہیں گے، وہاں نہ تو کسی آفت کا گزر ہوگا، نہ خزاں کا اور نہ درختوں کے سوکھ جانے کا۔

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ ''جنات عدن'' سے مراد بہشت کا درمیان والا حصہ ہے، یہ بھی حقیقت میں بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے، لیکن بہت وسیع، گویا اس کا ہر حصہ ایک مستقل بہشت کی حیثیت رکھتا ہے، اسی لئے اسے جمع کی صورت میں لایا گیا ہے۔[1] لیکن جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس کے پیش نظر یہ معنی کچھ بعید دکھائی دیتا ہے۔

تیسری آیت بھی اسی بات کو دوسرے انداز میں پیش کرتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''اما الذین امنوا وعملو الصلحت فلهم جنت الماوٰی نزلا بما کانو یعملون''۔ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دئے ان کے لئے ''جنت الماویٰ'' ہے یہ اُن کی پذیرائی ہے ان کے اعمال کے صلے میں جو انہوں نے انجام دیئے۔

''ماوی'' کا مادہ ''اوی'' (بروزن قوی) یا ''اوی'' (بروزن قتی) ہے۔ ''مفردات'' میں ''راغب'' کے بقول اس کا معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ضم کر دینا ہے، بعدازاں یہ کسی چیز کے پاس ٹھہرنے کے لئے استعمال ہونے لگا، ''مقائیس اللغت'' نے بھی اس کا ایک اصلی معنی ''تجمع'' کیا ہے، جس کا لازمہ کسی چیز کے پاس ٹھہرنا ہی ہے، خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر وہ مکان، یا جگہ کہ جہاں پر انسان دن یا رات میں رہتا ہے اور وہاں پر آرام کرتا ہے، اُسے ''ماوی'' کہتے ہیں، لہٰذا ''جنات الماوٰی'' کی تعبیر بھی جنت کے ہمیشگی اور دائمی ہونے کی طرف اشارہ ہے، یہ آرام اور سکون کے مفہوم کی بھی ادائیگی کر رہی ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف ایک لطیف سا اشارہ ہے کہ یہ دنیا انسان کے لئے ماویٰ (انسان کا اصلی مکان) نہیں ہے، بلکہ یہ تو راستہ ہے جسے عبور کر کے انسان نے اپنی منزل تک پہنچنا ہے، یا روایت کے الفاظ میں کہ ''الدنیا فنطرۃ'' (دنیا ایک پل ہے) اس میں ثبات اور ہمیشہ رہنے کا معنی ہی نہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ صفت پوری بہشت کے لئے ہے، لیکن اس کے باوجود ابن عباسؓ سے یہ منقول ہے کہ وہ کہتے ہیں:

بہشت کے آٹھ باغات ہیں، ان میں سے ایک ''جنۃ الماویٰ'' ہے، باقی باغوں کے نام یہ ہیں: ''دار الجلال''، ''دار القرار''، ''دار السلام''، ''جنۃ عدن''، جنۃ الخلد''، ''جنۃ الفردوس'' اور ''جنۃ النعیم''۔

پہلے ہم نے ذکر کیا تھا کہ ''نزل'' کا معنی وہ چیز ہے جسے مہمان کے سامنے سب سے پہلے پیش کیا جاتا ہے (جیسا کہ آج کل شربت یا ٹھنڈا پانی یا چائے وغیرہ پیش کی جاتی ہے)۔

---

[1] مجمع البیان۔ ج ٦، ص ٤٦٧، تفسیر قرطبی، ج ٦ ص ٤٠١٣۔

اگر اس طرح ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ''جنات الماؤی'' اپنی تمام وسعتوں اور عظمتوں کے ساتھ خدا کے خالص بندوں کے لئے ایک معمولی سی خدمت کے طور پر پیش کی جائے گی! ان کی اصلی خدمت تو اُن نعمات سے کی جائے گی جن کے مقابلے میں جنت الماوی معمولی سی چیز ہے۔ وہ نعمت خدا کے قرب ولقاء کی جنت اور اس کی معرفت کے جلال و جمال کی بہشت کے علاوہ کیا ہو سکتی ہے۔

فیض الٰہی کے اس عظیم سرچشمے کے لئے ایک اور تعبیر جو لائی گئی ہے وہ ''جنات الفردوس'' کی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''ان الذین امنوا وعملو الصلحت کانت لھم جنات الفردوس نزلا'' جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح بھی انجام دیئے اُن کی پذیرائی کے لئے جنات الفردوس ہے۔

کلمہ ''فردوس'' رومی ہے یا سریانی، نبطی ہے یا حبشی یا پھر عربی، اس سلسلے میں علمائے لغت اور مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، ہر ایک نے کسی ایک کو اختیار کیا ہے۔

بعض نے اس کی بنیاد فارسی کو قرار دیا ہے، جو پہلے ''پرادیزس'' اور ''پرادیز'' کی صورت میں تھا، پھر ''فردایس'' اور ''فردوس'' کی شکل اختیار کر گیا۔

اس کلمے کے لئے متعدد معانی ذکر کئے گئے ہیں: باغ وبستان، انگور کے باغات، ایسے باغ جو ہر طرح کے پھل اور پھول رکھتے ہوں، ایسے باغات جن میں درخت بہت زیادہ ہوں، پانی بھی فراوان ہو اور انگور کے درخت بھی ان میں ہوں۔

جو لوگ اس لفظ کو ''عربی'' سمجھتے ہیں وہ اسے ''الفردسة'' کے مادہ سے لیتے ہیں جس کا معنی وسیع اور کھلی ہے، یہ کلمہ قرآن میں صرف دو بار استعمال ہوا ہے (کہف۔۱۰۷، مومنون۔۱۱) اور بہشت کے لئے ہی استعمال ہوا ہے، پیغمبر اسلامؐ اور اہل بیتؑ سے منقول احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بہشت کے ایک بہت بلند مقام کا نام ہے۔

حضور اکرمؐ کی ایک حدیث ہے:

"اذا ساء لتم الله تعالیٰ فاسا لوہ الفردوس، فانه وسط الجنة واعلی الجنة وفوقه عرش الرحمن۔ ومنها تفجر انهار الجنة۔"

جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو فردوس مانگو جو بہشت کا درمیان اور سب سے اعلیٰ حصہ ہے، اُس کے اوپر خدا کا عرش ہے اور فردوس سے بہشت کی نہریں پھوٹتی ہیں۔[1]

حضرت علی علیہ السلام سے ایک حدیث یوں مروی ہے:

لکل شیءٍ ذروۃ و ذروۃ الجنة الفردوس وھی المحمد وآل محمد

[1] صحیح بخاری و مسلم (بحوالہ روح المعانی، ج۱۶، ص۴۷)

ہر چیز کا ایک بلند مقام ہوتا ہے اور بہشت کا بلند مقام فردوس ہے، یہ محمدؐ و آل محمد کے لئے ہے۔[1]

حضرت امام جعفر صادقؑ نے اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں فرمایا کہ:

یہ آیت حضرت ابوذرؓ، سلمانؓ، مقدادؓ، اور عمار یاسرؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

آیت یہ ہے: ''جعل الله لهم جنات الفردوس نزلا ای ماوی و منزلا''

خدا نے فردوس کے باغات کو اُن کی منزل قرار دیا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ دوسری اور تیسری حدیث میں کسی قسم کا تضاد نہیں، چونکہ باایمان افراد جیسے ابوذرؓ، سلمانؓ ۔۔۔۔۔۔۔ جو کہ محمدؐ وآل محمدؐ کے سچے پیروکار ہیں وہ بھی دراصل انہی کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔

یہاں پر ''نزلا'' کیا معنی رکھتا ہے؟ بعض نے اسے منزل اور جائے سکونت کے معنی میں لیا ہے، جیسا کہ امام جعفر صادقؑ سے مذکور حدیث میں بھی اشارہ ہوا ہے، بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ نزل کا معنی وہ چیز ہے جو مہمان کو پیش کی جاتی ہے، یا وہ چیز جو مہمان کو سب سے پہلے پیش کی جاتی ہے، ان دونوں معانی کے درمیان جمع کرنا بھی درست ہے۔

بہشتی باغات کے متعلق سورہ واقعہ میں ایک اور تعبیر آئی ہے جو کہ ''جنات النیعم'' کی ہے، ارشاد ہوتا ہے: (ایمان اور عمل میں) آگے بڑھنے والے ہی سب سے آگے ہوں گے، وہ اللہ تعالیٰ کے مقرب ہوں گے اور نعمتوں والی جنتوں میں ہوں گے۔

''جنات'' جمع ہے ''جنت'' کی، شاید یہ تعبیر اس لئے ہو کہ ہر ایک بہشتی کے لئے باغ ہوگا، یہ مجموعی طور پر کئی باغات بن جائیں گے، نعیم جمع ہے نعمت کی، چونکہ بہشت میں ہمیشہ کے لئے مختلف طرح کی مادی اور معنوی نعمات ہوں گی، یہ دنیا کے باغات کی طرح نہیں ہوگی کہ کبھی انسان کی تکلیف کا باعث بن جاتے ہیں اور کبھی راحت کا، علاوہ ازیں دنیا کے ہر کسی باغ میں کوئی ایک نعمت ہوتی ہے نہ کہ سب نعمتیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ پہلے اُن کے ''مقام قرب'' کا تذکرہ ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے ''اولئک المقربون'' پھر ''جنات النعیم'' کی بات کی گئی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ''جنات النعیم'' اپنی تمام نعمتوں اور عظمتوں کے باوجود خدا کے قرب کے مقام کے سامنے ایسے ہی ہے جیسے سمندر کے سامنے قطرہ۔

یہ تعبیر (جنۃ النعیم۔ جنات النعیم) قرآن کی آیات میں تقریباً دس مرتبہ آئی ہے اس کا بار بار آنا اس کی اہمیت اور عظمت پر دلیل ہے۔[2]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں جتنا بھی کسی سرچشمہ قوت کے نزدیک تر اور قریب تر ہوتا ہے اس کی فکر و پریشانی بڑھتی

---

[1] تفسیر برہان، ج ۲ ص ۴۹۵، حدیث ۲۔

[2] (مائدہ۔۶۵)، (یونس۔۹)، (حج۔۵۶)، (شعراء۔۸۵)، (لقمان۔۸)، (صافات۔۴۳)، (واقعہ۔ ۱۲، ۸۹)، (قلم۔۳۴)، (معارج۔۳۸)۔

جاتی ہے کیونکہ اُسے اس بات کا ہمیشہ خوف رہتا ہے کہ کہیں کسی وجہ سے وہ شخص اس سے اپنی نظریں پھیر نہ لے جس سے وہ بہت بڑی بدبختی میں مبتلا ہو جائے، اسی لئے ارباب معرفت بڑی شخصیات کو ''قرب سلطان'' سے روکتے ہیں، لیکن خدا کے قریب ہونا اس کے بالکل برعکس ہے، اس قرب کا نتیجہ تو آرام وسکون، معنوی اور روحانی سرور اور ''جنات النعیم'' کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ بہت سی روایات میں اس آیت:

ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ یَوْمَىٕذٍ عَنِ النَّعِیْمِ (تکاثر۔۸)

کے ذیل میں ''نعیم'' کی تفسیر ''نعمت ولایت'' کی گئی ہے،[1] اس سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے ''جنات النعیم'' ولایت والی بہشت ہو، خدا اور اس کے اولیاء کی محبت وولایت اُن سے عشق ومحبت اور ان کے نور سے فیضیاب ہونے کی جنت۔

''جنات النعیم'' سے مراد تمام تر بہشت ہے یا اس کے بعض خاص حصوں کی طرف اشارہ ہے، اس سلسلے میں دو احتمال ہیں، ایک طرف اس کا وعدہ چونکہ مقربین کو دیا گیا ہے اس لئے ممکن ہے یہ دوسرے احتمال کی طرف اشارہ ہو، بالخصوص اس لئے کہ اس سورۃ کی آیت ۸۸ اور ۸۹ میں بھی اسی سے ملتی جلتی تعبیر دکھائی دیتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''فاما ان کان من المقربین فروح وریحان و جنة نعیم'' (واقعہ۔۸۸۔۸۹)

اس سلسلہ آیات کے آخری حصے میں خدا کی چار جنتوں کی طرف ایک اجمالی سا اشارہ کیا گیا ہے، اُن کی خصوصیات کو دو دو کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''ولمن خاف مقام ربہ جنتان'' جو اپنے رب کے مقام سے ڈرے اس کے لئے دو جنتیں ہیں، ''ذواتا افنان'' اُن میں مختلف نعمتیں اور ہرے بھرے درخت ہیں، ''ومن دونہما جنتان...... مدھآمتان'' ان کے نیچے دو اور بہشتی باغات ہیں، وہ دونوں پوری طرح شاداب اور سرسبز ہیں۔

بعض اوقات یہ سوچا گیا ہے کہ یہ چار باغ تمام مومنین کے لئے ہیں یہ تعدد تنوع کی وجہ سے ہے کیونکہ انسان کی طبیعت تنوع پسند ہے، وہ اس سے ہی لطف پاتا ہے لیکن آیات وروایات کا طرز گفتگو اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ دو مختلف طرح کے لوگوں کے لئے ہوں گی، ''من دونہما'' کی تعبیر بھی نیچے ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

اس لحاظ سے بہشت کے دو پہلے باغ ''مقربین'' کے لئے ہیں، اور ان سے نیچے دو باغات ''اصحاب الیمین'' کے لئے، یہ حقیقت میں اہل بہشت کے درجات اور مقامات کی طرف اشارہ ہے، ایسا ہونا بھی چاہیے کیونکہ تمام بہشتی ایک سطح کے لوگ تو نہیں ہیں، ان کا مقام اور مرتبہ ایک جیسا تو نہیں ہے، لہٰذا ان کے درجات بھی مختلف ہونے چاہئیں۔

اہل بہشت کے درجات کے اس فرق کو نبی اکرمؐ کی ایک حدیث میں بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے:

'' جنتان من فضة انیتہما وما فیہما، جنتان من ذھب انیتہما وما

---

[1] اس حدیث کے لئے بحار الانوار، ج ۲۴ ص ۴۸ باب ۲۹ کی طرف رجوع کیا جائے۔

فیھما "

بہشت کے دو باغ ایسے ہیں جن کے برتن اور ہر چیز چاندی کی ہے اور باغات کے برتن اور ہر چیز سونے کی ہے۔[1]

حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک روایت میں ہی معنی زیادہ وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے:

لا تقولن واحدة ان الله يقول: ومن دونهما جنتان ۔ولا تقولن درجة واحدة ان الله يقول: درجات بعضها فوق بعض انما تفاضل القوم بالاعمال۔

یہ نہ کہو کہ بہشت ایک ہی ہے کیونکہ خدا نے فرمایا ہے: ''اس سے نیچے دو اور بہشتیں ہیں'' یہ نہ کہو کہ سب کا درجہ ایک ہی ہے کیونکہ خدا نے فرمایا ہے: ''بعض درجات بعض سے بلند ہیں''، اور یہ فرق ان کے اعمال کی وجہ سے ہے۔[2]

ان دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے لئے دو باغ کیوں ہوں گے؟ مفسرین نے اس سلسلے میں کئی احتمالات ذکر کئے ہیں، ان کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں پایا جاتا ممکن ہے آیت کے مفہوم میں سب کے سب جمع ہوں۔ احتمالات یہ ہیں:

۱۔ ایک تو روحانی جنت کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا جسمانی جنت کی طرف۔

۲۔ ہر بہشتی کے لئے دو باغ ہیں، ایک عمومی اور دوستوں سے ملاقات کے لئے اور دوسرا خصوصی اپنی بیویوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے۔

۳۔ ایک باغ تو عقیدے کی پاداش کے طور پر ہے اور دوسرا نیک اعمال کے بدلے میں۔

۴۔ ایک تو اپنے عمل کی جزاء کے طور پر ہے لیکن دوسرا خدا کے فضل اور کرم کے طفیل۔

۵۔ ایک خدا کے فرمان کی اطاعت کرنے کی وجہ سے اور دوسرا ترک گناہ کرنے کی وجہ سے۔

مذکورہ بالا آیات سے مجموعی طور پر اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ بہشت کے مختلف درجات اور مقامات ہیں ان میں سے ہر درجہ ہی اپنی جگہ پر بہشت ہے، اولیائے خدا کے مقامات کا مختلف ہونا ہی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ بہشت میں بھی ان کے درجات میں فرق ہو،

---

[1] تفسیر مجمع البیان، ج۹ و ۱۰، ص ۲۱۰۔

[2] تفسیر مجمع البیان، ج۹ و ۱۰، ص ۲۱۰۔

مقربین کی بہشت اصحاب الیمین کی بہشت سے مختلف ہے، جو لوگ ایمان، معرفت اور ایمان صالح کی بلندیوں پر فائز ہیں ان کا درجہ ان سے بلند ہے جو اس سے کم رتبے کے لوگ ہیں۔

اگر چہ ان میں سے کسی ایک کے بھی اوصاف پوری طرح ہمارے ذہن میں نہیں سما سکتے، لیکن یہ بات قطعی ہے کہ ان کے درجات مختلف ہیں، یہاں تک کہ خود قیامت کے دن بھی جو لوگ نچلے درجے کے ہیں وہ اوپر والے درجے کے متعلق تصور نہ کر سکیں گے کہ وہاں پر کیا ہے۔

''جنت'' قرآنی آیات میں کبھی تو ''واحد'' کی صورت میں آیا ہے جو کہ نوع اور عموم کا معنی عطا کرتا ہے، یہ تمام بہشتی باغات کے لئے ہے، اور کبھی جمع کی شکل میں آیا ہے (جنات)، یہ بھی تمام بہشتی باغات اور اُن کے مختلف مراحل، مراتب اور درجات پر محیط ہے، اور کبھی ''تثنیہ'' (جنّتان) کی صورت میں آیا ہے، یہ دو مختلف مرحلوں کی طرف اشارہ ہے جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

کبھی تو بہشت کے دوام اور جاوداں ہونے کا تذکرہ ہوا ہے اور ''جنات عدن'' یا ''جنۃ الماوی'' یا ''جنۃ الخلد'' کی تعبیرات لائی گئی ہیں، لیکن کبھی اُس کی مادی اور معنوی نعمات کے متنوع ہونے کا ذکر ہوا ہے جس کے لئے ''جنات النعیم'' کی تعبیر لائی گئی ہے، کبھی بہشت کے بہت بلند اور ممتاز حصے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ''جنات الفردوس'' کی تعبیر لائی گئی ہے۔

ان معنی خیز تعبیرات میں سے ہر ایک خدا کے فیض کے اس عظیم سرچشمے کی کسی ایک جہت کی طرف اشارہ کرتی ہیں، نیز یہ تعبیرات اس محبوب حقیقی کے قرب ووصال کے مختلف مقامات کی حکایت کرتی ہے۔

اللهم ارزقنا بمنك ورحمتك يا أرحم الراحمين۔

بہشت کے متعلق چند سوال

ا۔ کیا تکرار و یکسانیت ناگوار نہیں ہے؟

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آیات اور روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رحمت کے اس عظیم سرچشمے میں خدا کی نعمات میں یکسانیت ہوگی، یہ بات بالخصوص اگر کافی مدت تک رہے تو اس شوق اور نشاط کو خاموش کر دیتی ہے کیونکہ بہترین مناظر، خوبصورت زندگی اور لذیذ غذائیں بھی اگر بار بار سامنے آتی رہیں تو وہ ایک عام سی حالت اختیار کر جاتی ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات انسان یکسانیت کی اس زندگی سے جان چھڑانے کے لئے ایک سادہ اور محنت طلب زندگی اختیار کر لیتا ہے تاکہ اس کی زندگی میں ایک تنوع آ جائے۔

اس کے جواب میں تین نکتوں کی طرف توجہ فرمایئے:

ا۔ ہم اس دنیا کے جسمانی اور نفسیاتی معیاروں کا موازنہ اُس دنیا سے نہ کریں کیونکہ اس دنیا میں جو ہماری کیفیت ہوتی ہے وہ یہ ہے ایک چیز کے بار بار سامنے آنے سے ہمارا ذہن تھک جاتا ہے اور ہمارے اندر بیزاری اور عدم میلان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن وہاں پر اس کے برعکس ہے، انسان جتنا بھی دیکھے گا اس کا شوق اور جذبہ بڑھتا جائے گا، چیز جتنی بار بھی سامنے آئے گی اس کی لذت دو چند ہوتی جائے گی، اس طرح اس کا بار بار سامنے آنا معنوی اور مادی لذت میں اضافہ کرتا جائے گا، ہمارے پاس کیا دلیل ہے کہ یہاں کی اور وہاں کی روحانی اور نفسیاتی کیفیت ایک ہی ہے؟

۲۔ اس دنیا میں بھی کئی نعمتیں ایسی ہیں جن سے انسان کبھی بھی سیر نہیں ہوتا، ہم جتنا بھی تازہ ہوا میں سانس لیتے جائیں اس سے تھکاوٹ نہیں ہوتی، بلکہ ہمیشہ اس سے لذت محسوس کرتے ہیں، یہ ہمارے لئے نشاط اور فرحت کا باعث بنتی ہے۔

پانی ایک پینے کی معمولی سی چیز ہے ہم ہمیشہ اسے ہی پیتے ہیں، اگر ہم اس دنیا میں سو سال تک بھی رہیں تب بھی شدید پیاس کی حالت میں آب شیریں ہمارے لئے سب سے زیادہ لذت بخش ہے، اسی لئے کہتے ہیں کہ پانی زندگی کا سرچشمہ ہے نہ تو اس کے پینے سے تھکتے ہیں اور نہ ہی اسے بیکار سمجھتے ہیں، بلکہ پیاسوں کے لئے آب شیریں ہمیشہ معمولی، جذب کنندہ اور کیفیت آور نعمت ہوتا ہے۔

اس میں کیا مانع ہے کہ اس دنیا میں بھی خدا انسان پر ایک تشنگی کی سی کیفیت طاری کر دے (البتہ وہ تشنگی اور پیاس آور ہوتی ہے نہ کہ وہ پیاس جو وبال جان ہو، جیسے محبوب سے ملاقات کی پیاس کتنی سرور آفریں ہوتی ہے) جس کی وجہ سے وہ بہشت کی جسمانی اور روحانی نعمات سے ہمیشہ غیر معمولی لذت پاتا رہے۔

۳۔ خدا کی ذات اور صفات لامحدود ہیں، اس کے روحانی اور معنوی جلوئے بھی لامحدود ہیں، اہل بہشت پر ہر دن ایک نئے کرم کی بارش اور ہر لحہ ایک نئی رحمت اور ہدایت کی برسات ہوتی رہے گی ایسے کہ وہ اصلاً مکرر نہ ہوں، کیا لامحدود چیز بھی مکرر ہو سکتی ہے؟

جنت کی مادی نعمات بھی اس کی رحمانیت اور رحیمیت کے جلوئے ہیں، وہ بھی لامحدود اور بے انتہا ہوں گے اس میں کیا مانع ہے کہ

بہشت کے وہی درخت، وہی نہریں، وہی پھول، وہی رنگ و بو، وہی پاکیزہ شرابیں، ہر دن اور ہر لحہ ایک نیا رنگ و بو اختیار کرتے رہیں، ان سے ہر دفعہ خوشبو کی ایک نئی لہر اٹھتی رہے، ان کی شکل بدلتی رہے، ان کے رنگ ہمیشہ متغیر رہیں، ہر لمحے ان کے جلوئے اور ہوں، اس طرح ایک کھانا یا ایک منظر پوری عمر میں بہشتی صرف ایک بار ہی دیکھیں اور اس سے لطف اٹھائیں (کیا پیارا سماں ہوگا)۔

بعض آیات اور روایات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں، سورہ رحمن کی آیت نمبر ۲۹ میں ارشاد ہوتا ہے:

کل یوم هو فی شان

ہر وقت اس کی ایک نئی شان اور ہر زمان اُس کا ایک نیا کام

اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں مفسرین کی مختلف آرائیں، ہر ایک خدا کے کسی فعل کی طرف اشارہ کرتا ہے، کوئی انسانوں کی خلقت اور موت کی طرف اشارہ کرتا ہے، کوئی اُن کی زندگی اور رزق کی طرف، کوئی قوموں کی عزت یا ذلت کی طرف، کوئی گناہوں کی بخشش اور غم و اندوہ کے دور کر دینے کی طرف، کوئی فائدہ پہنچانے اور نقصان کو دور کر دینے کی طرف، لیکن یہ بات قطعی ہے کہ یہ آیت اپنے دامن میں ایک وسیع مفہوم لئے ہوئے ہے، جو اس کائنات میں ہر طرح کی تبدیلی کو شامل ہے، چونکہ ہمارے پاس اس امر پر کوئی دلیل نہیں کہ یہ آیت فقط دنیا کے لئے مختص ہو کیونکہ اس آیت سے پہلے ارشاد ہوتا ہے:

كل من عليها فان ويبقى وجه ربك ذوالجلال والاكرام

جو کچھ روئے زمین پر ہے وہ فنا ہو جائے گا، صرف تیرے ذوالجلال والاکرام رب کی ذات باقی رہے گی۔

ہوسکتا ہے یہ اس امر کے لئے قرینہ ہو، یہ تبدیلیاں اور تنوعات دوسری دنیا میں بھی جاری و ساری ہوں گے اور اہل بہشت خدا کے ارادے سے ایک کام میں مصروف رہیں گے، اور ہر روز وہ ایک نئی کیفیت میں ہوں گے۔

بعض مفسرین نے ''کل یوم'' کو بھی عام قرار دیا ہے، جو دنیا اور آخرت دونوں کے ایام کے لئے ہے۔[1]

حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث یوں مروی ہے:

ان الله خلق جنة لم يرها عين، ولم يطلع عليها مخلوق، يفتحها الرب تبارك وتعالى كل صباح فيقول ازدادي طيبا، ازدادي ريحا۔

خدا نے جنت پیدا کی ہے جسے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور کوئی مخلوق اس سے آگاہ نہیں، ہر صبح خدا اسے کھولتا ہے اور

[1] تفسیر روح المعانی، ج ۲۷، ص ۹۶۔

کہتا ہے! اپنی خوشبو کو زیادہ کرو، اپنی ہواؤں کو اور بڑھاؤ۔[۱]

حضرت امام محمد باقرؑ سے ایک حدیث مروی ہے:

ان اهل الجنة توضع لهم موائد عليها من سآئر ما يشتهونه من الا طعمة التى لا الذمنها ولا اطيب ثم يرفعون عن ذلك الىٰ غيره۔

بہشتیوں کے لئے ایسے دسترخوان بچھائے جائیں گے جن پر اُن کی پسند کے کھانے لگے ہوں گے ایسے کھانے جن سے لذیذ اور خوشبودار کھانا کوئی نہیں ہے، پھر وہ دسترخوان بڑھالیا جائے گا اور اُن کے لئے ایک اور دسترخوان بچھایا جائے گا۔[۲]

ان تعبیرات سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ وہاں پر کوئی چیز مکرر نہیں ہوگی بلکہ ہر لمحے نئے الطاف وعنایات ہوتے رہیں گے۔

گفتگو کے اس سلسلے کو ایک مفسر کی اس بات پر ختم کرتے ہیں، انہوں نے کہا ہے:

''مذکورہ بالا آیت ہر زمانے میں خدا کی تجلی، اور ہر انسانی جان میں اس کی صلاحیت کے مطابق جمال کے جلوے کی طرف اشارہ ہے، یہ بات بھی معلوم ہے کہ خدا کی تجلیات محدود اور ختم ہونے والی نہیں۔''[۳]

قطعی طور پر یہ بات آیت کا پورا پورا مفہوم بیان نہیں کرتی بلکہ یہ تو آیت کے مفہوم کا ایک جزء اور حصہ ہے (غور کیجئے گا)

۲۔ تضادات پہچان کا ذریعہ ہیں

یہ بات معروف ہے کہ ''کھونا'' ہی ''پانے'' کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے، دوسرے الفاظ میں یوں کہ خدا کی نعمتوں کا موازنہ ہمیشہ اُن کے زائل ہوجانے کے ساتھ ہی کیا جاسکتا ہے، اگر اس دنیا میں بیماری نام کی کوئی چیز نہ ہوتی تو کسے یہ معلوم ہو پاتا کہ تندرستی ایک بہت بڑی نعمت ہے، اگر دنیا میں بے سکونی نہ ہوتی تو آرام وسکون کی نعمت کا احسان کسے ہو پاتا۔

اس لحاظ سے بہشت میں تو کسی قسم کا زوال نہیں ہے، وہاں نہ بے سکونی ہے اور نہ بیماری، نہ قحط ہے اور نہ دوسری مصیبتیں۔۔۔۔۔۔اس وجہ سے وہاں کی نعمات کی قدر ومنزلت آہستہ آہستہ ختم ہوجائے گی، لہٰذا کسی قسم کی لذت نہیں بخش سکیں گی۔

اس سوال کا جواب کوئی ایسا مشکل نہیں کیونکہ ایک طرف تو بہشتی اہل دوزخ کو دیکھ رہے ہوں گے، اس لئے اپنا موازنہ اُن سے کر سکتے

---

[۱] بحارالانوار، ج۸، ص۱۹۹، حدیث ۱۹۸۔

[۲] بحارالانوار، ج۸، ص۱۹۹ حدیث ۱۹۹۔

[۳] روح البیان، ج۹، ص۳۰۰۔

ہیں جب وہ اتنے بڑے فرق کو دیکھیں گے اور ان لامحدود نعمتوں کی طرف نظر کریں گے تو بہت لذت اور سرور محسوس کریں گے۔

قرآن نے اس بات کو کئی جگہ پر ذکر کیا ہے کہ اہل بہشت دوزخیوں کی حالت کو دیکھتے رہیں گے، سورہ اعرف کی آیت ۵۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَنَادٰۤى اَصۡحٰبُ النَّارِ اَصۡحٰبَ الۡجَـنَّةِ اَنۡ اَفِيۡضُوۡا عَلَيۡنَا مِنَ الۡمَآءِ اَوۡ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ‌ ؕ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ۞

اہل دوزخ بہشتیوں کو آواز دیں گے کہ (تھوڑی سی مہربانی کرکے) تھوڑا سا پانی یا خدا نے تمہیں جو رزق دیا ہے اس میں سے کچھ ہمیں دے دو، وہ کہیں گے خدا نے انہیں کافروں پر حرام کیا ہے۔

سورہ صافات میں ارشاد ہوتا ہے:

فاقبل بعضهم على بعض يتسآء لون۔ قال قآئل منهم انى كان لى قرين........ فاطلع فراه فى سوآء الجحيم....... قال تا لله ان كدت لتردين....... ولو لا نعمة ربى لكنت من المحضرين۔

بعض بہشتی بعض دوسرے بہشتیوں کی طرف متوجہ ہوکر سوال کریں گے، ان میں سے ایک کہے گا۔۔۔۔ میرا ایک (گنہگار اور بے ایمان) ساتھی ہوا کرتا تھا۔۔۔۔ اچانک وہ اسے جہنم میں دیکھے گا اس سے کہے گا! خدا کی قسم تو تو مجھ کو بھی تباہ کرنے کو تھا، اور اگر میرے رب کا مجھ پر کرم نہ ہوتا تو میں بھی جہنم میں موجود لوگوں میں ہوتا۔ (صافات۔ ۵۰،۵۱،۵۵ تا ۵۷)

سورہ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

وَنَادٰۤى اَصۡحٰبُ الۡجَـنَّةِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلۡ وَجَدْتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمۡ حَقًّا‌ ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ‌ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيۡنَهُمۡ اَنۡ لَّعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ ۞ [۷:۴۴]

اہل بہشت دوزخیوں کو آواز دیں گے کہ ہم سے تو جو ہمارے رب نے وعدہ کیا تھا ہم نے اسے حق پایا، کیا تم سے جو تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا اُسے تم نے بھی حق پایا ہے؟ وہ کہیں گے! ہاں! پھر ایک پکارنے والا اُن کے

درمیان پکارے گا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو۔ (اعرف۔ ۴۴)

ان آیات کے مجموعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نہ تو اہل بہشت دوزخیوں کی حالت سے بے خبر ہیں اور نہ دوزخ میں رہنے والے بہشتیوں کے حال سے بے خبر، اہل بہشت کی آگاہی اُن کے سرور اور نعمت میں اضافے کا باعث بنے گی کہ وہ دردناک عذاب سے محفوظ ہیں اور نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں جب کہ اس کے برعکس دوزخی اس موازنے سے اور غمگین ہوں گے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث یوں منقول ہے:

ہر انسان کا ایک گھر جنت میں ہوتا ہے اور ایک دوزخ میں، جب بہشتی بہشت میں سکونت اختیار کر لیں گے اور دوزخی دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے تو ایک آواز آئے گی، کہ اے بہشت کے رہنے والو ادھر دیکھو! وہ دوزخ کی طرف دیکھیں گے، اس وقت اُن کے دوزخ والے گھر اوپر اٹھیں گے جو انہیں دکھائے جائیں گے پھر ان سے کہا جائے گا: اگر تم اپنے رب کی نافرمانی کرتے تو ان گھروں میں ہوتے۔

پھر امامؑ نے فرمایا:

اگر کوئی شخص زیادہ خوشی سے مرسکتا ہوتا تو اہل بہشت اُس وقت خوشی سے مرجاتے، کیونکہ اتنا بڑا عذاب ان سے دور کر دیا گیا ہے، (اسی طرح دوزخیوں کی حالت بھی حدیث کے ذیل میں ذکر کی گئی ہے کہ وہ بہشت میں اپنے مکانات دیکھ کر اتنے غمگین ہوں گے گویا وہ اس غم کی وجہ سے مرجانا چاہتے ہیں)۔[1]

اسی مفہوم سے ملتا جلتا مفہوم البتہ کچھ فرق کے ساتھ نبی اکرمؐ سے منقول ہے جسے **در المنثور** میں ذکر کیا گیا ہے۔[2] ہر انسان کے لئے دو مکانوں اور منزلوں کی موجودگی انسان کی ان صلاحیتوں اور استعداد کی طرف اشارہ ہیں جو اس کے اندر پوشیدہ ہیں، ان صلاحیتوں کے مطابق ہی اس کے لئے بہشت اور جنت میں مکان بنائے گئے ہیں، پہلے جو کچھ ہم نے ذکر کیا تھا کہ انسان اپنے اعمال کے ساتھ ہی اپنا مقام متعین کرتا ہے یہ اس کے ساتھ تضاد نہیں رکھتی۔

یہ سب کچھ ایک طرف، دوسری طرف یہ کہ اہل بہشت کبھی بھی اس دنیا کے حادثات اور واقعات کو فراموش نہیں کریں گے، وہ اس دنیا کے ساتھ اپنی حالت کا موازنہ کر کے خدا کی اُن بے شمار نعمات کی قدر و منزلت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

سورہ طور کی آیت ۲۵ سے لے کر ۲۷ تک میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ﴿۲۵﴾ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ﴿۲۶﴾ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ﴿۲۷﴾

---

[1] بحار الانوار، ج ۸ ص ۱۲۵، حدیث ۲۶۔

[2] تفسیر در المنثو ر بحوالہ المیز ان ص ۱۳۹ (سورہ اعراف کی آیت کے ذیل میں)۔

اہل بہشت ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر بات چیت کریں گے، (اور ان کی گذشتہ زندگی کے متعلق پوچھیں گے) اور پوچھیں گے، وہ کہیں گے ہم اپنے خاندان میں (انجام کار سے) بہت ڈرا کرتے تھے، پس خدا نے ہم پر بڑا احسان کیا اور ہمیں مہلک عذاب سے بچالیا۔

اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہوتی ہے کہ بہشتی اس دنیا کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو یاد رکھے ہوئے ہیں، جس حالت میں وہ اب ہیں، اس کے ساتھ گذشتہ حالت کا موازنہ بھی کرتے ہیں، یہ بات واضح ہے کہ یہ موازنہ اُن نعمات کی عظمت کو آشکار کر دیتا ہے، جو انہیں اب حاصل ہیں۔

۳۔ کیا بہشت میں ترقی کا امکان بھی ہے؟

اگر چہ اس سوال کا جواب بھی گذشتہ سوال کا جواب دینے سے کسی حد تک معلوم ہو گیا لیکن ضروری ہے کہ ایک واضح جواب دیا جائے، وہ یہ ہے! یقینی طور پر وہاں بھی آگے بڑھنے کے امکانات ہیں، بہشتی ایک جگہ پر ٹھہر نہیں جائیں گے بلکہ خدا کے لطف و کرم کے سائے میں روز بروز اس کی ذات کے قریب تر ہوتے جائیں گے، خدا کے نزدیک پہنچنے کے لئے اس راستے میں وہ آگے بڑھتے رہیں گے۔

اس بات کا یہ طلب نہیں ہے کہ وہاں اطاعت، عبادت یا کچھ اعمال کی ذمہ داری ہوگی بہشت فریضے اور ذمہ داری کی جگہ نہیں ہے کیونکہ ذمہ داری کے لئے جن بنیادی عناصر کی ضرورت ہوتی ہے وہ وہاں پر نہیں ہوں گے، بلکہ انہوں نے اس دنیا میں جو اعمال انجام دیئے ہیں اُن کے سائے میں اپنی ترقی اور ارتقاء کے اس سفر کو آگے بڑھاتے رہیں گے، بالکل ان بہت زیادہ پھل دینے والے درختوں کے مانند جنہیں انسان ایک دفعہ لگا دیتا ہے، پھر وہ ہمیشہ بیج اگاتے ہیں، اُن کی جڑیں آگے پھیلتی ہیں اور کسی اور جگہ سے سر نکال لیتے ہیں اور دشت و صحرا پر چھا جاتے ہیں، یا اُن خلائی جہازوں کی طرح جنہیں پہلی حرکت اور زمین کی کشش کے دائرہ کار سے باہر نکلنے کے لئے ایک بڑی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس دائرے سے نکلنے کے بعد کسی اور نئی توانائی کے بغیر آخر تک آگے بڑھتے رہتے ہیں، البتہ اگر راستے میں کوئی رکاوٹ نہ آئے تو۔

قرآن کی بعض آیات میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، سورہ مریم کی آیت ۶۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

ولهم رزقهم فيها بكرة وعشيا

بہشت میں ہر صبح و شام اُن کے لئے رزق مقرر ہے۔

اس آیت سے جو پہلی آیات ہیں اُن سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ یہ صفت آخرت کی بہشت کے لئے ہے، جسے ''جنات عدن'' کہتے ہیں نہ کہ برزخ والی بہشت کے لئے، اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن کی بعض دوسری آیات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہشتی جو کچھ بھی چاہیں اور جس وقت بھی چاہیں، اُن کے لئے آمادہ اور تیار ہوگا، یہ کون سی نعمت اور عطا ہے جو ہر صبح و شام انہیں عطا کی جائے گی؟

یقینا یہ ایک نئی معنوی اور مادہ نعمت ہو گی جو انہیں ان دو وقتوں میں عطا کی جائے گی، جس کے نتیجے میں اُنہیں اوپر والے درجات پر فائز کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں نبی اکرمؐ کی ایک بڑی معنی خیز حدیث ذکر ہوئی ہے جو اس بات کو پوری طرح واضح کر دیتی ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا:

وتاتیهم طرف الهدایا من الله تعالیٰ لمواقیت الصلاة التی کانوا یصلون فیها فی الدینا تسلم علیهم الملئکة۔

خدا کی جانب سے اُن کے لئے بڑے قیمتی اور خوبصورت تحفے لائے جائیں گے، اُن اوقات میں جن میں وہ اس دنیا میں نماز پڑھتے تھے فرشتے ان پر درود و سلام بھیجیں گے۔[1]

آیت کی تعبیرات کو دیکھ کر ایک اور سوال جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ بہشت میں تو دن رات ہی نہیں ہوں گے، اس لئے اس میں صبح وشام ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس سوال کا جواب بھی یوں دیا جا سکتا ہے کہ بہشت میں اگر چہ دائمی طور پر نور اور روشنی ہوگی لیکن اس نور میں ایک حرکت ہوگی، اس نور کے گھٹنے اور بڑھنے سے بہشتی دن اور رات کا اندازہ لگا لیا کریں گے، بالکل قطب شمالی یا قطب جنوبی پر بسنے والے لوگوں کی طرح جہاں پر چھ مہینے مسلسل دن رہتا ہے، یہ لوگ روشنی کے کم یا زیادہ ہونے سے دن اور رات کا اندازہ لگا لیتے ہیں، چونکہ یہ دو سوال (نئے رزق اور صبح وشام سے متعلق سوالات) بہت سے مفسرین سے حل نہیں ہو سکے اس لئے انہوں نے اس آیت کی کئی توجیہات کی ہیں جن میں سے اکثر آیت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں، مثلا یہ کہ یہ نعمت کے دوام کے لئے کنایہ ہے، کیونکہ عرب میں یہ رواج تھا کہ جن کے پاس صبح اور شام کے لئے کھانا ہوتا تھا اُسے وہ بے نیاز سمجھتے تھے، یا یہ کہ وہ نعمتیں مختلف وقفوں سے جن کی مقدار ہمارے دن رات کے برابر ہے، ان کے پاس پہنچتی رہیں گی۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ سب آیت کے ظاہر سے ہم آہنگ نہیں، اس سے بہتر اور کون سا معنی ہو سکتا ہے کہ وہاں پر بھی ہم ایک دن اور رات کا تصور کریں جن کا اندازہ نور کے بڑھنے اور گھٹنے سے لگایا جا سکے گا، اسی طرح ایک نئے رزق کا تصور کریں جس کا سرچشمہ خدا کا لطف و کرم ہو جو اس ارتقاء اور تکامل کے راستے پر آگے بڑھنے کی خوشخبری سنائے، یہ معنی آیت کے ظاہر سے ہم آہنگ ہے یا کم از کم اس میں ظاہر کے ساتھ کم اختلاف پایا جاتا ہے۔

نبی اکرمؐ کی ایک حدیث ہے:

والذی انزل الکتاب علی محمد ان اهل الجنة لیزدا دون جمالا و حسنا

---

[1] تفسیر روح المعانی، ج ۱۶ ص ۱۰۳، قرطبی، ج ٦ ص ۴۱۶٦ (زیر نظر آیت کے ذیل میں)

كما يزدادون في الدنيا قباحة وهرما۔

اس خدا کی قسم جس نے محمدؐ پر قرآن نازل کیا اہل بہشت کا حسن و جمال بڑھتا رہے گا (ان کا جتنا بھی وقت گزرتا جائے گا) جیسا کہ اس دنیا میں (زمانے کے گزرنے کے ساتھ) ان کی بدصورتی اور بڑھاپا بڑھتا رہتا تھا۔[1]

یہ حدیث بھی اہل بہشت کے تدریجاً ارتقاء اور ترقی کی بات کرتی ہے، یہ اگرچہ صرف جسمانی پہلو کی جانب اشارہ کر رہی ہے لیکن یہ بات قطع ہے کہ روحانی اور معنوی پہلو بدرجہ اولیٰ اس میں شامل ہیں۔

---

[1] علم الیقین ص ۱۰۳، (بحوالہ ''معاد'' گفتار ظرفی)۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جہنم اور جہنمی:

۱۔ جہنم کس کے لئے ہے؟ (جہنم کے راہی)

۲۔ جہنم کی ماہیت اور اس کا فلسفہ

۳۔ جہنم کے دروازے اور اُس کے درجات

۴۔ اہل جہنم کے جسمانی عذاب

۵۔ اہل جہنم کے روحانی عذاب

۶۔ سزاؤں کی ہمیشگی

۷۔ ہلکے اعمال والے

(ا) جہنم کس کے لئے ہے؟

اشارہ:

اگر چہ قاعدے کے مطابق سب سے پہلے جہنم کی ماہیت اوراس کے اوصاف کے بارے میں بحث ہونی چاہیے اور دوسرے مرحلے میں اہل جہنم کے بارے میں، لیکن چونکہ قرآن کی سنت اورروش یہ رہی ہے کہ اس طرح کی بحثوں میں ہمیشہ تربیتی اموراوراس کے اخلاقی، اجتماعی اورانسانی نتائج پر بہت تاکید کرتا ہے، لہٰذا ہم بھی اس مثبت روش کی پیروی کرتے ہوئے پہلے ان افراد کے بارے میں گفتگو کریں گے جو اس عظیم سزا کے مستحق ہیں تا کہ اہل جہنم کے بارے میں نازل شدہ آیتوں کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے اس امر میں اسلام کی منطق سے آشنا ہوں۔

دوزخیوں کے بارے میں نازل شدہ آیتیں بہت زیادہ ہیں، لہٰذا ہم ہر حصے سے چند نمونے اور مصادیق بیان کریں گے، اس ضمن میں ان آیات کی مختلف تعبیروں سے گناہوں کا آپس میں فرق اور ان کی کراہت کے درجات کا بھی پتہ چل جاتا ہے، اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اور جہنمیوں کے مختلف طبقوں کے بارے میں قرآن کی آیتوں کی روشنی میں تحقیق کرتے ہیں۔

ا۔ کفار اور منافقین:

دوزخ میں جانے والوں میں پہلا گروہ کفار اور منافقین کا ہے، قرآن مجید سورہ نساء کی آیت ۱۴۰ میں یوں کہتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ﴿۱۴۰﴾

خدا تمام منافقین اور کافروں کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔

سورہ توبہ کی آیت ۴۹ میں ہم پڑھتے ہیں:

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾

جہنم نے کافروں کا احاطہ کر رکھا ہے۔

سورہ نساء کی آیت ۱۴۵ میں یوں بیان ہوا ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾

منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہیں اور تم اُن کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔

حقیقت میں گناہوں اور آلودگیوں کا سب سے اہم اور وسیع سرچشمہ کفر، بے ایمانی اور نفاق ہی ہے کیونکہ جب تک ایمان کا نور انسان کے باطن اور روح کو جلا نہ بخشے اور وہ شرک، کفر اور نفاق سے خالص نہ ہو جائے، کار خیر کا موثر انگیزہ اس میں پیدا نہیں ہوسکتا اور وہ صرف مادی اور

شہوانی محرکات کا اسیر رہے گا، اس طرح کے محرکات کے انسان پر حاکمیت کا نتیجہ کسی سے پوشیدہ نہیں، اس کے نمونے دنیا کے موجودہ ظالموں کے ظلم میں کامل طور پر نمایاں ہیں، کفر حق کو چھپانے کے معنی میں ہے اور نفاق ظاہر اور باطن کی دوگانگی کے معنی میں ہے (یعنی ایمان کا اظہار اور کفر کا چھپانا) انسانی معاشرے کی اصلاح کے راستے میں سب سے اہم رکاوٹ یہ دو چیزیں ہیں، لہٰذا دوزخ اور اہل دوزخ سے مربوط بہت سی آیتیں ان دو گروہوں کے بارے میں ہیں۔

۲۔ لوگوں کو خدا تک پہنچنے سے روکنا:

قرآن کریم نے لوگوں کو پیغمبر اسلامؐ اور آیات قرآنی کے حوالے سے دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے اور کہا ہے:

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ط وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ۝

ان میں سے کچھ لوگ اس پر ایمان لائے اور کچھ نے اس کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کی جن کے لئے آتش دوزخ کا بھڑکتا شعلہ کافی ہے۔ (نساء۔ ۵۵)

قرآن مجید کی آیتوں میں (راہ خدا میں حائل) اس گروہ کے لئے بہت سی تہدیدات نظر آتی ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جو نہ صرف خود گمراہ ہیں بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے پر مصر ہیں، گویا اس طرح انہیں لذت ملتی ہے، بلکہ لوگوں کے کفر اور بے ایمانی ہی میں انہیں اپنے ناجائز مفادات نظر آتے ہیں کیونکہ ایک مومن اور الٰہی اقدار کی حامل اور معتقد قوم کبھی بھی فرعونوں، شیطانوں اور ان کی پارٹیوں کی پیروی نہیں کر سکتی، لہٰذا لوگوں پر تسلط پانے کا تنہا راستہ ہی ان سے گوہر ایمان کا چھین لینا ہے، امتوں کی تاریخ اس کی بہترین گواہ ہے کہ یہ فاسد گروہ ہمیشہ لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے، آج کے دور میں بھی استکباری حکومتوں اور جمعیتوں کی پوری کوشش یہی ہے کہ لوگوں کو ایمان باللہ اور الٰہی اقدار سے محروم کر دیں تا کہ وہ ان کے مفادات کے حصول کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔

۳۔ ترک اطاعت خدا اور مسلمانوں کی صفوں میں تفرقہ بازی

سورہ جن کی آیت ۲۳ میں ہے:

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۲۳[۱]

[۱] الجن: ۲۳

جو لوگ خدا اور رسول کی نافرمانی کریں ان کیلئے جہنم کی آگ ہے اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

سورہ نساء کی ۱۱۵ ویں آیت میں یوں بیان ہوتا ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ

الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۚ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۱۱۵

۲ النساء:۱۱۵

جو بھی حق کے ظاہر ہونے کے بعد پیغمبرؐ کی مخالفت کرے اور مومنین کے رستے کے بجائے کسی اور رستے پر چلے ہم بھی اسے اسی راہ پر چلائیں گے، جس پر وہ چلتا ہے اور ہم اُسے جہنم کی آگ میں جلائیں گے، اور وہ کیا برا ٹھکانا ہے۔

''یشاقق''، ''شقاق'' کے مادے سے ہے اور ایسی عمداً مخالفت کے معنی میں ہے جس میں دشمنی بھی شامل ہو، دشمنی سے مخالفت کرنے کے بعد کا یہ جملہ من بعد ما تبین له الهدیٰ (ہدایت کا راستہ اس کے لئے واضح ہونے کے بعد) بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس مخالفت کا سرچشمہ ہٹ دھرمی اور عناد ہی ہے، اور یہ مسلمانوں کی صفوں میں تفرقہ اور اختلاف پیدا کرنے کے لئے ہے۔ واضح ہے کہ ایسے افراد جہنمیوں کا واضح ترین مصداق ہیں۔

۴۔ الٰہی آیات کا تمسخر

اگرچہ آیات خداوندی کا مذاق اڑانا کفر اور بے ایمانی کی دلیل ہے اور کفر دوزخ میں جانے کا سبب ہے، تاہم قرآنی آیات میں اس چیز کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے اور اسے دوزخ میں لے جانے والے اسباب میں سے ایک اہم سبب گردانا گیا ہے، سورہ کہف کی آیت ۱۰۶ میں یوں مخاطب ہے:

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ۱۰۶

۲ الکہف:۱۰۶

ایسوں کی سزا جہنم ہے کیونکہ وہ کافر ہو گئے ہیں اور میری آیات اور میرے رسولوں کا تمسخر اڑاتے ہیں۔

حق کا مذاق عموماً جہل، عناد، تعصب، ہٹ دھرمی، دشمنی اور عداوت کی وجہ سے اُڑایا جاتا ہے اور ان امور میں سے ہر ایک جہنم کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے، اس بناء پر اگر استہزاء کرنے والوں کی جگہ دوزخ یا جہنم کے بدترین مقامات ہوں تو تعجب کا مقام نہیں جب کہ یہ لوگ زیادہ تر انبیاء اور اولیاء اللہ ہی کا تمسخر اُڑاتے رہے ہیں:

۵۔ عقل، آنکھ اور کان سے کام نہ لینے والے

ایک اور گروہ جو واقعاً جہنم کا حقدار ہے ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو معرفت اور شناخت کے دروازے اپنے آپ پر بند کر دیتے ہیں، خداداد عقل کا دروازہ بند کر دیتے ہیں، آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اپنے کانوں میں یوں روئی ٹھونستے ہیں کہ حق کی صدا اندر جا ہی نہ سکے، اور

حقیقت کے خوبصورت چہرے کو نہ دیکھ سکیں اور جو چیزیں بیداری و ہوش کا موجب بنتی ہیں ان میں تعقل نہ کریں، قرآن مجید سورہ اعراف کی ۱۷۹ ویں آیت میں یوں فرماتا ہے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ [۷:۱۷۹]

ہم نے یقیناً بہت سے جنوں اور انسانوں کو دوزخ کے لئے بنایا ہے، اُن کے پاس ایسے دل (اور عقلیں) ہیں، کہ جن سے وہ سوچتے ہیں، ایسی آنکھیں ہیں کہ جن سے دیکھتے نہیں اور ایسے کان رکھتے ہیں کہ جن سے سنتے ہیں، وہ چوپایوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی گمراہ تر ہیں وہ غفلت میں پڑے ہیں۔

واضح ہے کہ یہ بنانا ہرگز جبری نہیں ہے اور فخر رازی کی طرح کے بعض طرفداران جبر کا اپنے نظریے کے اثبات کے لئے اس سے استدلال قائم کرنا بالکل بے بنیاد ہے چونکہ اس استدلال کا جواب خود آیت میں موجود ہے، آیت کہتی ہے کہ ہم نے تمام اسباب معرفت اُن کے اختیار میں دیئے ہیں۔ (عقل امور عقلیہ کے ادراک کے لئے آنکھ امور محسوسہ کے مشاہدے کے لئے اور کان علوم نقلی کے لئے) لیکن وہ ان اسباب سے استفادہ نہیں کرتے اور بہرہ مند نہیں ہوتے (غور کیجئے گا)۔

اسی لئے فرماتا ہے کہ وہ لوگ حیوانیت کی حد تک جا پہنچتے ہیں بلکہ اس سے بھی نیچے گر جاتے ہیں کیونکہ اگر حیوان ادراک اور فہم نہیں رکھتا تو اس وجہ سے ہے کہ اسباب اس کے پاس نہیں اور وہ اختیار نہیں رکھتا، حیوان سے زیادہ گمراہ وہ ہیں جو ان وسائل اور اسباب اور ان سے استفادہ کرنے کا امکان ہونے کے باوجود ان سے بہرہ مند نہیں ہوتے، ان تمام امور کا سرچشمہ غفلت اور بے خبری ہے جس کی طرف آیت میں اشارہ ہوا ہے، ”اولئك هم الغفلون“ اسی معنی سے مشابہ مطلب سورہ ملک کی ۱۰ ویں آیت میں یوں مذکور ہے کہ جہنمی داروغوں اور عذاب کے فرشتوں کے جواب میں اہل جہنم کہیں گے اگر ہم سنتے اور اپنی عقل استعمال کرتے تو ہرگز دوزخیوں میں سے نہ ہوتے ”وقالو لو كنا نسمع او نعقل ما كنا في اصحب السعير“۔

حقیقت میں انسان کی تمام بدبختیوں کی جڑ اور اُم الفساد یہی ہے کہ عقل، کان اور آنکھ کو وہ استعمال نہیں کرتا اور ان عظیم الٰہی سرمایوں سے شناخت اور معرفت کے لئے استفادہ نہیں کرتا، ایسا نہیں ہے کہ خدا نے معرفت کے یہ سرچشمے اور منابع اسے نہ دیئے ہوں بلکہ اس کے پاس موجود ہیں، لیکن وہ فائدہ نہیں اٹھاتا۔

۶۔ شیطان کی پیروی:

خدا کے غضب اور قہر میں مبتلا ہونے کے عوامل میں سے ایک اہم عامل شیاطین کے سامنے سر تسلیم خم کرنا، اپنے تمام امور کی باغ ڈور

ان کے سپرد کر دینا ہے جیسا کہ قرآن سورہ اعراف کی ۱۸ ویں آیت میں کہتا ہے: جب شیطان کو بارگاہ الٰہی سے نکالا جا رہا تھا تو خدا نے اس سے یوں کہا:

قَالَ اخۡرُجۡ مِنۡهَا مَذۡءُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ؕ لَمَنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنۡكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ۝۱۸

فرمایا کہ اس (جگہ) سے ذلت اور رسوائی کے ساتھ نکل جاؤ، انسانوں میں جو بھی تمہاری پیروی کرے گا میں قسم کھاتا ہوں کہ جہنم کو ان سب سے بھر دوں گا۔

اگرچہ اس آیت میں خصوصیت سے شیطانوں کے سردار ابلیس کے بارے میں بات ہوئی ہے لیکن ہمیں یہ معلوم ہے کہ ابلیس کے پیروکار شیطانوں کا طریقہ کار ہر جگہ ایک سا ہی ہوتا ہے اور شیاطین جن وانس کی پیروی ہے اور ان تمام پیروکاروں کا انجام جہنم ہے، جھوٹے وعدے، دعوت گناہ، نیکیوں کی نہی، انحرافات کی تشویق اور شہوات کو خوبصورت دکھا کر وہ اپنے پیروکاروں کو خدا سے دور کرتے ہیں اور انہیں اُس کے قہر وغضب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ [1]

۷۔ تکبر اور سرکشی:

تکبر خواہ خالق کے مقابلے میں ہو یا مخلوق کے مقابلے میں یا حقائق کے مقابلے میں ہو (یعنی انسان سے روگردانی کرے) جہنم میں گرنے کے اسباب میں سے ایک سبب ہے، استکبار (خود کو بڑا سمجھنا) جو کہ بہت سے مظالم، جرائم اور حق تلفیوں کا سرچشمہ ہے، تکبر ہی کی طرح ہے اور انسان کو خدا کے قہر وغضب کے اس مرکز میں لے جاتا ہے، قرآن مجید سورہ زمر آیت ۶۰ میں یوں فرماتا ہے:

اَلَيۡسَ فِىۡ جَهَنَّمَ مَثۡوًى لِّلۡمُتَكَبِّرِيۡنَ۝۶۰ ﴿الزمر: ۶۰﴾

کیا جہنم میں متکبروں کا ٹھکانا نہیں ہے؟

نیز سورہ اعراف کی آیت ۳۶ میں فرماتا ہے:

وَالَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَاسۡتَكۡبَرُوۡا عَنۡهَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ۝۳۶

جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور اُن کے مقابلے میں تکبر کیا وہ اہل نار میں سے ہیں اور ہمیشہ اس میں

---

[1] اسی سے ملتا جلتا مفہوم سورہ لقمان آیت ۲۱ ۱ اور سورہ ابراہیم آیت ۲۲ میں بھی آیا ہے۔

رہیں گے۔[۱]

یہی مطلب قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی آیا ہے، سورہ ابراہیم کی آیت ۱۵ اور ۱۶ میں ''جباران عنید'' کے بارے میں فرماتا ہے:

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ

انہوں (اللہ کے رسولوں) نے خدا سے کامیابی کی دعا مانگی (اور اُن کی دعا قبول ہوئی) اور ہر جبار عنید نا اُمید ہوا اور نقصان میں رہا، دوزخ اُن کے پیچھے ہے اور انہیں غلیظ پانی پلایا جائے گا۔

''جبار'' کے مختلف معانی ہیں ان میں ایک معنی غلبہ، بالا دستی اور تسلط ہے، لیکن کبھی یہ امر رحمانی پہلو سے ہے مثلاً خدا کا عالم ہستی اور ہر شئے پر تسلط اور اس کی بالا دستی، اور کبھی شیطانی پہلو سے ہے، مثلاً ظالموں، سرکشوں اور جباروں کا تسلط، غلبہ اور بالا دستی، ''لسان العرب''[۲] کے بقول عنید وہ شخص ہے جو سیدھے راستے سے منحرف ہو جائے اور جانتے ہوئے حق کا انکار کرے، یہ تمام چیزیں تکبر، غرور اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کے آثار ہیں، اگر تھوڑا سا بھی غور کیا جائے تو سمجھ آتی ہے کہ یہ اخلاقی پستی، معرفت اور شناخت کی راہ میں ایک اہم حجاب ہے اور انسان کی گمراہی، حق کشی، دوسروں کے حقوق کی پائمالی اور دوسرے مختلف گناہوں کے عوامل میں سے ایک عامل ہے۔[۳]

۸۔ظلم اور بیداد:

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں ظالموں اور ستم گروں کو جہنم کی آتش سوزاں کی دھمکی دی گئی ہے اور جو تعبیریں ان کے بارے میں وارد ہوئی ہیں کسی اور کے بارے میں کم دکھائی دیتی ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام ظلم و ستم کے ترک کرنے کو کتنی اہمیت دیتا ہے، سورہ کہف کی آیت ۲۹ میں سخت تہدید کے ساتھ فرماتا ہے:

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا، اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا، وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ، بِئْسَ الشَّرَابُ، وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا

---

[۱] اس سے ملتا جلتا مفہوم سورہ مومن کی آیت ۶۰، ۷۲، ۷۶۔ اعراف آیت ۴۰، ۴۱، نبا آیت ۲۱، ۲۲، نازعات کی ۳۷ اور سورہ ص کی آیت ۵۵، ۵۶ میں بھی آیا ہے۔

[۲] ابن منظور کی عربی لغات پر مبنی گراں قدر کتاب جو ۱۸ جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

[۳] اس سے ملتی جلتی تعبیر مدثر کی آیت ۱۶ اور ق کی آیت ۲۴ میں آئی ہے۔

۲ الکہف:۲۹

ہم نے ستمگروں کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے جو ہر طرف سے اُن پر محیط ہے، جب وہ پیاسے ہوں گے اور پانی طلب کریں گے تو اُن کے لئے سرخ دھات کی طرح گرم پانی لایا جائے گا جو اُن کے چہروں کو جھلسا دے گا، کتنا برا مشروب اور کتنا برا ٹھکانا ہے۔

ایک اور سخت عبارت میں سورہ جن کی آیت ۱۵ میں فرماتا ہے:

"واما القاسطون فکانوا لجھنم حطبا"

ظالم لوگ جہنم کی آگ کا ایندھن ہیں۔

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی آگ اُن کے اندر سے بھڑکے گی اور وہ جس طرح اس دنیا میں مظلوموں کے لئے آتش سوز اں کی حیثیت رکھتے تھے وہ کہ جو "تجسم اعمال کا عالم ہے وہاں پر ان کا وجود سراپا آگ ہوگا، ظالم اور ستم گر قوموں کے لئے اس سے زیادہ مناسب اور واضح تعبیر استعمال نہیں ہوسکتی۔[۱]

۹۔ظالموں کا سہارا لینا

نہ صرف ظلم اور ستم ظالموں کو خدا کے قہر و غضب کے مرکز جہنم بھیجنے کا باعث بنے گا بلکہ قرآن مجید کے بقول جو لوگ ظالموں کا سہارا لیں گے یا (ان کی نصرت اور معاونت کریں گے) وہ بھی اس آیت کا مصداق ہوں گے، اس لئے فرمایا گیا ہے:

"ولا ترکنوا الی الذین ظلموا افتمستکم النار وما لکم من دون اللہ من اولیآء ثم لا تنصرون" ظالموں کا سہارا نہ لینا ورنہ آگ تمہیں گھیر لے گی اور خدا کے علاوہ تمہارا کوئی ولی اور سرپرست نہیں ہو گا (اور کوئی بھی تمہاری مدد کو نہیں پہنچے گا)۔(سود ۱۱۳)

ارباب لغت کے مطابق "ترکنوا" "رکون" کے مادے سے ہے اور اس کا معنی کسی شے پر اعتماد، میلان اور اس کی خواہش ہے جس کا لازمہ قوت اور قدرت ہے کیونکہ انسان ایسی چیز پر اعتماد کرتا ہے جو طاقت ور ہو، لہٰذا کلمہ رکن کا اطلاق ایسے ستون یا دیوار پر ہوتا ہے جو کسی عمارت یا اور چیز کو کھڑا ہونے میں مدد دے۔[۲]

---

[۱] اس سے مشابہ تعبیر سبا آیت ۴۲، زخرف کی آیت ۶۵، آل عمران کی آیت ۱۵۱، مائدہ کی آیت ۱۲۹، ابراہیم کی آیت ۲۲، مریم کی آیت ۷۲، اعراف کی آیت ۲۹ اور شوریٰ کی آیت ۴۵ میں آئی ہے۔

[۲] مصباح اللغه۔ صحاح اللغه والتحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔

اس بات کے پیش نظر مندرجہ بالا آیت ظالموں کے لحاظ سے بھی مطلق ہے اور ''رکون'' کی تعبیر کے لحاظ سے بھی اور کسی بھی ظالم سے کسی بھی قسم کی وابستگی اور اعتماد اس کے مفہوم میں شامل نہیں ہے۔

آیت کہتی ہے کہ بالآخر ان سب کا انجام عذاب الٰہی میں مبتلا ہونا ہے بلکہ دنیا میں بھی ناکامی اور بدبختی کے علاوہ کوئی ثمر انہیں نہیں ملے گا کیونکہ جب ظالم طاقت ور ہو جائیں گے تو وہ اُن پر بھی رحم نہیں کریں گے، بہرحال جب ظالموں کا سہارا لینا اس طرح باعث بدبختی ہو جائے تو مسلمان کی تقویت اور مدد بطریق اولیٰ انسان کو جہنم کی طرف کھینچ لے جائے گی، اس دلیل کی بناء پر قرآن نے صراحت سے کسی بھی طرح کے گناہ اور ظلم سے تعاون اور مدد کرنے سے منع کر دیا ہے اور فرمایا ہے:

وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (سورہ مائدہ: آیۃ ۲)

اسلامی روایت میں بھی ان لوگوں کے لئے جو کسی بھی طرح سے ظالموں کی مدد کریں اور حتیٰ کہ ایک ظالمانہ حکم کے لکھنے کے لئے قلم یا دوات تک بھی مہیا کریں سخت ترین عذاب اور سزاؤں کا ذکر ہوا ہے جس کی تفصیل انشاءاللہ مناسب موقع پر بیان ہوگی۔

۱۰۔ آخرت کا بھول جانا

سورہ جاثیہ کی آیت ۳۴ میں اس بارے میں یوں بیان ہوتا ہے:

وقیل الیوم ننسکم کما نسیتم لقآء یومکم ھذا وما ولکم النار وما لکم من نصرین۔

(خدا کی طرف سے) اُن سے کہا جائے گا آج ہم تمہیں بھول جاتے ہیں جس طرح تم آج کی ملاقات کو بھول بیٹھے تھے، تمہارا ٹھکانا آگ ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں۔

قیامت کی الٰہی عدالت کو بھول جانا برائیوں کی تمام اقسام کا سرچشمہ اور گناہوں اور ظلم وفساد کے دلدل میں پھنس جانے کا سبب ہے، یہی اعمال باعث بنتے ہیں کہ خدا بھی ان سے بھولنے والوں کی طرح سلوک کرے۔

مسلماً ہر چیز میں خدا کا حضور اور تمام اشیاء پر ہر حال میں اس کا علمی احاطہ اس طرح سے ہے کہ اس میں فراموشی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان بھول جانے والے انسانوں کے ساتھ وہ بھی بھولنے والا سلوک ہی کرتا ہے یعنی اپنا لطف، رحمت اور عنایت اُن سے بالکل منقطع کر دیتا ہے اور اس صورت میں نجات کا ہر راستہ ان پر بند ہو جاتا ہے اور ان کے لئے دوزخ (خدا کے غضب کے مرکز) میں گرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔[1]

---

[1] اسی طرح کا مفہوم سورہ ص کی آیت ۲۶ اور الم سجدہ کی آیت ۱۴ میں مذکور ہے۔

۱۱۔دُنیا پرستی

تمام گناہوں کا اصل سرچشمہ دنیا کی محبت ہے اوران اہم عوامل میں سے ہے جو بہت سے انسانوں کو جہنم کی طرف لے جاتا ہے جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۱۸ میں بیان ہوتا ہے:

من كان يريد العاجلة عجلنا له فيها ما نشآء لمن نريد ثم جعلنا له جهنم يصلها مذموما مدحورا۔

جوشخص صرف (مادی دنیا کی) زودگذر زندگی کا خواہاں ہو، جتنا چاہیں گے اور جسے چاہیں گے اس میں سے دے دیں گے، پھراس کے لئے جہنم قرار دیں گے وہ ایسی حالت میں آگ میں جلے گا کہ راندہ درگاہ خدا ہوگا۔

یعنی ایسا ہرگز نہیں ہے کہ دنیا پرست لوگ اپنی تمام خواہشات اور مقاصد تک پہنچ سکیں، بلکہ ممکن ہے ہزاروں کوششوں، طرح طرح کے گناہوں اور جرائم کے ارتکاب کے بعد بھی اپنے بعض مقاصد تک ہی پہنچ سکیں، لیکن خدا کے قہر وغضب کا مرکز دوزخ ان کے انتظار میں ہے، لہذا ان کے جسموں کو بھی جلا یا جائے گا اور مذموم ومدحور ہونے اور راندہ درگاہ خدا ہونے کی وجہ سے ان کی روح کو بھی جلا ڈالے گا۔[1]

۱۲۔زراندوزی

اگر چہ زراندوزی دنیا پرستی کے مظاہر میں سے ایک ہے لیکن قرآن نے خصوصی طور پر اس موضوع کا آتش جہنم میں مبتلا ہونے کے اسباب میں سے ایک سبب کی حیثیت سے ذکر کیا ہے اور یوں فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾

اور وہ لوگ جو سونا اور چاندی جمع کرتے رہتے ہیں اور اُسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے پس آپ انہیں دردناک عذاب کی بشارت دیں، جس دن (یہ سونا، چاندی اور سکے) جہنم کی آگ میں تپائے جائیں گے پھر اس سے

---

[1] اسی طرح کا مفہوم سورہ نازعات کی آیت ۳۷ میں بھی استعمال ہوا ہے کہ جو شخص دنیا کو آخرت پر ترجیح دے اس کی جگہ دوزخ ہے۔

اُن کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی اور (ان سے کہا جائے گا) یہی ہے جو تم اپنے لئے جمع کرتے تھے، پس تم مزہ چکھو اس کا جو تم جمع کیا کرتے تھے۔ (توبہ۔ ۳۴،۳۵)[۱]

اس آیت میں بہت سے نکات اور ابحاث ہیں جو اپنی جگہ پر بیان ہوں گے، لیکن یہاں پر دو نکتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، پہلا یہ کہ کس قدر مال جمع کرنا کنز کہلاتا ہے؟ یہ ایسا موضوع ہے جو مفسرین کے مابین بہت زیر بحث رہا ہے بہت سی شیعہ اور سنی روایات میں جو کچھ ملتا ہے اور بہت سے مفسرین نے جسے قبول کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہر وہ مال کہ جس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے وہ کنز محسوب نہیں ہوتا۔

ای مال ادیت زکاته فلیس بکنز[۲]

البتہ ممکن ہے ہنگامی اور غیر معمولی مواقع پر جب اسلامی معاشرے کی مصلحتوں کی حفاظت کا تقاضا ہو تو اسلامی حکومت کی جانب سے مال جمع کرنے پر پابندیاں اور حدود عاید کر دی جائیں، (جیسا کہ بعض روایات میں علی علیہ السلام سے منقول ہے) بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ممکن ہے کسی خاص موقع پر اعلان کیا جائے کہ لوگ اپنا تمام ذخیرہ شدہ مال اسلامی معاشرے کے وجود کی حفاظت کی خاطر خرچ کریں، (جیسا کہ بعض روایات میں قیام حضرت مہدیؑ کے بارے میں آیا ہے) لیکن ان میں سے کوئی بھی کلی قانون نہیں ہے، کنز کا اصلی قانون وہی ہے جو اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔

دوسرا یہ کہ کیوں قرآن کہتا ہے کہ ان کی پیشانی اور پہلو داغے جائیں گے، ممکن ہے یہ اُس طرز عمل کی وجہ سے ہو جو انہوں نے محروم اور ستم دیدہ لوگوں سے روا رکھا تھا، پہلے اُن کے چہروں اور پیشانیوں پر بل پڑ جاتے تھے، پھر وہ بے اعتنائی برتتے ہوئے ان سے گریز کرتے تھے، ان سے منہ موڑ لیتے تھے، لہٰذا اسی ترتیب سے ان کی پیشانی، پہلو اور اُن کی پیٹھیں انہی سکوں سے داغی جائیں گی جن سے انہوں نے محرومیوں کے دل جلائے تھے۔

۱۳۔ جہاد سے فرار

ہم جانتے ہیں کہ اسلامی نکتہ نگاہ سے عظیم گناہوں میں سے ایک گناہ یہی ہے یہ ایک ایسا گناہ ہے جو مسلمانوں کی شکست، ذلت، خواری اور بدبختی کا سرچشمہ ہے اور اس کی سزا بھی سخت ترین سزاؤں میں سے ایک ہے، قرآن کہتا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾
وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ

[۱] اسی طرح کا مفہوم سورہ ہمزہ کی آیت ۲ سے ۶ تک، سورہ حاقہ کی آیت ۲۸ سے ۳۱ تک اور سورہ تبت کی آیت ۲ اور ۳ میں بیان ہوا ہے۔
[۲] زیادہ تشریح کے لئے تفسیر نمونہ کی جلد نمبر ۷ صفحہ ۳۹۴ (فارسی) کے بعد والے حصے کی طرف رجوع فرمائیے۔

بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ⑯

اے ایمان لانے والو! جب میدان جنگ میں کافروں کی عظیم جماعت کا سامنا کرو تو ان کی طرف پیٹھ نہ کرو۔ جو بھی اس وقت ان کی طرف پیٹھ کرے گا سوائے اس کے کہ اس کے میدان سے باہر نکلنے کا مقصد دوبارہ حملے کی تیاری یا (مجاہدین کی) کسی جماعت سے جا ملنا ہو، الٰہی غضب میں مبتلا ہوگا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ کتنا برا ٹھکانا ہے! (انفال۔۱۵،۱۶)

ارباب لغت [۱] کے بقول ''زحف'' کا مطلب زمین پر پاؤں کھینچتے ہوئے حرکت کرنا ہے جیسا کہ بچے اپنے چلنے کے آغاز میں حرکت کرتے ہیں، یا اونٹ انتہائی تھکن کے عالم میں جس طرح حرکت کرتا ہے، پھر یہ لفظ ایک بڑی جماعت کی حرکت کے معنی میں استعمال ہوا کیونکہ لوگوں کی کثرت کی وجہ سے ایسا لگتا ہے کہ گویا وہ زمین پر گھسٹتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہوں۔

بہر حال یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دشمنوں کی تعداد خواہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، باعث نہیں بن سکتی کہ مسلمان اپنے لشکر کے کمانڈر کے حکم کے بغیر پسپائی اختیار کریں یا دشمن کا مقابلہ کرنے کے بجائے فرار کریں۔

واضح ہے کہ یہ اسلام کا ایک کلی حکم ہے اس لئے بعض مفسرین کا اس حکم کو جنگ بدر سے مختص کرنا بالکل بغیر دلیل کے ہے جیسا کہ تفسیر المیزان میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے [۲]، خصوصاً جب کہ یہ آیت جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے۔ [۳] لہٰذا جہاد سے فرار جہنم میں سقوط کے اسباب میں سے ہے۔

۱۴۔ بے گناہوں کا خون بہانا

اسلام میں انسانی خون کا احترام اس حد تک ہے کہ ایک انسان کے خون کو تمام انسانوں کے قتل کے برابر گردانا گیا ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ (مائدہ:۳۲) [۴]

نیز مومن کا خون بہانا ابدی عذاب کا سبب، غضب الٰہی اور عذاب عظیم کا موجب گردانا گیا ہے، لہذا فرمایا گیا ہے:

---

[۱] مقاییس اللغه۔ مفردات راغب اور التحقیق فی کلمات القرآن کریم۔

[۲] تفسیر المیزان جلد ۹، ص ۳۷۔

[۳] بعض پہلوؤں سے اس آیت سے مشابہ مفہوم سورہ توبہ کی آیت ۸۱ میں مذکور ہے۔

[۴] جس شخص نے کسی نفس کو بغیر کسی نفس کے یا فساد فی الارض کے ارتکاب کے قتل کر دیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔

وَمَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيۡهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا ﴿۹۳﴾ [۴:۹۳]

جو بھی کسی مومن کو عمداً قتل کر دے اس کی سزا جہنم ہے، وہ ہمیشہ اس میں رہے گا اور خدا اس پر غضب کرے گا اور اس کو اپنی رحمت سے دور کر دے گا، اور اس نے ایک بڑا عذاب اس کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ (نساء: ۹۳)

اس طرح سے مومن کے قاتل کو چار بڑی اخروی سزاؤں کی دھمکی دی گئی ہے:

۱۔ جہنم میں ہمیشہ رہنا۔

۲۔ غضب الٰہی۔

۳۔ خدا کی لعنت۔

۴۔ عظیم عذاب۔

اس سے اسلام کے نزدیک مومن کے خون کے احترام کا انتہا کا اظہار ہوتا ہے کیونکہ قرآن مجید میں کسی بھی مقام پر ایسی سزا کا ذکر نہیں ہوا ہے۔[1]

۱۵۔ ترک نماز

نماز کے عظیم فریضے کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کی اہمیت کے بارے میں معروف اسلامی کتب میں بے شمار آیتیں اور احادیث وارد ہوئی ہیں، قرآن مجید نے صراحت کے ساتھ اس فریضے کے ترک کرنے کو جہنم میں جانے کے اسباب میں سے قرار دیا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: بہشتیوں کا ایک گروہ (اصحاب الیمین) جب اپنے مقام سے جہنمیوں سے رابطہ قائم کرے گا تو ان سے پوچھے گا "ما سلککم فی سقر" "کس چیز نے تمہیں جہنم بھیجا؟ وہ جواب دیں گے: ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے اور مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور ہمیشہ اہل باطل کے ساتھ ہمنشین ہوتے تھے اور دائماً قیامت کا انکار کرتے تھے۔

قَالُوۡا لَمۡ نَكُ مِنَ الۡمُصَلِّيۡنَۙ ﴿۴۳﴾ [۷۴:۴۳] وَلَمۡ نَكُ نُطۡعِمُ الۡمِسۡكِيۡنَۙ ﴿۴۴﴾ [۷۴:۴۴]
وَكُنَّا نَخُوۡضُ مَعَ الۡخَآئِضِيۡنَۙ ﴿۴۵﴾ [۷۴:۴۵] وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوۡمِ الدِّيۡنِۙ ﴿۴۶﴾ [۷۴:۴۶]

(سورہ مدثر)

اگرچہ اس آیت میں ترک نماز کے علاوہ تین دوسرے گناہوں کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے لیکن ترک نماز کو پہلے گناہ کے عنوان سے

---

[1] یہی مفہوم ایک دوسری سورت میں آل عمران کی آیت ۲۱ میں بیان ہوا ہے۔

بیان کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس الٰہی فریضے کا ترک کر دینا کتنا خطرناک ہے، اس کے علاوہ ان چار امور میں سے ہر ایک مستقلاً دوزخ میں جانے کے اسباب میں سے قرار پا سکتا ہے، (غریبوں کو کھانا نہ کھلانا ظاہراً واجب حقوق کو ادا نہ کرنے کی طرف اشارہ ہے)۔

اسلامی نکتہ نگاہ سے نماز کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ بعض مشہور روایات کے مطابق نامہ اعمال میں سے پہلی چیز جو دیکھی جائے گی وہ نماز ہو گی، اگر نامہ اعمال میں (صحیح طور پر) نماز موجود ہو تو دوسرے اعمال کی طرف نیک نگاہ سے دیکھا جائے گا ورنہ باقی اعمال کی طرف نہیں دیکھا جائے گا، اور ایسے فرد کو دوزخ کی طرف روانہ کیا جائے گا، یہ شاید اس لئے ہو کہ نماز ایمان کا سرچشمہ اور اس کی بقاء کی ضامن ہے اور اس کے ترک سے ایمان کی جڑیں تزلزل کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اور ہم جانتے ہیں کہ اعمال کی قبولیت کی شرائط میں سے ایک شرط "ایمان" ہے اور ایمان کے بغیر کوئی چیز قابل قبول نہیں ہوتی۔

۱۶۔ زکوٰۃ نہ دینا

زکوۃ اسلام کے اہم ارکان میں سے ایک ہے اور اس کا ترک کرنا گناہان کبیرہ میں محسوب ہوتا ہے اور چونکہ قرآن مجید میں اس کو شرک اور تکذیب معاد کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لہٰذا یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ عمل دوزخ میں جانے کا ایک سبب ہے فرمایا گیا ہے:

وویل للمشر کین الذین لا یوتون الزکوۃ وھم بالاخرۃ ھم کافرون

افسوس ہے مشرکوں پر، وہی لوگ جو زکوۃ ادا نہیں کرتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ (حٰم سجدہ: ۶، ۷)

اس آیت سے مفسرین کے درمیان بحث کا ایک سلسلہ چل نکلا ہے اور اس کی تفسیر میں مختلف احتمالات کا ذکر کیا گیا ہے، بات یہ ہے کہ زکات فروع دین میں سے ایک ہے پھر کیسے اس کا ترک کر دینا کفر و شرک کی دلیل بن سکتا ہے؟ بعض مفسرین نے آیت کے ظہور کو معیار قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ زکوٰۃ کا ترک کرنا ہی کفر کی علامت ہے اگر چہ کوئی اس کے حکم ہونے کا انکار نہ کرتا ہو، بعض نے حکم کا انکار کرتے ہوئے زکوۃ نہ دینے کو کفر کی دلیل قرار دیا ہے کیونکہ زکوٰۃ کا وجوب ضروریات اسلام میں سے ہے اور اس کا منکر کافر ہے، اس آیت کی تفسیر کی زیادہ وضاحت اس نکتے سے ہوتی ہے کہ زکوٰۃ کو اسلامی احکامات میں ایک خاص مقام حاصل ہے کیونکہ اس کی ادائیگی اسلامی حکومت کو قبول کر لینے کی علامت اور اس کا ترک کر دینا حکومت اسلامی کے مقابلے میں قیام اطغیان اور سرکشی کے مترادف ہے اور ہم جانتے ہیں کہ حکومت اسلامی کے مقابلہ میں قیام کفر کا موجب ہے۔ (زیادہ وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ کی جلد ۲۰ (فارسی) صفحہ ۲۱۴ سے ۲۲۰ تک کا مطالعہ فرمائیے۔

آیت کنز (توبہ۔ ۳۵) بھی جس کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے، اس بات کی دلیل بن سکتی ہے کہ زکوٰۃ کا ترک کر دینا دوزخ میں چلے جانے کے اسباب میں سے ہے۔

۱۷۔ یتیم کا مال کھانا:

کسی بھی شخص کا مال شرعی جواز کے بغیر کھانا حرام ہے، لیکن یتیموں کے معاملے اس حکم کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے کیونکہ ایک طرف

ان کی شدید ضرورت اور دوسری طرف کسی سر پرست کا نہ ہونا اور پھر اپنا دفاع کرنے کی طاقت نہ رکھنا باعث بنتا ہے کہ یہ مسئلہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہو جائے، اس لئے قرآن نے یتیموں کا مال ناحق کھانے والوں کو صراحت کے ساتھ دوزخ کی آگ کی دھمکی دی ہے اور فرمایا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۰﴾ [۴:۱۰]

جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ صرف جہنم کی آگ ہی کھاتے ہیں اور بہت جلد (جہنم کی) سوزاں آگ میں جلیں گے۔ (نساء:۱۰)

اسلامی روایات میں پیغمبر اسلامؐ سے مروی ہے:

شر الما کل اکل مال الیتیم ظلما۔

بدترین خوراک یتیم کا مال ظلم سے کھانا ہے۔[1]

کیا قرآن کا یہ کہنا کہ یتیم کا مال کھانے والے لوگ جہنم کی آگ کھاتے ہیں مجازی ہے جیسا کہ کچھ مفسرین نے کہا ہے یا اس کو حقیقی معنی پر محمول کیا جا سکتا ہے؟ کیونکہ یہ عبارت ہمیں بتاتی ہے کہ ہمارے اعمال کے ظاہری چہرے کے علاوہ ایک باطنی چہرہ بھی ہے جو اس دنیا میں ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے اور قیامت کے دن ظاہر ہوگا اور تجسم اعمال کے مسئلے کی بنیاد بھی یہی چیز ہے۔ بنابریں آیت کو حقیقی مفہوم پر محمول کرنا بعید نہیں ہے۔ (توجہ کیجئے گا)

۱۸۔ سُود خوری

یہ کام بھی ان امور میں سے ہے جن کے مرتکبوں کو قرآن نے صراحتہً جہنم کے عذاب کی دھمکی دی ہے اور فرمایا ہے:

فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ [۲:۲۷۵]

جب کبھی کسی (سود خور) تک خدا کی طرف سے موعظہ پہنچے اور وہ روگردانی کرے، جو فائدے وہ (ربا کی حرمت کے حکم سے) پہلے حاصل کر چکا ہے وہ اسی کا ہے اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہوگا لیکن جو لوگ پلٹ جائیں (اور اس گناہ کے مرتکب ہوں) اہل آتش ہوں گے اور وہ ہمیشہ وہیں رہیں گے۔ (بقرہ:۲۷۵)

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۶ صفحہ ۲۶۷ حدیث ۱۔

اسی سے ملتا جلتا مفہوم سورہ آل عمران کی آیت ۱۳۰ اور ۱۳۱ میں بھی آیا ہے جس میں سود خوروں کو آتش جہنم کی تہدید کی گئی ہے، اہم بات یہ ہے کہ آیت کہتی ہے یہ وہی آگ اور عذاب ہے جو کافروں کے انتظار میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝۱۳۰ [۳:۱۳۰] وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ۝۱۳۱ [۳:۱۳۱]

جب سود خوروں نے خدا سے جنگ کا اعلان کیا یا خدا نے ان سے جنگ کا اعلان کیا تو وہ کافروں کے درجے تک جا گرے، اس عظیم گناہ کے بارے میں یہ بہت ہلا کر رکھ دینے والی عبارت ہے۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سود خوری تمام آسمانی کتب اور تمام انبیاء الٰہی کی شریعتوں میں حرام تھا جیسا کہ فقہ الرضا میں منقول ہے: وھو محرم علی لسان کل نبی وفی کل کتاب۔ [۱]

۱۹۔ نعمات الٰہی کا کفران

نعمات الٰہی کا کفران بھی ان گناہان کبیرہ میں سے ہے جن کے بارے میں قرآن نے دوزخ کی وعید کرتے ہوئے کہا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ○جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۭ وَبِئْسَ الْقَرَارُ۝۲۹ [۱۴:۲۹]

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے الٰہی نعمت کو کفران میں تبدیل کیا اور جو اپنی قوم کو دار البوار کی طرف کھینچ لے گئے جو جہنم ہے وہ لوگ اس کی آگ میں جلیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ (سورہ ابراہیم: ۲۸، ۲۹)

اس آیت میں نعمت خدا سے مراد کیا ہے؟ کچھ بزرگ مفسرین نے اسلامی منابع میں موجود بعض روایات کی پیروی کرتے ہوئے اس نعمت سے پیغمبر اکرمؐ کی ذات گرامی مراد لی ہے، امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی ایک روایت منقول ہے:

نحن واللہ نعمت اللہ التی انعم بہا علی عبادہ وبنا یفوز من فاز۔

خدا کی قسم ہم ہی خدا کی نعمت ہیں جو خدا نے اپنے بندوں کو عطا کی ہے اور ہمارے ہی وسیلے سے کامیابی لوگوں کے قدم چومتی ہے۔ [۲]

---

[۱] فقہ الرضا علیہ السلام ج ۱۳ ص ۱۳۳۱ حدیث ۷۔ مستدرک الوسائل جدید کے مطابق اسے ہر نبی نے اور ہر کتاب نے حرام قرار دیا۔

[۲] تفسیر علی بن ابراہیم جلد ۱ ص ۳۷۱۔

لفظ "نحن" (ہم) رسول اکرمؐ کے تمام خاندان کی طرف اشارہ ہے اور جب معصومین کی طرف اشارہ ہوگا تو بطریق اولیٰ پیغمبر اسلامؐ بھی اس میں شامل ہوں گے اور روایت ثقلین کی طرف توجہ دینے سے اس نعمت کی اہمیت زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔

بہر حال پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ معصومینؑ کا وجود اگرچہ عظیم ترین الٰہی نعمتوں میں سے ہے لیکن آیت کے مفہوم کو محدود نہیں کیا جا سکتا اور اس کا ظہور یہی ہے کہ خدا کی تمام بزرگ نعمتیں اس میں شامل ہوتی ہیں۔

مفسرین نے اس نعمت کا کفران کرنے والوں سے کبھی بنی امیہ اور کبھی بنی مغیرہ اور بنی امیہ یا عصر رسالت کے تمام کفار مراد لیا ہے، یہ مصداق کے ذکر کے اعتبار سے تو صحیح ہے لیکن مفہوم آیت ان لوگوں میں منحصر نہیں ہے، بہر صورت خدا کی عظیم نعمتوں پر شکر گزار ہونا چاہیے اور ان سے بہتر طور پر استفادہ کرنا چاہیے اور اگر یہ شکر کفران میں تبدیل ہوجائے تو اس کی سزا دوزخ ہے۔ [1]

۲۰۔ کم فروشی

قرآن نے اس گناہ عظیم کے عذاب پر بھی خصوصی تاکید کی ہے اور اسے بہت زیادہ اہمیت دی ہے، قرآن کی ایک سورۃ کا نام ہی مطففین (کم فروش لوگ) ہے، اس سورۃ کے آغاز میں یوں بیان ہوتا ہے:

وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ ① اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓٮِٕكَ اَنَّهُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ ④ لِيَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ⑤ كَلَّاۤ اِنَّ كِتٰبَ الۡفُجَّارِ لَفِىۡ سِجِّيۡنٍ ⑦

افسوس ہے کم فروشوں پر۔۔۔۔۔کیا وہ لوگ گمان نہیں رکھتے کہ ایک عظیم دن اٹھائے جائیں گے۔۔۔۔۔۔ایسا نہیں ہے جیسا وہ سوچتے ہیں، مسلماً فاجروں کے نامہ اعمال سجین میں ہیں۔ (مطففین۔۱، ۴، ۵، ۷)

بعض مفسرین نے ویل سے مراد قیامت کے عذاب کی شدت لی ہے اور بعض نے مطابق ویل جہنم کی ایک خاص وادی کا نام ہے۔ [2]

ایک حدیث میں امام جعفر الصادق علیہ السلام نے فرمایا: خدا نے قرآن میں کلمہ "ویل" کو کسی کے بارے میں استعمال نہیں کیا مگر یہ کہ اُسے کافر قرار دیا ہو، لہٰذا فرمایا ہے:

فویل للذین کفروا ....

---

[1] تفسیر المیزان میں آیا ہے کہ اس آیت میں ایک لفظ تقدیر میں ہے اور وہ یوں ہے: "بدلو اشکر نعمۃ اللہ کفرا"

[2] تفسیر قرطبی جلد ۱۰ صفحہ ۷۰۴۱۔

ویل کافروں کے لئے ہے۔[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا ''ویل'' جہنم کی ایک خاص وادی ہے جس میں کفار جا گریں گے۔[2]

ان تعبیرات سے استفادہ ہوتا ہے کہ کم فروشی کفر کے درجے میں ہے یا کفر کی ایک قسم شمار ہوتی ہے۔

البتہ لغت میں ''ویل'' ایک وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور اس کا مفہوم شر، غم واندوہ، ہلاکت یا دردناک عذاب کے مساوی ہے اور جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ اس مفہوم کا ایک مصداق ہوسکتا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اگرچہ آیت کے الفاظ مخصوصاً کم فروشوں اور ان اموال پر دلالت کرتے ہیں جو وزن اور پیمائش کے ذریعے قابل خرید وفروخت ہیں لیکن بعید نہیں کہ آیت کا مفہوم زیادہ وسعت رکھتا ہو اور وہ تمام افراد جو اپنی الٰہی، اجتماعی اور اخلاقی ذمہ داریاں انجام دینے میں کوتاہی کرتے ہیں آیت کے مصادیق میں شامل ہوں، چونکہ جو شخص بھی اپنے امور میں کوتاہی کرے اور اپنی ذمہ داریوں کے انجام میں تساہل برتے، حقیقت میں کم فروش ہی ہے لہٰذا معروف صحابی عبداللہ ابن مسعودؓ سے منقول ہے کہ جو شخص اپنی نماز میں کوتاہی کرے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جس کا وعدہ خدا نے کم فروشوں ''مطففین'' کے بارے میں کیا ہے۔[3]

۲۱۔عیب جوئی اور غیبت

یہ دونوں بھی گناہان کبیرہ میں سے ہیں کیونکہ یہ باایمان افراد کی آبرو اور عزت کی بربادی کا سبب ہیں یہ وہی سرمایہ ہے جو انسانی خون کے برابر اور کبھی اس سے بھی زیادہ قیمتی ہے، لہٰذا قرآن نے اس کے بارے میں دوزخ کے عذاب کی وعید کی ہے اور فرمایا ہے:

وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۣ ۝١ [۱۰۴:۱] الَّذِىۡ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝٢ [۱۰۴:۲] يَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ ۝٣ [۱۰۴:۳] كَلَّا لَيُنۡۢبَذَنَّ فِى الۡحُطَمَةِ ۝٤ [۱۰۴:۴]

افسوس ہے ہر غیبت کرنے والے عیب پر جو اُس شخص پر جو اموال کو جمع کرتا ہے، (حلال اور حرام کا حساب کئے بغیر) گنتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو جاوداں رکھے گا، ایسا نہیں ہے، بہت جلد وہ ایک جلا ڈالنے والی آگ میں پھینکا جائے گا۔

(ہمزہ: ۱ تا ۴)

---

[1] اصول کافی ج ۲ ص ۳۲ حدیث ۱۔

[2] روح المعانی جلد ۳۰، ص ۶۸۔

[3] تفسیر مجمع البیان جلد ۱۰، ص ۴۵۲۔

مفسرین نے ''همزة'' اور ''لمزة'' کی تفسیر میں تفصیلی گفتگو کی ہے، یہ دونوں مبالغے کے صیغے ہیں، جوھمز اور لمز کے مادے سے (رمز کے وزن پر) لئے گئے ہیں، بعض نے دونوں کو ایک ہی معنی میں سمجھا ہے اور ان کی غیبت اور عیب جوئی سے تفسیر کی ہے جب کہ بعض مفسرین نے پہلے کلمہ کی برملا عیب جوئی سے اور دوسرے کلمہ کی چھپا کر اور آنکھ، آبرو اور دوسری مشابہ اشیاء کے اشارے سے عیب جوئی کرنے سے تفسیر کی ہے، بعض نے پہلے کلمہ کو غیبت کے معنی میں اور دوسرے کو سامنے عیب جوئی کرنے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

بہر حال لگتا ہے کہ اس ایت کے مفہوم میں وہ تمام لوگ شامل ہوں گے جو دوسروں کی عزت و آبرو برباد کرنے کے لئے اُن کا مذاق اڑاتے ہیں اور طعن و تشنیع اور آنکھ اور ابرو کے اشاروں سے پیٹھ پیچھے، سامنے دوسروں کے عیب ڈھونڈتے اور اُن پر چھپے ہوئے عیوب کو آشکار کرنا چاہتے ہیں۔

جس طرح یہ لوگ دوسروں کی حیثیت سے کھیلتے ہیں جہنم کی آگ جو حطمہ (پیسنے والی) ہے، قیامت کے دن ان کے تمام وجود کو پیس ڈالے گی۔

حقیقت میں یہ افراد خدا کی شریر ترین مخلوقات میں سے ہیں، جیسا کہ پیغمبر اسلامؐ نے ایک حدیث میں فرمایا: (کیا) تمہیں تم میں سے شریر ترین افرد کی خبر دوں؟ عرض کیا ''ہاں'' یارسول اللہؐ، فرمایا:

المشآئون بالنميمة۔ المفرقون بين الا حية الباغون للبرئآء المعايب۔

وہ لوگ جو زیادہ چغلی کھاتے ہیں اور دوستوں کے مابین تفرقہ ڈالتے ہیں اور بے گناہ اور پاک افراد کے مابین عیب جوئی کرتے ہیں۔[1]

۲۲۔ اسراف اور فضول خرچی

اسراف اور فضول خرچی بھی اپنے وسیع مفہوم کے لحاظ سے گناہان کبیرہ میں سے شمار ہوتے ہیں اور قرآن نے نہایت اہمیت کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، اسراف کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۴۳ ﴿غافر: ۴۳﴾

مسرفین اہل آتش میں سے ہیں۔ (مومن۔ ۴۳)

اگرچہ یہ بات سورہ مومن میں آل فرعون کے مومن کی زبانی نقل ہوئی ہے لیکن قرآن نے اس کی توثیق کر دی ہے اور تبذیر کے بارے

[1] اصول کافی جلد ۲ باب النميمہ حدیث ا تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۷۱ و ۷۲۔

میں فرمایا ہے:

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ

تبذیر کرنے والے ہمیشہ سے شیاطین کے بھائی ہیں۔ (بنی اسرائیل:۲۷)

یہ بات واضح ہے کہ شیاطین اوران کے بھائیوں کا انجام خدا کے غضب وقہر یعنی دوزخ کا شکار ہونے کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوسکتا، اسراف اور سرف (''ہدف'' کے وزن پر) بعض ارباب لغت کے بقول کسی بھی کام میں حد سے بڑھ جانے کے معنی میں ہے، اگرچہ یہ لفظ اخراجات میں حد سے تجاوز کرنے پر اطلاق ہوتا ہے۔[1]

اسی بناء پر الٰہی حدود سے تجاوز کرنے والے مشرکین اور گناہگاروں کو قرآن کی آیتوں میں مسرف کہا گیا ہے، حتیٰ کہ بے گناہ افراد کا قتل بھی اسراف ہی کی ایک قسم میں شمار ہوا ہے۔

''تبذیر'' ''بزر'' کے مادے سے ہے اور اصل میں بکھیرے جانے کے معنی میں ہے اور عام طور پر ان موارد پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، جہاں بغیر ہدف کے اس طرح مال کو بکھیر دیا جائے کہ مال کے تلف اور ضائع ہونے کا باعث بنے، اگر ہم آج کی دنیا کے بارے میں سوچیں جس پر اسراف اور تبذیر اس طرح حاکم ہے کہ نہ صرف غذا اور مادی وسائل زندگی بلکہ ہر چیز میں حد سے تجاوز کیا جاتا ہے، ہم دیکھیں گے کہ یہ اسراف اور تبذیر قبل از اینکہ آخرت کے جہنم کا باعث بنے اسی دنیا میں ایک دہکتا ہوا جہنم فراہم کر رہا ہے جس کی آگ میں ہر چھوٹا بڑا جلتا ہے اور ان کی چیخوں کی کہیں شنوائی نہیں، پھر ہم تصدیق کریں گے کہ اسراف اور تبذیر کی سزا جہنم کی آگ ہی ہونی چاہیے۔

۲۳۔ جرم اور گناہ

قرآن مجید میں جہنمیوں کے اوصاف کے بارے میں جامع اور کلی تعبیریں دیکھنے کو ملتی ہیں جن میں ایک جرم اور گناہ ہے، فرماتا ہے:

وتسوق المجرمين الیٰ جهنم وردا۔

قیامت کے دن ہم مجرموں کو (ان پیاسے اونٹوں کی طرح جو پانی کی طرف لے جائے جاتے ہیں) جہنم کی طرف لے جائیں گے۔ (مریم:۸۶)

''مجرم'' ''جرم'' کے مادے سے اصل میں کاٹنے کے معنی ہے، لہذا درخت سے پھل کو جدا کرنے اور درخت کو کاٹنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، چونکہ گناہگار لوگ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے اپنے آپ کو خدا سے اور نجات وسعادت سے محروم کردیتے ہیں اس لئے یہ کلمہ ان کے بارے میں استعمال ہوا ہے، کیا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر گناہ ضرور دوزخ میں جانے کا سبب ہوگا؟ یا آیت کچھ خاص مجرموں سے متعلق

---

[1] مفردات راغب کلمہ سرف

ہے؟ آیت کا ظہور اگرچہ اطلاق رکھتا ہے لیکن دوسری آیتوں سے ممکن ہے استفادہ کیا جائے کہ آیت سے مراد وہ جرم ہے جو کفر اور بے ایمانی کے ساتھ ہو، زخرف کی آیت ۷۴ میں یوں بیان ہوتا ہے۔

اِنَّ الۡمُجۡرِمِیۡنَ فِیۡ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوۡنَ ۷۴﴿الزخرف: ۷۴﴾

مجرمین جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔

مسلماً کفار ہی جہنم میں ہمیشہ رہیں گے نہ کہ ہر گناہگار۔ مدثر کی آیت ۴۰ تا ۴۲ میں یوں بیان ہوا ہے:

فِیۡ جَنّٰتٍ ۛ یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۴۰﴾ [۷۴:۴۰] عَنِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۴۱﴾ [۷۴:۴۱] مَا سَلَکَکُمۡ فِیۡ سَقَرَ ﴿۴۲﴾ [۷۴:۴۲]

اہل بہشت مجرموں سے پوچھیں گے کہ کون سی چیز تمہارے جہنمی ہونے کا باعث بنی؟

تب وہ لوگ کچھ گناہوں کا نام لیں گے جن میں قیامت کے دن کی تکذیب بھی ہوگی جو کفر کے مساوی ہے، کفر سے آمیختہ جرم کی بات اور مقامات پر بھی ہوئی ہے، قرآن کی متعدد دوسری آیتوں میں مذکور ہے [1]۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس آیت میں گنہگاروں سے مراد وہ لوگ ہوں جو پوری طرح گناہ میں ایسے غرق ہو چکے ہوں کہ شفاعت کے سزاوار ہوں نہ عفو خداوندی کے قابل، یہ لوگ عام طور پر دوزخ ہی میں جائیں گے۔

۱۲۴ الٰہی حدود سے تجاوز

یہ عنوان بھی ان کلی عناوین میں سے ہے جن کے بارے میں قرآن نے دوزخ کی وعید کی ہے فرماتا ہے:

وَمَنۡ یَّعۡصِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوۡدَهٗ یُدۡخِلۡهُ نَارًا خَالِدًا فِیۡهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِیۡنٌ ﴿۱۴﴾ [۴:۱۴]

اور وہ شخص خدا اور اس کے نبی کی مخالفت کرے اور حدود الٰہی سے تجاوز کرے اس کو ایسی آگ میں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے رسوا کن عذاب ہے (نساء: ۱۴)

حدود الٰہی سے مراد اللہ کے احکام اور قوانین ہیں، اگرچہ ارباب لغت نے ''حد'' کے لئے تین مختلف معانی نقل کئے ہیں، منع کرنا، کسی

[1] اعراف کی آیت ۴۰، ۸۴، ۱۳۳۔ حجر کی آیت ۱۲، ۵۸۔ فرقان کی آیت ۳۱ اور نمل کی آیت ۶۹ وغیرہ جو مختلف اقوام مثلاً قوم لوط، قوم فرعون اور انبیاء کے دشمنوں کے بارے میں ہے جو سب کافر تھے اور مجرم کا کلمہ ان کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔

بھی چیز کی انتہا اور شدت۔[1] لیکن ظاہراً تینوں معانی ''منع'' کے مفہوم کی طرف لوٹتے ہیں کیونکہ کسی چیز کی انتہاء دوسری چیزوں کے ساتھ اس کے خلط ملط ہونے سے مانع ہوتا ہے جس طرح کسی مکان، زمین اور ملک کی حدود دوسرے مکان، زمین یا ملک سے ملنے سے مانع ہوتی ہیں چونکہ ''منع'' کے مفہوم میں ایک طرح کی شدت پائی جاتی ہے لہٰذا یہ لفظ شدت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

الٰہی احکامات کو اس لئے الٰہی حدود کہا گیا ہے کہ وہ انسان کے لئے ایک ''ممنوعہ علاقہ'' بنا دیتی ہیں جس میں اس کے داخلے پر پابندی ہوتی ہے، مخصوص شرعی سزاؤں کو بھی اس لئے ''حد'' سے تعبیر کیا گیا ہے، کہ اکثر اوقات یہ سزائیں اس جرم کی تکرار سے مانع ہوتی ہیں، بہرحال ''تلک حدود اللہ'' کی عبارت قرآن میں متعدد مقامات پر بعض الٰہی احکام کے ذکر کے بعد استعمال ہوئی ہے۔

زیر بحث آیت میں ارث کے احکام اور بقرہ کی آیت ۲۲۹، ۲۳۰ اور سورہ طلاق کی آیت ۱ میں طلاق کے کچھ احکام اور سوہ بقرہ آیت ۱۸۷ میں اعتکاف کے حالت میں مباشرت سے ممنوعیت اور روزہ کے بعض احکام اور سورہ بقرہ آیت ۱۸۷ میں اعتکاف کی حالت میں مباشرت سے ممنوعیت اور روزہ کے بعض احکام اور سورہ مجادلہ آیت ۴ میں ظہار کے کفارہ کے بیان کے بعد یہ عبارت آئی ہے، ان تمام آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ''الٰہی حدود'' کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں اس قسم کے تمام احکام شامل ہیں۔

دوسری طرف ہم جانتے ہیں کہ ہر گناہ کا ارتکاب جہنم میں ہمیشہ جلنے کا باعث نہیں بن سکتا، بنا برایں ممکن ہے مندرجہ بالا آیت سے مراد ایسے لوگ ہوں جو طغیان و سرکشی، دشمنی اور آیات الٰہی کے انکار کی بناء پر الٰہی حدود کو پامال کرتے ہیں یا ایسے لوگ جو ان تمام الٰہی حدود کو نظر انداز کرتے ہیں اور اس طرح گناہ میں غرق ہو جاتے ہیں کہ نتیجۃً دنیا سے بے ایمانی کی حالت میں چلے جاتے ہیں، ورنہ یہ ہم جانتے ہیں کہ کچھ گنہگار لوگ خدا کی عفو کے مستحق اور کچھ شفاعت کے لائق قرار پائیں گے اور کچھ دوسرے گنہگار جو گناہ صغیرہ کے مرتکب ہوئے ہوں گے بخش دیئے جائیں گے، اسی طرح کچھ توبہ کرنے والے بھی بخشے جائیں گے۔[2]

وعیدیہ میں سے ایک گروہ نے مندرجہ بالا آیات سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب افراد ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے لیکن ہمارے مذکورہ بیان سے ان کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ زیادہ وضاحت انشاء اللہ اپنے مقام پر کی جائے گی۔

نتیجہ

قرآن مجید کے بقول جہنم میں جانے والوں کی اکثریت ان ۲۴ گروہوں میں سے ہوگی، بعض لوگ محدود اور معین وقت کے لیے جائیں گے اور بعض ہمیشہ اس میں رہیں گے، ان تمام آیات سے یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اجتماعی اور حقوقی مسائل اور مختلف اخلاقی

---

[1] مقائیس اللغہ و مفردات راغب و التحقیق فی کلمات القرآن الکریم (مادہ حد)۔

[2] علامہ مجلسی مرحوم نے بحار الانوار کی جلد ۸ ص ۳۵۱ میں اہل ایمان کے جہنم میں ہمیشہ نہ رہنے کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے، اگر چاہیں تو باب ۲۷ (باب من یخلد فی النار و من یخرج منھا) کی طرف رجوع فرمائیے۔

انحرافات میں اسلامی نکتہ نظر کیا ہے اور کن امور کو اسلام بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے اس طرح کی آیات میں تربیت کا ایک قوی پیغام پایا جاتا ہے، جو تمام انسان کو ان گناہوں کے نتائج سے آگاہ اور بیدار کرتا ہے اور اصل مقصد بھی یہی ہے۔

(۲) جہنم کی ماہیت

اشارہ

مسلماً جہنم الٰہی قہر و غضب کا مرکز ہے اور قرآن کی آیتوں کے ظہور یا صراحت کے مطابق جسمانی اور روحانی عذاب پر مشتمل ہے، جو لوگ اُسے صرف معنوی اور روحی سزاؤں میں منحصر قرار دیتے ہیں انہیں قرآنی آیتوں کے ایک بڑے حصے کو نظر انداز کرنا پڑے گا یا ان آیات کا انکار کرنا پڑے گا یا پھر بغیر کسی دلیل کے مجازی معنی پر محمول کرنا ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ دوزخ کی ماہیت کیا ہے؟ اس کے عذاب اور سزا کی کیفیت کیا ہوگی؟ یہ جاننے کے لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی مختلف آیتوں میں اس کے لئے جو نام اور اوصاف ذکر ہوئے ہیں اُن سے مدد لیں تاکہ غضب اور قہر الٰہی کے اس مرکز کے اسرار سے پردہ اٹھا سکیں۔

اگر چہ ہم بارہا یہ کہہ چکے ہیں کہ دوسری دنیا کے مسائل کے بارے میں ہماری معلومات جتنی بھی زیادہ ہوں پھر بھی محدود ہی ہیں۔ میں اور ہم دور سے ایک دھندلا سا چہرہ ہی دیکھ پاتے ہیں لیکن اس کی خصوصیات اور جزئیات ہمارے لئے واضح نہیں ہیں، کیونکہ آخرت کلی طور پر اس عالم سے بالاتر ایک دنیا ہے، بالکل ایسے جیسے جنین کے لئے شکم مادر سے باہر کی دنیا ہے۔

بنابرایں اس کے تمام اسرار پر کامل طور پر عبور حاصل کرنا دنیا کے لوگوں کے لئے ناممکن ہے لیکن یہ چیز اجمالی معرفت اور شناخت سے مانع نہیں ہو سکتی، بہر حال دوزخ کی ماہیت جاننے کے لئے ہمیں اس کے بارے میں واردشدہ قرآنی اشارات، نام اور

اوصاف کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ لہٰذا ہم مندرجہ ذیل آیات پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو جہنم کے اسماء اور اوصاف کے بعض نمونے بیان کرتی ہیں:

۱۔ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ (حجر: ۴۴،۴۳)

۲۔ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿۲۹﴾ (مدثر: ۲۶ تا ۲۹)

۳۔ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ [۲:۲۴]

(بقرۃ: ۲۴)

۴۔ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ ۝ [۴۲:۷] (شوریٰ: ۷)

۵۔ فَأَمَّا مَنْ طَغَىٰ ۝ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝ فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝

(النزعت: ۳۷،۳۸،۳۹)

۶۔ كَلَّا ۖ لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝ نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ ۝ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ۝ [۱۰۴:۷] (همزة)

۷۔ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ۝ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَهْ ۝ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝ [۱۰۱:۱۱] (قارعة: ۸ تا ۱۱)

۸۔ كَلَّا ۖ إِنَّهَا لَظَىٰ ۝ نَزَّاعَةً لِلشَّوَىٰ ۝ تَدْعُو مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ ۝

(معارج: ۱۵ تا ۱۷)

ترجمہ

۱۔ اور جہنم ان سب کی میعادگاہ ہے جس کے ساتھ دروازے ہیں۔

۲۔ (لیکن بہت جلد ہم اُسے جہنم میں داخل کر دیں گے اور تمھیں کیا معلوم دوزخ کیا ہے؟ (ایک ایسی آگ ہے جو) کسی چیز کو باقی نہیں رکھتی اور کسی چیز کو نہیں چھوڑتی، جسم کی کھال کو پوری طرح تبدیل کر دیتی ہے۔

۳۔ اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن (گنہگار) لوگوں کے جسم اور پتھر ہیں اور کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

۴۔ ایک گروہ بہشت میں ہے اور ایک گروہ سعیر میں (جہنم میں)۔

۵۔ لیکن جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو مقدم سمجھا ضرور اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

۶۔ اس طرح نہیں جس طرح وہ سوچتا ہے، جلد ہی وہ حطمہ میں پھینکا جائے گا اور تو کیا جانتا ہے کہ حطمہ کیا ہے؟ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے، ایسی آگ جو دلوں تک پہنچ جائے گی۔

۷۔ اور جس کے (اعمال کے) پلڑے ہلکے ہوں گے اس کی پناہ گاہ ہاویہ ہوگی، تو کیا جانے ہاویہ کیا ہے؟ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔

۸۔ لیکن ہر گز ایسا نہیں ہے (جیسے وہ سمجھتے ہیں) وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے جو ہاتھ، پاؤں اور سر کی کھال کو ادھیڑ کر رکھ دے گی اور ان لوگوں کو اپنی طرف بلاتی ہوگی جنہوں نے خدا کے فرمان کی طرف پشت کی ہے۔

تفسیر

جہنم کے بارے میں قرآن کی مختلف تعبیریں

پہلی آیت میں دوزخ کے ایک ایسے معروف نام یعنی جہنم کا ذکر ہے جو قرآن مجید میں ۷۷ بار آیا ہے، یہ آیت ابلیس کے پیر کاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: جہنم! ان سب کی میعادگاہ ہے اور اس کے سات دروازے ہیں "وان جهنم لموعدهم اجمعين لها سبعة ابواب"

کلمہ "جهنم" کے معنی میں ارباب لغت اور مفسرین کے مابین بہت گفتگو ہوئی ہے، بعض نے اسے "آگ" کے معنی میں اور بعض نے "عمیق" اور گہرے کے معنی میں سمجھا ہے، لسان العرب میں آیا ہے: "جهنام" کے معنی زیادہ گہرائی کے ہیں، لہٰذا "بئر، جهنم و جهنام" گہرے اور عمیق کنویں کے معنی میں ہے، اسی کتاب میں بعض ارباب لغت سے نقل کیا گیا ہے کہ یہ لفظ اصل میں عبرانی ہے اور اس کا اصل "کہنام" تھا، اس کی عربی صورت جہنم بنی۔ (اسی لئے یہ ان الفاظ میں سے ہے جو "مالا ینصرف" ہیں کیونکہ یہ معرفہ بھی ہے اور عجمی بھی)، بعض نے اُسے اصل میں عبرانی لفظ "جهنیون" سے جانا ہے[1]، اور کچھ اسے عربی لفظ سمجھتے ہیں (اور اس کی تانیث اور معرفہ ہونے کو "مالا ینصرف" ہونے کی دلیل قرار دیتے ہیں)، بعض نے اُسے اصل میں فارسی قرار دیا ہے، زمین کے نیچے بنائے جانے والے اس کمرے کو بھی جہنم کہا گیا ہے جہاں حرارت پیدا کی جاتی ہے تاکہ اس کے اوپر موجود حمام کی زمین گرم ہو سکے۔[2]

بہر حال اس کی اصلیت کچھ بھی ہو (عربی، فارسی، عبرانی) یہ کلمہ قرآن مجید میں ایسی جگہ کے نام کے طور پر آیا ہے جو مختلف عذابوں سے بھری ہوئی ہے اور خدا کے قہر و غضب کا مرکز ہے، جس کے مختلف درجات اور مراتب ہیں، ضمنی طور پر عرض ہے کہ آیت میں ذکر ہوا تھا کہ قرآن کے ساتھ دروازے ہیں، انشاءاللہ ہم بھی بعد میں اس کے بارے میں بحث کریں گے۔

دوسری آیت میں دوزخ کا ایک اور نام نظر آتا ہے اور وہ "سقر" ہے، مشرکین میں سے ایک ہٹ دھرم اور سرکش فرد (ولید بن مغیرہ) کی داستان کی طرف اشارہ کرنے کے بعد خدا تعالیٰ فرماتا ہے: جلد ہی ہم اسے "سقر" میں داخل کریں گے اور تو نہیں جانتا کہ سقر کیا ہے، ایسی آگ ہے جو کسی شے کو اس کی اپنی حالت میں باقی نہیں رہنے دیتی اور نہ ہی کسی چیز کو چھوڑتی ہے جسم کی کھال کو پوری طرح ادھیڑ کر رکھ دیتی ہے "ساصليه سقر وما ادرك ما سقر لا تبقي ولا تذر لواحة للبشر"۔

---

[1] لغت نامہ دهخدا مادہ "جہنم"۔

[2] لغت نامہ دهمذا، مادہ جہنم۔ التحقیق، لسان العرب، المنجد اور اقرب الموارد۔

بہرحال سقر دوزخ کے ناموں میں ہے جو اصل میں مادہ سقر سے (فقر کے وزن پر) لیا گیا ہے جو تبدیل ہونے اور سورج کی روشنی کے اثر میں پگھلنے اور حل ہوجانے کے معنی میں ہے۔ [1]

بعض اسے دوزخ کے ہولناک طبقات میں سے ایک طبقے کا نام سمجھتے ہیں جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں آیا ہے: سقر کے نام سے ایک درہ ہے جو متکبروں کا ٹھکانا ہے اور جب کبھی وہ سانس لیتا ہے جہنم کو بھڑکاتا ہے۔ [2]

صحاح اللغہ میں آیا ہے کہ سقرات الشّمس سورج کی تیز دھوپ کو کہتے ہیں اور ''یوم مسقر'' گرم اور جلانے والے دن کے معنی میں ہے، التحقیق میں آیا ہے کہ یہ مادہ اصل میں شدید حرارت کے معنی میں ہے جس سے اشیاء کا رنگ یا اُن کی صفت تبدیل ہوجاتی ہے، لیکن بعد میں اس لفظ نے تدریجاً درزخ کے ناموں میں سے ایک نام کی صورت اختیار کر لی، ایسی جلانے والی بھڑکتی ہوئی آگ جو ہر چیز کو بدل کے رکھ دیتی ہے، جو اوصاف اس آیت میں ذکر ہوئے ہیں وہ بھی ہمارے مدعا پر شاہد ہیں، کیونکہ آیت ایک طرف کہتی ہے کہ (یہ آگ) جسم کی کھال کو جھلسا دے گی، دوسری طرف کہتی ہے کہ ''کسی شے کو اس کی حالت پر باقی نہیں رہنے دے گی''۔

قرآن میں کثرت سے استعمال ہونے والا جہنم کا دوسرا نام ''نار'' ہے، یہ لفظ قرآن مجید میں ۱۴۵ مرتبہ آیا ہے اور اکثر موارد میں جہنم کی آگ کے لئے ہی استعمال ہوا ہے، البتہ بعض موارد میں دنیا کی آگ کے لئے آیا ہے، قرآن کے معارضین کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے: اگر تم لوگ قرآن کی سورتوں کی طرح کوئی سورہ نہیں لاتے اور ہرگز لا بھی نہ سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن (گنہگار) لوگ اور پتھر ہیں اور جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے، ''نار'' کا کلمہ ہر قسم کی آگ کے لئے استعمال ہوتا ہے، راغب مفردات میں کہتا ہے کہ ''نار'' اس شعلے کے معنی میں ہے جو انسانی حس کے سامنے ظاہر ہوتا ہے اور صرف حرارت کو بھی ''نار'' کہا جاتا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ''نار'' اور ''نور'' ایک ہی مادہ سے لئے گئے ہیں، اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں، بہرحال قرآنی آیات میں دوزخ کی آگ کے لئے یہ کلمہ اس کثرت سے استعمال ہوا ہے کہ دوزخ کے ناموں میں سے ایک نام کی صورت اختیار کرگیا ہے۔

قرآن مجید سورہ آل عمران آیت ۱۰ میں مجرموں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، ''واُولٰئک ھم وقود النار'' وہ آگ کا ایندھن ہیں، یعنی دوزخ کا ایندھن ہیں، متعدد آیات میں ''اصحب النار'' کی عبارت بھی دوزخیوں کے لئے استعمال ہوئی ہے، اسی لئے ''اصحاب النار'' کو ''اصحب الجنة'' کے مقابلے میں قرار دیا گیا ہے۔[3] ضمناً اس آیت میں جہنم کی آگ کے لئے گنے جانے والے اوصاف میں سے یہ بھی ہے کہ اس کا ایندھن اور آتش گیر مادہ خود انسان اور پتھر (بت) ہیں، بنابراین دوزخ کی آگ اس لحاظ سے دنیا کی آگ سے کوئی شباہت نہیں رکھتی۔

---

[1] مقائیس اللغہ، مفردات راغب۔

[2] تفسیر صافی، سورہ قمر کی آیت ۴۸ کے ذیل میں۔

[3] اعراف ۴۴ اور حشر ۲۰۔

چوتھی آیت میں غضب الٰہی کے اس مرکز کے لئے ’’سعیر‘‘ کی صفت استعمال ہوئی ہے، نزول قرآن کے ہدف کی طرف اشارہ کرنے کے بعد جس میں لوگوں کو روز قیامت سے خوف دلایا گیا ہے، فرماتا ہے: (اس دن) ایک گروہ بہشت میں ہوگا اور ایک گروہ ’’سعیر‘‘۔ (فریق فی الجنۃ وفریق فی السعیر)۔

’’سعیر‘‘ کا لفظ قرآن میں سولہ بار اور اس کی جمع ’’سعر‘‘ دو بار استعمال ہوئی ہے، یہ لفظ اصل میں (قعر کے وزن پر) ’’سعر‘‘ کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا مطلب آگ بھڑکانا ہے اور آگ کے زیادہ اور شدید بھڑکنے کو بھی کہا گیا ہے، لہٰذا سعیر سے مراد وہ آگ ہے جو شعلہ ور اور سوزاں ہو، کبھی یہ لفظ جنون کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ اس حالت میں انسان شعلہ ور ہو جاتا ہے اور ہیجان کا شکار ہو جاتا ہے، پاگل اونٹ کو بھی ’’ناقہ‘‘ ’’مسعورہ‘‘ کہا جاتا ہے۔ [1]

مندرجہ بالا آیت میں ’’سعر‘‘ جنت کے مقابلے میں قرار پایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے، اس کا ایک اور قرینہ یہ ہے کہ قرآن کی چند آیتوں میں اصحاب السعیر کی عبارت استعمال ہوئی ہے۔ [2] لیکن اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ لفظ قرآن کی بعض آیتوں میں وصفی معنی میں استعمال ہوا ہے جو جہنم کی آگ کے بھڑکنے کی طرف اشارہ ہے۔

پانچویں تعبیر ’’جحیم‘‘ ہے جو قرآن مجید میں ۲۵ مرتبہ استعمال ہوئی ہے، زیر بحث آیت میں فرمایا گیا ہے: لیکن جو سرکشی کرے اور دنیوی زندگی کو اخروی زندگی پر فوقیت دے اس کا ٹھکانا جحیم ہے۔ ’’فاما من طغیٰ واثر الحیوۃ الدنیا فان الجحیم ھی الماوی‘‘ قرآن کی عبارات سے استفادہ ہوتا ہے کہ ’’جحیم‘‘ کا لفظ دوزخ کے ناموں میں سے ہے جو ’’جحم‘‘ کے مادہ سے ’’آگ کے شدید طور پر بھڑکنے‘‘ کے معنی میں ہے۔

مقائیس اللغۃ میں بھی اس معنی پر تاکید کی گئی ہے، لیکن صحاح اللغۃ نے اس کی ایسی عظیم آگ سے تعبیر کی ہے کہ جس میں عام طور پر حرارت کی بہت شدت ہو اور جو بہت بھڑکتی ہو، لیکن قرآن میں ایک جگہ دنیا کی سوزاں آگ کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے، حضرت ابراہیمؑ کے ہم عصر مشرکوں کی زبانی نقل کیا گیا ہے:

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ﴿الصافات: ۹۷﴾

انہوں نے کہا کہ ایک اونچی عمارت اس (ابراہیمؑ) کے لئے بنائیں اور اُسے جحیم میں پھینک دیں۔

(صافات۔۹۷)

لیکن یہ تعبیر اس سے مانع نہیں ہے کہ مذکورہ لفظ جہنم کے اسماء میں سے ایک ہو۔

---

[1] مقائیس، صحاح اللغۃ، التحقیق، مفردات راغب۔

[2] ملک، ۱۰، ۱۱۔ فاطر، ۶۔

چھٹی عبارت میں کلمہ ''حطمة'' کا ذکر ہے جس کا سورہ ہمزہ میں دوبار تکرار ہوا ہے، دوسروں کی عیب جوئی اور غیبت کرنے والوں اور جمع مال کی حرص رکھنے والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس ضمن میں فرمایا گیا ہے: ایسا نہیں جیسا وہ سمجھتا ہے، جلد ہی وہ حطمہ میں پھینکا جائے گا، تم کیا جانو حطمہ کیا ہے؟ خدا کی بھڑکائی ہوئی ایسی آگ ہے جو دلوں تک پہنچ جاتی ہے۔ ''**كلا لينبذن في الحطمة وما ادرك ما الحطمة نار الله الموقدة التي تطلع على الافئدة**''۔

لفظ ''**حطمة**'' جو صحاح اللغہ اور مجمع البحرین کے بقول دوزخ کے اسماء میں سے ہے ''**حطم**'' کے مادہ سے صیغہ مبالغہ اور توڑنے کے معنی میں ہے، بعض نے اسے خشک اشیاء توڑنے کے معنی میں استعمال کیا ہے، لہٰذا قحط کے سالوں کو ''**حطمة**'' (لقمہ کے وزن پر) کہا جاتا ہے، چونکہ اس طرح کے سال ہر چیز کو گویا توڑ کر رکھ دیتے ہیں، اور انسانوں کو اجاڑ دیتے ہیں، کعبہ میں ایک جگہ جو حجر الاسود اور خانہ کعبہ کے دروازہ کے مابین ہے ''**حطیم**'' کہلاتی ہے کیونکہ لوگوں کا وہاں بہت اژدھام ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے دباؤ کی شدت سے ہڈیاں چیخ رہی ہوں، لہٰذا دوزخ کو حطمہ کے نام سے موسوم کرنا اس وجہ سے ہوسکتا ہے کہ اس کی سوزاں آگ ہر شے کو توڑ کر فنا کردے گی، زیر بحث آیت کی قرآن نے خود جو تفسیر کی ہے اور کہا ہے کہ ''وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں تک پہنچ جائے گی'' وہ ہمارے مدعا کی گواہی دیتی ہے، لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کے تمام نام من جملہ حطمہ دوزخ کے مخصوص حصوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ [۱]

ساتویں تعبیر میں ''ھاویہ'' کا تذکرہ ہے جو قرآن میں صرف ایک بار آیا ہے، فرماتا ہے:

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۸ [۱۰۱:۸] فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۹ [۱۰۱:۹] وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ ۝۱۰ [۱۰۱:۱۰] نَارٌ حَامِيَةٌ ۝۱۱ [۱۰۱:۱۱] (قارعة:۸ تا ۱۱)

لیکن جس کے ترازو کے پلڑے (اعمال) ہلکے ہیں اس کا ٹھکانا ہاویہ ہے اور تو کیا جانے ہاویہ کیا ہے؟ جلتی ہوئی گرم آگ ہے۔ (قارعہ۔۷ تا ۱۱)

لسان العرب میں ابن منظور کے مطابق ہاویہ جہنم کے ناموں میں سے ہے، اس بنا پر ''**امه هاوية**'' کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا ٹھکانا دوزخ ہوگا۔ [۲] ''**مقائیس اللغه**'' اور ''**مفردات راغب**'' میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے، یہ کلمہ اصل میں ''**هوى**'' کے مادہ سے گرنے کے معنی میں ہے کیونکہ کفار اور مجرمین اس میں جا گریں گے، ضمناً دوزخ کی گہرائی کی طرف بھی اشارہ ہے۔

''ام'' کا لفظ یہاں پر مکان اور ٹھکانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور کبھی ماں کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، یعنی جس طرح ماں بچے کو آغوش میں لے لیتی ہے دوزخ بھی افراد کو اپنی آغوش میں کھینچ لیتی ہے، بعض نے اس مقام پر ''ام'' کی تفسیر ''سر کے مغز'' سے کی ہے اور کہا

---

[۱] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۱۷ اور ۱۹ حدیث ۶۰، ۶۴ سے رجوع فرمائیے۔

[۲] لسان العرب۔ مادہ ھوی۔

ہے کہ ہاویہ دوزخیوں کی ایک صفت ہے کیونکہ وہ سر کے بل اس میں جا گرتے ہیں لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح لگتی ہے۔

آٹھویں اور آخری تعبیر کلمہ ''لظیٰ'' ہے جو ایک ہی بار قرآن مجید میں آیا ہے، سورہ معارج میں ان مجرموں کی حالت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد جو قیامت کے دن اپنی نجات کے لئے بیوی، بھائی اور اپنے بچوں کو قربان کرنا چاہتے ہیں، فرمایا گیا ہے:

کلا انہا لظی۔ تزاعۃ للشوی۔ تدعوا من ادبر وتولیٰ

ہرگز ایسا نہیں ہے جیسا وہ سوچتے ہیں (بلکہ) وہ لظیٰ (سوزاں آگ) ہے جو ہاتھ، پاؤں اور سر کی کھال ادھیڑ دیتی ہے اور جنہوں نے خدا کے فرامین کی طرف سے پیٹھ پھیری ہے اُن کو بلاتی ہے۔ (معارج۔۱۵ تا ۱۷)

''لظیٰ'' اصل میں آگ یا آگ کے شعلے کے معنی میں ہے، لیکن ''لسان العرب'' اور ''مفردات راغب'' کے بقول یہ لفظ جہنم کے اسماء میں سے ہے لہٰذا مونث ہونے اور علم ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

''نزاعۃ'' کا مطلب وہ شے ہے جو پے در پے جدا کرتی ہے اور ''شوی'' سے مراد ہاتھ پاؤں اور بدن کے اطراف ہیں (اگر چہ کبھی بھوننے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن یہاں مناسب پہلا معنی ہی ہے کیونکہ جب کوئی چیز آگ میں ڈالی جاتی ہے تو پہلے اس کے باہر کا حصہ ہی جلتا ہے) بعض نے ''شوی'' سے بدن کی کھال یا سر کی کھال مراد لی ہے۔

اس آگ کی عجیب خصوصیت یہ ہے کہ جہنمیوں کو اپنی طرف بلاتی ہے، کیا جہنم حقیقت میں کسی قسم کی حیات، شعور اور ادراک رکھتا ہے؟ یا جہنم میں کوئی خفیہ قوت جاذبہ ہے جو مستحقین کو اپنی طرف جذب کرتی ہے؟

دونوں احتمالات ممکن ہیں، لیکن آیت کا ظہور پہلے معنی میں ہے، یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اسلامی روایات میں کہیں پر بھی ''نار'' دوزخ کے نام کے طور پر استعمال نہیں ہوا بلکہ سات اور نام آئے ہیں اور ہر نام دوزخ کے ایک طبقے کی نشاندہی کرتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ ان سات ناموں میں سے ہر ایک تمام تر دوزخ کے لئے ہو۔

ایک حدیث میں امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں: جہنم کے سات دروازے ہیں اور یہ دروازے وہی طبقات ہیں جن میں ہر ایک دوسرے کے اوپر ہے، اس کے بعد حضرتؑ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے کے اوپر رکھا اور فرمایا: اس طرح ۔۔۔۔۔۔ سب سے نچلا طبقہ ''جہنم'' ہے اس کے اوپر ''لظی'' اس سے اوپر ''حطمہ'' اس پر ''سقر'' اور اس سے اوپر ''جحیم'' اس پر ''سعیر'' اور سعیر'' کے اوپر ''ہاویہ'' ہے (لیکن بعض روایات میں آیا ہے کہ سب سے نچلا طبقہ ''ہاویہ'' اور سب سے اوپر کا طبقہ ''جہنم'' ہے)۔[1]

کوئی مانع نہیں ہے کہ مندرجہ بالا سات نام کبھی تمام جہنم پر اطلاق ہوں اور کبھی جہنم کے ایک حصے پر، جس طرح دنیا

[1] مجمع البیان ج ۵ اور ٦ صفحہ ۳۳۸، نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۱۹ حدیث ٦۴۔ حدیث ٦۰۔ میں بھی اس بارے میں امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک تفصیلی حدیث نقل ہوئی ہے۔

کے ناموں میں نظر آتا ہے کہ کبھی ایک نام ایک پورے صوبے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کبھی صرف ایک شہر کے لئے جو اسی صوبے کا ایک حصہ ہے۔

جہنم کے اوصاف

دوزخ سے مربوط آیات، ان کے نام اور اوصاف سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ ہولناک سزاؤں کا مرکز ہے، اور سوزاں آگ سے بھری ہوئی ہے جس کے مختلف دروازے اور طبقات ہیں، لیکن یہ آگ دنیا کی آگ کی طرح ہرگز نہیں بلکہ ایسی آگ ہے جس کی یہ خصوصیات ہیں:

۱۔ اس کا ایندھن اور آتش گیر مادہ انسان اور پتھر ہیں۔

۲۔ ایسی آگ ہے جو دلوں سے نکلتی ہے اور جس کی پہلی چنگاری قلوب میں ظاہر ہوجاتی ہے۔

۳۔ ایسی آگ ہے جو توڑتی ہے اور پیس ڈالتی ہے۔

۴۔ ایسی آگ ہے جس کے مختلف طبقات ہیں اور گناہگاروں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

۵۔ یہ آگ جب اپنے مستحقوں کو دور سے دیکھتی ہے تو اس کی غصیلی اور ہولناک آواز اس کی سانسوں کے ساتھ سنائی دیتی ہے ' اِذَا رَاَتۡهُمۡ مِّنۡ مَّكَانٍۭ بَعِيۡدٍ سَمِعُوۡا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيۡرًا ۱۲ ﴿الفرقان: ۱۲﴾ '

۶۔ یہ ایک متحرک آگ ہے، چنانچہ فرمایا گیا ہے: ''اس دن جہنم کو حاضر کیا جائے گا اس دن انسان چونک اٹھے گا، لیکن یہ چونکنا اُسے کوئی فائدہ نہیں دے گا وَجِایۡٓءَ يَوۡمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوۡمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الۡاِنۡسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكۡرٰى ؕ۲۳ ﴿الفجر: ۲۳﴾

۷۔ یہ سوزاں آگ ابھی سے کافروں کو گھیرے ہوئے ہے اگرچہ پردے اس کے مشاہدے سے مانع ہیں۔ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيۡطَةٌۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ ۴۹ ﴿التوبة: ۴۹﴾

شاید یہ تمام صفات باعث ہوئی ہوں گی کہ بعض مفسرین نے جہنم کے روحانی ہونے کی تفسیر کی ہے اور اس کی آگ کو معنوی سوزاں آگ جانا ہے، لیکن بے شک یہ تفسیر قرآن کی آیتوں کے ظاہر سے مطابقت نہیں رکھتی، جو روایتیں اُن کے ذیل میں نقل ہوئی ہیں اُن سے بھی مطابقت نہیں رکھتی، بنابریں ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ جہنم ایسی آگ کا مرکز ہے جو دنیا کی آگ سے اس طرح مختلف ہے جس طرح بہشت کی نعمتیں دینا کی نعمتوں سے پہلے مختلف ہیں۔

چند وضاحتیں

دوزخ کے وجود کا فلسفہ

بہت سے لوگ پوچھتے ہیں کہ جہنم کی ضرورت ہی کیا ہے؟ خدا تو انتقام کے درپے نہیں ہے کیونکہ عموماً سزائیں اس لئے ہوتی ہیں کہ افراد دوسری بار اس خطا کے مرتکب نہ ہوں یا وہ دوسروں کے لئے درس عبرت بنیں، جب کہ ہم جانتے ہیں کہ اس دنیا کے بعد دوبارہ اس دنیا کی طرف برگشت نہیں ہوگی اور دوسری دنیا میں فرائض، اطاعت اور گناہ کا تصور نہیں ہے، بنابرایں دوزخ کی سخت سزائیں کیا مفہوم رکھتی ہیں؟

دوسری طرف تمام دینی تعلیمات کا ہدف انسان کی تعلیم وتربیت اور اس کا تکامل ہے اور اگر کوئی شخص اُسے نہیں مانتا تو اس کے لئے یہی سزا کافی ہے کہ وہ ان عالی درجات تک پہنچنے سے محروم ہوجائے، بنابرایں سزاؤں اور قہر الٰہی کے مرکز دوزخ کے وجود کی کیا ضرورت ہوسکتی ہے؟ اس کے جواب کے لئے مندرجہ ذیل نکات ملاحظہ کریں:

۱۔ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ بہت سی الٰہی سزائیں حقیقت میں انسان اپنے اعمال کا نتیجہ ہیں چاہے اس دنیا میں ہوں یا دوسری دنیا میں، لیکن خدا کے مسبب الاسباب ہونے کی وجہ سے اُن کی اس کی طرف نسبت دی جاتی ہے، بہشت کی بہت سی نعمتیں انسان کے اپنے نیک اعمال کا تجسم اور بہت سی دوزخی سزائیں بھی اس کے برے اعمال کا تجسم ہیں، ہم جانتے ہیں کہ عمل کے آثار اور نتائج پر اعتراض کرنا معقول نہیں ہے، مثلا جو شخص نشہ آور اشیاء اور شراب استعمال کرتا ہے تا کہ اپنی دانست میں ان دو تباہ کن اشیاء کے ذریعے کچھ لحظات سکون اور اطمینان سے گذار لے اور ان تباہ کن عوامل سے حاصل ہونے والی بے خبری کی لذت سے استفادہ کرسکے، اسے خبردار کیا جاتا ہے کہ یہ دو عوامل آخرالامر تمہارے وجود کو تباہ کردیں گے، شراب کا استعمال، دل، اعصاب، پھیپھڑوں اور عروق کی بیماریوں کا باعث بنتا ہے، اور نشہ آور اشیاء انسان کے تمام اعصاب بلکہ تمام وجود کو برباد کردیتی ہیں، اب اگر کوئی شخص اس نصیحت کو نہ سنے اور ان اشیاء کو استعمال کرتا ہے تو اس کے عواقب ونتائج اور عذاب میں ضرور مبتلا ہوگا، قانون علیت کے علاوہ اس کی کوئی اور دلیل نہیں ہوسکتی اور یہ انسان کے اپنے عمل کا قہری نتیجہ ہے اور اس سے فرار ممکن نہیں ہے۔

بیشتر گناہ بھی اسی طرح ہیں اور اس دنیا کی زندگی اور دوسری دنیا کی زندگی میں اُن کے نتائج برآمد ہوتے ہیں جو دوزخ کے عذاب کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں، لہٰذا قرآن کی بہت سی آیتوں میں ہے کہ تمہاری سزا تمہارے اپنے اعمال ہی ہیں، سورہ نمل کی آیت ۹۰ میں ہے ''ومن جآء بالسیئۃ فکبت وجوھھم فی النار ھل تجزون الا ما کنتم تعملون'' یعنی جو لوگ اپنے ہمراہ برے اعمال لے کر آئیں گے منہ کے بل جہنم میں گرادیئے جائیں گے، تم نے جو اعمال انجام دیئے کیا تمہیں اس کے علاوہ کوئی سزا مل سکتی ہے؟ یعنی یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جنھوں نے تمہیں جکڑ لیا ہے، کوئی اور شے نہیں، سورہ تحریم کی آیت ۷ میں یوں ہے:

یا یھا الذین کفروا لا تعتذروا الیوم انما تجزون ما کنتم تعملون

اے کافر ہو جانے والو! آج معذرت کا اظہار مت کرنا کیونکہ تمہاری سزا وہ اعمال ہی ہیں جن کا تم نے ارتکاب کیا ہے۔

عذر خواہی کا فائدہ وہاں متصور ہے جہاں علت ومعلول اور اعمال کے طبیعی نتیجے کا مسئلہ متصور نہ ہو، وہ آیتیں جو تجسم اعمال کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں، مثلاً یتیم کا مال کھانے کو آگ کھانے کے عنوان سے پیش کرتی ہیں، اس بات پر گواہ ہیں، اسی طرح وہ روایتیں جو کہتی ہیں کہ انسانوں کی حیوانی صفات قیامت کے دن ان کے اندر سے باہر نکالی جائیں گی، اور اشخاص کے چہرے ان حیوانات کی طرح ہو جائیں گے جن میں وہ صفات موجود ہیں۔

مختصر یہ کہ یہ دنیا کھیتی ہے اور آخرت فصل کاٹنے کی جگہ ہے، اگر انسان پھول کا بیج بوئے تو اس کا حاصل خوبصورت اور خوشبو دار پھولوں کی شاخیں ہوں گی، اور اگر کانٹے بوئے گا تو کانٹے کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں کاٹ سکتا، گویا جو بوئے گا سو کاٹے گا۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں آیا اور تقاضا کیا کہ اُسے کوئی نصیحت فرمائیں، فرمایا: ''احفظ لسانک'' اپنی زبان کی حفاظت کرو، اس نے اس مسئلے کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور دوبارہ اپنا مدعا دہرایا، دوسری اور تیسری مرتبہ بھی پیغمبر اکرمؐ سے وہی جواب سنا، بعد ازاں آپؐ نے اس مسئلے کی اہمیت بیان کرنے کے لئے تیسری مرتبہ اضافہ فرمایا: ''ویحك وهل یکب الناس علی مناخرهم فی النار الا حصآئد السنتهم'' کیا اس کے علاوہ کچھ ہے کہ زبان کی کاٹی ہوئی فصل ہی لوگوں کو منہ کے بل دوزخ میں پھینک دے گی؟[1]

۲۔اس میں کوئی شک نہیں کہ انذار اور بشارت تربیتی امور کے اجراء کیلئے موثر ضامن ہیں۔

جس طرح بہشت کی عظیم نعمتوں کی بشارت خدا کی اطاعت اور گناہ کے ترک کرنے کی دعوت میں بہت موثر ہے، اسی طرح دوزخ کے دردناک عذاب کی وعید بھی بہت موثر ہے بلکہ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ سزائیں زیادہ قوی اثر رکھتی ہیں، اس بناء پر دنیا میں قانون ساز اداروں کے بنائے ہوئے تمام قوانین میں مجرموں کے لیے سزاؤں کا بھی تعین ہوتا ہے جسے وکلا کی اصلاح میں اجرا کی ضمانت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اجراء کی ضمانت کا مسئلہ اس حد تک اہم ہے کہ قانون کی تشکیل کے اصلی عناصر میں سے محسوب ہوتا ہے، وہ یوں کہ اگر کوئی قانون بنایا جائے اور مجرموں کے لئے کسی قسم کی بھی سزا (جیل، کوڑے، جرمانہ اور معاشرتی پابندی) معین نہ ہو تو اُسے قانون نہیں کہا جا سکتا، پھر کیسے ممکن ہے کہ الٰہی قوانین کے اجراء کی کوئی ضمانت نہ ہو؟ کیونکہ اس صورت میں اس کی قانونی قدر واہمیت ختم ہو کر رہ جائے گی، اور مجرموں کو اطاعت کرنے کی کوئی دلیل نظر نہیں آئے گی اور قانون سازی کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

یہ صحیح ہے کہ الٰہی قوانین کی مخالفت کی طبیعی اور وضعی آثار مخالفت سے روکنے کا عامل بن سکتے ہیں، لیکن صرف یہی کافی نہیں ہے، لہٰذا خدا نے ان آثار کے علاوہ بھی کچھ سزائیں مجرموں کے لئے معین کی ہیں اور جس طرح بعض قوموں کو دنیا ہی میں سزا دینے کی تہدید کی ہے (اور

---

[1] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۱۱۵ حدیث ۱۴۔

اس کے بہت سارے نمونے دنیا میں واقع ہو چکے ہیں جو گذشتہ اقوام کی حالت کے ذکر میں قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں) اسی طرح دوسری دنیا میں بھی مجرموں کے لئے سزائیں مقرر کی گئی ہیں، یہ نکتہ بھی واضح ہے کہ جس قدر تہدید اور حوصلہ افزائی زیادہ قوی اور شدید ہوگی اس کا اثر بھی زیادہ ہوگا۔

یہ بات بہشت اور دوزخ کے وجود کا ایک مقصد ظاہر کرتی ہے، ممکن ہے یہاں پر کہا جائے کہ مذکورہ تمام آثار سزاؤں کے وعدے پر مترتب ہوتے ہیں، لیکن کیا مانع ہے کہ یہ انذار اور تہدیدات خدا کی طرف سے بیان تو ہوں لیکن قیامت میں تحقق نہ پائیں چونکہ وہاں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی، کیونکہ نہ دوسروں کے لئے عبرت کا مسئلہ ہے اور نہ ہی گناہگاروں کی طرف سے گناہ کے عدم تکرار کا مسئلہ۔

لیکن اسکا لازمہ یہ ہوگا کہ خداوند حکیم عمل قبیح کا مرتکب ہو اور العیاذ باللہ جھوٹی بات کہے اور اپنے ہی وعدے کی مخالفت کرے، بدکاروں کو سزا دینے کی بات کرے اور اس کے انجام کی قسم بھی کھائے لیکن عملاً مخالفت کرے، مسلماً یہ ایک قبیح عمل ہے اور نہ صرف یہ کہ خدائے پاک کی ذات کے لائق نہیں بلکہ کوئی بھی مہذب اور حکیم شخص اس کا ارتکاب نہیں کرسکتا۔

نتیجہ یہ کہ ایک طرف سے سزاؤں کی دھمکی اور انذار اجراء کی ضمانت کے عنوان سے ضروری ہے اور دوسری طرف ان وعدوں پر عمل پیرا ہونا خدا کی ذات سے ہر قسم کی قباحت کی نفی کے لئے ضروری ہے۔

یہی دوزخ اور اس کی سزاؤں کے تحقق کا فلسفہ ہے۔

لہٰذا سورہ ابراہیم کی آیت ۴۷ میں بیان ہوا ہے:

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾ [۱۴:۴۷]

یہ نہ سمجھنا کہ خدا اپنے پیغمبروں سے کئے ہوئے وعدوں کی مخالفت کریگا، کیونکہ خدا قادر اور انتقام والا ہے۔

(اس آیت کے بعد روز قیامت کے بعض عذابوں کے بارے میں تشریح فرماتا ہے)۔

(۳)دوزخ کے دروازے اور طبقات

اشارہ

قرآن مجید کی متعدد آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کے متعدد دروازے ہیں، ایک آیت میں سات دروازوں کی تصریح ہوئی ہے، کیا یہ دروازے ان اعمال کی طرف اشارہ ہیں جو انسان کو جہنم کی طرف لے جاتے ہیں اور جو حقیقت میں انسانوں کے جہنم میں داخل ہونے کا راستہ ہیں جیسا کہ جنت کے دروازوں کے بارے میں بیان ہوا ہے؟

یا جہنم کے مختلف طبقات اور درجات کی طرف اشارہ ہے جن کی طرف مختلف روایات میں اشارہ ہوا ہے، یا دونوں معنی ان آیتوں کے مفہوم میں جمع ہوئے ہیں؟

بہتر ہے ہم پہلے اس بحث سے مربوط آیتوں کی تفسیر کریں تاکہ مندرجہ بالا سوالوں کے جوابات پا سکیں، لہٰذا مندرجہ ذیل آیات میں غور کرتے ہیں:

۱۔ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿الحجر: ۴۴﴾

۲۔ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۲۹

النحل: ۲۹

۳۔ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا ﴿الزمر: ۷۳﴾

۴۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۱۴۵

(النسائ)

ترجمہ

۱۔ اور جہنم ان سب کی میعادگاہ ہے جس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے کے لئے ان میں سے ایک معین گروہ کو تقسیم کردیا گیا ہے۔

۲۔ اب جہنم کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ، تم وہاں ہمیشہ کے لئے رہو گے، مستکبرین کے لئے کتنا برا ٹھکانا ہے۔

۳۔ اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں مختلف گروہوں کی شکل میں جہنم کی طرف بھیجے جائیں گے، جب وہ دوزخ تک پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھل جائیں گے۔

۴۔ منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں قرار پائیں گے اور تم ہرگز اُن کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔

تفسیر

جہنم کے دروازوں سے کیا مراد ہے؟

پہلی آیت میں شیطان کے پیروکاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جن کے بارے میں اس سے پہلے کی آیتوں میں گفتگو کی گئی ہے، فرماتا ہے: جہنم ان سب کی وعدہ گاہ ہے جس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازہ کے لئے ان میں سے ایک معین گروہ کو تقسیم کیا گیا ہے۔وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿الحجر: ۴۴﴾

جہنم کے دروازوں سے کیا مراد ہے، اس بارے میں مفسرین نے مختلف احتمالات کا ذکر کیا ہے۔

پہلا احتمال یہ ہے کہ یہ دوزخ میں داخل ہونے کے دروازوں کی طرف اشارہ ہے جو سب کے سب ایک ہی مرکز میں کھلتے ہیں، جیسے اس دنیا میں کسی عمارت کے چند دروازے ہوتے ہیں، اور حقیقت میں یہ اس قہرالٰہی کے مرکز میں داخل ہونے والوں کی کثرت کی طرف اشارہ ہے لیکن اس آیت کی تفسیر میں بیان ہونے والی متعدد روایتوں کے پیش نظر یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہاں پر جہنم کے مختلف طبقات مراد ہیں جو عذاب کی شدت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، بنا برایں حقیقت میں جہنم کا ہر دروازہ ان طبقات میں سے ایک طبقے میں کھلتا ہے، اہل بیت کرامؑ اور اہل سنت کی طرف سے مروی متعدد روایات اس تفسیر پر شاہد ہیں۔

در المنثور میں امام علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ فرمایا:

اتدرون كيف ابواب جهنم؟ قلنا كنحو هذه الابواب! قال لا ولكنها هكذا ووضع يده فوق يده وبسط يده على يده۔

کیا تم جانتے ہو کہ جہنم کے دروازے کیسے ہیں؟ ہم نے جواب دیا انہی دروازوں کی طرح، فرمایا: نہیں، بلکہ اس

طرح ہیں، پھر امامؑ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھ دیا اور اسے کھول دیا۔

(یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے اوپر مختلف طبقوں کی صورت میں ہیں) [1]

ایک اور حدیث میں اُن سے نقل ہوا ہے کہ فرمایا:

سبعة ابواب النار متطابقات

دوزخ کے سات دروازے ہیں جو ایکدوسرے کے اوپر قرار دیئے گئے ہیں۔ [2]

ایک اور حدیث میں امیر المومنینؑ سے دوزخ کے سات دروازوں کی ایک تفسیر دوسرے کے اوپر قرار دیئے گئے طبقوں کی صورت میں کرنے کے بعد ان طبقات کے نام اس طرح گنوائے گئے ہیں:

سب سے نیچے "جہنم"، اس کے اوپر "لظیٰ" اس کے اوپر "حطمہ" اس کے اوپر "سقر" اس کے اوپر "جحیم" اور اس کے اوپر "سعیر" اس کے اوپر "ہاویہ" ہوگا (لیکن بعض روایات میں سب سے نیچے ہاویہ اور سب سے اوپر جہنم کو قرار دیا گیا ہے) [3]

تیسرا احتمال یہ ہے کہ یہ متعدد دروازے ان مختلف اور متعدد اقوام کی وجہ سے ہوں گے جو ان دروازوں سے داخل ہوں گی، تفسیر روح المعانی میں احادیث کے کچھ منابع سے نقل کیا گیا ہے کہ پہلا دروازہ یکتا پرست مسلمان گنہگاروں کے لئے ہے، دوسرا دروازہ یہودیوں کے لئے، تیسرا دروازہ عیسائیوں کے لئے، چوتھا ردوازہ ستارہ پرستوں کے لئے مخصوص ہے اور پانچواں دروازہ مجوسیوں کے لئے، چھٹا دروازہ مشرکین کے لئے اور ساتواں اور آخری دروازہ منافقین کے لئے مخصوص ہے۔ [4]

چوتھا احتمال یہ ہے کہ ان دروازوں سے مراد وہ گناہ اور اعمال ہیں جو دوزخ میں داخل ہونے کا باعث بنتے ہیں، اس بات پر شاہد اولا وہ مقابلہ ہے جو بہشت کے دروازوں سے کیا گیا ہے، جنت کے دروازوں کے بارے میں بعض روایات میں صراحت سے بیان ہوا ہے کہ "جہاد" جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے، یا یہ کہ جنت کے دروازوں میں ایک کا نام "باب" "المجاہدین" ہے [5] ایک اور روایت میں کچھ اور دروازوں کی طرف اشارہ ہوا ہے جو "صبر" اور "شکر" کی طرح کے اعمال انسانی سے مربوط ہیں۔

ثانیا وہ روایتیں ہیں جو نشاندہی کرتی ہیں کہ جہنم کے بعض دروازوں سے فرعون، ہامان اور قارون اور بعض دروازوں سے مشرکین اور

---

[1] الدر المنثور۔ جلد ۴ صفحہ ۹۹۔

[2] نور الثقلین۔ جلد ۳ صفحہ ۱۸ حدیث ۶۲۔

[3] نور الثقلین۔ جلد ۳ صفحہ ۱۹ حدیث ۶۴۔

[4] روح المعانی۔ جلد ۱۴ صفحہ ۴۸۔ تفسیر قرطبی۔ جلد ۵ ص ۳۶۴۶۔

[5] کافی۔ جلد ۵ صفحہ حدیث ۲۔

بعض سے پیغمبر اسلامؐ کے اہل بیتؑ کے دشمن داخل ہوں گے [1] یہ بھی جہنم کے دروازوں کی مختلف گناہوں سے رابطے کی دلیل ہے، لیکن آخری تینوں تفسیریں آپس میں جمع ہوسکتی ہیں کیونکہ جہنم کے طبقات ایک دوسرے سے زیادہ دردناک اور اس میں داخل ہونے والے گروہ ایک دوسرے سے زیادہ گنہگار ہوں گے اور ان کے انجام دیئے ہوئے اعمال ایک دوسرے سے بدتر ہوں گے، اس لئے یہ تینوں تفسیریں ایک ہی مفہوم میں جمع ہونے کے قابل ہیں اور نتیجے کے طور پر جہنم کے دروازے ہمیں اس حقیقت کا پیغام دیتے ہیں کہ جس طرح انسان کے اعمال اور مجرمین و کفار آپس میں مختلف ہیں اُن کی سزائیں بھی آخرت میں ایک جیسی نہیں ہوں گی بلکہ اُن میں بہت فرق ہوگا۔

دوسری آیت میں ان کفار کو مخاطب کیا گیا ہے جنہوں نے اس غلط راستے کو انتخاب کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''اب (قیامت میں) جہنم کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ جب کہ تم کو ہمیشہ وہاں رہنا ہے اور متکبروں کا ٹھکانہ کتنا برا ہے'' **فادخلوا ابواب جهنم خلدين فيها فلبئس مثوى المتكبرين**''۔

یہاں پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ ''ابواب جہنم'' جمع کی صورت میں ذکر ہوا ہے جب کہ ہر گروہ ایک دروازے سے داخل ہوگا، متعدد دروازوں سے نہیں (توجہ کیجئے گا)۔

ممکن ہے یہ تعبیر اس لئے ہو کہ اس آیت کے مخاطبین جمع کی صورت میں ہیں اور طبعی طور پر جب ایک جماعت کسی ایسی جگہ داخل ہونا چاہیے جس کے متعدد دروازے ہوں تو ہر گروہ کسی ایک دروازے سے داخل ہوگا، پس مجموعی طور پر وہ متعدد دروازوں ہی سے داخل ہوں گے یا یہ کہ ہر گروہ ایک خاص عنوان کے تحت اُن میں سے کسی ایک دروازے سے داخل ہوگا جو اسی گروہ کے لئے مخصوص ہوگا، یہ بھی احتمال ہے کہ اس آیت کے مخاطبین دوزخ کے نچلے طبقہ میں قرار پائیں اور واضح ہے کہ انہیں اس کے لئے مختلف دروازوں اور طبقات سے گزرنا پڑے گا۔

بہر حال اس آیت میں صرف جہنم کے دروازوں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے لیکن ان کی تعداد کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی گئی دوسرے لفظوں میں جہنم اس ہولناک جیل کی مانند ہے جس کی مختلف بیرکیں اس طرح ہوں کہ ایک بیرک سے گذر کر دوسری میں جانا پڑتا ہو، جو لوگ بہت ہی زیادہ گمراہ ہوں گے اور جن کا ٹھکانا سب سے پست یا جہنم کی تہ یا اس کے نزدیک ہوگا، انہیں یقیناً ان تمام بیرکوں میں سے گزرنا پڑے گا۔

تیسر آیت میں یہی بات ایک اور انداز میں بیان کی ہے، ارشاد ہوتا ہے ''اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں گروہوں کی صورت میں جہنم کی طرف دھکیل دیئے جائیں گے، جب وہ اس تک پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے''۔ **وَسِيۡقَ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ اِلَى الۡجَـنَّةِ زُمَرًا‌ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوۡهَا وَفُتِحَتۡ اَبۡوَابُهَا** ﴿الزمر: ۷۳﴾ ۔

گویا یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جہنم اُن کی آمد کو جان لے گا، جب وہ نزدیک پہنچیں گے تو اچانک دروازے کھل جائیں گے، یہ ناگہانی منظر ان میں زیادہ خوف پیدا کر دے گا، جب کہ یہی مفہوم بہشتیوں کے بارے میں بھی آیا ہے اور یہ ان کی مزید خوشی اور سرور کا

---

[1] بحار، ج ۸ صفحہ ۲۵۸ حدیث ۱۱۔

باعث بنے گا، ایک بار پھر ہم یہاں جہنم کے دروازوں کی تعداد کا ذکر پاتے ہیں جب کہ ان کی تعداد بیان نہیں ہوئی، یہاں پھر جہنم کے تمام دروازوں کے کھلنے کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے، جب کہ ہر گروہ ایک دروازے سے داخل ہوگا، ممکن ہے اس تعبیر کا انتخاب ان دلیلوں کی بنا پر ہو جن کی طرف اس سے پہلے کی آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

چوتھی آیت میں دروازوں سے متعلق گفتگو نہیں ہو رہی بلکہ صرف جہنم کے نچلے طبقے کے بارے میں بات ہو رہی ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ جہنم کے مختلف طبقے ہیں، فرمایا گیا ہے: منافقین جہنم کے نچلے طبقے میں قرار پائیں گے اور تم ہر گز ان کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔ ''ان المنافقين في الدرك الاسفل من النار ولن تجد لهم نصيرا''۔ عربی زبان میں اوپر کی طرف جانے والی سیڑھیوں کو 'درجہ' اور نیچے کی طرف جانے والی سیڑھیوں (تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرح) کو 'درکہ' کہتے ہیں، یہ کلمہ 'درک' کے مادہ سے (''مرگ'' کے وزن پر) کسی چیز تک پہنچنے کے معنی میں ہے، لہٰذا سمندر یا کنوئیں کی تہہ میں اترنے کے لئے استعمال ہونے والی ایک دوسرے سے متصل کی گئی رسی کو درک (فلک کے وزن پر) کہا جاتا ہے، سمندر کی سب سے گہری تہہ کو یا کسی بھی جگہ کی گہرائی کو درک (''مرگ'' کے وزن پر) کہا جاتا ہے، بنا بریں آیت شریفہ میں لا درک کی الاسفل سے توصیف، تاکید اور قید توضیحی کے معنی میں ہے۔

فخر رازی اپنی تفسیر میں ''درک'' کی تفسیر کسی چیز کی گہرائی کے دورترین نقطے کے معنی میں کرنے کے بعد کہتا ہے: اس قرآنی تعبیر کا ظاہر یہ ہے کہ جہنم کے کچھ طبقات ہیں اور ظاہراً جہنم کے طبقوں میں سخت ترین طبقہ سب سے نچلہ طبقہ ہی ہے۔[1]

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس میں جہنم کی اتھاہ گہرائی کا ذکر منافقوں کے لئے ہوا ہے اور یہ بات ہمیں واضح طور پر بتاتی ہے کہ نفاق بد ترین گناہ اور جہنم کا پست ترین طبقہ ہے، اس کی دلیل واضح ہے اور وہ یہ کہ منافقوں کی جانب سے جو خطرہ اسلامی معاشرے کو لاحق ہوتا ہے ان کفار اور دشمنوں کے خطرے سے کہیں زیادہ ہے جو صراحت کے ساتھ اپنی دشمنی اور کفر کا اظہار کرتے ہیں۔

ایک حدیث میں فاسد علماء کے بارے میں ہے:

ان من العلمآء من يحب ان يخزن علمه، ولا يوخذ عنه، فذاك في الدرك الاسفل من النار۔

بعض علماء ایسے ہیں جو اپنے علم کا اس طرح ذخیرہ کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے یہ لوگ آگ کے درک اسفل میں ہوں گے۔[2]

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں بعض روایتوں سے بھی یہ استفادہ ہوتا ہے کہ جہنم کے سات دروازوں میں ہر ایک کے لئے خاص لوگ ہیں،

---

[1] تفسیر فخر رازی۔ جلد ۱۱، صفحہ ۸۷۔

[2] بحار الانوار۔ جلد ۸ صفحہ ۳۱۱ حدیث ۱۱۔

مثلا ایک دروازے سے فرعون، ہامان اور قارون داخل ہوں گے، دوسرے دروازے سے بنی امیہ، ایک اور دروازے سے مشرکین اور اسی طرح۔۔۔۔۔[1]

واضح ہو کہ فرعون، ہامان اور قارون یا بنی امیہ کا ان دروازوں سے داخل ہونا ان کے اعمال اور عقائد کی وجہ سے ہوگا، اسی دلیل کی بنا پر جو لوگ ان کے راستے پر اور ان کے علمی اور عقیدتی مکتب کے پیروکار ہوں گے قاعدے کے مطابق وہ بھی انہی دروازوں سے داخل ہوں گے، لہٰذا ''دروازوں'' اور انسان کے عقائد و اعمال کے درمیان رابطہ واضح ہو جاتا ہے۔

(۴) دوزخیوں کے جسمانی عذاب

اشارہ:

جس طرح الٰہی جزاؤں اور بہشتی نعمتوں کو روحانی اور جسمانی دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے جس کی تفصیل گزر چکی، اسی طرح عذاب دوزخ کو بھی روحانی اور جسمانی دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے، چونکہ ہم جانتے ہیں کہ معاد کے دو رخ ہیں اور ہر رخ اپنے تناسب سے سزا اور جزا کا متقاضی ہے۔

علاوہ ازیں اس دنیا میں انسانی اعمال بھی دو طرح کے ہیں (قلبی اور روحانی اعمال) اور (مادی اور جسمانی اعمال)، بنابرایں یہ ممکن نہیں کہ وہاں پر ایک طرح کی سزا یا جزا موجود ہو۔

قرآن کی مختلف آیتیں اور اسلامی روایات بھی اس مدعا پر روشن دلیل ہیں، اس اشارے کے ساتھ ہم پہلے دوزخیوں کی جسمانی سزاؤں کا ذکر کرتے ہیں اور اس بارے میں نازل شدہ قرآنی آیتوں کا مندرجہ ذیل عناوین کے تحت مطالعہ کرتے ہیں:

الف۔ دوزخ میں عذاب کی شدت

ب۔ جہنمیوں کی غذا اور مشروبات

ج۔ جہنمیوں کے لباس

د۔ جہنمیوں کے دیگر جسمانی عذاب

دوزخ میں عذاب کی شدت

۱۔ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ﴿١١﴾ وَصَاحِبَتِهِ

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۸ صفحہ ۲۸۵ حدیث ۱۱۔

وَاَخِيْهِ ﴿۱۲﴾ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ﴿۱۴﴾

(المعارج)

۲۔ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۵﴾ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۶﴾ (الفجر)

۳۔ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ﴿۲۴﴾ (الغاشية)

۴۔ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾ اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾ (المرسلات)

۵۔ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ﴿۱۱﴾ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ﴿۱۲﴾ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿۱۳﴾ (الاعلىٰ)

ترجمہ:

۱۔ گناہگار چاہے گا اپنے بچوں کو اس دن کے عذاب کے بدلے میں قربان کر دے، اپنی بیوی اور بھائی کو اور اپنے اس کنبے کو جو ہمیشہ اس کی حمایت کرتا تھا، اور روئے زمین کے تمام لوگوں کو تا کہ اس کی نجات کا باعث بن سکیں۔

۲۔ اس روز کوئی شخص اس کی طرح عذاب نہیں کرے گا اور کوئی بھی اس کی طرح کسی کو نہیں جکڑے گا۔

۳۔ خدا اس کو بہت بڑا عذاب دے گا۔

۴۔ چلے جاؤ تین حصوں والے سائے کی طرف (آگ کے گلوگیر دھوئیں) کی طرف جو نہ آرام بخش ہے اور نہ ہی آگ کے شعلوں کو روکے گا، اتنے بڑے انگارے برسائے گا جیسے محل، گویا (سرعت اور کثرت میں) زرد رنگ کے اونٹوں کی طرح ہوں گے جو ادھر اُدھر بکھر جاتے ہیں۔

۵۔ لیکن بدبخت ترین لوگ اس (الٰہی تذکر) سے دوری اختیار کریں گے، وہی شخص جو عظیم آگ میں داخل ہوگا، پھر اس آگ میں نہ مرے گا نہ جائے گا۔

تفسیر

قیامت میں دوزخ کے عذاب کی شدت اتنی زیادہ ہوگی کہ قرآن پہلی زیر بحث آیت میں فرماتا ہے کہ گنہگار چاہے گا کہ اس دن کے عذاب کے بدلے میں اپنی اولاد کو قربان کر دے، یہاں تک کہ اپنی بیوی، بھائی اور قبیلے کو بھی جس نے ہمیشہ اس کی حمایت کی ہے اور زمین کے تمام لوگوں کو بھی تاکہ اس کی نجات کا باعث ہو سکے۔"یود المجرم لو یفتدی من عذاب یومئذ ببنیه۔ وصاحبته واخیه۔ وفصیلته التی تویه۔ومن فی الارض جمیعا ثم ینجیه"۔[1]

دوسری آیت میں مجرموں کی قیامت میں بیداری اور الٰہی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں کوتاہی پر شدید افسوس کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرمایا ہے: اس دن خدا اُسے ایسی سزا دے گا کہ کوئی بھی اس طرح کی سزا نہیں سے گا اور اُسے اس طرح جکڑے گا کہ کسی نے بھی کسی اور کو اس طرح نہیں جکڑا ہوگا "فیومئذ لا یعذب عذابه احد۔ ولا یوثق وثاقه احد"۔[2]

اس لحاظ سے اس کی سزا بے مثال اور اس کا جکڑنا بے سابقہ ہے۔

یہ تعبیریں عموماً تربیتی ثمرہ رکھتی ہیں اور اس لئے ہیں کہ انسان الٰہی سزاؤں کو اہمیت دے، چونکہ غالباً لوگوں کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ خدا "ارحم الراحمین" ہے، اپنے بندوں کو ہرگز سزا نہیں دے گا یا پھر اس کی سزائیں بہت نرم ہوں گی اور یہی سوچ سبب بنتی ہے کہ وہ گناہوں پر جری ہوں اور مختلف معاصی میں آلودہ ہو جائیں، لہٰذا قرآن پوری صراحت سے ان دردناک سزاؤں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تاکہ لوگ خام خیالیوں کو ذہنوں سے نکال دیں اور اپنے اعمال کا خیال رکھیں۔

یہی معنی کسی اور تعبیر کے ساتھ تیسری آیت میں بیان ہوا ہے، حق کی طرف پیٹھ پھیرنے والے کافروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا اس کو بہت بڑے عذاب کی صورت میں سزا دے گا "فیعذبه الله العذاب الاکبر"۔

عذاب اکبر (سخت ترین عذاب) قیامت کے عذاب کی طرف اشارہ ہے جو دنیا کے عذاب کے مقابلہ میں ہے اور جسے ادنی سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ سورہ الم سجدہ کی آیت ۲۱ میں ہے: "ولنذیقنهم من العذاب الادنی دون العذاب الاکبر"۔

ہم انہیں عذاب اکبر سے پہلے عذاب ادنیٰ چکھائیں گے۔

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ دنیا میں بعض اوقات گناہگار اقوام کے لئے الٰہی سزائیں (مثل قوم لوط کے لئے) اتنی شدید ہوتی تھیں کہ

---

[1] "فصیله"، "فصل" کے مادہ سے جدا ہونے کے معنی میں ہے اور یہاں پر ایسے قبیلے اور کنبے کے معنی میں ہے جس سے انسان وجود میں آیا ہے۔

[2] "عذابه" اور "ثاقه" میں ضمیر خدا کی طرف پلٹتی ہے، بعض مفسروں نے (مثلاً آلوسی نے روح المعانی میں اور برسوئی نے روح البیان میں) اس احتمال کا اظہار کیا ہے کہ یہ ضمیر انسان کی طرف پلٹتی ہے لیکن یہ احتمال بہت بعید نظر آتا ہے۔

ان کی تمام آبادی، شہر، زندگی اور اجساد درہم برہم ہو جاتے تھے، لیکن پھر بھی یہ تمام سزائیں قیامت کے عذاب کے مقابلے میں "عذاب اصغر" ہیں اور یہ امر قیامت کے عذاب فوق العادہ کی شدت کی خبر دیتا ہے۔

چوتھی آیت میں جہنمیوں کے عذاب کا ایک اور نمونہ بیان ہوا ہے، قیامت اور الٰہی عدالت کے منکروں سے کہا جائے گا: چلے جاؤ تین حصوں والے سائے (آگ کے حبس پیدا کرنے والے دھوئیں) کی طرف جس سے نہ چین آتا ہے اور نہ ہی وہ آگ کے شعلوں کو روک سکتا ہے (بلکہ اس کے ہولناک آثار میں اضافہ کرتا ہے) اتنے بڑے انگارے برساتا ہے جتنے بڑے محل ہوتے ہیں، گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں (جو تیزی سے ہر طرف پھیلتے ہیں) "انطلقوا الی ظل ذی ثلث شعب۔ لا ظلیل ولا یغنی من اللهب۔ انها تمی بشرر کالقصر۔ کانه جمالة صفر"۔

اس آیت میں جہنم کی آگ کی شدت کے بارے میں عجیب نکتے بیان ہوئے ہیں۔

پہلا نکتہ یہ کہ اس عظیم عدالت کے منکروں اور مختلف گناہوں سے آلودہ لوگوں سے کہا جائے گا کہ سائے کی طرف چلے جاؤ، لیکن کون سا سایہ؟ حبس کرنے والے دھوئیں سے بننے والا سایہ جس کے تین حصے ہوں گے، سر کی طرف ایک حصہ اور دو حصے دائیں اور بائیں طرف مختصرا یہ کہ ایسا ہولناک سایہ جو ہر طرف سے ان کا احاطہ کئے ہوگا، نہ ایسا سایہ جو بہشت کے باطراوت اور آرام بخش درختوں اور محل اور چھت کا ہوتا ہے بلکہ گرم اور جلانے والا سایہ۔

اس سائے کے متعدد حصے ہوں گے، ہر ایک آگ کے انگاروں سے بھرا ہوگا محلوں کی طرح کے عظیم انگارے یا زرد رنگ کے اونٹوں کی طرح جو بہت تیزی سے ادھر اُدھر دوڑتے ہیں، جہاں سایہ اس طرح کا ہو وہاں آگ کس طرح کی ہوگی؟ کیسی دقیق اور بیدار کنندہ تعبیر ہے، لوگ ہمیشہ گرمی سے نجات کے لئے سائے کی طرف جاتے ہیں جب کہ یہاں آگ کے دھوئیں کے سائے کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے، اگر آیت کے نزول کے زمانے میں اس کا تصور مشکل تھا تو آج کے ہولناک جنگی میدان جہاں ٹنوں وزنی بم پھنکے جاتے ہیں اور ہر چیز دھوئیں اور آگ کی لپیٹ میں آجاتی ہے اس سے اُس عظیم عذاب کی ایک ہلکی سی تصویر ذہن میں آسکتی ہے جس میں آگ کی عظیم چنگاریاں اور آتش انگارے اپنے اردگرد کے ایک وسیع حصے کو شراروں سے بھر دیتے ہیں، یہ تو ابھی اس آگ کا سایہ ہے۔[1]

"قصر" کی تعبیر ممکن ہے ستمگروں کے محلوں کی طرف اشارہ ہو، آتش جہنم کی چنگاریوں کی ان محلوں سے تشبیہ بہت معنی خیز ہے جب کہ یہ محل ہمیشہ محروموں کے دلوں کو آگ لگاتے تھے، اسی طرح ایک طرح کے زرد رنگ کے اونٹوں سے تشبیہ جو مستکبروں کی بے حساب دولت کی علامت ہے اس مورد میں ایک اور پر معنی تعبیر ہے، ممکن ہے بعض لوگ یہ سمجھیں کہ ان شراروں کی کبھی محلوں سے تشبیہ اور کبھی زرد اونٹوں سے

---

[1] بعض مفسرین معتقد ہیں کہ (انها) کی ضمیر آگ (النار) کی طرف پلٹتی ہے جو مونث مجازی ہے! اگر چہ "نار" کا آیہ میں ذکر نہیں ہوا تاہم دھوئیں کے سائے کے قرینے سے ہم یہ بات سمجھ سکتے ہیں، لیکن بہتر یہ ہے کہ ضمیر اس حبس کرنے والے سائے کے تینوں حصوں کی طرف پلٹے کیونکہ مقصد یہ ہے کہ اس سائے کے ہولناک آثار معلوم ہوں تا کہ بطریق اولی آگ کی کیفیت واضح ہو جائے۔

تشبیہ کے درمیان کوئی ہم آہنگی نہیں ہے کیونکہ ایک چیز بہت بڑی اور دوسری نسبتاً چھوٹی ہے، لیکن توجہ دینی چاہیے کہ ان دونوں میں سے ہر تشبیہ ایک خاص جہت کی طرف اشارہ ہے، پہلی تشبیہ ان شراروں کی بڑائی کے لئے ہے اور دوسری تشبیہ کثرت، سرعت اور ہر طرف پھیلنے کے لئے ہے جس طرح اونٹ بیابانوں میں بکھر جاتے ہیں یا پھر ان چنگاریوں کے باہمی تفاوت کے لئے ہے، اس کے بڑے انگارے ستمگروں کے محلوں کی مانند اور چھوٹی چنگاریاں زرد رنگ کے اونٹوں کی طرح۔

جمالة "جمل" کی جمع ہے جو اونٹ کے معنی میں ہے حجر اور حجارہ کی مانند اور صفر (قفل کے وزن پر) اصفر کی جمع ہے جس کا معنی زرد رنگ ہے اور کبھی کبھی گہرے سیاہی مائل رنگ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے لیکن یہاں پہلا معنی ہی مناسب ہے۔

پانچویں اور آخری آیت میں ایک اور تعبیر نظر آتی ہے جو جہنم کے شدید عذاب کی حکایت کرتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: بدترین لوگ اس (خدا کے بیدار کنندہ تذکر) سے دوری اختیار کریں گے پھر جو شخص اس عظیم آگ میں داخل ہوگا وہ نہ اس میں جئے گا اور نہ مرے گا۔

ویتجنبها الا شقی الذی یصلی النار الکبری ثم لا یموت فیها ولا یحیی۔

یہ عذاب جہنم کی شدت کی ایک تصویر ہے جس میں جہنمی ہمیشہ موت اور زندگی کی درمیانی حالت میں گرفتار ہوں گے، (نہ اُن کو موت آئے گی تا کہ وہ کوئی چیز درک نہ کریں اور ان کو آرام ہو اور نہ اس حالت کو زندگی کا نام دیا جا سکتا ہے) اسی طرح جیسے دنیا کے شدید عذاب میں ہوتا ہے کہ انسان زندگی اور موت کی کشمکش میں ہوتا ہے اور اس طرح ہمیشہ موت اور زندگی کے درمیان ہاتھ اور پاؤں مارتا ہے۔

عظیم آگ (النار الکبری) کی تعبیر چھوٹی آگ کے مقابلہ میں ہے جو اس دنیا کے عذاب کی طرف اشارہ ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے:

ان نارکم هذه جزء من سبعین جزء ا من نارجهنم وقد اطفئت سبعین مرة بالمآء ثم التهبت! ولو لا ذلك ما ستطاع ادمی ان یطیقها۔

تمہاری یہ آگ جہنم کی ستر اجزاء والی آگ کا ایک جز ہے جسے ستر بار پانی ڈال کر بجھایا گیا لیکن یہ پھر شعلہ ور ہوگئی، اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی انسان اس کو برداشت کرنے کی طاقت نہ رکھتا یعنی اس کے قریب نہیں جا سکتا تھا، [1] یہی مفہوم علی علیہ السلام نے پیغمبر اکرمؐ سے بھی نقل کیا ہے۔

بعض مفسرین نے اس احتمال کا بھی اظہار کیا ہے کہ "نار کبریٰ" جہنم کے ایک حصے کی طرف اشارہ ہے جس کا عذاب زیادہ شدید ہے

---

[1] تفسیر امام حسن عسکریؑ، بحار الانوار جلد ۸ صفحہ ۲۸۸ حدیث ۲۱ کی نقل کے مطابق۔

(یعنی جہنم کا سب سے نچلا طبقہ)[1]، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب لگتی ہے، یہ سب جہنم کی آگ کے وسیع وعریض پہلوؤں اور اس کے دردناک عذاب کی شدت کا گوشہ تھا۔

ب: جہنمیوں کی غذا اور مشروبات

اشارہ:

بارہا ہم کہہ چکے ہیں کہ معاد کے جسمانی اور روحانی دو پہلو ہیں، اس لئے جزا اور سزا بھی دو طرح کی ہیں، اس مورد میں جو امور جسمانی لذت کا سبب یا عذاب کا باعث بن سکتے ہیں، غذا اور مشروبات ہیں ایک نامناسب بدبودار، بدمزہ، ناگوار گرم اور سوزاں اور گلے میں اٹکنے والی غذا، ایک دردناک عذاب ہے، اس کے مقابلے میں ایک لذیز اور پسندیدہ مشروب یا غذا جسم کی لذت کا باعث اور بدن کی راحت کا سبب ہے حتی کہ یہ انسان کی روح پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور اس کا سرور اور نشاط بخشتی ہے جب کہ اس کے برعکس ایک ناگوار اور بدمزہ کھانا یا مشروب روح کی ناراحتی کا سبب بھی ہے اور جسم کے عذاب کا باعث بھی۔

قرآن مجید نے جہنم کے تربیتی پہلو کو شدت بخشنے، مجرموں اور بدکرداروں کو شدت سے خبردار کرنے اور اُن کو برے اعمال سے روکنے کے لئے جہنمیوں کی غذاؤں اور مشروبات کی کیفیت سے پردہ اٹھایا اور اس کے ایک گوشے کی تصویر کشی کی ہے۔

اس مورد میں وارد ہونے والی تعبیریں اتنی خوفناک اور بیدار کنندہ ہیں کہ ہر انسان کو متاثر کرسکتی ہیں، اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف لوٹ آتے ہیں اور مندرجہ ذیل آیات کو جان ودل سے پڑھتے ہیں:

۱۔ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِيْمِ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ

۲۔ اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ

۳۔ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا

---

[1] المیزان جلد ۲۰ اسی آیت کے ذیل میں۔

الْخَاطِئُونَ

۴۔ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ

۵۔ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ۲۹

؎ الکہف: ۲۹

۶۔ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا

۷۔ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ

ترجمہ:

۱۔ زقوم کا درخت گناہگاروں کی غذا ہے جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح پیٹ میں ابلتا ہے، اس کا اُبلنا کھولتے ہوئے پانی کی طرح ہے۔

۲۔ کیا یہ (بہشت کی جاوداں نعمتیں) بہتر ہیں یا زقوم کا (نفرت انگیز) درخت؟ ہم نے اس کو ظالموں کی دردوالم کا باعث قرار دیا ہے۔ یہ ایسا درخت ہے جو جہنم کی تہہ سے اُگتا ہے، اس کے شگوفے شیاطین کے سروں کی طرح ہیں، وہ (مجرم) اس میں سے کھائیں گے اور اسی سے اپنا پیٹ بھریں گے۔

۳۔ آج یہاں اس کا کوئی مہربان دوست نہیں ہے اور نہ ہی پیپ کے علاوہ کوئی کھانا، یہ ایسی غذا ہے جسے گناہگاروں کے علاوہ کوئی نہیں کھائے گا۔

۴۔ اور وہ دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے اور انہیں ایک کھولتے ہوئے چشمے کا پانی پلایا جائے گا، ان کا کھانا ضریع (ایک خشک اور تلخ و بدبودار جھاڑی) کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا جو نہ ان کو تنومند کرے گا اور نہ ہی بھوک مٹائے گا۔

۵۔ ہم نے ستم گروں کے لئے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوں گی اور اگر وہ پانی طلب کریں گے تو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح کھولتا پانی انہیں دیا جائے گا جو چہروں کو جھلسا دے گا، کیا برا پانی ہے اور کتنا برا ٹھکانا ہے!

۶۔ جہنم ایک بڑی کمین گاہ ہے اور سرکشوں کی واپسی کی جگہ، اس میں مدتوں رہیں گے، وہاں پر نہ ٹھنڈی چکھیں گے اور نہ ہی مشروب دل پسند، سوائے کھولتے ہوئے پانی اور بہتی ہوئی پیپ کے۔

۷۔ انہون نے (خدا سے) فتح اور کامرانی کی دعا مانگی اور ہر سرکش اور منحرف ہلاک اور بابود ہوا، اور جہنم اس کے پیچھے ہے اور اُسے بدبودار متعفن پانی پلایا جائے گا، اُسے زحمت سے گھونٹ گھونٹ کر کے پینا پڑے گا، وہ اپنی مرضی سے اس کے پینے پر کبھی راضی نہ ہو گا اور موت ہر جگہ سے اس کی جانب لپکے گی، لیکن اس کے باوجود وہ نہیں مرے گا، اس کے پیچھے ایک شدید عذاب ہوگا۔

تفسیر:

زقوم۔ حمیم۔ غسلین۔ ضریع۔ غساق۔ صدید:

پہلی آیت میں جہنمیوں کی غذا کے بارے میں پہلی تعبیر دکھائی دیتی ہے، اور وہ ہے زقوم کا درخت۔ فرمایا گیا ہے: زقوم ضرور گناہگاروں کی غذا ہے جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح پیٹوں میں ابلتا ہے اور یہ یوں ابلتا ہے جیسے کھولتا ہوا پانی "ان شجرت الزقوم۔ طعام الاثیم۔ کالمھل یغلی فی البطون۔ کغلی الحمیم"۔

ارباب لغت اور مفسرین نے (زقوم) کے کلمہ اور اس کے معنی کے بارے میں کافی گفتگو کی ہے، یہ لفظ قرآن مجید میں تین بار آیا ہے [۱]۔ بعض نے اسے عربی کلمہ "زقم" کے مادہ سے نکلنے کے معنی میں سمجھا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ کلمہ عربی میں نہیں تھا اور افریقی علاقے حبشہ سے عربی معاشرے میں آیا ہے کچھ مفسرین اور اہل لغت نے اسے ایک تلخ اور بدبودار جڑی بوٹی کا نام قرار دیا ہے، جس کے چھوٹے چھوٹے پتے ہوتے ہیں اور یہ جزیرہ نمائے عرب کی سرزمین "تہامہ" میں اُگتی تھی اور مشرکین اس سے آشنا تھے، ایسی جڑی بوٹی جس کا رس انتہائی تلخ اور کھٹا ہے اس طرح کی اگر بدن کے کسی حصے سے لگ جائے تو وہ جگہ سوج جائے گی۔ [۲]

راغب مفردات میں کہتا ہے کہ زقوم دوزخیوں کی ہر تنفر آمیز غذا کو کہتے ہیں، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جب یہ کلمہ قرآن مجید میں نازل ہوا تو کچھ قریش کے کفار نے کہا کہ ہم نے اپنی زمینوں میں زقوم نام کا کوئی پودا نہیں دیکھا، افریقہ کی سرزمین سے ایک شخص ان سے ملا انہوں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم زقوم کو پہچانتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ یہ لغت ہمارے نزدیک مکھن اور کھجوروں کے معنی میں ہے! (اس نے مذاق اڑاتے ہوئے یہ بات کہی یا یہ کلمہ ان کے درمیان واقعاً اسی معنی میں استعمال ہوتا تھا، یہ نہیں معلوم، بہتر حال مسلم طور پر قرآن میں یہ ایک درخت یا پودے کے معنی میں بیان ہوا ہے)۔

جب یہ بات ابوجہل نے سنی تو اس نے مذاق اُڑاتے ہوئے اپنی کنیز سے کہا "زقمینا" ہمارے لئے زقوم لے آؤ اور اس کی مراد مکھن

---

[۱] صافات، ۶۲ دخان، ۴۳ واقعہ ۵۲۔

[۲] تفسیر مجمع البیان، روح البیان، روح المعانی۔

اور کھجوریں تھیں، اور اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا کہ تم بھی زقوم کھایا کرو، یہ وہی چیز ہے جس سے محمدؐ ہمیں ڈراتا ہے اور سمجھتا ہے آگ سے درخت اُگیں گے جب کہ آگ درختوں کو جلاتی ہے۔[1]

یہ امر باعث بنا کر بعض ارباب لغت اور مفسرین نے اسے زقوم کا ایک معنی قرار دیا اور سمجھے کہ مذکورہ تفسیر ایک حقیقی تفسیر ہے جیسا کہ لسان العرب میں جوہری سے نقل ہوا ہے کہ ''الزقوم اسم طعام لهم فيه تمر وزبد'' زقوم عربوں کی ایک ایسی غذا کا نام ہے جس میں کھجور اور مکھن ہوتا ہے۔

دوسری آیتیں جہنمیوں کی ناپسندیدہ غذا ''زقوم'' کی صفات کو زیادہ وضاحت سے بیان کرتی ہیں، ارشاد ہوتا ہے کیا وہ (بہشت کی جاوداں نعمتیں) پذیرائی کے لئے بہتر ہیں یا زقوم کا (نفرت انگیز) درخت؟۔۔۔۔۔۔۔وہ ایسا درخت ہے جو جہنم کی تہہ سے اگتا ہے جس سے شگوفے شیاطین کے سروں کی طرح ہیں، وہ (مجرم) لوگ اس سے کھائیں گے اور اپنا پیٹ بھریں گے۔'' اذلك خير نزلا ام شجرة الزقوم۔ انا جعلنها فتنة للظلمين۔ انها شجرة تخرج فی اصل الجحيم۔ طلعها كانه رئوس الشيطين۔ فانهم لا كلون منها فما لون منها البطون''۔

یہاں پر ہمیں سب سے پہلے ابوجہل کا اعتراض نظر آتا ہے جو اس نے تمسخرانہ انداز میں کیا کہ کیا کبھی کوئی درخت بھی آگ میں اُگا ہے؟ آگ تو درخت کی دشمن ہے اور اُسے جلا دیتی ہے، لیکن یہ مغرور ظالم اور مفسد لوگ اس نکتے سے غافل تھے کہ اُس دنیا کی زندگی پر حکم فرما اصول اس دنیا پر حاکم اصولوں سے بہت مختلف ہیں، کوئی پودا یا درخت اگر جہنم کی تہہ سے اُگے تو جہنم ہی کے رنگ کا ہوگا اور وہ جہنمی ماحول میں پرورش پائے گا، وہ ہمارے باغوں میں اُگنے والے پودوں کی طرح نہیں ہوگا، حتی کہ ہماری دنیوی زندگی میں بھی اس طرح کے عجائبات نظر آتے ہیں مثلاً برف کے اندر جاندار پرورش پاتے ہیں، اس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ زندہ موجودات کی حیات کے ماحول کا ہمیشہ ہمارے اطراف کی زندہ چیزوں کے ماحول کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے، اصولی طور پر کیا جہنمی انسان کا جہنم میں زندہ رہنا عجیب نہیں؟ پھر انسان اور کسی پودے کے مابین کیا فرق ہے؟!

لیکن اس درخت کے شگوفوں کو شیاطین کے سروں سے تشبیہہ دی گئی ہے جب کہ ان آیات کے مخاطبین نے نہ شیطانوں کا دیکھا تھا اور نہ ہی ان کے سروں کو، یہ شاید اس لئے ہو کہ ہر ناپسندیدہ اور وحشت ناک چیز کو شیطان سے تشبیہہ دی جاتی ہے جس طرح ہر خوبصورت چیز کو فرشتے سے تشبیہہ دی جاتی ہے باوجود اس کے کہ کسی نے فرشتہ کو نہیں دیکھا، مصر کی خواتین نے یوسفؑ کی صورت کے بارے میں کہا:

اس کی صورت تو بالکل فرشتے کی طرح ہے۔

اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيۡمٌ (یوسف:۳۱)

ہم اپنی روزمرہ کی گفتگو میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی صورت ''دیو'' کی طرح ہے جب کہ کسی نے دیو کو دیکھا نہیں، بلکہ اصولاً دیو ایک

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۸ صفحہ ۵۵۲۹ صافات کی آیت ۶۲ کے ذیل میں۔

وہی چیز ہے۔

یہ سب ایسی تشبیہات ہیں جو کلمہ شیطان اور فرشتہ کے مفہوم کے بارے میں ہماری تصویر ذہن کی اساس پر وجود میں آئی ہیں اور یہ عموماً خوبصورت، گویا اور رسا تشبیہات ہیں۔

اس لحاظ سے زقوم نہ صرف بدبودار، بدمزہ اور ناپسندیدہ غذا ہے بلکہ ظاہری لحاظ سے بھی بہت بدنما ہے، دنیا کے بہت سے زہریلے پودوں کے برعکس جو ظاہرا خوبصورت ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ شیطان کا ایک معنی بدصورت سانپ ہے اور زقوم کے شگوفے کو اس سے تشبیہ دی گئی ہے لیکن یہ تفسیر بعید لگتی ہے کیونکہ شیطان کا اس طرح کے مفاہیم میں استعمال بہت ہی نادر ہے۔

ان آیات کے تیسرے حصے میں جہنمیوں کی ایک غذا ''غسلین'' کا نام لیا گیا ہے، فرماتا ہے (اپنے اعمال کی وجہ سے) آج یہاں پر ان کا کوئی مہربان دوست نہیں ہے اور نہ ہی غسلین کے علاوہ کوئی غذا، ایسی غذا جسے گناہگاروں کے علاوہ کوئی نہیں کھائے گا۔ ''فلیس له الیوم ھھنا حمیم۔ ولا طعام الا من غسلین۔ لا یاکله الا الخاطون''۔

لفظ ''غسلین'' جو ایک ہی بار قرآن مجید میں آیا ہے غسل کے مادہ سے (نسل کے وزن پر) دھونے کے معنی میں ہے، راغب مفردات میں کہتا ہے غسلین ایسا پانی ہے جو کفار کے جسم دھونے سے دوزخ میں گرتا ہے، لیکن مفسرین اور ارباب لغت کے نزدیک یہ ایسی پیپ ہے جو جہنمیوں کے جسم سے بہتی ہے اور چونکہ اس پانی سے ملتی جلتی ہے جس سے انسان نہانے دھونے کا کام لیتا ہے، اس لئے اس کو غسلین کا نام دیا گیا ہے اور ہوسکتا ہے راغب کی مراد بھی مفردات میں یہی معنی ہو، لیکن بعض نے (زقوم) اور غسلین کو ایک معنی میں جانا ہے، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، وہ ایک بدمزہ اور بدبودار پودا ہے جو جہنم والوں کی غذا ہے، لیکن پہلا معنی زیادہ مشہور ہے۔

چوتھی آیت میں پھر جہنمیوں کی غذا کے بارے میں ایک نئی تعبیر (ضریع) پیش ہوئی ہے، مجرموں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے اور انہیں ایک کھولتے ہوئے چشمہ کا پانی پلایا جائے گا، اُن کی غذا ضریع کے علاوہ کچھ نہ ہوگی، ایسی غذا جو نہ ان کو تنومند کرے گی اور نہ ہی بھوک مٹائے گی'' تصلی نارا حامیة۔ تسقی من عین انیة۔ لیس لھم طعام الا من ضریع۔ لا یسمن ولا یغنی من جوع''۔

ضریع کے بارے میں مختلف تعبیریں اور تفسیریں ذکر ہوئی ہیں جو قریب المعنی ہیں بعض نے کہا ہے ایک سبز رنگ کا بدبودار پودا ہے جو سمندر سے باہر نکل آتا ہے۔ [1]

کچھ اور نے کہا ہے کہ ضریع ایک قسم کا کانٹا ہے جو زمین سے چپکتا ہے، جب وہ گیلا ہوتا تو قریش اس کو ''شبرق'' کہتے اور جب خشک

---

[1] خلیل ابن احمد نے کتاب العین میں۔

ہوتا تو ''ضریع'' کہتے تھے، ایک ایسا زہریلا پودا جس کے نزدیک کوئی حیوان اور چوپایا نہیں جاتا۔ [1]

بعض نے اس کو ضرع کے مادہ سے جانا ہے جس کا معنی ضعف اور ذلت ہے اور کہتے ہیں کہ یہ ایک ذلت آمیز کھانا ہے جس سے نجات کے لئے جہنمی خدا کی بارگاہ میں زاری کریں گے۔ [2]

پیغمبر اسلامؐ سے ایک روایت میں یوں بیان ہوا ہے:

الضريع شيئی يكون من النار يشبه الشوك اشدمرارة من الصبر وانتن من الجيفة واحر من النار۔ سماه الله ضريعا۔

ضریع ایک ایسی چیز ہے جو جہنم کی آگ میں اُگتی ہے، کانٹوں سے مشابہ ہے،[3] صبر سے زیادہ تلخ، مردار سے زیادہ بدبودار اور آگ سے زیادہ سوزاں کہ جس کا نام خدا نے ضریع رکھا ہے۔[4]

''لا يسمن ولا يغنی من جوع'' سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اس طرح کی غذا نہ جسم کو قوت دے سکتی ہے اور نہ ہی بھوک کی حالت میں آرام پہنچا سکتی ہے یہ گلے میں پھنسنے والی ایک ایسی غذا ہے جو خود ایک طرح کا عذاب ہے جیسا کہ سورہ مزمل کی آیت ۱۳ میں فرمایا گیا ہے:

وطعاما ذاغصة وعذابا اليما۔

ہمارے پاس گلے میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب ہے۔

البتہ تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ یہ دردناک اور شدید عذاب کیونکر بعض مجرموں کے انتظار میں ہے، وہ لوگ جنہوں نے اس دنیا میں اپنا پیٹ ایسے مختلف رنگ برنگے لذیذ اور مرغن وشیریں کھانوں سے بھرا جو انہوں نے دوسروں کے حقوق پر تجاوز اور مختلف قسم کے مظالم سے حاصل کئے تھے جب کہ ان کے اردگرد ایسے بھوکے لوگ تھے جنہوں نے عمر بھر میں ایک دفعہ بھی پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھایا تھا، ہر سال لاکھوں انسان ان کے اردگرد یا دوسرے ممالک میں بھوک کی شدت سے مرتے تھے لیکن وہ اپنا اضافی کھانا کوڑے دانوں میں پھینکتے تھے، ان کو اس دنیا میں ایسی غذا ملنی چاہیے جو ان کے لئے دردوالم اور عذاب کا باعث بنے۔

یہاں پر ہم ایک بار پھر ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ بات جو ہم بار بار کہہ چکے ہیں دوبارہ کہیں کہ یہ تمام تعبیریں دوسری دنیا کے دردناک عذاب کی طرف ایک اشارہ ہیں ورنہ اس دنیا کے زندان میں محبوس ہم جیسے لوگوں کے لئے بہشت کی نعمتیں صحیح طور پر قابل فہم ہیں اور نہ دوزخ کے

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۱۰ صفحہ ۱۱۹ ۷۔

[2] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰ صفحہ ۱۲ ۷۔

[3] ''صبر'' ایک ایسا پودا ہے جس کے زرد رنگ کے پھول ہوتے ہیں جو نہایت تلخ ہوتے ہیں۔

[4] مجمع البیان جلد ۹، ۱۰ صفحہ ۴۷۹ اسی آیت کے ذیل میں۔

عذاب، بلکہ ہم دور سے صرف ایک ہیولا ہی دیکھتے ہیں۔

یہاں پر ایک معروف اعتراض پیش کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ سورہ غاشیہ کی آیت ٦ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنمیوں کی غذا صرف ''ضریع'' ہے (لیس لهم طعام الا من ضريع) جب کہ اوپر کی آیتوں میں دو اور چیزوں کا جہنمیوں کی غذا کے عنوان سے نام لیا گیا ہے، ایک ''زقوم'' اور دوسری ''غسلین''، حتیٰ کہ غسلین کا سورہ حاقہ کی آیت ٣٦ میں بھی جہنمیوں کی واحد غذا کے عنوان سے ذکر ہوا ہے۔

اس سوال کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں جن میں سے یہ دو جواب اہم ہیں:

١۔ ضریع، زقوم اور غسلین کے تینوں کلمات ایک ہی معنی میں ہیں اور وہ ہے ایک خشک اور ناپسندیدہ، بدبودار اور بدمزہ پودا جو جہنم میں اُگتا ہے لیکن یہ تفسیر غسلین کے بارے میں تفسیر اور لغت کی بہت سے کتب میں بیان شدہ مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتی۔

٢۔ بعض نے زقوم اور ضریع کو ایک معنی میں جانا ہے جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا اور وہ ہے جہنمیوں کی غذا، لیکن غسلین اُن کا مشروب ہے اور مشروبات کے لئے لفظ طعام کے استعمال کی مثالیں عرب زبان میں موجود ہیں۔

مندرجہ بالا تین قسم کی غذاؤں میں سے ہر ایک جہنمیوں کے ایک گروہ سے مخصوص ہے جو جہنم کے کسی ایک طبقے میں رہتے ہیں اور یہ جواب سب سے زیادہ مناسب ہے۔

پانچویں آیت میں پھر جہنمیوں کے ناپسندیدہ مشروبات کے بارے میں گفتگو ہے، ارشاد ہوتا ہے، ہم نے ستم گروں کے لئے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور اگر وہ پانی طلب کریں تو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح کھولتا پانی ان کو دیا جایا گا جو چہروں کو جھلس ڈالے گا، کیا برا مشروب ہے اور کتنا برا ٹھکانا ہے 'انا اعتدنا للظلمين نارا احاط بهم سرادقها وان يستغيثوا يغاثوا بمآء كالمهل يشوى الوجوه بئس الشراب وسآءت مرتفقا۔'

قابل توجہ امر یہ ہے کہ یہ دردناک سزائیں ظالموں کے لئے معین کی گئی ہیں، ایسے ظالم جو اس دنیا میں اپنے زرق و برق رئیسانہ خیموں میں مےخواری میں طرح طرح کے مشروبات پینے میں مگن تھے اور ماہ روساقی ان کی رونقِ محفل تھے، لیکن یہ لوگ جہنم میں آگ کے پردوں میں رہیں گے اور جب وہ پانی چاہیں گے تو ساقی دوزخ انہیں پگھلے ہوئے تانبے، یتیموں کے اشک سوزاں اور مستضعفوں کے گرم آہوں کی طرح کا پانی دیں گے کیونکہ وہاں جو کچھ بھی ہوگا یہاں کی چیزوں کا تجسم ہوگا۔

کیا وہ پانی جو چہروں کو جھلسا دے، پینے کے قبل ہے؟ یہ چیز ہمیں بتاتی ہے کہ اس دنیا میں انسان کے وجود کی تشکیل اُس دنیا سے بہت مختلف ہوگی اور اس طرح ہوگی کہ ایسے امور میں سے گذر سکے اور موت آئے بغیر وہ اپنے عذاب کا درد چکھ سکے یا پھر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب اسے پانی کا مشاہدہ کرے گا تو پانی پینے سے گریز کرے گا اور اُسی طرح پیاس کی آگ میں جلتا رہے گا۔

مهل (قفل کے وزن پر) کچھ مفسرین اور ارباب لغت کے مطابق ایسا کچرا ہے جو گھی کے برتن کی تہہ میں بیٹھ گیا ہو جو عموماً گندا اور بدمزہ ہوتا ہے۔

طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں اس کی پگھلے ہوئے تانبے سے تفسیر کی ہے جب کہ بعض نے اس کو پگھلے ہوئے مس سے مخصوص کیا ہے

اور بعض نے کہا ہے کہ سیاہ رنگ کے پانی کے معنی میں ہے، چونکہ جہنم خود بھی سیاہ ہے اور بلکہ اس کا پانی، درخت اور باسی بھی سیاہ ہیں۔[۱]

بعض نے اس کی تارکول کی ایک قسم سے یا ایک زہرلے مادے سے تفسیر کی ہے۔[۲]

اگر چہ یہ معانی مختلف ہیں لیکن ان کا نتیجہ یکساں ہے جو جہنمیوں کا غیر معمولی اور بے مثال درد ہے۔

ان آیات کے چھٹے حصے میں اُن کے مشروبات کے بارے میں دو اور تعبیریں نظر آتی ہیں، ایک ''حمیم'' اور دوسری ''غساق'' جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ آئی ہیں، فرمایا گیا ہے: وہ وہاں پر نہ ٹھنڈی چیز پائیں گے نہ ہی پسندیدہ مشروب سوائے حمیم اور غساق کے۔''ان جهنم كانت مرصادا۔ للطاغين مابا۔ لبثين فيها احقابا۔ لا يذوقون فيها بردا ولا شرابا۔ الا حميما و غساقا۔''

اکثر مفسرین اور اربان لغت نے حمیم کی تفسیر گرم اور کھولتے ہوئے پانی سے کی ہے جو ''حم'' کے مادہ سے حرارت کے معنی میں ہے۔''غساق'' کو ''غسق'' کے مادے سے لیا گیا ہے جو کبھی تاریکی اور کبھی سیلان اور بہنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہاں پر اکثر نے جہنمیوں کے بدن سے بہنے والی پیپ سے اس کی تفسیر کی ہے۔

یہ روشن کی طرح عیاں ہے کہ جو آگ کے قریب یا آگ کے اندر ہو، شدت سے پیاسا ہوگا، گرمیوں کے گرم موسم میں انسان پر پیاس کا ایسا شدید غلبہ ہوگا کہ ایک ٹھنڈے اور دلنشین مشروب کے علاوہ کوئی اور چیز اس کی پیاس نہیں بجھاسکتی لیکن جہنمیوں کے لئے کوئی ٹھنڈا مشروب نہیں ہوگا بلکہ اس کے برعکس ان کا مشروب ہی گرم اور کھولتا ہوا ہوگا اور ان کی پیاس کی شدت میں برابر اضافہ کرے گا۔

کیا اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس طرح کا مشروب دیکھ کر اس کے پینے سے گریز کریں گے اور پیاس کی آگ میں جلیں گے؟ یا وہ پینے پر مجبور ہوں گے اور پہلے سے زیادہ پیاس میں مبتلا ہوں گے؟ ذوق (چکھنا) کی تعبیر دوسری تفسیر سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

بعض (مفسرین) جہنمیوں کے بارے میں ان تمام تعبیروں اور دھمکیوں کو معنوی اور روحانی عذاب سے تفسیر کرنا چاہتے ہیں جو خدا سے دوری اور شیطانوں سے قربت کا نتیجہ ہے، لیکن جیسا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں ہمیں حق حاصل نہیں ہے کہ ہم واضح قرینے کے بغیر الفاظ کو ان کے ظاہر کے خلاف معانی پر محمول کریں۔

ان آیات کے ساتویں اور آخری حصے میں ایک بار پھر جہنمیوں کے مشروب کی طرف ایک اور تعبیر سے اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ہر سرکش اور حق سے منحرف گمراہ نا اُمید ہوا اور جہنم اس کے پیچھے ہے اور اس کو ''صدید'' میں سے پلایا جائے گا، اس کو زحمت سے گھونٹ گھونٹ کر کے پینا پڑے گا، وہ اس کے پینے پر تیار نہیں ہوگا (اسے مجبور کر کے پلایا جائے گا) اور ہر طرف سے موت اس کی طرف آئے گی، لیکن وہ اس کے باوجود نہیں مرے گا اور ایک شدید عذاب اس کے پیچھے ہوگا۔

---

[۱] مجمع البیان، جلد ۵ صفحہ ۶۶ ۴ اور تفسیر قرطبی، جلد ۶ صفحہ ۴۰۱۱۔

[۲] تفسیر قطرطبی، جلد ۶ صفحہ ۴۰۱۱۔

" وخاب کل جبار عنید۔ من ورآئه جهنم ویسقی من مآء صدید۔
یتجرعه ولا یکاد یسیغه ویأتیه الموت من کل مکان وما هو بیمت ومن
ورآئه عذاب غلیظ"۔

صدید (صد) کے مادہ سے اصل میں کسی چیز کی طرف پشت کرنے، عدول کرنے اور منہ پھیرنے کے معنی میں ہے، بعد ازاں زخمی حالت میں جسم کے گوشت اور کھال کے درمیان جمع ہونے والی پیپ پر اس کا اطلاق ہونے لگا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ مزاج کی سلامتی سے بیماری کی طرف عدول اور برگشت کی علامت ہے، راغب مفردات میں کہتا ہے: یہ تعبیر جہنمیوں کے مشروب (بدمزہ، بدبودار اور ناپسندیدہ) کے لئے مثال کے طور پر ذکر ہوئی ہے۔

اس کراہت پر گواہ بات یہ ہے کہ جہنمی ہرگز اپنی رضامندی سے اُسے نہ پئیں گے بلکہ مجبور ہو کر کراہت سے گھونٹ گھونٹ کر کے پئیں گے، ان کی حالت اس قدر دردناک ہوگی گویا موت ہر طرف سے ان کی جانب آرہی ہو، لیکن ان کی تخلیق ایسی ہوگی کہ انہیں موت نہیں آئے گی، تا کہ اپنی سزائیں پاسکیں۔

عجیب یہ کہ اس دردناک عذاب کا زیر بحث آیت اور متعدد دوسری آیتوں میں ظالموں، ستمگروں، جباروں اور سرکشوں کے لئے ذکر ہوا ہے (کبھی "طاغین" کی تعبیر سے کبھی "جبار" اور کبھی "ظالمین")، ظلم و جور اور بے اعتدالیوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے اور یہ حقیقت میں ان مظالم کا تجسیم عمل ہے جو اس دنیا میں انہوں نے بے گناہوں پر کئے تھے، کبھی اپنے زندانوں میں سالہا سال تک بدترین غذاؤں اور بدترین پانی سے انہیں زندہ رکھتے اور ان پر ظلم کرتے تھے، حتی کہ کچھ مدت بعد ان قیدیوں کے چہرے اتنے بدل جاتے تھے کہ ماں اپنے بیٹے کو نہیں پہچان سکتی تھی (ایسے ہی جیسے حجاج کے قیدیوں کی وحشت ناک داستانوں میں آیا ہے اور اس زمانے میں بھی ہم نے ایسے نمونے ہم عصر سرکشوں کے قیدیوں میں دیکھے اور سنے ہیں، کیا ایسے افراد اس طرح کے عذاب کے مستحق نہیں ہیں؟)

ان آیات کے مجموعی مطالعے سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ جہنمیوں کی سزاؤں میں ایک بدترین سزا ان کی غذا اور پینے کا پانی ہے، یعنی عین وہی چیز جس سے انسان کو لذت حاصل ہونی چاہیے اس کے شدید درد و رنج کا باعث بن جائے گی، غذاؤں کے بارے میں کبھی "زقوم" کبھی "ضریع" اور کبھی "غسلین" کی تعبیر آئی ہے اور مشروبات کے بارے میں کبھی "حمیم"، کبھی "مهل"، کبھی "صدید" اور بعض موارد میں غساق کی تعبیریں آئی ہیں، جن کا اشارہ عموماً گرم، کھولتا ہوا، ناپسندیدہ، بدبودار، بدمزہ اور تنفر آمیز غذاؤں کی طرف ہے اور جب بھی ہم ان مفسد عناصر کے دنیا میں کئے ہوئے اعمال ملاحظہ کریں کہ انہوں نے دنیا کے مظلوموں کے ساتھ کیا کیا ہے تو ان شدید سزاؤں پر تعجب نہیں ہوگا۔

خدا ہم سب کو اپنے لطف و کرم کے صدقے ایسے گناہوں میں آلودہ ہونے سے بچائے جن کا انجام ایسا ہوتا ہے۔

ج: جہنمیوں کا لباس

اشارہ:

جہنم میں ہر چیز عذاب اور سزا کا رنگ رکھتی ہے، حتیٰ کہ ''لباس'' جو عموماً سردی اور گرمی سے انسان کو بچانے والا ایک پہناوا اور بدن کو پہنچنے والے ممکنہ مختلف نقصانات کے مقابلے میں ایک مانع اور زیب و زینت کا ایک وسیلہ ہے، جی ہاں یہ بھی وہاں پر درد و رنج اور سزا و عذاب کے اسباب میں سے ایک ہوگا۔

اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اور ان دو آیتوں کی طرف توجہ دیتے ہیں:

۱۔ فالذین کفروا قطعت لهم ثیاب من نار یصب من فوق رء وسهم الحمیم۔ یصهر به ما فی بطونهم والجلود۔ ولهم مقامع من حدید۔ کلما ارادوا ان یخرجوا منها من غم اعیدوافیها وذوقوا عذاب الحریق۔

۲۔ وتری المجرمین یومئذ مقرنین فی لاصفاد۔ سر ابیلهم من قطران و تغشی وجوههم النار۔

ترجمہ:

۱۔ جو لوگ کافر ہو چکے ہیں آگ سے ان کے لئے لباس کاٹا جائے گا اور ایک جلانے والا کھولتا ہوا مائع ان کے سروں پر انڈیلا جائے گا اس طرح کہ ان کے اندر اور باہر دونوں کو جلا ڈالے گا اور ان کے لئے لوہے کے کچھ گرز ہیں، جب وہ جہنم کے غم و اندوہ سے نکلنا چاہیں گے تو اُن کو ان (گرزوں) کے ذریعے سے واپس لوٹا یا جائے گا اور (ان سے کہا جائے گا) جلانے والے عذاب کو چکھو۔

۲۔ اور اس دن تم مجرموں کو ایک دوسرے کے ہمراہ آہنی زنجیروں میں جکڑے پاؤ گے (ایسی زنجیر جس میں ان کے ہاتھ اور گردن بندھے ہوں گے)، ان کا لباس قطران ہوگا (ایک بدبودار، آتش گیر اور چپکنے والا مادہ) ان کی صورتوں کو آگ چھپا لے گی۔

تفسیر:

پہلی آیت میں کفار کے ایک گروہ کی طرف جو ہمیشہ پروردگار کے بارے میں جدال اور دشمنی میں مشغول تھے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: جو لوگ کافر ہوئے ہیں ان کے لئے آگ سے لباس کاٹا جائے گا ''فالذین کفروا قطعت لهم ثیاب من نار'' آیا اس بات کا مفہوم

یہ ہے کہ آگ لباس کی طرح ہر طرف سے اُن کا احاطہ کرے گی یا پھر حقیقت میں آگ کے کچھ قطعے اُن کے لباس کی صورت میں کاٹے اور سیئے جائیں گے؟ آیت کا ظاہر دوسرا معنی ہے، اس سے زیادہ دردناک بات یہ ہے کہ ایک جلانے والا کھولتا ہوا مائع ان کے سروں پر انڈیلا جائے گا'' **یصب من فوق رءوسھم الحمیم**''۔

اس کے بعد اضافہ فرماتا ہے: یہ جلانے والا پانی ان کے اندر اتنا اثر کرے گا کہ ان کے اندر کو بھی اور باہر کو بھی گلا دے گا'' **یصھر بہ ما فی بطونھم والجلود**''۔

''یصھر''''صھر'' کے مادہ سے (قھر کے وزن پر) چربی وغیرہ کے پگھلانے کے معنی میں آیا ہے، نیز سورج کی تپش سے گرم اور متغیر ہونے والی ہر چیز اپر اس کا اطلاق ہوتا ہے، پھر اُن کی دوسری سزاؤں کی خبر دیتا ہے اور فرماتا ہے: ان کے لئے تازیانے یا (آگ کے) گرز ہیں۔'' **ولھم مقامع من حدید**''۔

مقامع ''مقمع'' کی جمع (منبر کے وزن پر) کبھی تازیانہ کے معنی میں اور کبھی ایسی لکڑی کے معنی میں آتا ہے جس سے کسی کو مارا جاتا ہے۔

آخر میں اُن کی غیر معمولی دردناک مجموعی کیفیت کی اس طرح ترسیم فرماتا ہے: جب وہ جہنم اور اس کے غم واندوہ سے نکلنا چاہیں گے تو فورا ان کو واپس پلٹا دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا: جلانے والے عذاب کو چکھو'' **کلما ارادوا ان یخرجوا منھا من غم اعیدوا فیھا وذوقوا عذاب الحریق**''۔

بے شک اس طرح کی دردناک سزائیں بلکہ اس سے کم تر سزائیں بھی دنیا میں انسان کی موت کا باعث بن جاتی ہیں، لیکن مجرموں کی جسمانی ساخت وہاں پر اس طرح ہوگی کہ یہ سزائیں ان کی موت کا باعث نہیں بن سکیں گی تاکہ وہ اپنے برے اعمال کی بھاری سزائیں بھگت سکیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی پر حاکم قوانین اُس دنیا سے بہت متفاوت ہیں (غور کیجئے گا)۔

دوسری آیت میں جہنمیوں کے لباس کے بارے میں ایک نئی تعبیر بیان ہوئی ہے، ارشاد ہوتا ہے ان کا لباس'' **قطران** '' سے ہوگا اور آگ ان کے چہرے ڈھانپ لے گی'' **سرابیلھم من قطران و تغشی وجوھھم النار**''۔

سرابیل ''سربال'' کی جمع مثقال کے وزن پر، مفردات میں راغب کے بقول، قمیص کے معنی میں ہے چاہے اس کی جنس جو بھی ہو۔

یہی معنی لسان العرب اور صحاح اللغہ میں بھی آیا ہے، بعض نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ قطران کسی بھی طرح کے لباس کو کہتے ہیں، کتاب التحقیق میں آیا ہے کہ سربال اس لباس کو کہتے ہیں جو بدن کے اوپر کے حصے کو ڈھانپتا ہے اور'' سروال '' سے مراد وہ شئے ہے جس سے بدن کا نچلا حصہ ڈھانپا جاتا ہے، اس لفظ (سربال) کا بدن کو اوڑھنے والے بغیر سلے کپڑے اور جنت میں پہنی جانے والی زرہ پر بھی اطلاق ہوا ہے۔

لیکن'' قطران''(لغت میں کبھی قطران اور کبھی قطِران پڑھا جاتا ہے) ایسے بدبودار، سیاہ رنگ، آتش گیر مادے کو کہا جاتا ہے جو

''ابہل'' نام کے ایک درخت سے نکلتا تھا اور اس کو اُبالا جاتا تھا تاکہ وہ سخت ہو جائے، پھر جَرَب [1] کی بیماری کو ختم کر دیتا ہے۔[2] یہ قطران ایک طرح کا پودا ہے، قطران کی ایک اور قسم بھی ہے جو گیس بنانے کے لئے پتھر کے کوئلے کو جلا کر حاصل کیا جاتا ہے، بعض کتب سے استفادہ ہوتا ہے کہ قطران جو کہ تیل کی طرح کا مائع ہے اور چپکتا ہے درختوں کی گوند والی لکڑی سے بھی حاصل کیا جاتا ہے، بعض تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ قطران جو تیل کی طرح کا ایک چپک جانے والا مائع ہے اسے بعض دیگر درختوں کی لیس دار لکڑیوں سے بھی حاصل کیا جاتا ہے، اسے طب حیوانات میں جراثیم کشی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، بہر حال مندرجہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنمیوں کے بدن کو لباس کے بجائے سیاہ رنگ کے آتش گیر مادے کی ایک قسم سے ڈھانپا جائیگا جس کی تمام چیزیں انسان کے لباس سے حاصل ہونے والے فوائد کے برعکس ہیں، لباس زینت ہے اور انسان کو گرمی، سردی اور خطرات سے بچاتا ہے، لیکن یہ جہنمی لباس بہت بدصورت، کریہہ منظر اور بدبودار ہے اور ایسا مادہ ہے جو جہنم کی آگ میں بھڑک اٹھتا ہے۔

یہ ہے ان لوگوں کی سزا جو یتیم بچوں اور بے لباس مستضعفوں کے سامنے طرح طرح کی آرائش اور زینت والے زریں لباس سے استفادہ کرتے تھے اور اس پر غرور کرتے تھے اور ان کے دلوں کو جلاتے تھے، لہٰذا روز قیامت ان مجرموں اور ظالموں کے حصے میں ایسا آتشیں لباس ہی آئے گا۔

---

[1] کھال کی ایک بیماری (مترجم)۔

[2] تفسیر فخر الدین رازی، ج۱۹، ص۱۴۸۔

د۔ جہنمیوں کے دوسرے جسمانی عذاب

اشارہ:

اصولاً جہنم الٰہی قہر وغضب کا مرکز ہے اور وہاں ہر چیز عذاب اور سزا کا رنگ رکھتی ہے اور اس کی مختلف شکلیں اور رنگ ہیں، چاہے ان سزاؤں کا تصور کیا جا سکے یا نہ کیا جا سکے، مجرموں، ستم گروں اور ظالمون کے لئے مقرر ہو چکی ہیں، قرآن مجید نے جگہ جگہ ان سزاؤں کے بعض گوشوں کی طرف اشارہ کیا ہے جس کے بعض نمونے تو ذکر ہو چکے اور بعض کا ہم یہاں پر تذکرہ کرتے ہیں:۔

۱۔ وَاَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ فِیۡ سَمُوۡمٍ وَّحَمِیۡمٍ وَّظِلٍّ مِّنۡ یَّحۡمُوۡمٍ لَّا بَارِدٍ وَّلَا کَرِیۡمٍ

۲۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا سَوۡفَ نُصۡلِیۡہِمۡ نَارًا ؕ کُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُہُمۡ بَدَّلۡنٰہُمۡ جُلُوۡدًا غَیۡرَہَا لِیَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَزِیۡزًا حَکِیۡمًا ۵۶

۲ النساء:٥٦

۳۔ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَالرُّہۡبَانِ لَیَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّہَبَ وَالۡفِضَّۃَ وَلَا یُنۡفِقُوۡنَہَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۙ فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ یَّوۡمَ یُحۡمٰی عَلَیۡہَا فِیۡ نَارِ جَہَنَّمَ فَتُکۡوٰی بِہَا جِبَاہُہُمۡ وَجُنُوۡبُہُمۡ وَظُہُوۡرُہُمۡ ؕ ہٰذَا مَا کَنَزۡتُمۡ لِاَنۡفُسِکُمۡ فَذُوۡقُوۡا مَا کُنۡتُمۡ تَکۡنِزُوۡنَ

۴۔ وَاِذَاۤ اُلۡقُوۡا مِنۡہَا مَکَانًا ضَیِّقًا مُّقَرَّنِیۡنَ دَعَوۡا ہُنَالِکَ ثُبُوۡرًا ۱۳ؕ لَا تَدۡعُوا الۡیَوۡمَ ثُبُوۡرًا وَّاحِدًا وَّادۡعُوۡا ثُبُوۡرًا کَثِیۡرًا

۵۔ تَلۡفَحُ وُجُوۡہَہُمُ النَّارُ وَہُمۡ فِیۡہَا کٰلِحُوۡنَ

۶۔ اِذِ الۡاَغۡلٰلُ فِیۡۤ اَعۡنَاقِہِمۡ وَالسَّلٰسِلُ ؕ یُسۡحَبُوۡنَ فِی الۡحَمِیۡمِ ۙ ثُمَّ فِی النَّارِ

يُسۡجَرُوۡنَ

۷۔ وَقَالَ الَّذِيۡنَ فِى النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادۡعُوۡا رَبَّكُمۡ يُخَفِّفۡ عَنَّا يَوۡمًا مِّنَ الۡعَذَابِ قَالُوۡۤا اَوَلَمۡ تَكُ تَاۡتِيۡكُمۡ رُسُلُكُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ‌ؕ قَالُوۡا بَلٰى‌ؕ قَالُوۡا فَادۡعُوۡا‌ ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الۡكٰفِرِيۡنَ اِلَّا فِىۡ ضَلٰلٍ۞

ترجمہ:

۱۔ اور اصحاب شمال کیسے اصحاب شمال؟ (جن کا نامہ عمل ان کے جرم کی علامت کے طور پر اُن کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا) وہ لوگ جلا دینے والی لو اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان ہوں گے، اور کالے سیاہ آگ پیدا کرنے والے دھوئیں کے سائے میں ہوں گے، ایسا سایہ جو نہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ مفید۔

۲۔ جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا ہم بہت جلد انہیں آگ میں جھونک دیں گے جب بھی ان کے بدن کی کھالیں (اس میں) جل جائیں گی ہم اُن کی جگہ نئی کھالیں لے آئیں گے تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں، خداوند غالب اور حکیم ہے (اور حساب و کتاب سے سزا دیتا ہے)۔

۳۔ اے ایمان لانے والو! (اہل کتاب) علماء اور رہبان لوگوں کے اموال کو حرام طریقے سے کھاتے ہیں اور اُن کو خدا کی راہ سے روکتے ہیں وہ لوگ جو سونے اور چاندی کا خزانہ (جمع کرتے اور) چھپاتے ہیں اور خدا کی راہ میں انفاق نہیں کرتے، ایسے لوگوں کو دردناک سزاؤں کی بشارت دیجئے، اس دن جب ان (سونے اور چاندی) کو جہنم کی آپ میں تپایا جائے گا اور ان سے اُن کے چہروں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا (اور اُن سے کہا جائے گا) کہ یہ وہی چیز ہے جس کا تم نے ذخیرہ کیا تھا، پس چکھو اس چیز کو جسے تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔

۴۔ اور جب انہیں زنجیروں میں جکڑ کر جہنم کی کسی تنگ جگہ میں جھونک دیا جائے گا تو اُن کی چیخ و پکار بلند ہوگی! آج ایک بار واویلا مت کرو بلکہ بار بار واویلا کرو۔

۵۔ آگ کے سوزاں شعلے تلوار کی طرح ان کے چہروں پر مارے جائیں گے اور دوزخ میں اُن کے منہ بنے ہوئے ہوں گے۔

۶۔ جس وقت اُن کی گردنوں پر طوق اور زنجیریں ہوں گی اور ان کو گھسیٹا جائے گا اور کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دیا جائے گا پھر وہ جہنم کی آگ میں داخل کئے جائیں گے۔

۷۔ اور جو لوگ آگ میں ہوں گے جہنم کے داروغوں سے کہیں گے کہ اپنے پروردگار سے درخواست کرو کہ ہمارے عذاب میں ایک دن کی تخفیف کر دے، وہ کہیں گے کیا تمہارے انبیاء تمہارے پاس واضح دلائل لے کر نہیں آئے تھے؟ وہ کہیں گے ہاں۔ تب وہ کہیں

گے جتنا چاہو پکارو، لیکن کافروں کی پکار کی کہیں شنوائی نہیں۔

تفسیر

مہلک ہوائیں اور آتشیں سائے:

ان آیات کے پہلے حصے میں لوگوں کو قیامت میں تین قسموں "مقربین"، "اصحاب الیمین"، "اصحاب الشمال" میں تقسیم کرنے کے بعد اصحاب الشمال (ایسے لوگ جن کے نامہ اعمال مجرم ہونے کی علامت کے طور پر ان کے بائیں ہاتھ میں دے دیئے جائیں گے) کے بارے میں فرماتا ہے: وہ لوگ جلانے والی لو اور آب سوزاں کے درمیان ہوں گے "فی سموم و حمیم"

"اور آگ پیدا کرنے والے دھوئیں کے سائے میں" (وظل من یحموم)۔

"ایسا سایہ جو ٹھنڈا ہوگا نہ آرام دہ" (لا بارد ولا کریم)۔

حقیقت میں جہنم میں بھی جنت کی طرح پانی، ہوا، نسیم اور سایہ ہوگا لیکن کیسی بادنسیم! ایسی کہ جسے قرآن نے "سموم" کا نام دیا ہے۔

سموم سم کے مادے سے اس سوزاں ہوا کے معنی میں ہے جو مقام (بدن کے بہت ہی چھوٹے سوراخ) میں داخل ہوتا ہے اور اس کو ہلاک کر دیتا ہے، بنیادی طور پر "سم" کو اس لئے سم کہا گیا ہے کہ بدن کے تمام سوراخوں اور ذرات میں داخل ہو جاتا ہے کیونکہ سم اور سُم راغب کے بقول ہر اس باریک سوراخ کو کہتے ہیں جو سوئی یا کان اور ناک کے سوراخ کی طرح ہو۔[1]

ان کے پاس پانی ضرور ہے لیکن مار ڈالنے والا اور سوزاں، سایہ بھی ہے لیکن سیاہ اور گاڑھے دھوئیں کا اور گرم۔

اس جہان میں جب انسان گرمی کا شکار ہوتا ہے تو کبھی ہوا سے استفادہ کرتا ہے، کبھی پانی کے اندر چلا جاتا ہے اور کبھی سائے کی پناہ لیتا ہے، لیکن یہ تینوں چیزیں وہاں پر گرم اور مہلک ہوں گی، جنت کے برعکس جہاں ان میں سے ہر ایک دوسرے سے خنک تر اور زیادہ روح پرور ہوگی۔

دوسری آیت میں کافروں کی ایک اور دردناک سزا کے بارے میں فرماتا ہے:

جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا بہت جلد ہم انہیں (ہولناک) آگ میں جھونک دیں گے "ان الذین کفروا بایتنا سوف تصلیھم نارا"[2] پھر اضافہ فرماتا ہے: جب بھی ان کے کھالیں جھلس جائیں گی ہم اُن کو نئی کھالوں میں تبدیل کر دیں گے تاکہ وہ

---

[1] قاموس اللغۃ میں آیا ہے کہ سموم دن میں چلنے والی گرم لو کو کہا جاتا ہے، اس کے مقابلے میں "حرور" ہے جو رات کو چلنے والی گرم ہواؤں کو کہا جاتا ہے، تفسیر فخر رازی میں آیا ہے کہ سموم ایسی متعفن ہوا ہے کہ جن انسان اس میں سانس لیتا ہے تو اس کا قلب متعفن ہوتا ہے اور وہ انسان کو ہلاک کر دیتی ہے۔ (تفسیر کبیر، جلد ۲۹، صفحہ ۱۹۸)۔

[2] یہاں پر نارًا کا نکرہ ہونا آگ کی بڑائی کے بیان کے لئے ہے۔

(الٰہی) عذاب چکھ لیں، خدا غالب وحکیم ہے (ان تمام امور پر قادر ہے تاہم جرم کے مطابق سزا دیتا ہے)'' **کلما نضجت جلودھم بدلناھم جلودا غیرھا لیذوقوا العذاب ان اللہ کان عزیزا حکیما**''۔

آخری جملہ حقیقتاً اس سوال کا جواب ہے کہ کیا ایسا عذاب ممکن ہے؟ اگر ممکن ہے تو کیا عادلانہ ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ کام خدا کی قدرت کے سامنے آسان ہے اور اس کی حکمت کے مطابق بھی ہے۔

یہاں پر مفسرین کے درمیان ایک معروف سوال پایا جاتا ہے، وہ یہ کہ اگر وہ کھالیں نئی کھالوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں تو نئی کھالوں کا کیا جرم ہے کہ وہ بھی جل جائیں؟

بزرگ مفسرین نے اس سوال کے متعدد جوابات دیے ہیں اور سب سے بہتر امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث میں مذکور جواب ہے جو انہوں نے اس وقت ارشاد فرمایا جب ایک مادہ پرست ابن ابی العوجانے مندرجہ ذیل آیت کے حوالے سے سوال کیا کہ ''ماذنب الغیر'' دوسری کھالوں کا کیا گناہ ہے؟

امامؑ نے ایک مختصر اور پُرمعنی جواب فرمایا کہ ''**ھی ھی وھی غیرھا**'' نئی کھالیں وہی پرانی کھالیں ہی ہیں اور درعین حال دوسری بھی ہیں۔

ابن ابی العوجاء جب اس بات کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکا تو درخواست کی کہ مثال کے ساتھ مزید وضاحت فرمائیں۔امامؑ نے فرمایا: یہ ایسے ہے جیسے کسی نے اینٹ توڑی ہو اور دوبارہ اس کو قالب میں ڈال کر نئی اینٹ بنائے، یہ دوسری اینٹ وہی پہلی اینٹ ہی ہے، اور درعین حال دوسری بھی ہے۔[1]

اس روایت کے مطابق نئی کھال پرانی کھال کے مواد سے ہی بنے گی، نئی اور جدید شکل میں پرانا مادہ ہی محفوظ ہے۔

کچھ نے کہا ہے: اگر مادہ اور صورت دونوں پرانی کھال کی صورت اور مادے سے مختلف بھی ہوں تب بھی کوئی اشکال پیش نہیں آتا کیونکہ قیامت کے دن انسان کی روح عذاب چکھے گی نہ بدن کی کھالیں، انہوں نے **لیذوقوا العذاب** (تاکہ وہ یعنی کفار عذاب چکھیں) کی تعبیر کو بھی اس مدعا پر شاہد جانا ہے اسی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنے ایک عضو سے کوئی گناہ انجام دیتا ہے اور سزا کسی دوسرے عضو کو دی جاتی ہے، مثلاً وہ شراب پیتا ہے اور ۸۰ کوڑے اس کی پیٹھ پر مارے جاتے ہیں، یہ اس لئے ہے کہ جسم کو تکلیف دینا روح کی آزار کا ایک وسیلہ ہے۔

تیسری آیت میں کچھ ایسے بدکاروں کی سزا کا ذکر ہے جو سونا چاندی اور درہم ودینار کا ذخیرہ کرتے تھے اور اس کا حق ادا نہیں کرتے تھے، ارشاد فرمایا گیا ہے: جو لوگ سونے اور چاندی کا خزانہ جمع کرتے اور چھپاتے ہیں اور خدا کی راہ میں انفاق نہیں کرتے ایسے لوگوں کو دردناک سزاؤں کی بشارت دیجئے (**والذین یکنزون الذھب والفضة ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب**

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۹۴ حدیث ۳۱۴۔

الیم)۔

اس کے بعد اس"عذاب الیم" کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: اس دن جب ان (سونے اور چاندی کے سکوں) کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کے چہروں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا"یوم یحمی علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم"اور ان سے کہا جائے گا (یہ وہی چیز ہے جس کا تم نے ذخیرہ کیا تھا،) پس چکھو اس چیز کو جسے تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا"ھذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون"۔

یہ عبارت قیامت کے دن شدید الٰہی عذاب سے مربوط تمام آیتوں کے بارے میں پیش آنے والے اہم سوال کا جواب دے رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ تمام سزائیں لوگوں کے اپنے اعمال اور کاموں کا نتیجہ ہیں جو اس دن اس صورت میں مجسم ہوں گے اور حقیقت میں وہ اپنے اعمال ہی کو چکھیں گے۔

یہ بالکل ایسے ہے جیسے کوئی شخص کچھ دن شراب نوشی میں افراط کے نتیجے میں شدید اور دردناک بیماریوں میں مبتلا ہو اور ایک عرصے تک تکلیف اٹھائے۔

چونکہ مندرجہ بالا آیت کے بارے میں اس سے پہلے کافی وضاحت ہو چکی ہے، لہٰذا اب ہم تکرار نہیں کرتے۔

جہنم کی انفرادی بیرکیں:

چوتھی آیت میں ایک بار پھر جہنمیوں کے مختلف طرح کے عذاب کے ایک اور نمونے کا ذکر ہے، ارشاد ہوتا ہے: جب انہیں زنجیروں میں جکڑ کر جہنم کی کسی تنگ جگہ میں جھونک دیا جائے گا تو ان کی چیخ و پکار بلند ہوگی"واذا القوا منھا مکانا ضیقا مقرنین دعوا ھنالك ثبورا"۔

ایسی حالت میں ان سے کہا جائے گا کہ یہ چیخ و پکار بے فائدہ ہے اور کسی بھی مشکل کا حل نہیں ہے (آج ایک بار نہیں بار بار چیخ و پکار کرو) کیونکہ تمہارے مصائب ہی اتنے زیادہ ہیں کہ تمہیں بہت زیادہ واویلا کرنا چاہیے"ولا تدعوا الیوم ثبورا وحدا وادعوا ثبورا کثیرا"

اس تعبیر سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ جہنم میں بھی آزاد نہیں ہوں گے بلکہ وہاں ان کی جگہ جیل کی انفرادی بیرکوں کی طرح ہوگی اور اس میں بھی طوق و زنجیر میں بندھے ہوں گے اس طرح کہ ان کی چیخیں بلند ہوں گی، ایسی چیخ جو کسی مشکل کا حل نہیں ہے۔

"مقرنین" قرن کے مادے سے (قدر کے وزن پر) مفردات میں راغب کے بقول اصل میں کسی ایک جہت کی طرف دو یا دو سے زیادہ چیزوں کے اجتماع کو کہتے ہیں، اسی لئے اس رسی کو بھی قرن (نظر کے وزن پر) کہتے ہیں جس سے اشیاء کو باندھا جاتا ہے قرن ایسی قوم اور جمعیت کو کہا جاتا ہے جو ایک زمانے میں زندگی گذار رہی ہو اور کبھی خود اس زمانے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور جب اس لفظ کو باب تفعیل میں لے جایا جائے تو کثرت اور شدت پر دلالت کرتا ہے۔

لہٰذا زیر بحث آیت میں ''مقرنین'' کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ جہنمیوں کے ہاتھ پاؤں باندھے جائیں گے، بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس دن جہنمیوں کو گروہ در گروہ طوق وزنجیر کے ایک طولانی سلسلے میں باندھ دیا جائے گا، اور یہ گناہگاروں کی فکری اور عملی ہم آہنگی کا تجسم ہی ہے جو اس دنیا میں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے مظلوموں کے حقوق پر تجاوز کرتے اور ظلم وفساد کا ارتکاب کرتے اور اُن کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے۔

لیکن ''مکانا ضیقا'' کی تعبیر کے پیش نظر پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے، یہ بھی اُن کے اعمال کا ایک تجسم ہی ہے جو وہ اس دنیا میں بے گناہوں کو انفرادی بیرکوں میں قید کر دیتے اور انہیں زنجیروں سے باندھ دیتے تھے، یا اُن کی اجتماعی زندگی میں ایسی محدودیتیں پیدا کر دیتے تھے کہ زنجیروں میں بندھے ہوئے قیدیوں کی طرح حرکت کی طاقت ان سے سلب ہوجاتی تھی۔

''ثبور''اصل میں ہلاکت کے معنی میں ہے اگرچہ مقائیس اللغتہ نے اس کے تین اصلی معانی بیان کئے ہیں، پہلا ہلاکت، دوسرا نگہداشت اور تیسرا سہولت، لہٰذا ایسی زمین کو جس کی مٹی چونے کی طرح ڈھیر کی صورت میں ہو'' ثبرۃ'' کہا جاتا ہے۔

لیکن ممکن ہے یہ تمام معانی ہلاکت کے معنی کی طرف برگشت کریں کیونکہ ایسی زمینوں سے گذرنا خطرے سے خالی نہیں ہے، اور چونکہ خطرے کے مواقع میں انسان اپنی اور اپنے اموال کی نگہداشت کرتا ہے لہٰذا یہ لفظ نگہداشت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، بہرحال جب کسی عرب کو کسی خطرناک چیز کا سامنا ہوتا تو وہ ''واثبورا'' کہہ کر چیختا یعنی ہائے میں مرگیا، یہ چیز اُن کی ناراحتی کی شدت اور درد والم کے احساس کو بیان کرتی ہے۔

ممکن ہے لا تدعوا الیوم ثبورا واحدا وادعوا ثبورا کثیرا کی عبارت ہلاکت یا شدت کے متعدد عوامل یا دوزخ میں ان عوامل کی طولانی مدت کی طرف اشارہ ہو، اور بہرحال یہ بھی ان کے اعمال کا تجسم ہی ہے کہ وہ اس دنیا میں مختلف گناہوں کا ارتکاب کرتے رہے اور مخلوقات پر مختلف مظالم ڈھاتے رہے اور ہر طرف سے ان کے لئے ہلاکت کے دروازے کھولتے رہے۔

پانچویں آیت میں ان کے دردناک عذاب کا ایک اور چہرہ ہمیں نظر آتا ہے، فرمایا گیا ہے: ان کے چہروں پر آگ کے سوزاں شعلوں کے تھپیڑے پڑیں گے ''**تلفح وجوههم النار**'' اس بناء پر قیامت کے دن ان کے منہ بنے ہوئے ہوں گے ''**وهم فيها كالحون**''۔

''تلفح ''لفح کے مادے سے (فتح کے وزن پر) بہت سے ارباب لغت وتفسیر کے بقول اصل میں چہرے پر دھوپ آگ اور بادسموم کی تاثیر اور اس کے متغیر ہونے کے معنی میں ہے، اور کبھی تلوار کے وار پر بھی اطلاق ہوتا ہے جو آفتاب کی تابش، آگ کے شعلے اور بادسموم کے تھپیڑوں کی مانند ہے۔

کبھی لفح کی جگہ نفح کہا جاتا ہے لیکن بعض کے خیال میں لفح کا زیادہ شدید مرحلے پر اور نفح کا خفیف مرحلے پر اطلاق ہوتا ہے۔

''کالحون'' کلوح کے مادے سے (کلوخ کے وزن پر) بہت سے ارباب لغت وتفسیر کے بقول ترش روئی اور اس طرح منہ بسورنے کے معنی میں ہے کہ دونوں لب کھل جائیں اور یہ وہی حالت ہے جو دوزخیوں کے چہرے پر آگ کے شعلوں کی شدید تپش کی وجہ سے پیدا ہوگی، مجموعی طور پر اُن کے چہروں پر آگ کے شعلوں کے تھپیڑوں کی تاثیر کی ترسیم ہے جو بہت دردناک ہے، وہی چہرے جو جو اس دنیا میں

مستضعفون کے سامنے بن جاتے تھے اور وہی ہونٹ جواُن پر طنز اور تمسخر کے لئے کھلے رہتے تھے، یہ دردناک اور برے اعمال آخر کار قیامت میں انہی کے لئے ان دردناک عذابوں میں تبدیل ہوں گے۔

ان آیات کے چھٹے حصے میں ان کے دردناک عذاب کی ایک اور صورت کا ذکر ہو رہا ہے، ارشاد ہوتا ہے وہ بہت جلد اپنے اعمال کے نتیجے سے باخبر ہوں گے ''جب طوق اور زنجیریں ان کی گردنوں میں ڈال دی جائیں گی'' (اذا الاغلال فی اعناقھم والسلاسل)۔

بعدازاں فرماتا ہے: ان کو کھولتے پانی میں گھسیٹا جائے گا، پھر جہنم کی آگ میں جلایا جائے گا (یسحبون فی الحمیم ثم فی النار یسجرون)۔

''اغلال'' غل کی جمع اور ''سلاسل'' سلسلہ کی جمع ہے اور ان کے مابین فرق یہ ہے کہ غل ایسا طوق ہے جو قیدیوں کے ہاتھ پاؤں یا گردن میں ڈال دیا جاتا ہے اور سلسلہ ایسی زنجیر ہے جس سے انہیں باندھا جاتا ہے یا ان کی گردن اور ہاتھ پاؤں میں ڈال دی جاتی ہے۔

''یسحبون''، ''سحب'' کے مادے سے (سھل کے وزن پر) کھینچنے کے معنی میں ہے، بادلوں کو بھی اسی لئے سحاب کہتے ہیں کہ انہیں وسیع طور پر صفحہ آسمان پر کھینچا اور پھیلا دیا جاتا ہے۔[1]

بعض نے اس لفظ کی زمین پر کھینچے جانے سے تفسیر کی ہے[2] جب کہ یہ تفسیر نہ زیر بحث آیت سے مناسبت رکھتی ہے اور نہ ہی اسے اس لفظ کے سحاب کی طرح کے بعض مشتقات سے کوئی مناسبت ہے۔

''یسجرون'' سجر کے مادے سے (زجر کے وزن پر) مقائیس اللغۃ میں اس کے لئے تین معنی بیان ہوئے ہیں، ایک بھرنا، دوسرا ملانا، تیسرا جلانا، لیکن بعض نے ان تین اصولی معانی کو ایک ہی بنیاد کی طرف پلٹایا ہے اور کہا ہے اصل معنی کسی شے کا ظرف میں لبریز ہونے کے بعد گرنا ہے، اس لئے بھڑکتی ہوئی آگ، بحر امواج اور جذبوں سے معمور پر ہیجان محبت کرنے والے قریبی دوستوں کو ''مسجور'' اور'' سجیر'' کہا جاتا ہے۔

اس بنا پر پہلے انہیں طوق و زنجیر میں باندھا جائے گا پھر آپ سوزاں میں ڈالا جائے گا اور بعدازاں آگ میں جلایا جائے گا، اور یہ واضح ہے کہ گرم اور جلانے والے پانی میں ڈالنے کے بعد آگ میں ڈال دینا زیادہ دردناک ہوگا۔

یہ ان کے ایسے اعمال کا تجسم ہے جو انہوں نے بے گناہ افراد سے اس دنیا میں روا رکھے تھے اور انہیں مختلف مظالم کا نشانہ بناتے تھے، ان سے آزادی سلب کر کے انہیں طوق و زنجیر میں کھینچتے تھے۔

ان آیات سے مجموعی طور پر اس نکتے کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ جہنمیوں کی سزائیں ناقابل بیان ہیں اور طاقت ور ترین افراد بھی انہیں تحمل نہیں کر سکتے، بلکہ بہت دردناک اور شدید سزائیں ہیں۔

---

[1] مقائیس اللغۃ، مصباح اللغۃ اور مفردات راغب۔

[2] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم والمیزان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

وضاحتیں:

الٰہی عذاب کیوں اتنا شدید ہے؟

ان دردناک سزاؤں کی مختلف قسموں اور شدت اور طولانی مدت کی وجہ سے بہت سے افراد کو یہ سوال پیش آتا ہے کہ یہ شدید عذاب لطف الٰہی سے کیونکر ہم آہنگ ہے اور دوسری طرف جہنمیوں کے اعمال سے ان کا کیا تناسب ہے، شاید اس اشکال کا لاینحل رہنا ہی باعث بنا ہو کہ کچھ نے اس کو مجازی معنی یا روحانی سزاؤں پر محمول کیا ہے۔

لیکن اس نکتے کی طرف توجہ دینے سے یہ معما حل ہوجاتا ہے جو ایسے مسائل کے حل کی کلید ہے اور بارہا اس کی طرف توجہ دی جاچکی ہے، وہ یہ کہ یہ عذاب زیادہ تر انسان کے اپنے اعمال کا تجسم اور ان کا نتیجہ اور ثمر ہیں اور اس کے نمونے ہم اسی جہان میں دیکھتے ہیں۔

ایسے افراد موجود ہیں جو چند دنوں کی خیالی لذتوں کے لئے خطرناک نشوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور یہ نشے ان کی تمام قوتوں کو ختم کر دیتے ہیں اور وہ بہت جلد اس قدر ضعیف و کمزور ہوجاتے ہیں کہ مختلف جانگداز بیماریوں میں ایک عمر تک ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔

یا پھر جنسی انحرافات کی بدولت ''ایڈز'' کی طرح کی لاعلاج بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں، یہ وہی بیماری ہے جس میں مبتلا افراد کو دیکھ کر انسان کا دل سچ مچ جلنے لگتا ہے اور اسے سخت افسوس ہوتا ہے۔

کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ نشے یا جنسی انحراف کا نتیجہ اتنا شدید دردناک اور طولانی کیوں ہے؟ اور ان کے درمیان کوئی منطقی تناسب نہیں ہے؟

اگر کوئی اس طرح کی بات کرے تو اس سے فوراً یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ان کے اعمال کی خاصیت ہی ہے اور پہلے انہیں خبردار کر دیا گیا تھا۔

یہی معنی جہنمیوں کے عذاب پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

بہت دیکھا گیا ہے کہ بعض افراد ڈرائیونگ میں سہل انگاری کی وجہ سے خطرناک حادثے سے دوچار ہوکر اپنے ہاتھ پاؤں یا ریڑھ کی ہڈی تڑوا بیٹھتے ہیں اور ایک عمر تک تکلیف سہتے ہیں جب کہ وہ قوانین کی صحیح پیروی کر کے اس سے بچ سکتے تھے، جب اعمال کے طبعی آثار کی بات آتی ہے تو مندرجہ بالا سوالات کی گنجائش باقی نہیں رہتی، اس کے علاوہ جہنمیوں میں ایسے بھی افراد ہوں گے جنھوں نے دوسروں کو اس طرح کے مظالم میں مبتلا کر دیا تھا، اگر انسان گذشتہ تاریخ میں ثبت شدہ واقعات قطع نظر آج کی دنیا میں ہونے والے مظالم کے بارے میں خبروں کی تحقیق کرے تو اس کو یقین ہوجائے گا کہ بعض افراد واقعی ایسی شدید سزاؤں کے حقدار ہیں۔

بلکہ کبھی ظالموں کے مظالم اتنے زیادہ ہوتے ہیں اور ان کے جرائم اتنے مختلف اور بے حساب ہوتے ہیں کہ انسان سوچتا ہے ان کے جرائم کے مقابلے میں تو کوئی بھی سزا نہیں ہے۔

(۵) روحانی عذاب

اشارہ:

جس طرح بہشت کے بارے میں فوق العادہ جسمانی اور روحانی دونوں طرح کی لذت بخش نعمتیں موجود ہیں اور یہ دونوں اصولاً ایک دوسرے کی کامل کنندہ ہیں اور جسمانی و روحانی معاد کے ساتھ ساتھ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتیں، اسی طرح جہنم کے بارے میں بھی دونوں طرح کی سزائیں دیکھنے میں آتی ہیں، اس سے متعلق آیتیں بھی اس بات پر گواہ ہیں۔

اس سلسلے میں ان آیات کی طرف توجہ کیجئے:

۱۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ

۲۔ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۚ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ

۳۔ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ

۴۔ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ

۵۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ) قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ قَالُوْا بَلٰى ۚ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ

۶۔ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا

۷۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ

مَا يُؤۡمَرُوۡنَ [۱]

۸۔ ونادی اصحب الجنة اصحب النار ان قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقا فهل وجدتم ما وعد ربکم حقا قالو نعم فاذن موذن بینهم ان لعنة الله علی الظلمین۔

ترجمہ:

۱۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کی تکذیب کی ان کے لئے ایک رسوا کن عذاب ہوگا۔

۲۔ خدایا! جس کو تو (اس کے اعمال کی وجہ سے) آگ میں ڈال دے اس کو تو نے خوار اور رسوا کر دیا، ایسے ستم گر افراد کا کوئی بھی مدد گار نہیں ہے۔

۳۔ جب وہ جہنم کے غم واندوہ سے نکلنا چاہیں گے تو ان کو اس میں پلٹا دیا جائے گا (اور ان سے کہا جائے گا) عذاب سوزاں کو چکھو۔

۴۔ خدایا! ہمیں اس سے باہر نکال دے، اگر ہم پھر ایسا کریں تو ضرور ستم گر ہوں گے (اور عذاب کے مستحق) وہ کہے گا: جہنم میں دور ہو جاؤ اور مجھ سے بات نہ کرو۔

۵۔ اور جو لوگ جہنم میں ہوں گے جہنم کے داروغوں سے کہیں گے اپنے پروردگار سے درخواست کریں کے ہمارے عذاب میں ایک دن کی تخفیف کر دے، وہ کہیں گے کیا تمہارے انبیاء واضح دلائل لے کر تمہارے پاس نہیں آئے تھے؟ وہ جواب دیں گے، جی ہاں! تب وہ کہیں گے پھر جتنا چاہو پکارو لیکن کافروں کی پکار کی کہیں شنوائی نہیں۔

۶۔ جب آگ دور سے انہیں دیکھے گی تو وہ اس کی وحشت ناک اور غصیلی آواز جو شدید تنفس کے ساتھ ہوگی، سنیں گے۔

۷۔ اے ایمان والو! خود کو اور اپنے خاندان والوں کو اس آگ سے روکو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، وہ آگ کہ جس پر نہایت سخت گیر فرشتے مقرر ہیں، وہ ہرگز خدا کے فرمان کی مخالفت نہیں کرتے اور اس کے فرامین پر پوری طرح عمل کرتے ہیں۔

۸۔ اور بہشت والے جہنمیوں کو پکاریں گے کہ ہمارے پروردگار نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا ہم نے اُسے حق پایا، کیا تم نے بھی اس وعدے کو سچا پایا جو خدا نے تم سے کیا تھا؟ وہ کہیں گے جی ہاں! تب ایک منادی ان کے درمیان ندا دے گا کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔

تفسیر:

جاں کاہ غم واندوہ اور بے پایاں حسرتیں:

روحانی غم اور سزاؤں سے مراد وہ امور ہیں جو انسان کی جان اور روح پر اثر ڈالتے ہیں اگرچہ ظاہری طور پر اس کے جسم پر کوئی اثر نہ

---

[۱] کچھ اور آیتیں بھی انہی مفاہیم کو بیان کرتی ہیں مثلاً مجادلہ ۵، سجدہ ۲۰، اعراف ۵۰، حاقہ ۳۵۔

رکھتے ہوں یا یہ کہ ان کے دو اثر ہیں اور وہ جسم کو بھی بلا واسطہ طور پر آزار دیتے ہیں اور روح کو بھی۔

پہلی آیت میں دوسری قسم کا ایک نمونہ نظر آتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اور جن لوگوں نے الکار کیا اور ہماری آیتوں کی تکذیب کی ان کے لئے ایک رسوا کن عذاب ہوگا'' **والذین کفروا و کذبوا بایتنا فاولٓئك لهم عذاب مهين**''۔

قرآن یہاں پر وضاحت نہیں کرتا کہ یہ عذاب کیسے جہنمیوں کو ذلت و خواری میں مبتلا کرتے گا، پس ایک کلی اشارہ کرتا ہے جہنم کے عذاب کی بہت سی تحقیر آمیز جہتیں اس ایک اشارے میں پنہاں ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغروروں اور خود پرستوں کو ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں گرایا جائے گا، بعض مفسروں نے جن میں قرطبی بھی شامل ہے اس احتمال کا ذکر کیا ہے کہ یہ رسوا کُن عذاب یہاں اس انجام کی طرف اشارہ ہے کہ جس کا میدان بدر میں مشرکوں کو سامنا کرنا پڑا، لیکن اس سے پہلی آیت کہ جن مومنوں کو جنات نعیم کی بشارت دی گئی ہے، کی طرف توجہ دی جائے تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اس آیت کا اشارہ دوزخ کے رسوا کن عذاب کی طرف ہے۔

بہرحال قرآن کی متعدد آیتوں میں آنے والی یہ عبارت ہمیں بتاتی ہے کہ دوزخ کا عذاب طرح طرح کی رسوائیوں سے آمیختہ ہے جو روح کے لئے بھی آزار کا باعث ہے اور یہ ان تحقیروں اور اہانتوں کا تجسم ہے جو وہ انبیاء الٰہی، پاک دل مومنین اور باایمان مستضعفین کے لئے روا رکھتے تھے، اس روز انہیں اپنے اعمال کے نتیجے کو اس صورت میں دیکھنا ہوگا۔

دوسری آیت میں جہنمیوں کی رسوائی کی بات ہو رہی ہے جو خود ایک دردناک اور معنوی عذاب ہے، باایمان (اولو الالباب) کی زبان سے یہ بات نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وہ کہتے ہیں: خدایا جس کو تو (اس کے اعمال کی وجہ سے) آگ میں ڈال دے اس کو تو نے خوار اور رسوا کر دیا اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ''ربنا انك من تدخل النار فقد اخزيته وما للظلمين من انصار''۔

اخزیته خزی کے مادے سے ہے اور لغت کی کتابوں میں اس کے بہت سے معانی بیان ہوئے ہیں، مثلاً بدحالی، دور ہونا، ذلت، رسوائی، تحقیر اور یہی معانی مفسرین نے بھی بیان کئے ہیں۔[1]

اس آیت کے لہجے سے پتہ چلتا ہے کہ قیامت کی روحانی سزائیں زیادہ دردناک ہیں کیونکہ اولوالالباب خدا کی بارگاہ میں عرض کریں گے کہ جن کو تو نے جہنم میں ڈال دیا انہیں رسوا کر دیا، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ رسوائی جہنم کی آگ سے زیادہ شدید ہے، یہ بات بالکل اس طرح ہے جیسے بعض لوگوں کو جیل خانے سے زیادہ پریشانی نہیں ہوتی لیکن اس مسئلے کے فاش نہ ہونے پر بہت زور دیتے ہیں کیونکہ اس کا فاش ہونا معاشرے میں ان کی رسوائی کا باعث بن جاتا ہے اور یہ جیل سے زیادہ دردناک بات ہے۔

---

[1] مقائیس اللغه۔ مصباح اللغه۔ صحاح اللغه۔ لسان العرب اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔ تفسیر مجمع البیان میں خزی کے دو اور معانی بھی بیان ہوئے ہیں، ایک ہلاکت اور دوسرا انجالت آور مقام پر ہونا۔

"وما للظلمین من انصار" اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ وہ جو بھی سہیں گے ان کے ظلم وستم ہی کی وجہ سے ہو گا، اور ایسا ہی ہونا چاہیے کہ وہاں پر ان کا کوئی یار و مددگار نہ ہو، البتہ یہ عبارت قابل شفاعت افراد کی شفاعت کے مسئلے کے منافی نہیں ہے کیونکہ یہاں پر مراد ان مددگاروں کی نفی ہے جو اپنی طاقت کے بل بوتے پر ظالموں کی مدد کریں نہ یہ کہ الٰہی قدرت سے مدد کرنے والوں کی نفی ہوتی ہو۔

تیسری آیت میں جہنمیوں کے جاوداں غم واندوہ کا تذکرہ ہو رہا ہے جو اُن کے روحانی مصائب وآلام کی حکایت کرتا ہے، ارشاد ہوتا ہے: جب بھی وہ جہنم کے غم واندوہ سے نکلنا چاہیں گے انہیں اس میں واپس پلٹا دیا جائے گا (اور اُن سے کہا جائے گا) عذاب سوزاں کو چکھو۔ "**كلما ارادوا ان يخرجوا منها من غم اعيدوا فيها و ذوقوا عذاب الحريق**"۔

بہت سے مفسروں نے کہا ہے کہ جب وہ اس جانکاہ غم واندوہ سے نجات چاہیں گے اور دوزخ کے کناروں کے نزدیک ہوں گے تو جہنم کے داروغے انہیں اپنے تازیانوں یا آتشیں گرزوں سے واپس دھکیل دیں گے، کیونکہ اس سے پہلی "**ولهم مقامع من حديد**" میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے "**ذوقوا عذاب الحريق**" (عذاب سوزاں کو چکھو) جو بھی اُن کی تحقیر اور سرزنش کے طور پر ان سے کہا جائے گا، اس روحانی عذاب کا ایک اور نمونہ ہے۔[1]

انتہائی تحقیر اور سرزنش:

چوتھی آیت میں جہنمیوں کی توہین اور تحقیر کے بارے میں جو خود ایک روحانی عذاب الیم ہے، ایک اور انداز سے گفتگو ہو رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے: (جہنمی کہیں گے) خدایا ہمیں جہنم سے باہر نکال دے، اگر ہم اپنے سابقہ اعمال کی طرف پلٹیں تو یقینا ظالم ہوں گے (اور عذاب کے مستحق بھی) "**ربنا اخرجنا منها فان عدنا فانا ظلمون**"۔

لیکن پروردگار عالم کی طرف سے اُن سے کہا جائے گا (جہنم میں دور ہو جاؤ اور مجھ سے بات نہ کرو" **قال اخسوا فيها و لا تكلمون**"۔

تقریبا تمام ارباب لغت اور تفسیر نے تصریح کی ہے کہ "**اخساٴ**" وہ کلمہ ہے جو کتوں کو دھتکارتے وقت استعمال کیا جاتا ہے، اس کلمہ کا یہاں پر استعمال گناہگار اور متکبر ظالموں کی تحقیر کے لئے ہے۔

بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ "**لا تكلمون**" (مجھ سے بات نہ کرو) اس سے زیادہ دردناک اور غم انگیز ہے کہ رحیم وکریم مولا ایک بندے کو اپنے پاس سے اس طرح دور کر دے اور اس سے یہ کہے کہ مجھ سے ہرگز بات نہ کرو، یہ وہی چیز ہے جس کی طرف دعائے کمیل میں بہت ہی لطیف عبارت میں اشارہ ہوا ہے: "**فهبني يا الهي وسيدي ومولاي وربي صبرت على عذابك فكيف اصبر على فراقك**" اے

---

[1] حریق اگرچہ اسم مصدر ہے لیکن یہاں فاعلی معنی رکھتا ہے لیکن بعض کے قول کے مطابق صیغہ مبالغہ (یا صفت مشبہ ہے اور مفردات کے مطابق حریق آگ کے معنی میں ہے، عذاب کے حریق کی طرف اضافے کے پیش نظر یہ تفسیر یہاں زیادہ مناسب لگتی ہے۔

میرا خدا، آقا، مولا اور پروردگار! عذاب پر اگر میں صبر بھی کرلوں تو بھی تیرے فراق اور جدائی کو کیسے برداشت کر پاؤں گا۔

وہ لوگ وہاں پر ایسے دردناک روحانی عذاب میں کیوں مبتلا ہوں گے؟ بعد والی آیتیں اس کا جواب دیتی ہیں اور کہتی ہیں: یہ اس لئے ہوگا کہ میرے بندوں میں ایک جماعت یہ کہتی تھی کہ خدایا ہم ایمان لائے ہیں، ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو بہترین رحم کرنے والا ہے۔لیکن تم لوگوں نے اُن کا مذاق اڑایا یہاں تک کہ اس طرزِ عمل کے باعث تم میری یاد سے غافل ہو گئے اور ہمیشہ ان پر ہنستے رہے۔''انه کان فریق من عبادی یقولون ربنا امنا فاغفر لنا وارحمنا وانت خیر الراحمین فاتخذ تموهم سخریا حتی انسو کم ذکری و کنتم منهم تضحکون'' [1]

اس استہزاء تمسخر اور باایمان افراد کے ساتھ ٹھٹھے کا نتیجہ یہی ہے کہ آج تم لوگوں کی توہین اور تحقیر کی جائے اور حقیقت میں یہ تمہارے ہی اعمال کا تجسم ہے۔

پانچویں آیت کے مطابق جہنم کے داروغے اور عذاب وسزا کے مامور جہنمیوں کی ملامت سرزنش اور تحقیر کریں گے، ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ جہنم کی آگ میں ہیں جہنم کے داروغوں سے درخواست کریں گے کہ اپنے خدا سے عرض کرو کہ ہمارے عذاب میں (کم از کم) ایک دن کی تخفیف کردے، وہ کہیں گے: کیا تمہارے انبیاء تمہارے پاس واضح دلائل لے کر نہیں آئے تھے؟ وہ جواب دیں گے جی ہاں (آئے تھے)، تب وہ کہیں گے پھر جتنا چاہو پکارو لیکن جان لو کہ کافروں کی دعا بیکار ہی ہے (اور ہرگز قبول نہیں ہوگی)'' وقال الذین فی النار لخزنة جهنم ادعوا ربکم یخفف عنا یوم من العذاب۔ قالوا اولم تك تأتیکم رسلکم بالبینت قالوا بلی قالو فادعوا وما دعوا الکفرین الا فی ضلل'۔

یہ جواب ان کی روح کے لئے تازیانہ ثابت ہوگا اور انہیں اذیت دے گا، انہوں نے عذاب سے صرف ایک دن نجات کی درخواست کی تھی، لیکن قبول نہ ہوئی، انہوں نے داروغوں سے کہا کہ تم ہمارے لئے دعا کرو لیکن داروغوں نے جواب دیا کہ تم خود دعا کرو کیونکہ وہ اس قابل نہ تھے کہ اُن کے لئے دعا کی جاتی اور یہ بھی ایک طرح کی توہین ہے یا ان کے لئے دعا بھی خدا کی اجازت ہی سے کی جاسکتی ہے جب کہ خدا نے ہرگز اس طرح کی کوئی اجازت نہیں دی یا چونکہ یہ مستجاب ہونے والی دعا نہیں، لہٰذا بے فائدہ ہے، اس لئے وہ دعا تک نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ تم خود ہی دعا کرو (اور جان لو کہ کہیں سُنی نہیں جائے گی) اور یہ بھی ایک تکلیف دہ بات ہے۔

چھٹی آیت میں جہنمیوں کے ایک اور روحانی عذاب کی نشاندہی ہوتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: جب جہنم انہیں دور سے دیکھے گا تو وہ اس کی وحشت ناک اور غضیلی آواز جو شدید تنفس کے ساتھ ہوگی، سنیں گے'' اذا راتهم من مکان بعید سمعوا لها تغیظا وزفیرا''۔

یہاں پر جہنم کے لئے ایک ایسے وحشی درندے کی تمام صفتیں بیان ہوتی ہیں جو اپنے شکار کو دیکھ کر اپنی غضیلی اور وحشت ناک آواز بلند کرتا ہے جو شدید تنفس کے ساتھ ہوتی ہے، یہ گویا ایک ایسا وحشت ناک منظر ہوگا جو اس کے پورے وجود پر وحشت طاری کردے گا اور اُسے ہلا

---

[1] سورہ مومنون۔۱۰۹،۱۱۰۔

کرر کھ دے گا۔

''تغیظ'' غیظ کے مادے سے مفردات میں راغب کے بقول ''غضب کی شدت'' کے معنی میں ہے اور تغیظ اس کے اظہار کے معنی میں ہے، غصے کی حالت اگر چہ سنی نہیں جاسکتی لیکن خوفناک صداؤں جیسی بعض صفتیں اس کے ساتھ ہوتی ہیں جو سنی جاسکتی ہیں۔

''زفیر'' پھیپھڑوں میں اس طرح سانس کی آمدورفت کے معنی میں ہے کہ جس سے سینہ اُوپر کو اٹھ جائے اور اس کے ساتھ اکثر ایسی وحشت ناک صدائیں ہوتی ہیں کہ جو سنی جاسکتی ہیں۔

بعض ایسے مفسرین جو یقین نہ کر سکے کہ جہنم ایک زندہ وجود ہے، دیکھتا ہے اور ادراک رکھتا ہے اور مجرموں کو پہچانتا ہے، وہ مجبور ہوئے ہیں کہ یہاں کچھ تقدیر میں فرض کریں، انہوں نے کہا ہے کہ جہنم کے دیکھنے سے مراد داروغوں کا دیکھنا ہے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ تقدیر میں لینا قاعدے کے خلاف ہے اور یہاں اس کی ضرورت نہیں ہے کیا مانع ہے کہ ہم کہیں جہنم اور جنت میں بھی روح ہے اور میں پیش آنے والے واقعات کو وہ سمجھتا ہے، بعض روایتوں سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی آنکھ، کان اور زبان ہوگی اور وہ مجرموں کو بخوبی پہچان لے گا اور انہیں پکڑ لے گا، پرندے جس طرح اپنے دانے کو پہچانتے ہیں، دوزخ کی یہ شناخت اس سے بہتر ہوگی۔[1]

آج ہم اس مسئلے کے بعض چھوٹے نمونے دنیا میں دیکھتے ہیں کہ کمپیوٹر کی مدد سے مختلف عمارتوں میں لگائی گئی الیکٹرونک کان اور آنکھیں بہت سے مسائل کو دیکھتی اور سنتی ہیں اور ان کا مناسب ردعمل دکھاتی ہیں اگر چہ وہ عمارت ادراک نہیں رکھتی، ممکن ہے مجرموں کے بارے میں جہنم کا ردعمل اسی طرح کا یا اس سے بالاتر یعنی ادراک کے ساتھ ہو۔

ساتویں آیت میں دوزخیوں کی روحانی سختیوں کا ایک اور چہرہ دکھایا جارہا ہے، اس آیت میں خدا مومنوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے ایمان لانے والو خود کو اور اپنے خاندان والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھروں گے۔ ''یایھا الذین امنو اقوا انفسکم واھلیکم نارا وقودھا الناس والحجارۃ''

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی آگ اس دنیا کی آگ سے بہت مختلف ہوگی، حجارہ سے مراد خواہ پتھر کے بت ہوں یا اس سے اعم ہوں اور خواہ مراد وہ آگ ہو جو ان پتھروں کے ایٹموں کے اندر سے باہر نکلتی ہے یا کوئی اور چیز، جیسا بھی ہے اس کا کچھ حصہ انسانوں ہی کے وجود کے اندر سے یعنی ان کے اعتقادات اور باطنی بری نیتوں سے، اور ان کے گناہوں میں آلودہ اعضاء سے شعلہ ور ہوگا یا پھر ان پتھروں سے جنہیں انہوں نے اپنا معبود بنالیا تھا یا ان پتھروں سے جو محل اور اس طرح کی چیزیں بنانے میں ان کے غرور اور تکبر کا ذریعہ تھے۔

پھر مزید ارشاد ہوتا ہے: ''اس آگ پر نہایت سخت گیر فرشتے مقرر کئے گئے ہیں جو ہر گز اللہ کے فرمان کی مخالفت نہیں کرتے اور اس کے فرامین کا پوری طرح اجرا کرتے ہیں'' علیھا ملئکۃ غلاظ شداد لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یومرون''۔

ان نہایت سخت گیر فرشتوں کا وجود اہل دوزخ کی روحانی مصیبتوں میں مزید اضافہ کرے گا اور نجات کی رائیں ہر طرف سے ان پر

---

[1] تفسیر قرطبی وروح المعانی زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

مسدود کردے گا۔

یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنی زندگی میں ہمیشہ اپنے زیر دستوں پر سختی کی تھی، ان کے سخت گیر مامور عوام پر سختیاں کرتے تھے اور بے رحمی، سخت گیری اور شفقت کا نہ ہونا ان کی رفتار زندگی کا حصہ تھا، آج وہ خود بھی ایسے انجام میں مبتلا ہوں گے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعد والی آیت میں کافروں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''آج معذرت نہ چاہو، تمہاری سزا تمہارے اعمال ہی ہیں''، ''لا تعتذروا الیوم انما تجزون ما کنتم تعملون''۔

بعض مفسرین جب پتھر کے اندر سے آگ کے باہر نکلنے کا تصور نہیں کر سکے تو انہوں نے یوں کہا ان پتھروں سے مراد گندھک کا پتھر ہی ہے جو لوہے سے ٹکرا کر بھڑک اٹھتا ہے، جب کہ آج ہم جانتے ہیں کہ ہر مادی وجود کے اندر پنہاں ایٹمی قوت میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ آگ کے عظیم شعلوں میں تبدیل ہو۔

''غلاظ'' غلیظ کی جمع ہے ''شداد'' شدید کی جمع ہے اور دونوں کا ایک ہی معنی ہے، ممکن ہے ان دونوں کا اکٹھا ذکر تاکید کے لئے ہو لیکن بعض نے کہا ہے کہ ''غلاظ'' قول میں سختی کی طرف اشارہ ہے اور ''شداد'' عمل میں سختی کی طرف یا پہلا کلمہ خشونت خلق کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا خشونت خلق کی طرف، بہرحال وہ فرشتے خدا کے فرامین کے سامنے سر تسلیم خم ہیں اور اس کے اوامر سے منحرف نہیں ہوتے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اصولی طور پر انسان کو لکڑی اور پتھروں کے ساتھ قرار دینا خود اُن کے لئے ایک طرح کی روحانی اور معنوی تحقیر ہے۔[1]

آٹھویں اور آخری عبارت میں بہشتیوں اور جہنمیوں کے مابین ہونے والی دلخراش اور جانکاہ گفتگو کے بارے میں بات ہو رہی ہے جس سے دوزخیوں کی روح کو بہت تکلیف ہوگی، ارشاد ہوتا ہے: جنتی جہنمیوں کو بلائیں گے اور (ان کی تنبیہ کے طور پر) کہیں گے کہ ہمارے پروردگار نے جو وعدے ہم سے کئے تھے وہ ہم نے سچ پائے، کیا تم نے بھی اپنے پروردگار کے وعدے سچ پائے؟ ''و نادی اصحب الجنة اصحب النار ان قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقا فهل وجدتم ما وعد ربکم حقا''۔

اور وہ انتہائی شرمندگی اور سرافگندگی سے جواب دیں گے: جی ہاں! (سب سچ تھا لیکن افسوس کہ ہم غرور و غفلت میں مبتلا تھے) ''قالوا نعم''۔

اس وقت ان کے درمیان سے ایک منادی پکارے گا کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہو''فاذن موذن بینهم ان لعنة الله علی الظلمین''۔

یہ باتیں جہنمیوں کے زخمیوں پر نمک چھڑکیں گی اور آگ کے شعلے اُن کے باطن کو مزید جلائیں گے۔

ہاں وہ (جیسا کہ بعد والی آیت میں آیا ہے) ایسے لوگ ہوں گے جو لوگوں کو خدا کے راستے سے رور کرتے تھے، لہٰذا اس دن خدا کی

---

[1] فی ظلال القرآن جلد ۸ صفحہ ۱۹۸۔

رحمت سے دور ہوں گے (لعنت رحمت سے دوری ہی ہے)۔

یہ منادی کون ہے جو بہشت وجہنم پر محیط ہے اور سب اس کی آواز سنیں گے اور وہ خدا کی طرف سے بات کرے گا؟ اس بارے میں شیعہ اور اہل سنت سے مروی بہت سی روایتوں میں ہے کہ وہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ہوں گے جنھوں نے اپنی پوری عمر ظالموں اور ستم گروں سے لڑنے میں گزار دی۔

یہ عجیب ہے کہ بعض متعصب افراد نے اس فضیلت کا مرتبہ گھٹانے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ یہ کام علیؑ کی فضیلت کا باعث نہیں بن سکتا، جب کہ یہ واضح ہے کہ ایسے الٰہی مادی کو بہت بلند مرتبہ اور عالی ہونا چاہیے جو بہشت اور جہنم پر مسلط ہوگا اور اس روز خدا کا پیغام تمام لوگوں تک پہنچائے گا۔

مختصر یہ کہ انسان جسم اور روح کا مرکب ہے اور معاد بھی دو پہلوؤں سے متحقق ہوگا اور سزائیں اور جزائیں بھی دو طرح کی ہیں، بنا برایں جہنمیوں کو نہ صرف جسمانی تکالیف کا سامنا ہوگا بلکہ شاید روحانی اور معنوی عذاب اور تکالیف ان کے لئے زیادہ دردناک ہوں، بے پایاں غم اور اندوہ، بڑی رسوائی، گذشتہ پر افسوس اور ندامت، بہشتیوں سے اپنی حالت کا موازنہ، سخت گیر داروغے، مختلف سرزنشیں، تحقیریں اور ڈانٹ ڈپٹ ایسے امور ہوں گے جو اُن کی روح کو بہت تکلیف پہنچائیں گے اور انہیں عذاب الیم میں مبتلا کر دیں گے۔

مسلماً یہ سزائیں اُن کے دنیا میں کئے ہوئے اعمال سے ہم آہنگ ہوں گی جب وہ دنیا میں مظلوموں پر طرح طرح کی مظالم ڈھاتے تھے، الٰہی آیتوں کا کتنا مذاق اُڑاتے تھے اور خدا کے بندوں کا تمسخر اڑاتے تھے اور مومنوں کی تحقیر کرتے تھے، دوسروں کے سامنے مغرور بنتے تھے، اگر وہ اپنے اعمال کا تجسم وہاں دیکھیں اور اُن کے نتائج میں مبتلا ہوں اور دنیا کی کھیتی میں بوئی ہوئی فصل وہاں کاٹیں، تو مقام تعجب نہ ہوگا۔

(٦) سزاؤں کا دوام

اشارہ:

بے شک ہمیشہ جرم اور جرمانے کے مابین ایک تناسب برقرار رہا ہے، جتنا جرم بھاری ہوگا اس کی سزا اور جرمانہ بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا، سزاؤں میں یہ ایک اصول ہے۔

لیکن انسانی اعمال کے طبیعی اور وضعی آثار میں یہ مسئلہ اور طرح سے ہے، کبھی انسان ایک لمحے کی غفلت اور سستی سے ایسے انجام کو پہنچتا ہے کہ جس کی کبھی تلافی نہیں ہوسکتی، کیونکہ جہل اور سستی کا وار اتنا سخت اور بھاری ہوتا ہے کہ کبھی انسان کے ایک عضو کو ہمیشہ کے لئے ناکارہ بنا دیتا ہے اور اُسے آخر عمر تک اس کا کفارہ اور جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے جب کہ وہ صرف ایک لمحہ کے لئے خطا کا ارتکاب کرتا ہے۔

قرآنی آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ایک گروہ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہے گا، دوسرے لفظوں میں دائماً جہنم میں رہے گا، ''خلود'' کا یہ مسئلہ بہت سے سوالات کا موجب بنا ہے اور ان کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں جن کی تفصیل انشاءاللہ آگے آئے گی۔

پہلے ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اور ان آیات میں غور وفکر کرتے ہیں جن میں سے ہر ایک میں عذاب کی ہمیشگی کے بارے میں ایک نئے انداز سے بات ہوئی ہے:

١۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

٢۔ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ٣٧ ﴿المائدۃ: ٣٧﴾

٣۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ

٤۔ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ،،

٥۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ۭ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ

ترجمہ:

۱۔ اور جو لوگ کافر ہوئے اور انہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا وہ اہل دوزخ ہیں اور ہمیشہ وہاں رہیں گے۔

۲۔ وہ ہمیشہ آگ سے نکلنا چاہیں گے لیکن نکل نہ سکیں گے اور اُن کے لئے پائیدار عذاب ہوگا۔

۳۔ لیکن جو لوگ شقی ہوں گے وہ آگ میں ہوں گے اور اُن کے لئے زفیر اور شہیق (طولانی آہیں اور نالے) ہوں گے اور وہ ہمیشہ اس میں رہی گے جب تک زمین و آسمان قائم ہیں، مگر وہ جو خدا چاہے، پروردگار جس چیز کا ارادہ کرتا ہے انجام دیتا ہے۔

۴۔ وہ لوگ چیخیں گے کہ اے دوزخ کے مالک! ہماری آرزو ہے کہ تمہارا پروردگار ہمیں مار ڈالے (تا کہ ہم آرام پا سکیں)، وہ کہے گا: تم یہیں رہو گے۔

۵۔ اور (اس وقت) پیروکار کہیں گے: کاش ہم ایک بار پھر دُنیا میں پلٹ جاتے تا کہ ان گمراہ رہبروں سے بیزاری کا اظہار کر سکتے جیسے (آج) وہ ہم سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں، (جی ہاں) خدا انہیں اس طرح حسرت کی صورت میں ان کے اعمال دکھائے گا اور وہ ہرگز (جہنم کی) آگ سے نکل نہ سکیں گے۔

تفسیر:

عذاب جاوداں:

پہلی آیت میں مشہور کلمہ ''خلود'' (جاودانی) کا ذکر ہے، فرمایا گیا ہے جو لوگ کافر ہوئے اور انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اہل آتش ہیں، اور ہمیشہ وہاں رہیں گے'' والذین کفروا و کذبوا بایتنا اولٰئک اصحب النار هم فیها خلدون''۔ جب کہ بعض دوسری قرآنی آیتوں میں ''خلود'' کے لفظ کے بعد ''ابدیت'' کا لفظ بھی آیا ہے جو اس کی زیادہ تاکید کے لئے ہے، اسی طرح فرماتا ہے: جس نے خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اس کے لئے آتش دوزخ ہے، وہ جاوداں طور پر ابد تک وہاں رہے گا'' ومن یعص الله ورسوله فان له نار جهنم خلدین فیها ابدا''۔ (سورہ جن ۲۳)

یہی مفہوم سورہ احزاب کی آیت ۶۵ میں بھی ہے اور ''خلود'' کا ابدیت کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔

آگ کے بارے میں ''خلود'' کی عبارت قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں آئی ہے، کبھی وصف کی صورت میں ''خلدون، خلدین'' اور کبھی فعل کی صورت میں جیسا کہ سورہ فرقان کی آیت ۶۹ میں مشرکوں، قاتلوں اور زنا کاروں کے قیامت میں کئی گنا عذاب کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ان کے بارے میں فرماتا ہے:

''ویخلد فیه مهانا''

ہمیشہ رسوائی سے وہاں رہے گا۔

کبھی یہ عنوان عذاب کے لئے قید کے طور پر بیان ہوا ہے جیسا کہ سورہ یونس کی آیت ۵۲ میں ہے:

"ثم قیلاللذین ظلموا ذوقوا عذاب الخلد"

پھر ظالموں سے کہا جائے گا، چکھو ہمیشہ عذاب۔

جہنم کے عذاب کے بارے میں خلود کی تعبیر مختلف عبارتوں (فعلی، مصدری، وصفی) میں تیس بار سے زیادہ قرآنی آیات میں آئی ہے اور اس عنوان پر قرآن کی اس قدر تاکید کا ایک خاص مفہوم ہے جس کی دلیل آئندہ کی بحثوں میں انشاء اللہ واضح ہوگی، البتہ بہشتی نعمتوں کے بارے میں بھی بہت سی قرآنی آیتوں میں یہ لفظ آیا ہے جس کی طرف بہشتی نعمتوں کی بحث میں اشارہ ہو چکا ہے،

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ لغت اور مفسرین کے کلام میں ''خلود'' کس معنی میں آیا ہے؟ لسان العرب میں ''خلد'' کی تفسیر ایسی سرائے سے کی گئی ہے جہاں انسان کا قیام دائمی ہے اور وہ وہاں سے نکل نہیں سکتا، مزید کہا گیا ہے کہ آخرت کو ''دار الخلد'' اس لئے کہا گیا ہے کہ لوگ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔

مقائیس اللغہ میں اس لفظ کی اصل کے لئے ایک ہی معنی ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے ثبات، بقا، اور ملازمہ (لازم و ملزوم ہونا)، یہی معنی ''صحاح اللغۃ'' اور دوسری کتابوں میں بھی آیا ہے۔

لیکن راغب نے مفردات میں اس کی اصل کو کسی چیز کے خراب ہونے سے محفوظ رہنے اور اپنی اصلی حالت پر باقی رہنے کے معنی میں قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ہر وہ چیز جو جلد متغیر نہ ہو اور خراب نہ ہو جائے عرب اس کی خلود سے توصیف کرتے ہیں، اسی لئے طول عمر اور لمبی مدت تک بقاء کے معنی میں بھی آیا ہے۔

''راغب'' اپنے کلام میں ایک اور جگہ کہتا ہے کہ ''رجل مخلد'' (جاوداں مرد) دیر سے بوڑھا ہونے والے مرد کو کہتے ہیں۔

بہر حال ارباب لغت کی عبارت سے مجموعی طور پر دو مختلف اقوال سامنے آتے ہیں، پہلا قول یہ کہ اس کا اصلی معنی جاودانی، ہمیشگی اور ابدیت ہے اور اگر طول عمر پر اس کا اطلاق ہوتا ہے تو تشبیہہ کے باب سے ہے، دوسرا قول یہ کہ اس کا اصلی معنی طول عمر ہے اور اگر جاودانگی اور ابدیت کو بھی خلد کہا جاتا ہے تو اس وجہ سے ہے کہ یہ اس کا واضح اور روشن مصداق ہے۔

اس بارے میں مفسرین نے بھی مختلف باتیں کی ہیں۔

بعض مفسرین نے تصریح کی ہے کہ یہاں پر ''خلود'' دوام کے معنی میں ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔[1]

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ اس کا اصلی معنی دوام اور مجازی معنی طولانی مدت ہے اور جب قرآن میں استعمال ہوتا ہے تو پہلے معنی یعنی

---

[1] مجمع البیان میں طبرسی نے۔

دوام کے معنی میں ہے۔[۱]

بعض نے اسی مفہوم کو ایک اور عبارات میں یوں بیان کیا ہے کہ خلود الغت میں طولانی مدت تک ٹھہرنے کے معنی میں ہے جیسا کہ طویل المدت قید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "خلد فلان فی السجن" لیکن شریعت کی زبان میں دوام اور ابدیت کے معنی میں ہے۔ [۲]

تفسیر المنار میں آیت ہے کہ عصر حاضر کے فکری استقلال کے بعض مدعی خلود کے بارے میں گذشتہ علماء کے بعض کلام میں استعمال ہونے والی تاویلوں سے استفادہ کرتے ہوئے جرات سے یہ کہنے لگے ہیں کہ کافروں کے عذاب میں خلود کا معنی یہ ہے کہ وہ طولانی مدت تک وہاں رہیں گے کیونکہ خداوند رحمن ورحیم، جس کی رحمت اس کے غضب پر مقدم ہے، ہرگز اپنے بندوں میں سے کسی کو لامتناہی عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔[۳]

بعض کہتے ہیں: اگر چہ سرکشی کرنے والے کافروں اور سرکش جنوں کا پوداوجود گناہوں میں گھرا ہوا ہے ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، لیکن دوزخ ہمیشہ ایک حالت پر باقی نہ رہے گی بلکہ ایک وقت وہ بھی آئے گا جب اس کی آگ بجھ جائے گی اور جہنمیوں کو آرام میسر آئے گا۔

اس احتمال کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ لمبی مدت گزرنے اور بہت زیادہ سزائیں برداشت کرنے کے بعد ان کے اور جہنم کے ماحول کے مابین ایک طرح کی ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی اور وہ آہستہ آہستہ آگ کے عادی ہو جائیں گے جس سے تکلیف کا احساس جاتا رہے گا۔

البتہ علمائے اسلام اور مفسرین قرآن نے اس طرح کے احتمالات کو رد کر دیا ہے چونکہ یہ قرآن کی صریح آیتوں کے خلاف ہیں کیونکہ جیسا کہ زیر بحث آیتوں میں ہم نے دیکھا ہے صرف خلود کی تعبیر نہیں آئی جس کی اس طرح سے تفسیر کی جائے بلکہ قرآن مجید میں اس بارے میں دوسرے الفاظ بھی آئے ہیں جن کی اس طرح توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ (توجہ کیجئے گا)

المختصر یوں لگتا ہے کہ بعض لوگ عذاب کی جاودانی اور خلود کا مسئلہ حل کرنے میں جب ناکام ہوئے تو اس طرح کی توجیہات کرنے لگے ہیں ورنہ مجرموں کی ایک جماعت پر عذاب کی ہیشگی کے بارے میں قرآنی آیات اور اسلامی روایات کی دلالت قابل بحث نہیں ہے۔

دوسری تعبیر میں لفظ "اقامت" کا ذکر ہوا ہے، فرمایا گیا ہے: کافروں کی خواہش ہوگی کہ وہ آگ سے نکل سکیں لیکن ہرگز نکل نہ سکیں گے اور ان کے لئے عذاب "مقیم" اور پائیدار عذاب ہوگا "یریدون ان یخرجوا من النار وما هم بخرجین منها ولهم عذاب مقیم"۔

عذاب کی "مقیم" سے توصیف یہ ظاہر کرتی ہے کہ اُن کے لئے یہ سزائیں پائیدار اور برقرار ہوں گی۔

---

[۱] تفسیر قرطبی جلد ۱ صفحہ ۲۰۷۔

[۲] تفسیر مراغی، جلد ۱ صفحہ ۶۹۔

[۳] تفسیر المنار، جلد ۱ صفحہ ۳۶۴،

عذاب کی ابدیت:

تیسری آیت میں دوزخیوں کی ایک جماعت کے لئے عذاب دوزخ کی ابدیت ایک اور عبارت میں زیادہ صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: لیکن جو لوگ شقاوت والے ہوں گے جہنم کی آگ میں ہوں گے اور ان کے لئے زفیر اور شہیق (طولانی گریہ وزاری) ہے، ہمیشہ وہاں رہیں گے جب تک زمین وآسمان قائم ہیں "فاما الذین شقوا ففی النار فیها زفیر و شهیق۔ خلدین فیها ما دامت السموت والارض"۔

اور آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: مگر جو تمہارا پروردگار چاہے، مسلماً تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے "الا ما شآء ربک ان ربک فعال لمایرید"۔

(مسلماً اس روز آسمان اور زمین ہوں گے اور وہ ایسی زمین اور ایسا آسمان ہوگا جو قرآنی آیات کے مطابق دنیا کے آسمان اور زمین کی بربادی کے بعد قائم ہوا ہوگا اور یہ زمین وآسمان جاوداں اور ابدی ہوں گے)۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ عبارت عربی زبان میں ابدیت کے لئے کنایہ ہے کیونکہ عربی گرائمر میں بہت سی ایسی تعبیریں ہیں جو ابدیت کے معنی میں استعمال ہوتی ہیں مثلاً "مالاح کوکب" (جب شب وروز بے در بے گذر جائیں) اور ان عبارتوں کی طرح جو امیر المومنین علی علیہ السلام کے کلام میں آئی ہیں، جب جاہل منتقدوں نے بیت المال کی مساوی تقسیم پر آنحضرتؑ پر اعتراض کیا جب کہ انہیں توقع تھی کہ خلیفہ سوم کے زمانے کی طرح وہ بھی افراد کے مابین تبعیض برتیں تا کہ اس طرح سے ان کی حکومت کی بنیادیں مضبوط ہوں تو امام نے فرمایا: "اتآ مرنی ان اطلب النصر بالجور فیمن ولیت علیه والله لا اطوربه ماسمر سمیر وما ام نجم فی السمآء"[1] (کیا تم مجھے حکم دیتے ہو کہ میں اپنی کامیابی کے لئے ان لوگوں پر ظلم کروں جو میری حکومت کے سائے میں ہیں؟ خدا کی قسم میں ایسا نہیں کروں گا جب تک لوگ راتوں کو بحث کیا کرتے ہیں اور آسمان کے ستارے ایک دوسرے کے بعد طلوع اور غروب ہوتے ہیں)۔

دوسری زبانوں کی گرائمر میں بھی اس سے مشابہ تعبیریں نظر آتی ہیں جو دوام، استمرار اور ابدیت کے لئے کنایہ ہیں۔

یہاں پر جو واحد سوال باقی ہے وہ یہ ہے کہ اگر مندرجہ بالا آیت سزاؤں کی ابدیت کی طرف اشارہ ہے تو آیت کے آخر میں مذکورہ استثناء کا کیا مفہوم ہوسکتا ہے "الا ما شاء ربک"، "مگر جو تمہارا پروردگار چاہے" کیونکہ اس استثناء کا کم از کم ظہور یہ ہے کہ ان میں سے ایک گروہ کا عذاب ابدی اور دائمی نہ ہوگا بلکہ یہ احتمال بھی ہے کہ اس استثناء میں وہ سب شامل ہوں، تب اس کا نتیجہ بالکل برعکس ہوگا۔

عظیم مفسر علامہ طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں اور بعض دوسرے مفسرین نے اس استثناء کے لئے بزرگ مفسروں سے دس صورتیں نقل کی ہیں، لیکن چونکہ ان میں سے بہت سی صورتیں غیر معتبر ہیں لہٰذا ہم اُن کا ذکر نہیں کریں گے، (طبرسی مرحوم نے بھی ظاہراً تمام اقوال ذکر کئے

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۶،

ہیں نہ یہ کہ انہیں قبول کیا ہے) ہم ان دلائل پر قناعت کریں گے جو قابل ذکر ہیں۔

پہلی صورت یہ کہ اس استثناء کے ذکر کا مقصد خدا کی قدرت مطلقہ، حاکمیت اور مشیت کاملہ کا بیان ہے وہ یہ کہ تم لوگ یہ نہ سوچنا کہ یہ خلود اور ابدیت اس کے ارادے کے بغیر وجود میں آئی ہے، اگر وہ چاہے تو ہر چیز کو تبدیل کر سکتا ہے لیکن اس کا ارادہ ہے کہ دوزخیوں کا یہ گروہ ابد تک اسی میں رہے، لہٰذا بہشتیوں کے بارے میں یہی عبارت اس سے پہلی آیت میں بھی آئی ہے اور اس کے بعد فرماتا ہے: ''عطآء غیر مجذوذ'' (یہ ایسی عطا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی)۔

اس جملے سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ استثناء سے مراد نعمت یا عذاب کا ختم ہونا نہیں ہے بلکہ صرف خدا کی طاقت کا بیان مقصود ہے۔

دوسری یہ کہ استثناء سے مراد وہ لوگ ہیں جو جاودانہ عذاب کے مستحق نہیں ہیں، ان گنہ گار مومنوں کی طرح جو کچھ عرصے تک جہنم میں رہ کر پاک ہوں گے پھر بہشت میں چلے جائیں گے اور ''الا ماشاء ربک'' کا جملہ اس گروہ کی طرف اشارہ ہے، لیکن بے ایمان کافر اسی طرح دوزخ میں باقی رہیں گے (اور عربی ادب کی اصطلاح کے مطابق وہ لوگ مستثنیٰ میں سے نہیں بلکہ مستثنیٰ منہ میں سے ہیں)۔

اسی سے مشابہ مفہوم بہشتیوں کے بارے میں بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ بہشت میں ہوں گے سوائے گنہگار مومنوں کے جو پہلے دوزخ میں جائیں گے اور بعد میں بہشت میں چلے جائیں گے، بہرحال اس استثناء سے عذاب کی ابدیت پر آیت کی دلالت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

چوتھی آیت میں مسئلہ خلود اور مجرموں کے عذاب میں عدم تخفیف پر تصریح کرتے ہوئے صراحت سے بیان فرماتا ہے کہ خدا نے ان پر کوئی ظلم روا نہیں رکھا بلکہ انہوں نے خود ہی اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، پھر ارشاد ہوتا ہے: وہ چیخیں گے کہ اے (جہنم کے) مالک! کاش تمہارا پروردگار ہمیں موت دے دیتا (تاکہ ہمیں آرام ملتا) لیکن وہ کہے گا: تم لوگ یہیں پر مکث کرتے ہوئے رہو گے ''ونادوا یملك لیقض علینا ربك قال انكم ماكثون''۔

کلمہ ''مکث'' مطلق اور غیر محدود طور پر ان کے عذاب کے دوام پر ایک اور دلیل ہے،[1] اس لئے طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں تصریح کی ہے کہ یہاں پر ''ماکثون'' دائمون کے معنی میں ہے۔

اگرچہ مندرجہ بالا آیت میں یہ بیان نہیں ہوا کہ دوزخ کا مالک یہ بات فوراً کہہ اُٹھے گا یا کچھ مدت کے بعد لیکن کچھ مفسرین نے کہا ہے کہ یہ جواب کچھ تاخیر کے ساتھ، بے اعتنائی کے لئے ساتھ اور تحقیرانہ انداز میں دیا جائے گا، بعض نے کہا ہے کہ یہ جواب چالیس سال بعد انہیں دیا جائے گا اور بعض نے کہا ہے سو سال کے بعد جواب دیا جائے گا، اور ابن عباسؓ سے نقل ہوا ہے کہ ہزار سال کے بعد ان کو یہ جواب دیا

---

[1] مکث کا معنی انتظار کی حالت میں باقی رہنا ہے (جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے) البتہ عارضی طور پر ٹھہرنے کو بھی مکث کہا جاتا ہے، لیکن جب یہ لفظ مطلق طور پر کسی قید اور شرط کے بغیر ذکر ہوتا ہے تو دائمی طور پر ٹھہرنے اور باقی رہنے کے معنی میں ہوتا ہے۔

جائے گا[1]، تا کہ وہ زیادہ انتظار کی حالت میں رہیں اور انہیں اذیت پہنچے اور ان کی زیادہ تحقیر کی جائے۔

اس آیت س بخوبی پتہ چلتا ہے کہ وہاں پر موت نہیں ہوگی بلکہ وہاں وہ ہمیشہ زندہ اور تکلیف اور عذاب میں ہوں گے۔

پانچویں اور آخری آیت میں مطلق طور پر ''دوزخ سے عدم خروج'' کا تذکرہ ہوا ہے جو دوسرے الفاظ میں دوام ہی ہے، اس آیت میں ''گمراہ کرنے والے رہبروں کی اپنے گمراہ پیروکاروں سے بیزاری اور دنیا میں لوٹ آنے کی صورت میں ان پیروکاروں کی اپنے قائدین سے بیزاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: خدا انہیں اس طرح حسرت میں مبتلا کر کے ان کے اعمال دکھائے گا اور وہ آگ سے ہرگز نکل نہ سکیں گے'' كذلك يريهم الله اعمالهم حسرت عليهم وما هم بخرجين من النار ''۔

جی ہاں! وہ اپنی گذشتہ زندگی پر حسرت کرنے کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں، گمراہ راہنماؤں کی اندھی تقلید اور آنکھ اور کان بند کر کے ان کی پیروی کرنے پر حسرت، اپنی فضول گزاری ہوئی زندگی پر حسرت، حرام سے دولت جمع کر کے آخر میں دوسروں کے لئے چھوڑ آنے پر حسرت اور توبہ و بازگشت کے مواقع گنوا دینے پر حسرت، لیکن ایسی حسرت جو فضول اور بے فائدہ ہے کیونکہ تلافی اور برگشت کے راستے اب باقی نہیں رہے۔

علامہ طباطبائی مرحوم نے المیزان میں اس آیت کے ذکر کے بعد فرمایا ہے کہ یہ ان لوگوں کے خلاف ایک دلیل ہے جو دوزخ کے عذاب کے بند ہونے کے معتقد ہیں۔

نتیجہ:

مندرجہ بالا پانچ آیات س بخوبی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دوزخ کا عذاب جاوداں ہے جیسے بہشت کی نعمتیں جاوداں ہیں اور جن لوگوں نے خود سے پہلے فیصلہ کرتے ہوئے عذاب کے انقطاع کا عقیدہ اختیار کر لیا ہے ان کے سامنے ان آیات اور (ان سے مشابہ دوسری آیتوں) کے خلاف بولنے اور تفسیر بالرائے کے علاوہ کوئی راستہ باقی نہیں بچتا۔

یہ صحیح ہے کہ عذاب کی جاودانی پر اعتقاد رکھنے میں کچھ مشکلات اور پیچیدگیاں ہیں، اگرچہ دوزخیوں کے کسی خاص گروہ کے بارے میں ہوں لیکن اس بارے میں آیات کے ظہور یا ان کی صراحت کے پیش نظر ان پیچیدگیوں کو منطق اور استدلال کے راستے سے حل کرنا چاہیے نہ کہ اصل موضوع ہی کو نظرانداز کرتے ہوئے اس کا انکار کر دینا چاہیے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۷ صفحہ ۲۲۷، تفسیر قرطبی جلد ۹ صفحہ ۵۹۳۷، تفسیر مجمع البیان میں بھی چالیس سال اور ہزار سال والی بات نقل کی گئی ہے۔

چند وضاحتیں:

کون لوگ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے:

قرآن مجید میں کچھ افراد یا اقوام کا خصوصی طور پر نام لیا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

۱۔ کافرین:

چاہے مبداء اور معاد کے منکر ہوں یا مشرک ہوں یا آیات الٰہی کو جھٹلانے والے ہوں یا خدا اور پیغمبر کے دشمن ہوں یا مرتد ہوں جن کا قرآن کی مختلف آیتوں میں ''جہنم میں ہمیشہ رہنے والے افراد'' کی حیثیت سے ذکر آیا ہے، مثلاً سورہ آل عمران کی آیت ۱۱۶ میں یوں آیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْھَا خٰلِدُوْنَ۝۱۱۶

جو لوگ کافر ہوئے ہیں انہیں ان کے اموال اور بچے ہرگز خدا سے بے نیاز نہیں کر سکتے، وہ اہل آتش میں سے ہیں اور وہاں ہمیشہ رہیں ہے۔[1]

۲۔ منافقین:

اگر چہ ظاہری طور پر اہل ایمان کی صفوں میں اور مومنین کے زمرے میں ہوں لیکن وہ بھی ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہیں گے جیسا کہ سورہ مجادلہ کی آیت ۱۷ میں انکے بعض اعمال اور کردار کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَـيْـــًٔا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝۱۷

اُن کی اولاد اور اموال ہرگز انہیں الٰہی عذاب سے نہیں بچا سکتے وہ اہل دوزخ میں سے ہیں اور ہمیشہ وہیں

---

[1] قرآن میں بہت زیادہ آیتیں اسی مفہوم کی ہیں مثلاً سورہ اعراف کی آیت ۳۶ جس میں آیات الٰہی کو جھٹلانے والوں کے بارے میں گفتگو ہے، سورہ بینہ کی آیت ۶ میں مشرکوں اور اہل کتاب کو مخلد قرار دیا گیا ہے، سورہ توبہ آیت ۱۷ میں مشرکوں کے خلود کے بارے میں گفتگو ہے، سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۷ اور سورہ آل عمران کی آیت ۸۸ میں خاص طور پر مرتد افراد کے بارے میں بات کی گئی ہے اور سورہ فصلت آیت ۲۸ میں خدا کے دشمنوں کے جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہنے کی طرف اشارہ ہے۔

رہیں گے۔

سورہ نساء کی آیت ۱۴۰ میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ﴿۱۴۰﴾

خدا تمام منافقوں اور کافروں کو جہنم میں جمع کرے گا۔

۳۔ جو لوگ گناہوں میں غرق ہوں گے:

سورہ بقرہ کی آیت ۸۱ میں گنہگاروں کی ایک جماعت کے بارے میں ایک بہت پر معنی عبارت آئی ہے، فرمایا گیا ہے:

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۸۱ ﴿البقرة: ۸۱﴾

جی ہاں! جو لوگ گناہ انجام دیں اور گناہ کے آثار اُن کے تمام وجود پر چھا جائیں وہ لوگ اہل آتش ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

اسی سے ملتا جلتا مفہوم سورہ یونس کی آیت ۲۷ میں بیان ہوا ہے ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَاۗءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۲۷ ﴿یونس: ۲۷﴾

جو لوگ گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں اسی مقدار میں سزا کے مستحق ہیں اور انہیں ذلت و رسوائی دبوچ لے گی اور کوئی چیز انہیں الٰہی سزاؤں سے نہیں روک سکتی، گویا ان کے چہروں کو ظلمانی رات کے تھوڑے سے حصے نے چھپا لیا ہے وہ اہل آتش میں سے ہیں اور ہمیشہ وہاں رہیں گے۔

کیا باایمان افراد گناہان کبیرہ کی وجہ سے عذاب الٰہی میں ہمیشہ رہیں گے یا نہیں؟ اس بارے میں ایک تفصیلی بحث ہے جو انشاء اللہ ان آیات کی تفسیر کے بعد بیان کی جائے گی۔

۴۔قاتلین:

قرآن کی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عمداً قتل کا ارتکاب کرنے والے بھی جاوداں عذاب کا شکار ہوں گے جیسا کہ سورہ نساء کی آیت ۹۳ میں بیان ہوا ہے:

وَمَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۤؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيۡهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا ۹۳ ﴿النساء: ۹۳﴾

جو بھی کسی مومن فرد کو عمداً قتل کر ڈالے اس کی سزا جہنم ہے، وہ ہمیشہ وہاں رہے گا اور خدا اُسے عذاب کرے گا اور اس کو اپنی رحمت سے دور کر دے گا اور اس کے لئے خدا نے عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے۔

یہاں پر عمداً قتل کرنے والوں کے لئے چار قسم کی سزائیں بیان ہوئی ہیں، جہنم میں خلود، غضب الٰہی، لعنت اور خدا کی رحمت سے دور اور ان کے لئے عذاب عظیم کا آمادہ کرنا۔

کیا یہ سزائیں صرف اس صورت میں ہیں جب وہ توبہ اور تلافی نہ کریں یا ہر صورت میں وہ ان میں مبتلا ہوں گے؟ دوسرا احتمال بہت بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ جب شرک جیسے بزرگ ترین گناہ توبہ سے برطرف ہو سکتے ہیں اور مشرکین اسلام قبول کرنے کے بعد بخش دیئے جا سکتے ہیں تو ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ قتل نفس اس سے بھی بڑا گناہ ہے؟

اس کے علاوہ تاریخ اسلام میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب کے قاتل ''وحشی'' کو پیغمبر اکرمؐ نے معاف کر دیا تھا اور اس کی توبہ قبول کر لی تھی، بہت سے دوسرے مسلمانوں نے بھی اپنے بیٹوں، بھائیوں اور والدین کے قاتلوں کو ان کے اسلام قبول کرنے اور توبہ کرنے کے بعد معاف کر دیا تھا، البتہ یہ مسلم ہے کہ ایسے عظیم گناہوں سے توبہ کرنا آسان کام نہیں ہے اور صرف استغفر اللہ کہنے سے تمام امور حل نہیں ہو جاتے بلکہ اسے اپنے آپ کو قصاص کے لئے پیش کرنا پڑے گا یا مقتول کے وارثوں کو دیت وغیرہ کے ذریعے راضی کرنا پڑے گا اور اپنے آئندہ کے اعمال سے اپنے ماضی کے اعمال کی تلافی کرنا ہوگی۔

پیغمبر اکرمؐ سے مروی ایک روایت میں ہے:

لزوال الدنیا وما فیھا اھون علی اللہ من قتل مومن ولو ان اھل سماواتہ واھل ارضہ اشتر کوا فی دم مومن لا دخلھم اللہ تعالی النار۔

کسی مومن کے قتل سے دنیا و مافیہا کی نابودی خدا کے نزدیک زیادہ آسان ہے اور اگر اہل زمین و آسمان کسی مومن کا

خون بہانے میں شریک ہوں تو خدا ان سب کو آگ میں داخل کر دے گا۔[1]

یہ کیسے ممکن ہے کہ عمداً قتل کرنے والا ہمیشہ دوزخ میں رہے جب کہ آئندہ کی ابحاث میں یہ واضح ہوگا کہ صرف کافر ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، اس بارے میں مفسرین نے مختلف جوابات دیئے ہیں۔

کبھی یہ کہا گیا ہے کہ ایسے افراد توبہ کرنے کی توفیق ہی نہیں پا سکتے یا بہت کم انہیں توبہ کرنے کی توفیق ملتی ہے، وہ اپنی عمر کے آخری حصے میں بے ایمانی کی حالت میں دنیا سے چلے جاتے ہیں، اسی لئے وہ ہمیشہ جہنم میں رہنے کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

کبھی کہا گیا ہے کہ یہ ایسے لوگوں کی سزا ہے جو عمداً قتل کرنے کے حرام ہونے کا انکار کرتے ہوئے اس کا ارتکاب کریں اور یہ امر خود کفر کا موجب ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں خلود سے مراد عذاب کی جاودانی نہیں ہے بلکہ طولانی مدت ہے، لیکن پہلی اور دوسری تفسیر زیادہ مناسب لگتی ہیں۔

۵۔ سود خور:

قرآنی آیتوں میں سود خوروں کو بھی ہمیشہ کے عذاب کی تہدید کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهِ فَانْتَهٰى فَلَهُ مَا سَلَفَ ۚ وَأَمْرُهُ إِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَنْ عَادَ فَأُولٰئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ﴿البقرة: ۲۷۵﴾

جس شخص تک خدا کا موعظہ پہنچ جائے اور وہ (سود خوری سے) بچے، جو فائدہ وہ (تحریم کے حکم کے نزول سے) پہلے حاصل کر چکا تھا وہ اسی کا ہے اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہوگا لیکن جو لوگ لوٹ جائیں اور اس گناہ کا ارتکاب کریں وہ اہل آتش ہوں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ (بقرہ: ۲۷۵)

یہاں پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ جماعت کیسے، ہمیشہ آگ میں رہے گی جب کہ صرف گناہ کبیرہ ہی عذاب جاوداں کا موجب نہیں ہے۔

اس سوال کا جواب یہاں پر زیادہ آسان ہے کیونکہ آیت کے تین میں (پہلے کے جملوں میں) سود کی حرمت کے منکرین کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے جو لوگ کہتے تھے کہ سود اور فروخت میں کیا فرق ہے؟ اور خدا نے کیسے ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام قرار دیا ہے؟ جب کہ ان دونوں کے مابین فرق واضح تھا کیونکہ خرید و فروخت تجارت اور اس سے مشابہ امور معاشرے کے فائدے میں ہیں اور صحیح اقتصادی فعالیت

---

[1] تفسیر روح المعانی، جلد ۵ صفحہ ۱۰۴۔

محسوب ہوتے ہیں، لیکن سود خوری معاشرے کے لئے نقصان کے علاوہ کچھ نہیں جس کے بارے میں تفصیلی بحث ہے اور ہم نے اس کے اپنے مقام پر اس بارے میں گفتگو کی ہے۔

۶۔ظالمین:

ایک اور گروہ جسے قرآن مجید نے جاوداں عذاب کا مستحق قرار دیا ہے وہ ظالموں کا گروہ ہے، جیسا کہ سورہ شوریٰ کی آیت ۴۵ میں ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ۴۵﴿الشوری: ۴۵﴾

جو لوگ ایمان والے ہوں گے وہ کہیں گے: واقعا نقصان اٹھانے والے لوگ وہ ہوں گے جو اپنے آپ سے اور اپنے خاندان والوں سے محروم ہو جائیں گے، آگاہ رہو ظالم ہمیشہ کے عذاب میں رہیں گے۔

اس عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ظلم کا انجام جہنم کی آگ میں ہمیشہ کے لئے رہنا ہے اس سے پہلے کی آیتوں میں بھی بار ہا ظالموں کے عذاب الیم کی طرف (شوری، ۴۲ میں) اور آتش دوزخ میں ان کی دردناک پشیمانی پر (شوری، ۴۴ میں) اشارہ کیا گیا ہے۔

کیا یہاں پر ظلم سے مراد خدا کے بندوں اور مستضعفوں پر ظلم ہے؟ یا مراد اپنے آپ پر ظلم اور شرک کی طرف مائل ہونا ہے کیونکہ سورہ لقمان کی آیت ۱۳ کے مطابق شرک ''ظلم عظیم'' ہے اور سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۴ میں ہے:

والکفرین هم الظالمون۔

کفار ظالم ہی ہیں۔

کچھ مفسرین نے دوسرے معنیٰ کو ترجیح دی ہے اور شاید ''قال الذین امنوا'' بھی اسی بات پر گواہ ہو کہ کفار کے ہاتھوں بہت زیادہ ظلم سہنے والے مظلوم مومن قیامت کے دن اس طرح کی بات کریں گے۔

سورہ حشر کی آیت ۱۷ میں بھی شیطان اور اس کے ساتھیوں کے ہمیشہ جہنم میں رہنے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

و ذلك جزآئو الظلمین

یہ ہے ستمگروں کی سزا۔

لیکن اس بات کے پیش نظر کہ یہاں پر شیطان اور اس کے کافر پیروکاروں کے بارے میں بات ہو رہی ہے اور اس سے پہلے والی آیت سے بھی یہ مفہوم واضح ہو چکا ہے ''کمثل الشیطان اذا قال للانسان اکفر فلما کفر قال انی بری منک'' (ان کا کام شیطان کی

طرح ہے جس نے انسان سے کہا: کافر ہوجاؤ تا کہ تمہاری مشکلات حل کروں لیکن جب وہ کافر ہوگیا تو اس نے کہا: میں تم سے بیزار ہوں) یہاں پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس آیت میں ظلم سے مراد اس کا کامل ترین مصداق یعنی کفر ہے۔

۷۔ ہلکے اعمال والے:

قرآن کی بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن میزان عمل کا بھاری ہونا نجات وسعادت کی علامت ہے اور میزان عمل کا ہلکا ہونا جس کا مطلب اعمال کا بے قیمت ہونا ہے جہنم کی آگ میں خلود کا باعث ہے، سورہ مومنون کی آیت ۱۰۲ اور ۱۰۳ میں ہے:

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴿۱۰۲﴾ [۲۳:۱۰۲] وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ﴿۱۰۳﴾ [۲۳:۱۰]

وہ لوگ جن کے (اعمال کے) پلڑے بھاری ہوں گے وہ کامیاب ہیں اور جن لوگوں کے اعمال کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہ ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے وجود کا سرمانہ ضائع کر دیا اور وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

''خسروا انفسھم'' (اپنے وجود کا سرمایہ ضائع کر دیا ہے) کی عبارت اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ انسان کا سب سے بڑا سرمایہ اس کی ہستی، عمر اور اس کی حیات ہے اور اس جماعت نے دنیا کے بازار تجارت میں اُسے ضائع کر دیا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی قابل قدر چیز حاصل نہیں کی، ممکن یہ عبارت بھی کافروں کی طرف اشارہ ہو کیونکہ اگر کوئی باایمان ہو چاہے جتنا بھی گناہ کرے پھر بھی اس کے میزان عمل میں کچھ باقی ہوگا اور وہ بالکل بے وزن نہیں ہوگا، کیونکہ صرف ایمان اور عقائد حقہ کا بھی اچھا خاصہ وزن ہوتا ہے، بنابریں اس جماعت کے میزان عمل کا ہلکا ہونا اور کسی بھی قسم کے حسنہ سے خالی ہونا ان کے کفر کی دلیل ہے جیسا کہ سورہ کہف کی آیت ۱۰۵ میں ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۱۰۵﴿الکھف:۱۰۵﴾

وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں اور اس سے لقاء کا انکار کیا ہے، اس لئے اُن کے اعمال ضائع ہو گئے، لہذا ہم قیامت کے دن ان کے لئے کوئی میزان برپا نہیں کریں گے۔

۸۔ عام گنہگار لوگ:

کچھ آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ مطلقاً گنہگار لوگ ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہیں گے جیسا کہ سورہ جن کی آیت ۲۳ میں ہے۔

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا۲۳

۲ الجن: ۲۳

جو بھی خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا مسلما جہنم کی آگ اس کے لئے ہے وہ ہمیشہ اس میں رہے گا۔

یہی مفہوم کچھ اضافات کے ساتھ سورہ نساء کی آیت ۱۴ میں بھی ہے:

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۱۴ ﴿النساء: ۱۴﴾

تجاوز کرے گا اس کو ایسی آگ میں ڈالا جائے گا جس میں وہ ہمیشہ کے لئے رہے گا اور اس کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔

اسی سے مشابہ عبارت سورہ زخرف کی آیت ۷۴ میں بھی آئی ہے، فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۷۴ ﴿الزخرف: ۷۴﴾

مجرم لوگ جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔

لیکن اس بات کے پیش نظر کہ سابقہ آیات (سورہ جن آیہ ۲۰) میں پیغمبر اکرمؐ کی توحید کی طرف دعوت اور شرک کے خلاف جہاد کی دعوت تھی اور اس کے بعد کی آیت (سورہ جن آیت ۲۴) میں مکہ کے مشرکوں کی باتیں نقل ہوئی ہیں جب انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے مددگاروں کے نہ ہونے کی بناء پر اُن کی سرزنش کی تھی لگتا ہے کہ یہاں پر عصیاں سے مراد عورت توحید کا ترک کر دینا اور شرک وکفر کی طرف مائل ہونا ہے، بنا بریں تمام گناہ گاروں کے ہمیشہ آتش دوزخ میں رہنے پر کسی طرح کی دلالت نہیں پائی جاتی۔

سورہ زخرف کی آیت ۷۴ میں بھی اسی مطلب پر قرینہ پایا جاتا ہے کیونکہ وہاں پر ان لوگوں کے بارے میں گفتگو ہے جو حق سے دشمنی رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ خدا اُن کی ڈھکی چھپی گفتگو اور رازوں کے بارے نہیں نہیں جانتا یہ خود کفر کی علامت ہے (توجہ کیجئے گا)۔

لہٰذا بہت سے مفسرین نے زیر بحث آیت کی تفسیر میں تصریح کی ہے کہ مراد توحید میں عصیان کرنا ہے۔[1]

لیکن یہ احتمال بہت بعید معلوم ہوتا ہے کہ خلود سے مراد طولانی عذاب ہو، کیونکہ ''خلود'' کی ''ابدا'' کے ساتھ تاکید اس بات کی دلیل ہے کہ مراد عذاب الٰہی کی جاودانی ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۹، ۱۰ صفحہ ۳۷۳۔ المیزان جلد ۲۰ صفحہ ۵۲۔ روح البیان جلد ۱۰ صفحہ ۲۰۰۔ روح المعانی جلد ۲۹ صفحہ ۹۴ سے رجوع کیجئے۔

نتیجہ:

مندرجہ بالا آٹھ موارد سے ہم جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہنے والوں کے بارے میں قرآن کی رائے جان چکے، لیکن اُن آیات پر ایک اجمالی نگاہ ڈالنے سے یہ نکتہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ مسلم امر یہ ہے کہ کفار اور بے ایمان افراد دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے لیکن تمام گنہگاروں کے بارے میں یہ امر مسلم نہیں ہے، مگر یہ کہ عصیان اور گناہ اتنا عظیم اور زیادہ ہو کہ انسان کو کفر اور ترک ایمان پر مجبور کردے یا وہ دنیا سے بے ایمانی کی حالت میں چلا جائے، مزید تفصیل عنقریب آئے گی۔

ایک سوال اور اس کا جواب:

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا گناہ کبیرہ کے مرتکبین ہمیشہ جہنم میں رہیں گے؟

مسلمانوں کی ایک جماعت جو ''وعیدیہ''[1] کے نام سے مشہور ہے، سمجھتی ہے کہ ہر گناہ کبیرہ کفر کا موجب ہوتا ہے یہ لوگ کہتے ہیں کہ گناہ کبیرہ آگ میں ہمیشہ رہنے کا باعث ہوگا، ان کے برعکس ''مرجئہ'' سمجھتے ہیں کہ اگر انسان ایمان دار ہو تو کوئی گناہ اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، (ایک جماعت افراط کر رہی ہے اور دوسری تفریط)۔

علامہ حلی مرحوم ''شرح تجرید'' میں کفار کے عذاب کے ابدی ہونے پر مسلمانوں کے اجماع اور اتفاق کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: مسلمانوں میں گناہ کبیرہ کے مرتکبین کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے ''وعیدیہ'' ان کو کفار کی مانند سمجھتے ہیں، لیکن امامیہ و معتزلہ و اشاعرہ کی ایک بڑی جماعت کا خیال ہے کہ اُن کا عذاب آخر کار ختم ہوجائے گا، پھر اس مطلب پر چند دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

شیخ مفید ''اوائل المقالات'' میں فرماتے ہیں کہ تمام علمائے امامیہ میں اتفاق نظر پایا جاتا ہے کہ صرف کفار کو جاوداں کی آگ کی تہدید کی گئی ہے لیکن نمازیوں میں سے جو لوگ ایمان دار ہیں اور فرائض الٰہی کا اقرار کرتے ہیں اگر کسی گناہ کا ارتکاب کریں تو اس تہدید میں شامل نہیں ہوں گے، ''مرجبہ'' اور محدثوں کی تمام جماعتیں اس امر پر متفق ہیں جب کہ معتزلہ نے اس قول کے خلاف اتفاق کیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ آگ میں ہمیشہ رہنے کی تہدید میں تمام کفار اور تمام فاسقین شامل ہیں۔[2]

اس جماعت نے اپنے مقصور کو ثابت کرنے کے لئے استدلال کرتے ہوئے بعض گذشتہ آیات کا سہارا لیا ہے، خصوصاً وہ آیتیں جو قتل عمد کے مرتکبین اور رباخوروں وغیرہ کے ہمیشہ جہنم میں رہنے کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، ان تمام آیتوں میں زیادہ سے زیادہ وسیع سورہ جن کی آیت ۲۳ ہے جس کی تفسیر گزر چکی ہے: ''ومن یعص اللہ ورسولہ فان لہ نار جھنم خلدین فیھا ابدا'' جو لوگ خدا اور اس کے رسول کی معصیت کریں گے اُن کے لئے جہنم کی آگ ہے اور وہاں وہ ابد تک رہیں گے لیکن خود ان آیتوں اور قرآن کی دوسری آیتوں میں بہت سے

---

[1] وعیدیہ'' خوارج کے ایک گروہ کا نام ہے۔

[2] اوائل المقالات، صفحہ ۵۳۔ پبلشر مطبوعاتی داوری۔

قرینے ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے گناہ کا انجام کفر اور معاد، مبداء یا دین کی ضروریات میں سے کسی چیز کا انکار ہو، من جملہ آیات میں سے ایک یہ ہے:

كَأَنَّمَآ أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ ٱلَّيْلِ مُظْلِمًا

گو یا اُن کے چہرے شب دیجور کے ٹکڑے سے ڈھک دئے گئے ہیں۔ (یونس، ۲۷)

اس بات کے پیش نظر کہ یہ عبارت قرآن میں کفار کے لئے آئی ہے جہاں فرمایا گیا ہے:

وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝٤٠ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝٤١ أُولَٰئِكَ هُمُ ٱلْكَفَرَةُ ٱلْفَجَرَةُ ۝٤٢

بہت سے چہروں پر اس روز گرد پڑی ہوگی، ان پر دھواں اور تاریکی چھائی ہوگی، وہ لوگ وہی فاجر کفار ہوں گے۔ (عبس، ۴۰ تا ۴۱)

معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت میں بھی مقصود کفار ہی ہیں، لہٰذا امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

یہ آیت اہل بدعت، اہل شبہات اور اہل شہوت کی طرف اشارہ ہے جن کے چہرے قیامت کے روز خدا سیاہ کر دے گا اور ذلت وحقارت کا لباس انہیں پہنائے گا، لہٰذا ان کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ اہل آتش میں سے ہیں اور وہاں ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔[1]

احاطت بہ خطیئتہ (جو گناہ انجام دے اور گناہ کے آثار اس کے تمام وجود کو ڈھک دیں) کی عبارت جو سورہ بقرہ کی آیت ۸۸ میں آئی ہے، ہمیں بتاتی ہے کہ صرف گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہی ہمیشہ کے لئے جہنم کی آگ میں رہنے کا باعث نہیں ہے، بلکہ گناہوں کا انسان کے تمام وجود پر احاطہ جو اس کو کفر کی طرف دھکیلتا ہے، اس کا باعث ہے کیونکہ جیسے روایات سے معلوم ہوتا ہے، ایمان ایک روشن نقطے کی صورت میں انسان کے دل میں ظاہر ہوجاتا ہے، جتنا وہ اعمال خیر بجالاتا ہے وہ نور اتنا ہی پھیلتا جاتا ہے جب تک اس کے پورے دل پر نہ چھا جائے اور جب بھی وہ گناہ اور برے اعمال کا ارتکاب کرتا ہے تاریکی اس کے دل کو گھیر لیتی ہے جب تک اس کے پورے قلب پر چھا نہ جائے (اور ایمان کی روشنی بجھ جاتی ہے) خصوصاً ان روایات کے بعض حصوں میں آیت "کلا بل ران علی قلوبھم ما کانو یکسبون"، (ایسا نہیں جیسا وہ سوچتے ہیں بلکہ ان کے اعمال نے (سیاہ) زنگ ان کے دلوں پر ثبت کیا ہے۔[2]) (مطففین ۱۴) ان میں سے بعض آیتوں میں "گناہ عمدی" کی عبارت آئی ہے جیسے آیہ قتل ہے، ممکن ہے اس سے مراد خدا کے فرمان کی عمدی مخالفت اور حق کے مقابلے میں عناد اور ہٹ دھرمی ہو جو کفر کے واضح ترین مصادیق میں سے ہے۔

---

[1] تفسیر علی ابن ابراہیم جلد ۱ صفحہ ۳۱۱۔

[2] اصول کافی، جلد ۲ صفحہ ۲۷۳ باب الذنوب، حدیث ۲۰۔

اس پر شاہد سورہ روم کی آیت ۱۰ ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاءُوا السُّوْآى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ۝۱۰ ﴿الروم: ۱۰﴾

پھر برے اعمال کا ارتکاب کرنے والوں کا انجام یہ ہوا کہ انہوں نے خدا کی آیتوں کا انکار کیا اور ان کا تمسخر اڑایا۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ پر اصرار اور انہیں جاری رکھنے کا انجام کبھی کفر اور آیات الٰہی کی تکذیب (اور جہنم میں خلود) بھی ہوسکتا ہے، مزید برایں آیت:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ

خدا شرک کے گناہ کو نہیں بخشتا لیکن اسے چھوٹے گناہوں میں سے جسے چاہے بخش دیتا ہے۔

دوبار سورہ نسائ (آیہ ۴۸ و ۱۱۶) میں آئی ہے۔

یہ اس حقیقت پر روشن دلیل ہے کہ صرف مشرکین قابل بخشش نہیں ہیں (کفر کی تمام قسمیں شرک سے ملحق ہیں) اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، لیکن دوسرے گناہگار قابل بخشش ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حساب کتاب کافروں سے جدا ہے اور سب کو ایک صف میں قرار نہیں دیا جاسکتا۔

یہاں پر غلط فہمی پیدا نہ ہو، یہ آیت گناہگاروں کو گناہ کی ترغیب نہیں دلاتی کیونکہ یہ آیت ان سے معافی کا قطعی وعدہ نہیں کرتی بلکہ احتمالی طور پر وعدہ کرتے ہے کیونکہ یہ چیز مشیت الٰہی پر موقوف ہے اور چونکہ مشیت الٰہی اور رضائے الٰہی اس کی حکمت سے آمیختہ ہے اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس معافی کا معیار ''قابلیت اور لیاقت'' قرار پائے۔ یہ چیز باعث بنتی ہے کہ گناہگار لوگ اپنے تمام رابطے خدا اور اس کے اولیا سے منقطع نہ کریں اور اپنی ساری کشتیاں نہ جلا بیٹھیں۔

روایات میں ہے کہ قرآن مجید کی یہ آیت اُمید بخش ترین آیات میں سے ہے جیسا کہ امیر المومنین علی علیہ السلام سے مروی ہے:

ما فی القرآن ایه ارجی عندی من هذه لایة

قرآن میں اس آیت سے زیادہ اُمید بخش کوئی اور نہیں ہے۔

زیادہ وضاحت کے لئے اس نکتے کی طرف توجہ دینا ہوگی کہ مسلما مندرجہ بالا آیت گناہ صغیرہ کے ارتکاب کی طرف اشارہ نہیں ہے کیونکہ قرآن میں گناہ کبیرہ سے اجتناب کرنے والوں سے گناہ صغیرہ کی معافی کا وعدہ کیا گیا ہے، اسی طرح توبہ کے بعد گناہ کبیرہ کی طرف بھی اشارہ نہیں ہے کیونکہ توبہ گناہوں کی بخشش حتیٰ کہ شرک کے گناہ کی بخشش کا بھی سبب ہے، اس بناء پر آیت کا یہی مفہوم باقی رہ جاتا ہے کہ شرد اور (بغیر توبہ کئے) گناہ کبیرہ کے ارتکاب کے مابین فرق رکھا جائے، پہلا گناہ قابل معافی نہیں ہے کیونکہ شرک کی صورت میں معافی کی کوئی راہ باقی

نہیں رہتی لیکن دوسرا گناہ قابل بخشش ہے لیکن نہ بغیر کسی شرط کے، بلکہ ان شرائط کے ساتھ جن کیطرف **لمن یشآء** جس کو بھی چاہے کے جملے میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ہمارے اس مدعا پر قرآن مجید کی متعدد آیتیں بھی گواہ ہیں مثلاً فرمایا گیا ہے:

''جو بھی نیک اعمال بجالائے اور ایمان دار ہو اس کو اپنے عمل کا پھل ملے گا''۔

اگر گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہی جہنم کی آگ میں داخل ہونے کا باعث ہوتا تو اعمال صالحہ کا انہیں کوئی نتیجہ نہ ملتا[1]۔ ایک اور دلیل شفاعت کے بارے میں نازل شدہ آیتیں ہیں، گناہان کبیرہ سے اجتناب کی وجہ سے گناہان صغیرہ بخش دیئے جاتے ہیں اور گناہان کبیرہ توبہ کرنے سے بخش دئے جاتے ہیں، لہٰذا شفاعت گناہ کبیرہ کے مرتکب ایسے افراد کے لئے جو توبہ نہیں کر سکے، یہ ایسے لوگ ہوں گے جن میں شفاعت کی قالبیت اگر پائی گئی تو بخش دیئے جائیں گے، اس صورت میں گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے افراد کو ہم کیسے مشرکوں کی صف میں قرار دے سکتے ہیں اور کیسے انہیں جہنم کی آگ میں ہمیشہ جلنے والوں میں شمار کر سکتے ہیں؟ حکمت الٰہی میں یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک فرد عمر بھر ایمان کی حالت میں رہے اور تمام اعمال صالحہ بجالاتا رہے لیکن کسی وقت ایک گناہ کبیرہ انجام دے بیٹھے اور اپنی عمر کے ایام میں مثلاً کسی دن جھوٹ بول دے تو نتیجہ کے طور پر ہمیشہ جہنم میں رہے، البتہ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ اس جھوٹ کی سزا نہیں پائے گا بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص کے بارے میں جاوداں عذاب کوئی معنی نہیں رکھتا، معصومینؑ سے بہت سے ایسی روایتیں مروی ہیں جو ''وعیدیہ'' کے اس دعویٰ کی نفی کرتی ہیں جس میں وہ گناہ کبیرہ کے مرتکبین کو جہنم میں ہمیشہ رہنے کا مستحق سمجھتے ہیں۔[2] حقیقت یہ ہے کہ خوارج کی یہ افراطی جماعت اپنے شدید تعصب اور ہٹ دھرمی اور آیات قرآن، احادیث نبوی و معصومین پر عبور حاصل نہ ہونے اور عقلی دلائل سے عدم توجہ کی بناء پر اس ہولناک گڑھے میں گر گئی ہے۔

حقیقت میں تمام خوارج اپنے تعصب اور نادانی کے برے نتائج کا شکار تھے جس پر بہترین گواہ تاریخ اسلام میں خوارج کی سر گذشت ہے۔

چندوضاحتیں:

عذاب کی ہمیشگی سے مربوط اعتراضات:

مجرموں کی ایک خاص جماعت کے لئے ابدی سزاؤں کے بارے میں مختلف سوالات پیش آتے ہیں جن کے بارے میں یہاں پر

---

[1] سورہ مومن، آیہ ۴۰ اور زلزال، آیہ ۷۔

[2] اس بارے میں زیادہ وضاحت کے لئے بحار الانوار، جلد ۸ صفحہ ۳۵۱ سے ۳۷۶ باب ۲۷ تک اور تفسیر فخر رازی جلد ۳ صفحہ ۱۴۴ سے رجوع فرمائیے۔

گفتگو کرنا ضروری ہے۔

ا۔ مادہ فنا پذیر ہے:

مادہ جاوداں نہیں ہوسکتا، لہٰذا ابدی جزاؤں یا ابدی سزاؤں کی پذیرش کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا، دوسرے لفظوں میں عذاب اور جزاء کی ابدیت، جسمانی مادہ کی فنا پذیری سے مطابقت نہیں رکھتی۔

اس سوال کا جواب پیچیدہ نہیں ہے، عالم میں خدا کی پاک ذات کے علاوہ کوئی چیز ذاتاً ابدی نہیں ہے بلکہ خداوندسبحان کے علاوہ سب ذاتاً فانی ہیں، بقاء صرف اس کی پاک ذات سے مختص ہے لیکن یہ چیز اس سے مانع نہیں ہوسکتی کہ امکانی موجودات اپنے غیر کی وجہ سے ابدی ہو جائیں، یعنی خدا انہیں دائمی طور پر ''ہستی'' کی امداد دے اور جب بھی وہ فرسودہ ہو جائیں دوبارہ ان کی تعمیر کرے اور فلسفی عبارت میں ''امکان بالذات'' ''وجوب بالغیر'' کے ساتھ تنافی نہیں رکھتا۔ (توجہ کیجئے گا)

بنابریں جس طرح خدا ہمیشہ دوزخ اور بہشت کو وجودی امداد دیتا رہتا ہے اور انہیں باقی اور برقرار رکھتا ہے اسی طرح بہشتیوں اور جہنمیوں کے جسم بھی اس قانون کے تحت ہیں وہ بھی خدا کی امداد کے بل بوتے پر ہمیشہ باقی رہیں گے تاکہ اپنی ابدی جزائیں اور سزائیں پاسکیں، المختصر فنا اس صورت میں ہے جب باہر سے امداد نہ پہنچے اور تعمیر تو نہ ہو۔

۲۔ کیا عرضی امور دائمی ہوسکتے ہیں؟

بعض فلاسفروں کے کلام میں یہ دیکھا گیا ہے کہ ''فلسفہ'' میں پہچانے گئے اصول اس پر دلالت کرتے ہیں کہ قسری امور (ایسے امور جو کسی چیز کی طبع اور فطرت کے خلاف ہوں) دائمی نہیں ہوسکتے، اور طبیعی موجودات میں سے ہر ایک غایت اور ہدف رکھتا ہے جس میں اس کی صلاح ہے اور اس موجود کو اسی ہدف تک پہنچنا چاہیے، دوسری طرف خداوندتعالیٰ نے تمام موجودات کو اس طرح خلق فرمایا کہ وہ اپنی ذاتی فطرت کی بناء پر اپنے اندر موجود ''خیر'' کی حفاظت کریں اور اپنے اندر نا موجود کمال کو طلب کریں مگر یہ کہ کوئی مانع اس کو روکے، یہ بھی واضح ہے کہ موانع دائمی نہیں ہوتے ورنہ آفرینش کا نظام برباد ہوجاتا، ان تمام مقدمات سے مجموعی طور پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تمام اشیاء ذاتاً اس سے ملاقات کی طالب اور مشتاق ہیں اور حق سے مخالفت عارضی پہلو ہے، جو فرد لقاء اللہ کا ذاتاً طالب ہوتا ہے خدا بھی اس سے ملاقات کا طالب ہوتا ہے اور جو بھی خدا سے ملاقات کو عارضی طور پر کسی بیماری کی وجہ سے ناپسند کرتا ہے خدا بھی اس سے ملاقات کو عارضی طور پر ناپسند کرتا ہے، لہٰذا ایک مدت کے لئے اس کو سزا دیتا ہے تاکہ اس کو اپنی بیماری سے نجات ملے اور وہ اپنی پہلی فطرت کی طرف لوٹ آئے۔[1]

ان بوتوں کا جواب بھی زیادہ مشکل نہیں ہے کیونکہ کبھی انحرافات اور خطائیں انسان کے وجود میں اس طرح رسوخ کرجاتی ہیں کہ

---

[1] اسفار جلد ۹ صفحہ ۲۴۶ (اختصار کے ساتھ) البتہ صدر المتالہین نے اس مطلب کو ایک رائے کے طور پر نقل کیا ہے اور ان کی عبارتوں سے پتہ نہیں چلتا کہ وہ قطعی طور پر اس سے متفق ہوں۔

اس کی فطرت ثانیہ کی صورت اختیار کر لیتی ہیں جس طرح اس دنیا میں بعض مجرم انحراف کے ایسے مرحلے تک پہنچ جاتے ہیں کہ اپنے جرائم سے انہیں لذت ملتی ہے اور جن امور سے انسان فطرتاً نفرت رکھتا ہے ان کے لئے وہ امور پسندیدہ واقع ہوتے ہیں جیسا کہ بعض برے، پست اور نیچ اعمال کے عادی افراد کے زندگی کے حالات میں نظر آتا ہے، جب انسان فطرت ثانیہ کے ایسے مرحلے پر پہنچ جائے تو پھر واپسی کا کوئی راستہ اس کے لئے باقی نہیں رہتا اور یہی وہ چیز ہے جس کے لئے گذشتہ آیات میں ''خطاؤں کا محیط ہونا'' کی تعبیر استعمال ہوئی ہے جو فطرت کی تبدیلی کا موجب بنتی ہے۔

۳۔کیا جہنمی عذاب سے مانوس نہیں ہوں گے؟

بعض نے یہ کہا ہے کہ دوزخی جہنم کی آگ میں داخل ہونے کے بعد اتنی مدت تک معذب ہوں گے جتنی مدت انہوں نے دنیا میں شرک کی حالت میں گزاری تھی لیکن اس مدت کے ختم ہونے کے بعد دوزخ کے عذاب ان کے لئے نعمت کی صورت اختیار کر لیں گے کیونکہ ان کی طبیعت کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہو جائیں گے کہ اگر انہیں بہشت میں بھیج دیا جائے تو وہ پریشان ہو جائیں گے کیونکہ بہشت اُن کی طبیعت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوگی، وہ دوزخ کی آگ، سانپوں اور بچھوؤں کے ڈنک سے اس طرح لذت حاصل کریں گے جس طرح بہشتی لوگ جنت کے درختوں کے سائے، حور وقصور، طوبیٰ اور کوثر سے لذت حاصل کریں گے، اس دنیا میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اگر بلبل پھول کی خوشبو سے مست ہوتا ہے تو بعض حشرات غلاظت کی بدبو سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔[1]

یہ نظریہ جو گذشتہ نظریئے کے مقابلے میں اور اس کے متضاد پیش کیا گیا ہے جہنم میں خلود اور عذاب کی جاودانی کے بارے میں نازل شدہ کسی بھی آیت سے مطابقت نہیں رکھتا، خصوصاً بعض روایات میں تصریح کی گئی ہے کہ جب بھی اُن کے بدن کی کھال جل جائے گی خدا انہیں نئی کھال دے دے گا تاکہ وہ عذاب الٰہی کو چکھ سکیں، اصولی طور پر آگ میں ہمیشہ جلانے کی تہدید دائمی عذاب کی تہدید ہے اور اگر جاوداں نعمتوں میں تبدیل ہو جائے تو تہدید آمیز نہیں رہے گی۔

خلود کے بارے میں اس طرح کی تفسیریں اس بات پر دلیل ہیں کہ ان کے قائلین نے قرآنی آیات میں گہری تحقیق ہی نہیں کی بلکہ اجمالی طور پر بھی تحقیقات نہیں کی ہیں، اگر گذشتہ آیتوں کو ایک بار پھر پڑھیں تو اس طرح کی پست اور بے اساس باتوں اور ان آیتوں کے مابین موجود تضاد زیادہ ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ہمیں توجہ دینی چاہیے کہ انسان کا کسی تکلیف کا عادی ہو جانا ایک حد رکھتا ہے، بعض تکالیف اور پریشانیاں جزئی ہوتی ہیں اور انسان وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن سے مانوس ہو جاتا ہے لیکن مثلاً جب انسان کے بدن کا پانی کم ہو جاتا ہے تو اسے پیاس کی وجہ

---

[1] یہ باتیں جو اختصار سے اوپر نقل ہوئی ہیں ''اسفار'' میں محی الدین ابن عربی سے نقل کی گئی ہیں جو انہوں نے ''فتوحات مکیہ'' میں لکھی ہیں۔ اسفار جلد ۹ صفحہ ۳۴۹۔

سے تکلیف ہونے لگتی ہے اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس طرح عادت ڈالے کہ اس کا بدن پانی کا محتاج نہ ہو اور اُسے ہرگز پیاس نہ لگے۔

۴۔ کیا خلود نوعی ہے یا شخصی؟

بعض کتابوں میں دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ خلود کو "نوعی" سمجھتے ہیں نہ کہ شخصی، یعنی یہ کہ کافر انسانوں کی نوع ابد تک جہنم میں رہے گی لیکن اشخاص تبدیل ہوتے رہیں گے، اس طرح سے کہ ان میں سے ہر ایک ایک معین مدت تک دوزخ میں رہے گا لیکن چونکہ اپنی جگہ دوسرے کو دیتے رہیں گے لہٰذا دوزخ میں نوع انسانی کی بقاء ابدی ہوگی۔

اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ آئیندہ بھی دنیا میں ایک اور مخلوق آئے گی، اُن میں سے بھی کچھ لوگ انحراف کا راستہ اپنائیں گے اور جہنم کی آگ کا شکار ہوں گے، لیکن اس وقت جہنم میں داخل ہوں گے جب ان سے پہلے کی مخلوق جہنم سے نجات پا چکی ہوگی۔[1]

یہ بات بھی کفار کے بارے میں جاوداں عذاب اور خلود کی آیتوں سے ہم آہنگ نہیں ہے اور گذشتہ آیتوں میں کچھ غور اس عدم ہم آہنگی کو سمجھنے کے لئے کافی ہے کیونکہ ان آیات کا ظاہر اور ان کی صراحت شخصی خلود کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس طرح کی توجیہات کی علت پہلے بیان ہو چکی ہے، یعنی وہ خلود کی بحث میں موجود مشکلات کو حل نہ کر پائے تو اس طرح کی توجیہات کا سہارا لینے لگے۔ چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

جب وہ حقیقت کو نہ دیکھ سکے تو افسانوں کی راہ اپنالی۔

۵۔ کیا خلود عدل الٰہی سے ہم آہنگ ہے؟

خلود کے مسئلے میں پیش آنے والا اہم اشکال، جو حقیقت میں اصلی اشکال ہے، گناہ اور سزا کے مابین عدم تناسب کا مسلہ ہے کہا جاتا ہے کہ ہم یہ کیسے قبول کر سکتے ہیں کہ ایک انسان جس کی عمر زیادہ سے زیادہ سو سال ہوتی ہے، اس تمام عمر میں وہ برے کام کرتا رہے اور گناہ اور کفر میں غوطہ ور رہے اور پھر اس سو سال گناہ کے نتیجے میں وہ اربوں سال تک عذاب سہتا رہے؟

البتہ اس مسئلے سے جنت کی جاوداں نعمتوں کے بارے میں کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ایک مہربان اور رحمت کرنے والی ہستی سے جس کی رحمت تمام عالم ہستی پر محیط ہے، زیادہ تفضّل اور جزاء ملنا مقام تعجب نہیں ہے، لیکن سزا اور عقوبت میں جرم کا تناسب لازمی امر ہے، اگر یہ تعادل ختم ہو جائے تو عدل الٰہی سے مطابقت نہیں رہتی مختصراً یہ کہ سو سال گناہ اور کفر کا انجام سو سال کی سزا ہے نہ کہ زیادہ۔

اس اشکال کی پیچیدگی باعث بنی کہ بعض لوگ اس کی توجیہہ کرنے لگے اور اس کی توجیہہ وہ کبھی طولانی مدت سے کرتے اور کبھی شخصی خلود کے بجائے نوعی خلود سے اور کبھی کہتے کہ وہ ماحول کے ساتھ ایک طرح سے مانوس ہو جائیں گے، اور اسی طرح کی دوسری تاویلات کا سہارا لیتے جس کی مثالیں اوپر گذر چکی ہیں، لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے یہ توجیہات بہت کمزور اور ناقابل قبول ہیں اور خلود کی آیتوں سے کسی طرح

---

[1] یہ تفسیر اسفار جلد ۹ صفحہ ۳۴۸ کے حاشیے میں ذکر ہوئی ہے۔

بھی ہم آہنگ نہیں۔

جواب:

جولوگ یہ اشکال کرتے ہیں وہ ایک بنیادی نکتے سے غافل ہیں اور وہ اساسی نکتہ قراردادی سزاؤں اور تکوینی سزاؤں کے مابین فرق کا ہے جو اعمال کا طبیعی نتیجہ یا خود انہی اعمال کے ساتھ زندگی گذارنا ہے۔

اس کی یوں وضاحت ہوگی کہ کبھی قانون ساز افراد ایک قانون بناتے ہیں کہ جو شخص فلاں جرم کا ارتکاب کرے گا اسے اس قدر جرمانہ ادا کرنا پڑے گا یا فلاں مدت تک جیل میں رہنا ہوگا۔

ایسے موادمیں مسلما جرم اور سزا کے مابین تناسب کا لحاظ رکھا جائے گا، کسی چھوٹے سے کام کے لئے ہرگز پھانسی یا عمر قید کی سزا نہیں ہو سکتی، اس کے برعکس ایک اہم کام مثلاً قتل نفس کے لئے صرف ایک دن کی قید بے معنی بات ہے، حکمت اور عدالت کا تقاضا ہے کہ ان دونوں کے مابین کامل طور پر تناسب ہو۔

لیکن جو سزائیں عمل کا طبیعی اثر ہیں اور اس کی تکوینی خاصیت شمار ہوتی ہیں یا انسان کے سامنے خود عمل کا حضور ہیں یہ بات اُن میں نہیں چل سکتی چاہے اس دنیا میں عمل کے آثار کے بارے میں ہو یا اُس دنیا میں، مثلاً اگر کہا جائے کہ جو شخص ڈرائیونگ کے قوانین کی خلاف ورزی کرے اور غیر قانونی رفتار سے بغیر دلیل کے اوورٹیک کرتے ہوئے ممنوعہ علاقے میں ڈرائیونگ کرے تو ممکن ہے انہی چند لحظات کی خلاف ورزی کے نتیجے میں اس طرح حادثے کا شکار ہو کہ اس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں اور ایک عمر تک اپنی جگہ سے ہل نہ سکے، یہاں پر کوئی یہ نہیں کہتا کہ اس چھوٹی سی خلاف ورزی کا اتنا تلخ نتیجہ عادلانہ نہیں ہے کیونکہ مسلم ہے کہ یہ ٹریفک پولیس کی قراردادی سزاؤں اور جرمانوں کی طرح نہیں ہے کہ جس میں جرم اور جرمانے کے مابین تناسب اور ہم آہنگی کا مسئلہ پیش نظر ہو، یہ عمل کا طبیعی اثر ہے جس کی طرف انسان جان بوجھ کر گیا ہے اور اس میں مبتلا ہوا ہے۔

اسی طرح اگر کہا جائے کہ نشہ آور اشیاء اور شراب استعمال نہ کریں کیونکہ بہت کم مدت میں آپ کے دل، معدہ، مغز اور اعصاب کو تباہ کر دیتی ہیں، اب اگر کوئی شخص ان کا استعمال کرے اور اعصاب کے ضعف، دل کی بیماری اور السر کا شکار ہو جائے اور چند دن کی نفس پرستی کے نتیجہ میں آخر تک عذاب الیم اور شدید درد میں مبتلا ہو تو کوئی بھی شخص جرم اور سزا کے مابین عدم تناسب کے مسئلے کو نہیں اٹھاتا۔

اب آپ فرض کیجئے کہ ایسا آدمی سو سال کی جگہ ہزار سال تک زندہ رہے یا ایک ملین سال تک دنیا میں رہے تو مسلم طور پر اس طولانی مدت میں صرف چند دن کی ہوس پرستی کی وجہ سے اس شدید درد اور عذاب سے دو چار ہوگا۔

اخروی عذاب اور سزاؤں کے مسئلے میں بات اس سے بھی زیادہ اہم ہے ممکن ہے اس کے تکوینی آثار اور تباہ کن نتائج ہمیشہ کے لئے انسان کو مبتلا کر دیں، بلکہ خود اعمال انسان کے مقابلے میں مجسم ہوں گے (جیسا کہ تجسم عمل کی بحث میں ہم کہہ چکے ہیں) اور چونکہ وہ دنیا جاودان ہے انسان کے نیک اور برے اعمال میں ہمیشہ اس کے ساتھ ہوں گے اور اس کی تسکین یا سزا کا باعث بنیں گے۔

پہلے ہم کہہ چکے ہیں کہ قیامت کی سزاؤں اور عقاب میں زیادہ تر تکوینی اثر ہے اور عمل کی خاصیت کا پہلو زیادہ نمایاں ہے جیسا کہ قرآن مجید کا فرمان ہے:

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ

اُن کے برے اعمال ان کے سامنے آشکار ہو جائیں گے اور جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے وہی چیزیں ان پر وارد ہوں گی۔ (جاثیہ ۳۳)

سورہ یٰسٓ کی آیت ۵۴ میں ہے:

وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۳۹ ﴿الصافات: ۳۹﴾

تمہارے اپنے اعمال کے علاوہ تمہارے لئے کوئی جزا نہیں ہے۔

یہی مفہوم کچھ اختلاف کے ساتھ دوسری متعدد آیتوں میں آیا ہے۔

اس طرح سے اس سوال کی کوئی گنجائش نہیں کہ جرم اور سزا کے مابین کیوں تناسب کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

انسان کو چاہیے کہ ایمان اور عمل صالح کے دو پروں کے ساتھ سعادت کے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرے اور بہشت کی ابدی نعمتوں اور قرب خدا کی لذتوں سے بہرہ مند ہو، اب اگر ایک لحظے یا سو سالہ عمر کی ہوس پرستی کے نتیجے میں اپنے دونوں پر گنوا ڈالے تو اسے ہمیشہ کے لئے ذلت اور بدبختی میں رہنا ہوگا، یہاں پر زمان و مکان اور جرم کی مقدار کا مسئلہ درپیش نہیں ہے بلکہ علت اور معلول کا مسئلہ اور اس کے لئے مختصر اور طویل مدت کے لئے اثرات کا مسئلہ درپیش ہے، ماچس کی ایک تیلی سے ممکن ہے ایک شہر جل جائے اور ایک گرام کانٹوں کے بیج سے ممکن ہے ایک مدت بعد ایک وسیع صحرا کانٹوں سے بھر جائے جو ہمیشہ انسان کے لئے تکلیف دہ ہو، ایسے ہی پھول کے چند گرام بیج سے ایک صحرا چند سال بعد خوبصورت اور معطر پھولوں کے ایک باغ میں تبدیل ہو جائے جس کی خوشبو روح کو معطر کر دے اور آنکھ کی ٹھنڈک اور دل کے سرور کا باعث بنے۔

اب اگر کوئی شخص کہے کہ ماچس کی ایک تیلی اور ایک شہر کے جلنے کے مابین کیا تناسب ہے یا چند چھوٹے چھوٹے بیجوں اور پھولوں یا کانٹوں سے بھرے صحرا کے مابین کیا تناسب ہو سکتا ہے تو کیا یہ سوال منطقی ہوگا؟ مسلماً نہیں۔

ہمارے نیک اور برے اعمال بھی اسی طرح سے ہیں اور ممکن ہے بہت وسیع اور جاوداں آثار کا موجب بنیں (توجہ کیجئے گا)

اہم مسئلہ یہ ہے کہ الٰہی رہبر، عظیم انبیاء اور ان کے اوصیاء ہمیشہ ہمیں خبردار کرتے رہے کہ ایسے گناہوں کا نتیجہ ابدی عذاب ہوگا اور اس طرح کے اعمال صالحہ کا نتیجہ ہمیشہ کی ابدی نعمتیں ہوں گی، بالکل اسی طرح جیسے ایک آگاہ اور بیدار مالی پھول اور کانٹوں کے بیجوں کے اس وسیع اثر سے ہمیں پہلے ہی مطلع کر دیتا ہے اور ہم اپنا راستہ آگاہانہ طور پر خود ہی انتخاب کرتے ہیں، یہاں اپنے علاوہ ہم کس پر اعتراض کر سکتے ہیں اور کس چیز کے بارے میں نکتہ چینی کر سکتے ہیں اور کس قانون پر اشکال کر سکتے ہیں؟

یہاں پر جزاء و سزاء اور ان کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بحث کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

قرآن اور شفاعت کا اہم مسئلہ

اشارہ:

بے شک قیامت کے دن الٰہی سزائیں انتقامی پہلو نہیں رکھتیں چاہے وہ سزائیں زود گزر ہوں یا طولانی اور ابدی، چاہے جسمانی لحاظ سے ہوں یا روحانی، چاہے ہم انہیں اعمال کا طبیعی اثر قرار دیں یا قرار دادی، یہ تمام سزائیں انسان کی تربیت کے لئے ہیں اور ان الٰہی قوانین کے اجراء کی ضامن ہیں جو انسانوں کی ترقی وکمال کے لئے معین شدہ ہیں۔

اس بناء پر باوجود اس کے کہ قرآن مجید میں قیامت کے عذاب کی شدت بیان ہوئی ہے ہر طرف سے نجات کے راستے بھی انسان پر کھول دئے گئے ہیں اور گنہ گاروں کو مہلت دی گئی ہے کہ گناہ کے راستہ سے لوٹ آئیں اور اپنی اصلاح کریں اور خدا تک پہنچنے کا راستہ پائیں۔

شفاعت انہی میں سے ایک راستہ ہے کیونکہ اس کلمہ کے صحیح مفہوم کے مطابق شفاعت گنہگار لوگوں کو خبردار کرتی ہے کہ اپنی تمام کشتیاں نہ جلا ڈالیں اور اولیاء الٰہی سے ارتباط کے تمام راستے مسدود نہ کردیں اور اگر کسی گناہ میں آلودہ ہو چکے ہیں تو مایوس نہ ہوں اور جہاں کہیں بھی ہوں واپسی کا راستہ اپنائیں اور خدا کی وسیع رحمت کے استقبال کے لئے دوڑیں۔

شفاعت کی بحث اپنی تمام ریزہ کاریوں اور خوبصورت تربیتی نکات کے ساتھ اسی مقصد کے لئے ہے جس کا قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں ذکر ہے۔

ہم اسی اشارے پر اکتفا کرتے ہوئے مفہوم شفاعت کے ادراک اور حقیقت کو سمجھنے اور اس سے مربوط تمام مسائل کا جواب جاننے کے لئے قرآن مجید کی طرف لوٹتے ہیں اور مندرجہ ذیل آیات پر توجہ دیتے ہیں جو چند حصوں میں تقسیم ہوتی ہیں:

۱۔ فَمَا تَنۡفَعُهُمۡ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيۡنَ

۲۔ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـئًا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ [۱]

۳۔ مَا لَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا شَفِيۡعٍ‌ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوۡنَ [۲]

۴۔ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيۡعًا‌ؕ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ ثُمَّ اِلَيۡهِ

[۱] یہی مفہوم مختصر فرق کے ساتھ بقرہ آیت ۲۵۴ میں بھی آیا ہے۔

[۲] یہی مطلب سورہ انعام کی آیت ۱۵۱ اور ۷۰ میں بھی آیا ہے۔

تُرْجَعُوْنَ ۴۴

۵۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ

۶۔ یَوْمَىٕذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَهٗ قَوْلًا

۷۔ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ

۸۔ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْــٴًـا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرْضٰی ۲۶

۹۔ وَلَا یَمْلِكُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ۸۶

۱۰۔ وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی

۱۱۔ لَا یَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا

۱۲۔ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ

ترجمہ:

۱۔ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت انہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔

۲۔ اور اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص کسی اور کی جگہ سزا نہیں پائے گا اور نہ ہی شفاعت قبول ہوگی، نہ ہی معاوضہ قبول کیا جائے گا۔

۳۔ تمہارے لئے اس کے علاوہ کوئی ولی اور شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا۔

۴۔ کہہ دو تمام شفاعتیں خدا کے لئے ہیں کیونکہ زمین اور آسمان کی حاکمیت اسی کی ہے اور پھر تم سب اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

۵۔ کون ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کر سکے۔

۶۔ اس دن (کسی کی) شفاعت سودمند نہیں ہوگی مگر اس کی جسے خداوند رحمن نے اجازت دی ہوگی اور اس کی گفتار سے راضی ہوگا۔

۷۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا۔

۸۔ اور کتنے فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی شفاعت فائدہ مند نہیں ہے مگر یہ کہ خدا جسے چاہے اور (شفاعت کی) اجازت دے۔

۹۔ اس کے علاوہ جنہیں تم بلاتے ہو وہ شفاعت پر قادر نہیں ہیں مگر وہ لوگ جنہوں نے حق پر گواہی دی ہے اور اچھی طرح علم رکھتے ہیں۔

۱۰۔　وہ لوگ اس کے علاوہ کسی کی شفاعت نہیں کریں گے جس سے خدا خوشنود ہوگا (اور اس کی شفاعت کی اجازت دی ہوگی)۔
۱۱۔　وہ ہرگز شفاعت کے مالک نہیں ہیں مگر وہ جو خدا کے نزدیک عہد کر چکا ہے۔
۱۲۔　ظالموں کا کوئی دوست موجود نہیں ہوگا اور نہ ہی شفاعت کرنے والا جس کی شفاعت قبول کی جائے۔

تفسیر:

آیات شفاعت کی پانچ قسمیں:

اگر مندرجہ بالا ۱۲ آیتیں اور ان سے مشابہ چار آیتیں جن کی طرف حاشیے میں اشارہ ہوا ہے ایک دوسرے کے ساتھ رکھی جائیں اور ان کی تفسیر کی جائے تو شفاعت کی بحث میں موجود تمام مسائل بخوبی حل ہو جاتے ہیں اور اس ضمن میں پیش آنے والے ہر سوال کا جواب مل جاتا ہے، لیکن شفاعت کی بحث کے کلی مطالعات میں ان آیات کی موضوعی تفسیر کی طرف عدم توجہ اور بعض کا مطالعہ کر کے باقی کو چھوڑ دینا بہت سارے اشکالات کا باعث بنا ہے اور بعض اوقات کچھ لوگوں کی اپنی گمراہی اور دوسروں کو گمراہ کرنے کا باعث بنا ہے، اور یہ ان لوگوں کی غلطی ہے جو آگاہانہ یا ناآگاہانہ طور پر موضوعی تفسیر کو نظر انداز کر کے چاہتے تھے ایسے مسائل کو ایک یا چند آیتوں کا سہارا لے کر حل کریں کہ جو اس طرح سے قابل حل نہیں ہیں یا پھر اس طرح بعض آیات کے انتخاب سے اپنے مدعا کو ثابت کرنے میں ان کی بدنیتی کا دخل تھا۔

بہر حال مندرجہ بالا آیات حقیقت میں پانچ قسموں میں تقسیم ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک کا ایک خاص ہدف ہے۔

پہلی قسم:

اس میں وہ آیتیں ہیں جو شفاعت کی کلی طور پر نفی کرتی ہیں جیسا کہ پہلی اور دوسری آیت ہے، پہلی آیت میں بے ایمان مجرموں کی جہنم میں بعض حالتوں اور بہشتیوں کی ان سے گفتگو بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے: شفاعت کرنے والوں کی شفاعت انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی ''فما تنفعهم شفاعة الشافعين''۔

اگر چہ یہ آیت اس جماعت کے بارے میں ہر طرح کی شفاعت کی کلی طور پر نفی کرتی ہے (جس میں انبیاء، اوصیائ، فرشتوں، صدیقین، شہداء اور صالحین سب کی شفاعت شامل ہے) لیکن شافعین کی عبارت سے جو فعلیت میں ظہور رکھتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن کچھ لوگ شفاعت کرنے والے اور کچھ لوگ شفاعت پانے والے ہوں گے لیکن ان کی شفاعت ان لوگوں کے لئے نہیں ہوگی جو ہمیشہ قیامت کی تکذیب کرتے تھے اور نماز کو بھی بالکل چھوڑ بیٹھے تھے اور مسکین کو بھی ہرگز کھانا نہ کھلاتے تھے ''فما تنفعهم'' کی عبارت (یعنی اس بناء پر شفاعت انہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی) سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان اعمال وعقائد اور ان کی حالت ہی اس طرح کی محرومیت کا باعث بنی ہے، اس بنا پر اگر چہ یہ آیت نفی شفاعت کی آیتوں میں سے ہے لیکن اس کے متن میں اور ضمنی طور پر شفاعت کا اجمالی اثبات کیا گیا ہے۔

دوسری آیت میں بھی شفاعت کی نفی ہوئی ہے، فرمایا گیا ہے: اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص دوسری کی سزا نہیں کاٹے گا اور اس کی شفاعت بھی قبول نہیں ہوگی (اور عذاب سے آزادی کے لئے اس سے) معاوضہ بھی نہیں لیا جائے گا اور کوئی اس کی مدد کو نہیں اٹھے گا" واتقوا یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئا ولا یقبل منها شفاعة ولا یوخذ منها عدل ولا هم ینصرون"۔

اگر چہ اس آیت میں مخاطب (سابقہ آیت کے قرینے کی بنا پر) یہودی قوم ہے لیکن آیت کا حکم عمومی پہلو رکھتا ہے اور مجرموں پر نجات کے تمام دروازے بند کر دیتا ہے اور ان میں سے چار راستوں کی طرف اشارہ ہوا ہے جو اس دنیا میں بہت سے مجرموں کی نجات کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔

پہلا یہ کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا جرمانہ اپنے ذمے لے، دوسرا یہ کہ کوئی باعزت شخص اس کی شفاعت کرے، تیسرا یہ کہ سزاؤں کا جرمانہ معاف کر دیا جائے، چوتھا یہ کہ کچھ لوگ اس کی مدد کو اٹھیں اور اُسے سزاؤں کے چنگل سے نجات دلائیں، قیامت کے دن ان میں سے کوئی ایک مفہوم نہیں رکھتا۔

گفتگو اس بارے میں ہے کہ یہاں پر شفاعت کی کلی طور پر نفی ہوئی ہے لیکن کیا یہ صرف یہود قوم سے مخصوص ہے جنہوں نے کفر و عناد اور حق سے دشمنی کا راستہ اختیار کیا تھا اور جو انبیاء الٰہی کو بھی قتل کرتے تھے؟ اس بناء پر یہ چیز آیات شفاعت اور ان روایات متواترہ کے منافی نہیں ہے جو کہتی ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ اور باقی معصومین اس امت کے گناہ گاروں کی شفاعت کریں گے۔

یا پھر یہ آیت یہودیوں کے طرز فکر کی طرف اشارہ کرتی ہے جو یہ سمجھتے تھے کہ ان کے آباء ان کی شفاعت کریں گے، کیا یہ آیت اس طرز تفکر پر خط بطلان کھینچتی ہے اور انہیں مایوس کرتی ہے یا آیت کے ظاہر میں اطلاق ہے اور کسی بھی فرد کے بارے میں کسی بھی طرح کی شفاعت کی نفی کرتی ہے؟

ذیل میں آنے والی دوسری آیتیں اور اجماع امت و روایات متواترہ کو اس آیت کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو یہ آیت کفار اور ایسے گناہ گار افراد سے مختص قرار پاتی ہے جو عظیم گناہوں کی وجہ سے شفاعت سے محروم ہو گئے ہیں، لہٰذا اس آیت کی عمومیت کی دوسری آیتیں تخصیص کرتی ہیں اور اس مودر میں ہر قسم کے ابہام کو برطرف کرتی ہیں، اس کی مزید تشریح جلد آئے گی۔

دوسری قسم:

ان آیتوں کی ہے جو "شفاعت کو خدا سے مختص قرار دیتی ہیں، تیسری زیر بحث آیت ان میں سے ہے جس میں آسمانوں اور زمین کی خلقت اور خدا کی ہر شے پر حاکمیت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے، اس کے علاوہ تمہارے لئے کوئی ولی اور شفاعت کرنے والا نہیں ہے، خالق وہ ہے (عالم کا مدبر بھی اس کی پاک ذات ہے بنابرایں شفاعت اور ولایت کا مقام بھی اس کی مقدس ذات کے لئے مخصوص ہے)" ما لکم من دونه من ولی ولا شفیع "۔

اس بناء پر بالذات اور علی الاطلاق شفیع عالم ہستی کا خالق اور مدبر ہے کیونکہ شفاعت بھی ایک طرح کی تدبیر، ربوبیت اور تربیت ہے،

لہٰذا بتوں کا دامن نہیں پکڑنا چاہیے اور اس کی پاک ذات کے علاوہ کسی کی پناہ نہیں لینی چاہیے، اگر انبیاء واولیاء میں سے کوئی شفاعت کا مقام پا سکتا ہے تو وہ ضرور اس کی طرف سے ہے جس طرح حاکمیت ہدایت اور مربی ہونے کا مقام بھی انہیں خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔

یہی مطلب چوتھی زیر بحث آیت میں ایک اور طرح سے آیا ہے، جن بت پرستوں نے بتوں کو اپنے شفیع کے طور پر اپنایا تھا ان کے جواب میں خدا فرماتا ہے: ان سے کہہ دو کہ تمام شفاعتیں خدا کے لئے ہیں ''قل للّٰہ الشفاعة جمیعا''۔

پھر اس کی دلیل یوں بیان کرتا ہے: زمین اور آسمانوں پر حاکمیت سرف اس کی ہے پھر تم سب اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے ''له ملك السموت ولارض ثم الیه ترجعون''۔

یہ واضح ہے کہ گناہگاروں کی بخشش اور عفو کا حق وہ رکھتا ہے جو تمام موجودات کا خالق اور مالک ہے اور آغاز میں موجودات اسی کی طرف سے وجود میں آئے ہیں اور آخر کار اُسی کی طرف لوٹ جائیں گے اور وہی شفاعت کر سکتا ہے اور شفاعت کو قبول کر سکتا ہے۔

اس لحاظ سے اصل میں شفاعت کا مالک خدا ہے اور کوئی بھی اس کا ہمسر و ہمتا نہیں ہے بلکہ دوسرے اپنی شفاعت کی اجازت اسی سے لیتے ہیں اور یہ بھی واضح ہے کہ شفاعت کا ذاتا اور مستقلا خدا کے وجود میں منحصر ہونا اس بات کے منافی نہیں ہے کہ خدا کی اجازت سے دوسروں کی شفاعت جائز ہو، جس طرح حاکمیت اور مالکیت ذاتا خدا کی ہے لیکن دوسرے لوگ اس کی اجازت اور حکم پر ایک خاص حد کے اندر مالک اور حاکم ہو سکتے ہیں۔

عجیب یہ ہے کہ اس سے پہلی آیت میں جب بتوں کی شفاعت کی نفی کرتا ہے تو فرماتا ہے:

''کہہ دو کیسے اُن سے شفاعت طلب کرتے ہیں جب کہ وہ کسی چیز کے مالک نہیں ہیں اور کسی طرح کی عقل وشعور نہیں رکھتے''

قل اولو کانو الا یملکون شیئا ولا یعقلون۔

یہ عبارت اس بات پر روشن دلیل ہے کہ شفاعت، حاکمیت اور مالکیت کی طرح ہے اور اس کا خدا سے مختص ہونا بھی اسی وجہ سے ہے کیونکہ عالم ہستی میں اصل حاکم اور مالک وہی ہے اور دوسرے اس کے دسترخوان نعمت پر سے کھانے والے ہیں۔

تیسری قسم:

اُن آیتوں کی ہے جو ''شفاعت'' کو خدا کے اذن پر منحصر سمجھتی ہیں'' اور حقیقت میں یہ آیات دوسری قسم کی آیات کی تکمیل کرتی ہیں، لہٰذا پانچویں زیر بحث آیت میں استفہام انکاری کے ساتھ فرماتا ہے: کون خدا کے حضور شفاعت کر سکتا ہے اس کی اجازت کے بغیر ''من ذالذی یشفع عندہ الا باذنه''۔

بنابرایں قیامت کے دن تمام شفاعت کرنے والے، تمام پیغمبر اور اولیاء اللہ اپنی شفاعت کی مشروعیت خدا سے لیں گے اور صرف اس

کی اجازت سے شفاعت کریں گے اور مسلما اس کی اجازت کا سرچشمہ اس کی حکمت ہے یعنی حساب و کتاب سے ہے اور جب تک کوئی شخص شفاعت کے لائق نہیں ہوگا اس کی شفاعت کرنے کی اجازت بھی نہیں دی جائے گی (اس گفتگو کو اپنے مدنظر رکھیں تا کہ مناسب موقع پر اس بارے میں زیادہ تشریح ہو سکے)۔

قابل غور بات یہ ہے کہ ((آیۃ الکرسی کی) مندرجہ بالا آیت میں پہلے زمین اور آسمان میں موجود تمام اشیاء کی قیومیت اور مالکیت کا منصب خدا کے لئے ثابت کیا گیا ہے، پھر یہ جلمہ ہے اس بناء پر شفاعت کا سرچشمہ خدا کی حاکمیت، مالکیت اور قیومیت ہے اور اس طرح بت پرستوں کے عقاید پر خط بطلان کھنچا گیا ہے جو بتوں کی پرستش کو خدا کی درگاہ میں ان کی شفاعت کا بہانہ سمجھتے تھے۔

یہی مطلب چھٹی آیت میں ایک اور طرح سے آیا ہے، فرماتا ہے: اس (قیامت کے) دن شفاعت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا مگر اس کے لئے جسے خداوند رحمن نے اجازت دی ہوگی اور اس کی گفتار سے راضی ہوگا ''یومئذ لا تنفع الشفاعة الا من اذن له الرحمن ورضی له قولا''۔

''من اذن له الرحمن' سے مراد کون ہے؟ اس میں دو احتمال پائے جاتے ہیں پہلا یہ کہ مراد شفاعت کرنے والے ہیں جو خدا کی اجازت سے اس عہدے پر فائز ہوں گے، دوسرا یہ کہ شفاعت پانے والے مراد ہیں جو خدا کی اجازت سے شفاعت میں شامل ہوں گے، لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ گذشتہ آیت (آیت الکرسی) سے ہم آہنگ ہے، وہاں پر بھی شفیعوں کے لئے اجازت کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی، ہمارے اس مدعا پر ایک اور دلیل آئیدہ آنے والی ایک آیت ہے، اس لئے اس مقام پر بہت سے مفسرین نے اس معنی کا انتخاب کیا ہے۔

''ورضی له قولا'' سے بھی دو معانی اخذ کئے جا سکتے ہیں، یہ پہلا یہ کہ شفیع مراد ہوں یعنی ان افراد کی شفاعت قابل قبول ہوگی جن کی گفتار اور شفاعت سے خدا راضی ہوگا، اس طرح سے دونوں جملے ایک دوسرے کی تاکید کریں گے، دوم یہ کہ مار دوہ شفاعت پانے والے ہوں جن کے قول سے خدا راضی ہوگا، دوسری عبارت میں وہ لوگ صالح اعتقاد، عمل یا بات کے مالک ہوں گے جس کی وجہ سے شفاعت کی اجازت پر خدا کی رضامندی پائیں گے لیکن اس بات کے پیش نظر کہ پہلا جملہ شفعیوں کے کام کی طرف اشارہ ہے، مناسب یہ ہے کہ دوسرا جملہ بھی اسی کی طرف اشارہ ہو تا کہ ضمیروں کا مرجع یکساں ہو سکے۔

بہرصورت یہ آیت خدا کی اجازت سے گناہگاروں کی ایک جماعت کی شفاعت کے وجود پر روشن دلیل ہے، ساتویں آیت میں بھی یہی مطلب ایک اور طرح سے بیان ہوا ہے، فرماتا ہے: اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا موجود نہیں ہے' ما من شفیع الا من بعد اذنه''۔

بنابریں شفاعت کے لئے کیوں بتوں کی عبادت کرتے ہو صرف اپنے پروردگار کی عبادت کرو، نہ اس کے غیر کی، کیوں تم سمجھتے نہیں ہو؟''ذلکم الله ربکم فاعبدوه افلا تذ کرون''۔

یہی مطلب آٹھویں آیت میں فرشتوں کی شفاعت کے بارے میں آیا ہے جو تاکید کرتا ہے کہ ان کی شفاعت بھی خدا کی اجازت سے

ہے، فرماتا ہے: کتنے زیادہ آسمانی فرشتے ہیں جن کی شفاعت کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی مگر اس وقت جب خدا کسی پر راضی ہو اور جسے چاہے اجازت دے ''ولکم من ملك في السموت لا تغني شفاعتهم شيئا الا من بعد ان یاذن الله لمن یشآء و یرضی''۔

جب آسمانی فرشتے اتنی عظمتوں کے باوجود خدا کی اجازت کے بغیر شفاعت پر قادر نہ ہوں تو بے شعور اور بے قیمت بتوں سے کیا اُمید رکھی جاسکتی ہے؟ کیا یہ شرم آور بات نہیں ہے کہ وہ کہیں کہ ہم بتوں کی پوجا اس لئے کرتے ہیں کہ وہ درگاہ الٰہی میں ہماری شفاعت کریں گے۔

عجیب یہ ہے کہ اس مطلب کی اہمیت کے بیان کے لئے ''کم'' کی تعبیر آئی ہے جو عموماً کثرت کا معنی دیتی ہے، نیز فی السموات (آسمانوں میں) کی تعبیر جمع کی صورت میں آئی ہے تاکہ معلوم ہو کہ ان سب کی شفاعت بھی خدا کی رضا اور اذن الٰہی کے بغیر بے سود ہے، تمام شفاعت کرنے والوں میں صرف فرشتوں کا ذکر کرنا ممکن ہے اس لئے ہو کہ عرب بت پرستوں کی ایک جماعت ان کی پرستش کرتی تھی، یا اس لئے ہو کہ جب خدا کے فرمان کے بغیر ان کی شفاعت مفید نہ ہو تو بے شعور بتوں سے ہرگز کوئی اُمید نہ ہونی چاہیے۔

رضا اور اذن کے مابین اس نظر سے تفاوت ہے کہ اذن کا استعمال اس جگہ ہوتا ہے جہاں فرد اپنی رضا مندی کا اظہار کرے، لیکن رضایت باطن سے متعلق ہے اور چونکہ کبھی ممکن ہے رضایت کا اظہار جبر کی وجہ سے ہو اور اس میں باطنی رضایت نہ پائی جائے اس لئے یہاں پر دونوں الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں تاکہ مقصود پر تاکید ہو، اگرچہ خدا کے بارے میں جبر کا تصور نہیں ہوسکتا اور اس کی رضایت اور اذن دونوں ہم آہنگ ہیں (توجہ کیجئے گا)۔

کیا یہ اذن شفاعت کرنے والوں کی شفاعت سے مربوط ہے یا شفاعت پانے والوں سے؟ زیر بحث آیت میں دونوں معانی ہو سکتے ہیں، اگرچہ مجموعی طور پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت کرنے والوں کی طرف اشارہ ہو یعنی خدا انہیں شفاعت کی اجازت دے اور ان کی شفاعت سے راضی ہو۔

چوتھی قسم:

ان آیتوں کی ہے جو شفاعت کرنے والوں اور شفاعت پانے والوں کے لئے کچھ شرائط کا ذکر کرتی ہیں، من جملہ نویں زیر بحث آیت میں بتوں کی شفاعت کی نفی کے ضمن میں فرمایا گیا ہے: اس (خدا) کے علاوہ جن لوگوں کو وہ بلاتے ہیں شفاعت پر قادر نہیں ہیں ''ولا یملك الذین یدعون من دونه الشفاعة الا من شهد بالحق وهم یعلمون''۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ وصف شفیعوں کے لئے ہے اور حق کی شہادت سے مراد جو ان کی پہلی صفت ہے یہ ہے کہ موحد اور یکتا پرست ہوں یعنی توحید کے سائے میں بتوں کی نفی اور الٰہی عنایت کے استمرار کے بغیر شفاعت ممکن نہیں ہے۔

بعض مفسروں نے کہا ہے کہ یہ توصیف شفاعت پانے والوں کے لئے ہے یعنی شفاعت صرف ان افراد کے شامل حال ہوگی جو خدا کی حقانیت اور یکتائی پر شہادت دیتے ہیں اور مشرکین ہرگز شفاعت میں شامل نہ ہوں گے لیکن آیت کا ظاہر پہلی تفسیر ہی ہے کیونکہ دوسری تفسیر

میں تقدیر میں کوئی چیز لینے کی ضرورت ہے [1] اور تقدیر ظاہر کے خلاف ہے۔

دوسری توصیف ”وھم یعلمون“ کے بارے میں بھی یہی دو تفسیریں نقل ہوئی ہیں کہ اگر شفاعت کرنے والوں کے لئے وصف ہو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو حق کی شہادت از روئے علم و آ گاہی دیتے ہیں یا یہ ہے کہ شفاعت پانے والوں کو بخوبی پہچانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کن لوگوں کی شفاعت کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

اور اگر شفاعت پانے والوں کی توصیف ہو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایسے لوگ شفاعت میں شامل ہوں گے جو حق کی شہادت اور کلمہ توحید از روئے علم و آ گاہی ادا کریں اور دلیل و برہان کے ساتھ ہو، صرف زبان کے ذریعے نہ ہو۔

یہی مطلب (دسویں زیر بحث آیت میں ایک اور طرح سے آیا ہے، بت پرستوں کے اس قول کی نفی کے بعد کہ فرشتے خدا کی اولاد ہیں، فرمایا گیا ہے: وہ خدا کے شائستہ بندے ہیں اور وہ اُن کے علاوہ کسی اور کی شفاعت نہیں کرتے جن سے خدا راضی ہے ”ولا یشفعون الا لمن ارتضی“ اور وہ اس کے خوف سے خوف زدہ ہیں ”وھم من خشیتہ مشفقون“۔

بنا برایں شفاعت کی خاطر فرشتوں کی پرستش (جو مشرکوں کا عقیدہ تھا) بیہودہ ہے کیونکہ وہ خدا کے فرمان پر سر تسلیم خم کئے ہیں اور صرف اُن کی شفاعت کرتے ہیں جن سے خدا راضی ہے یعنی صرف مخلص موحدوں کی شفاعت کرتے ہیں۔

لہٰذا ”لمن ارتضیٰ“ (یعنی ان کے لئے جن سے خدا راضی ہو) ان کے دین و ایمان اور توحید سے رضا مندی کی طرف اشارہ ہے یا ان کے لئے شفاعت سے رضا مندی کی طرف اور دونوں کی برگشت ایک ہی معنی کی طرف ہوتی ہے۔

اس طرح سے غیر خدا کی شفاعت صرف اسی کی اجازت سے ہو سکتی ہے اور اس کی اجازت ان افراد سے مخصوص ہے جو مومن اور موحد ہوں۔

نویں آیت میں اس بارے میں نئی عبارت نظر آتی ہے جس میں قیامت کے دن مجرموں کے جہنم کی طرف دھکیلے جانے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے: وہ شفاعت کے مالک اور صاحب نہیں ہیں مگر وہ جو خدا کے حضور عہد کر چکا ہے ”لا یملکون الشفاعۃ الا من اتخذ عند الرحمن عھدا“۔

یہ شفاعت پانے والوں کی ایک توصیف ہے (جس پر قرینہ مجرموں کے بارے میں نازل شدہ اس سے پہلی آیت ہے) اور مسلماً عہد و پیمان سے مراد یہاں پر خدا پر ایمان، اس کی وحدانیت کا اقرار، پیغمبروں کی تصدیق اور ان کے اوصیاء کی ولایت کے قبول کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی اور بعض نے اس میں عمل صالح کا بھی اضافہ کیا ہے، مفسرین نے اگر چہ یہاں پر عہد کی تفسیر میں متعدد احتمالات کا ذکر کیا ہے تا ہم ان کے اقوال میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ سب کی برگشت ایک قدر جامع کی طرف ہوتی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے۔

بعض بزرگ مفسرین نے اس احتمال کا بھی اظہار کیا ہے کہ یہ شفاعت کرنے والوں کی صفت ہے اور یہاں پر ”عھد“ سے مراد وہی

---

[1] ان آیت میں تقدیر اس طرح سے ہوگی۔ الا لمن شھد بالحق

ہے جو سورہ زخرف کی آیت ۸۶ میں آیا ہے یعنی ''شہادت بالحق'' [۱]

لیکن اس بات کے پیش نظر کہ ''لا یملکون'' میں ضمیر کی برگشت اس مرجع کی طرف ہونی چاہیے جس کا ذکر پہلی آیت میں ہے اور وہاں پر گفتگو مجرموں کے بارے میں ہو رہی تھی یہ احتمال بعید لگتا ہے اور ظاہر یہی ہے کہ یہ شفاعت کرنے والوں کا وصف ہے۔

اس طرح سے شفاعت پانے والوں اور شفاعت کرنے والوں کے مابین ایمان اور عمل صالح کا ایک رابطہ ہونا چاہیے کیونکہ وہاں پر شفاعت حساب و کتاب کے ساتھ ہے اور ہرگز نااہل افراد کی طرف داری کے معنی میں نہیں ہے، پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث مروی ہے:

من ادخل علی مومن سرورا فقد سرنی ومن فقدا تخذ عند الله عهدا۔

جس نے کسی مومن کے دل میں سرور اور خوشی پیدا کی اس نے مجھے مسرور کیا اور جس نے مجھے مسرور کیا اس نے خدا کے حضور (شفاعت کا) عہد حاصل کیا۔

یقینا جو بھی کسی مومن کو اس کے ایمان کی وجہ سے شاد کرتا ہے وہ باایمان اور ایک طرح کے عمل صالح کا مالک ہے جو شفاعت کے لئے اس کے اور خدا کے مابین رابطے کو مضبوط کرتا ہے۔

پانچویں قسم:

میں زیر بحث آخری آیات میں اشارہ بعض ایسے افراد کی طرف ہے جو اپنے ارتکاب کردہ اعمال کی وجہ سے شفاعت کی قابلیت نہیں رکھتی، اس کا مفہوم یہ ہے کہ شفاعت کچھ دوسرے لوگوں کے شامل حال ہوگی، فرماتا ہے: ظالموں کا (اس سخت دن۔۔۔۔۔روز قیامت) کوئی دوست نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی ایسا شفاعت کرنے والا جس کی شفاعت قبول کی جائے ''ما للظلمین من حمیم ولا شفیع یطاع''، پس ظالموں کے علاوہ لوگ اجمالا شفاعت کی شائستگی رکھتے ہیں۔

''ظالموں'' سے مراد کون ہے؟ اس میں بعض مفسرین نے مشرکوں اور کافروں کو مراد لیا ہے جیسا کہ محقق طبرسی نے مجمع البیان میں فرمایا ہے: کیونکہ سب سے بڑا ظلم شرک اور نفاق ہی ہے۔ [۲]

فخر الدین رازی نے بھی تصریح کی ہے کہ یہاں پر ظالموں سے مراد کفار ہیں۔ [۳]

جو آیتیں اس سے پہلے وارد ہوئی ہیں اور اسی آیت کا آغاز جہاں انہیں قیامت کے دن سے ڈرایا گیا ہے اور اس کے بعد آنے والی آیتیں جو عذاب الٰہی میں گرفتار ہونے والے گذشتہ زمانے کے کفار کی سرنوشت کو ان کے لئے درس عبرت کے عنوان سے ذکر کرتی ہیں، اس

---

[۱] المیزان جلد ۱۴ سورہ مریم آیہ ۸۶ کے ذیل میں۔

[۲] مجمع البیان جلد ۷، ۸ صفحہ ۵۱۹۔

[۳] تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۷ ۲ صفحہ ۵۰۔

مطلب پر شاہد اور گواہ ہیں۔

تفسیر روح البیان، روح المعانی اور تفسیر مراغی میں بھی اسی تفسیر کا انتخاب کیا گیا ہے، بہرحال ظالموں کی جماعت کے پیش نظر شفاعت کی نفی (چاہے اس کی کسی بھی معنی میں تفسیر کریں) دوسری اقوام کے لئے شفاعت کے اثبات پر دلیل ہے اور یہ وہی چیز ہے جس کا تذکرہ ہم نے بارہا کیا ہے کہ شفاعت بغیر حساب کے نہیں ہے، بلکہ ایک قسم کی شائستگی اور قابلیت کی ضرورت ہے یعنی گنہگاروں کے دو گروہ ہیں، ایک شفاعت کے لائق ہے اور دوسرا نا قابل شفاعت۔

نتیجہ:

مندرجہ بالا آیات کے تنوع اور پانچ قسموں کے پیش نظر جن میں سے ہر قسم شفاعت کے بعض مسائل بیان کرتی ہے اور ان آیتوں کی جمع بندی اور ایک دوسری کی مدد سے کی جانے والی تفسیر کو دیکھتے ہوئے جس کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے شفاعت کا حقیقی مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے اور اس کا فلسفہ، اس کی شرائط، اس کی اہمیت اور اس کا تربیتی کردار بھی، اس سے بے خبروں کے شفاعت سے مربوط تمام آیات پر عدم احاطہ کی وجہ سے اس مورد میں کئے جانے والے مختلف اشکالات کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے، بعض قرآنی آیتیں تمام سوالات کا جواب دیتی ہیں۔

تاہم اس مسئلے کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ ان مباحث میں سے ہر ایک کو جداگانہ طور پر وضاحت سے بیان کیا جائے تا کہ قرآن کی آیتوں اور منطقی تحلیل کی مدد سے اس آئینے سے ہر طرح کے زنگ کو صاف کیا جائے اور اس کے چہرے سے گرد و غبار برطرف ہو جائے، اب شفاعت کے اہم مسائل کے بارے میں وضاحتیں ملاحظہ فرمایئے:

چند وضاحتیں:

۱۔ شفاعت کا مفہوم:

اگر ہم شفاعت کے لغوی معنی پر صحیح طور پر غور کریں تو اس کے اسلامی مفہوم تک پہنچ سکتے ہیں کیونکہ شفاعت ''شفع'' کے مادے سے کسی چیز کو اس جیسی چیز کسی چیز کے ساتھ ضم کرنے کے معنی میں ہے ''ضم الشیئی الی مثله' اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان دونوں کے مابین ایک طرح کی شباہت اور یکسانیت ہونی چاہیے اگر چہ ان دونوں کے مابین کچھ اختلاف بھی ہو۔

اس دلیل کی بناء پر شفاعت کا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ گناہگار شخص اپنے بعض مثبت (ایمان، یا اعمال صالحہ کے) پہلوؤں سے اولیاء اللہ سے شباہت اختیار کر لے اور وہ اُسے اپنی عنایتوں اور مدد سے کمال کی طرف لے جائیں اور خدا کے حضور سے عفو کا تقاضا کریں۔

دوسری عبارت میں شفاعت کی حقیقت کسی قوی اور برتر موجود کا کسی ضعیف تر موجود کے کنارے قرار پانا اور کمال کے مراتب طے کرنے کے لئے اس کی مدد کرنا ہے۔

انسانی معاشروں میں گناہگاروں کی شفاعت کا سلسلہ ہمیشہ سے رہا ہے اور شاید قرآن کے نزول سے ہزاروں سال پہلے صاحب حیثیت افراد ارباب اقتدار کے حضور گناہگاروں کی شفاعت کرتے تھے،البتہ لوگوں کے درمیان رائج شفاعت اور آسمانی ادیان اور منطق قرآن میں موجود شفاعت کے مابین ایک اہم اور واضح فرق موجود ہے، وہ یہ کہ:

انسانی معاشروں میں شفاعت (شفارش) غالبا اس طرح سے ہوتی تھی کہ شفاعت کرنے والا معاشرے میں اثر ورسوخ والا شخص ہوتا تھا اور شفاعت پانے والا کسی بھی جہت سے اس کا محتاج ہوتا تھا، لہٰذا گناہگار کے لئے اس کی شفاعت قبول کی جاتی تھی تا کہ ضرورت کے موقع پر شفاعت کرنے والے کے اثر ورسوخ سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

مثلا بادشاہ اپنے اردگرد کے افراد اور حکومتی عہدہ داروں کی شفاعت بعض موارد میں قبول کر لیتے تھے تا کہ ان کی قدر وعظمت میں اضافہ ہو اور ضرورت کے موقع پر ان سے اپنے امور میں استفادہ کیا جا سکے، اسی طرح شفاعت کرنے والے بھی شفاعت پانے والوں سے اپنے ذاتی تعلقات کو پیش نظر رکھتے تھے نہ کہ افراد کی قابلیت واہلیت کو۔

خدا چونکہ غنی بالذات اور بے نیاز علی الاطلاق ہے لہٰذا اس کے حضور شفاعت ایک اور شکل میں ہے، وہ یہ ہے کہ اس کی بارگاہ میں شفاعت کرنے والے دیکھتے ہیں کہ گناہگاروں کے مابین کون ایسے افراد ہیں جو اپنے بعض مثبت پہلوؤں مثلا ایمان اور بعض اعمال صالحہ کی وجہ سے خدا کی رضا پاتے ہیں اور انہی مثبت پہلوؤں کی وجہ سے خدا کے حضور ان کی شفاعت کرتے ہیں، اور یہی ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن خدا ''عالم'' اور ''عابد'' کو مبعوث فرمائے گا جب وہ خدا کی عدالت میں حاضر ہوں گے۔

قیل للعابد انطلق الی الجنة وقیل للعالم قف تشفع للناس بحسن تادیبك لهم۔

تب عابد سے کہا جائے گا، بہشت کی طرف روانہ ہو جاؤ اور عالم سے کہا جائے گا ٹھہرو اور لوگوں کی شفاعت کرو اس لئے کہ تم نے اُن کی اچھی تربیت کی تھی۔[1]

یہ تعبیریں خصوصا آخری روایت میں مذکور عبارت ہمیں بخوبی بتاتی ہے کہ شفاعت نیک و پاک افراد مومنین اور علماء سے ایک طرح کے معنوی پیوند کا نتیجہ ہے۔

شہیدوں کے بارے میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوا ہے، فرمایا:

ویشفع الرجل منهم فی سبعین الفا من اهل بیته وجیرانه۔

---

[1] بحار الانوار، جلد ۸ صفحہ ۵٦ حدیث ٦٦۔

ان میں سے ہر فرد اپنے خاندان اور ہمسایوں (وغیرہ) میں سے ستر ہزار افراد کی شفاعت کرے گا۔[1]

یہاں تک کہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے:

شافع الخلق: العمل بالحق والزوم الصدق

انسان کا شفیع خدا کی اطاعت اور حق پر عمل ہے۔[2]

مختصر یہ کہ ان تمام روایات اور اسلامی منابع میں وارد دوسری بہت سی روایتوں سے یہ واضح نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شفاعت اسلام کے اہم ترین تربیتی مسائل میں سے ایک ہے جو شفاعت کرنے والوں کی نوعیت کے پیش نظر اسلام کی بالاترین اقدار کی نشاندہی کرتا ہے اور ان اقدار اور شفاعت کرنے والوں کی صفات اور ان سے ارتباط کی طرف تمام مسلمانوں کو ترغیب اہم فرق لوگوں کے درمیان مروج شفاعت کو خدا کی بارگاہ میں اولیاءاللہ کی شفاعت سے جدا کرتا ہے کیونکہ پہلی شفاعت کی بنیاد رابطے ہیں اور دوسری شفاعت کی بنیاد ضابطے۔

یہاں پر بعض ایسے بے خبر معترضین کے سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے جو شفاعت کو گناہگاروں کی طرف داری یا انہیں سبز چراغ دکھانے سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کا موازنہ جبار سلاطین کے حواریوں کی شفاعت سے کرتے ہیں۔شرعی مفہوم میں شفاعت کے بنیادی عوامل تعمیری اور تربیتی ہیں اور لیاقت واہلیت کی اساسس پر ہیں جب کہ لوگوں کے درمیان رائج شفاعت کا سرچشمہ بہت سے موارد میں ''طرفین کی احتیاج اور غیر منطقی اور ذاتی تعلقات'' ہیں۔

شفاعت الٰہی تربیت کنندہ ہے جب کہ مروج شفاعت کبھی گناہ کی جرات کا باعث بھی بنتی ہے۔

اوپر مذکورہ آیتیں اس مطلب پر زندہ گواہ ہیں کیونکہ ہر شفاعت پانے والے کے لئے بعض ایسے اوصاف کا ذکر کرتی ہیں جو مثبت پہلوؤں اور لیاقت واہلیت کے ترجمان ہیں اگر چہ یہ اہلیت بعض اعمال صالحہ کی وجہ سے ہی کیوں نہ ہو۔

۲۔شفاعت تکوینی اور تشریعی:

ہم وسیع نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ مصداق خارجی کے اعتبار سے شفاعت اتنی وسیع ہے کہ تمام عالم ہستی اور علت ومعلول کی بنیاد پر محیط ہے کیونکہ ضعیف موجودات کی پرورش اور ان کی نجات میں قوی موجودات کی مدد کا اہم جہان تکوینی میں جگہ جگہ مشاہدہ کرتے ہیں۔

جب کسی پودے کا بیج شفافتہ ہوتا ہے اور اس میں سے ایک نازک کونپل سر اٹھاتی ہے تو زمین اپنا غذائی مواد اُسے فراہم کرتی ہے، سورج اپنی حرارت وگرمی اور خفیہ قوتیں اس پر نچھاور کرتا ہے اور بادل اپنے حیات بخش قطرے اس پر برساتے ہیں تاکہ یہ نازک اور ناتواں موجود قوت پائے اور ان تمام رکاوٹوں سے گزر کر ایک تنومند درخت میں تبدیل ہو جائے جس کی ٹہنیاں پھلوں سے لدی ہوں یہ شفاعت تکوینی کی

---

[1] مجمع البیان جلد ۶ صفحہ ۵۳۸ (آل عمران کی آیت ۱۷۱ کے ذیل میں)۔

[2] غرر الحکم۔

ایک واضح مثال ہے۔

ایک ضعیف نومولود کے ساتھ والدین کا ہونا، پودوں کے پاس مالی کا ہونا اور حروف ابجد سے ناواقف بچے کے ہمراہ ایک معلم کا ہونا سب ہی شفاعت تکوینی کی مثالیں ہیں اس طرح سے علت ومعلول اور تمام عالم اسباب کو ہم اس شفاعت کی مختلف مثالیں قرار دے سکتے ہیں۔

مسلم طور پر دھوپ، ہوا، بارش اور زمین کبھی کسی خشک لکڑی کی مدد نہیں کرتیں کیونکہ وہ لکڑی ہے اور اس کی قسمت میں جلنا ہی لکھا ہے، بلکہ یہ چیزیں تازہ پھوٹی ہوئی کونپلوں اور کمزور پودوں اور ایک ایسے موجود کی مدد کرتی ہیں جس میں اپنے کمال کے لئے کچھ اہلیت پائی جاتی ہے۔

جب ہم عالم تکوین سے اس واضح نمونے کو عالم تشریع یعنی گناہگاروں کے بارے میں انبیاء اور اولیاء کی شفاعت کے باب میں لے جاتے ہیں تو شفاعت قرآنی کا حقیقی مفہوم واضح ہو جاتا ہے اور بے خبروں کے تمام اعتراضات کا جواب بھی مل جاتا ہے اور اس طرح سے شفاعت کا تربیتی مفہوم کاملا واضح ہو جاتا ہے۔

قابل توجہ یہ ہے کہ امیر المومنین علی علیہ السلام کا نہج البلاغہ کے کلمات قصار میں ایک جملہ ملتا ہے جو اس مطلب کو ایک بہت خوبصورت عبارت میں بیان کرتا ہے:

الشفیع جناح الطالب

شفاعت کرنے والا طلب کرنے والے کا پر ہوتا ہے۔[1]

جس طرح چھوٹے اور نومولود پرندے جو پرواز کی طاقت نہیں رکھتے اور اپنے والدین کی مدد سے پرواز کرتے ہیں اور والدین ان کے اپنے پروں کی طرح ہوتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں تا کہ وہ ایک مکمل پرندے کی صورت اختیار کر لیں، الٰہی شفاعت کنندہ افراد بھی شفاعت پانے والے ضعیف افراد کی مدد کرتے ہیں تا کہ وہ سعادت اور کمال کے آسمانوں پر پرواز کر سکیں۔ (غور کیجئے گا)۔

۳۔ فلسفہ شفاعت:

شفاعت کے مفہوم کی تفسیر میں جو کچھ کہا گیا اور ان آیات کی تفسیر میں جو متعدد اشارات ہم نے دیئے ان سے شفاعت کا فلسفہ مکمل طور پر واضح ہو جاتا ہے۔

شفاعت گناہ کی تشویق ہے نہ گنہاہوں کے لئے سبز چراغ، پیچھے رہ جانے کا عامل ہے نہ ہی آج کی دنیا کے معاشروں میں موجود پارٹی سے مشابہ کوئی چیز، بلکہ ایک اہم تربیتی مسلہ ہے جس کے مختلف جہات سے مثبت اور تعمیری سازندہ آثار ہیں۔ مثلا:

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار کلمہ ۶۳۔

الف: اُمید پیدا کرنا اور مایوسی کا سدباب:

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہوائے نفس کا غلبہ اہم گناہوں کے ارتکاب کا باعث بنتا ہے اور بعد ازاں اس گناہ کے مرتکب افراد پر مایوسی کا غلبہ ہو جاتا ہے اور یہی مایوسی انہیں زیادہ آلودہ اور گناہوں میں غوطہ ور کرتی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں اب سر سے پانی گذر چکا ہے، لہٰذا چاہے ایک گناہ چاہے سو گناہ۔

لیکن اولیاء اللہ کی شفاعت کی امید انہیں نوید دیتی ہے کہ اگر وہ یہیں پر رک جائیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو ممکن ہے نیک اور پاک افراد کی شفاعت سے اُن کے ماضی کی تلافی ہو جائے، بناء بر ایں شفاعت کی اُمید گناہ سے رکنے اور اصلاح و تقویٰ کی طرف لوٹ آنے میں مدد کرتی ہے۔

ب: اولیاء اللہ سے روحانی تعلق:

مفہوم شفاعت کی تفسیر میں اوپر کہے گئے مطالب سے یہ نتیجہ نکالنا آسان ہے کہ شفاعت شفیع اور شفاعت پانے والے کے مابین ایک طرح کے تعلق پر منحصر ہے جو ایمان کے لحاظ سے اور بعض صفات فاضلہ اور حسنات کے انجام کے لحاظ سے ایک روحانی رابطہ ہے۔

مسلم امر ہے کہ جو بھی شفاعت کی امید رکھتا ہے کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح سے یہ رابطہ برقرار ہو سکے اور ایسا کام کرے جو شفیع کی رضا مندی کا موجب بنے اور اپنے پیچھے کی سب کشتیاں نہ جلا ڈالے اور دوستیوں اور محبتوں کے پیوند کو کبھی نہ توڑے۔

یہ تمام امور مل کر اس کی تربیت کے لئے موثر عامل ہوں گے اور اس چیز کا باعث بنیں گے کہ وہ تدریجا آلودہ لوگوں کی صف سے باہر نکل آئے یا کم از کم کچھ آلودگیوں کے ساتھ نیک اعمال کا رخ اختیار کرلے اور شیطان کی آغوش میں زیادہ گمراہ ہونے سے بچ جائے۔

ج۔ شفاعت کی شرائط کا حصول:

جن آیتوں کی تفسیر آپ اوپر پڑھ چکے ہیں ان میں شفاعت کی مختلف شرائط ذکر ہوئی ہیں جن میں سب سے اہم شرط خدا کی اجازت اور اس کا اذن ہے جسے شفاعت کی امید اور اس کا انتظار ہو گا کسی طرح اس اجازت کو حاصل کرے گا یعنی اُسے ایسا کام انجام دینا ہو گا جو خدا کے حضور مطلوب اور محبوب ہو گا۔

گذشتہ بعض آیتوں میں ذکر ہوا ہے کہ قیامت کے دن شفاعت صرف ان کے لئے مفید ہو گی جن کی شفاعت کی اجازت خداوند رحمن نے دی ہو گی اور وہ جس کی گفتار سے راضی ہو گا، (طہ۔۱۰۹)۔ سورہ انبیاء کی آیت ۲۸ میں بیان ہوا تھا کہ ایسے لوگ شفاعت کے ذریعے بخشش کے حقدار ہوں گے جو مقام ارتضاء (خدا کی خوشنودی) تک پہنچیں گے اور سورہ مریم کی آیت ۸۷ کے مطابق عہد الٰہی کے حامل ہوں گے اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ تمام مناصب خدا اور اس کے عدل پر ایمان کے سائے میں اور حسنات وسیئات (نیک اعمال کی نیکی اور برے اعمال کی

بدی) کے اعتراف اور خدا کی طرف سے نازل شدہ تمام قوانین کی صحت پر گواہی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ بعض گذشتہ آیات میں یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ ظالمین شفاعت میں شامل نہیں ہوں گے اس کے لئے شفاعت کی امید رکھنے والوں کو ظالموں کی صف سے خارج ہونا پڑے گا (چاہے ظلم کی کسی بھی معنی میں تفسیر کی جائے)۔

یہ سب پہلو سبب بنتے ہیں کہ شفاعت کی امید رکھنے والے اپنے گذشتہ اعمال میں تجدید نظر کریں اور مستقبل کے بارے میں بہتر فیصلے کریں، یہ بھی ایک مثبت نقطہ اور تربیت کا موثر عامل ہے۔

د۔ شفیعوں کے سلسلے پر توجہ:

قرآنی آیات میں شفیعوں کے بارے میں وارد ہونے والے اشارات کی طرف توجہ اور روایات میں وارد شدہ تصریحات مسئلہ شفاعت کے تربیتی پہلوؤں پر ایک اور دلیل ہے۔

پیغمبر اسلامؐ سے ایک حدیث مروی ہے آپؐ فرماتے ہیں:

الشفاء خمسة القرآن والرحيم والا مانة ونبيكم واهل بيت نبيكم

شفیعوں کی قیامت میں پانچ قسمیں ہوں گی، قرآن، صلہ رحم، امانت، تمہارے پیغمبرؐ اور تمہارے نبیؐ کے اہل بیتؑ۔[1]

مسند حنبل میں پیغمبر اسلامؐ سے ایک اور روایت نقل ہوئی ہے، فرماتے ہیں: ''تعلموا القرآن فانه شافع یوم القيامة'' قرآن سیکھو، وہ قیامت میں شفاعت کنندہ ہے۔[2]

یہی مطلب نہج البلاغہ میں امیر المومنین علی علیہ السلام کے کلام میں آیا ہے، فرماتے ہیں ''فانه شافع مشفع'' قرآن ایسا شفیع ہے جس کی شفاعت قبول ہوتی ہے۔[3]

دوسری متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت کرنے والی بہترین چیز ''توبہ'' ہے علی علیہ السلام فرماتے ہیں ''لا شفيع انجح من التوبة'' توبہ سے زیادہ کوئی بھی شفیع کامیاب نہیں ہے۔[4]

بعض دوسری روایات میں انبیاء اوصیاء مومنین اور ملائکہ کی شفاعت کے بارے میں تصریح ہوئی ہے پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں:

---

[1] میزان الحکمۃ ج ۵ صفحہ ۱۲۲۔

[2] مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۲۵۱ (طبع بیروت دار صادر)

[3] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷۶۔

[4] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۳۷۱۔

الشفاعة للانبيآء والاوصياء والمومنين والملائكة وفى المومنين من يشفع مثل ربيعة ومضر! واقل المومنين شفاعة من يشفع ثلاثين انسانا۔

شفاعت انبیاء، اوصیائ، مومنین اور فرشتوں کے لئے ہے اور مومنین کے درمیان ایسے بھی لوگ ہیں جو قبیلہ مضر یا قبیلہ ربیعہ کے برابر افراد کی شفاعت کریں گے اور مومن کی کم سے کم شفاعت یہ ہے کہ وہ تیس افراد کی شفاعت کرے۔[۱]

اور تشویق کرتا ہے اور شفاعت کے مسئلے سے کسی بھی طرح کی غلط تفسیر اور باطل تحریف کی نفی کرتا ہے۔[۲][۳]

۴۔شفاعت کا وقت:

جن اوقات میں شفاعت ہوسکتی ہے ان میں سے ایک بے شک قیامت کا دن ہے کیونکہ شفاعت کی بہت سی آیتیں اس دن کے بیان میں ہیں لیکن کیا عالم برزخ یا اسی عالم میں بھی شفاعت ہوسکتی ہے اور کیا آخرت میں بھی حساب سے پہلے شفاعت ہوسکتی ہے یا نہیں، یہ امور قابل بحث ہیں۔

علامہ طباطبائی مرحوم نے اس ضمن میں ایک تفصیلی بحث کی ہے اور آخر میں یوں نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شفاعت کا مسئلہ قیامت کے مراحل میں سے آخری مرحلے میں انجام پائے گا، ایسے مقام پر شفیع شفاعت پانے والے کی مغفرت کا تقاضا کرے گا تا کہ وہ جہنم میں داخل نہ ہو یا پھر اس کی شفاعت کے ذریعے بعض جہنم جانے والے لوگ باہر نکل سکیں۔

انہوں نے عالم برزخ کی طرف اشارہ کیا ہے اور موت کی وقت اور قبر میں سوال کے موقع پر پیغمبر اکرمؐ اکرمؐ اور آئمہ (علیہم السلام) کے وہاں تشریف لانے اور مومنوں کی مدد کرنے پر دلالت کرنے والی روایات پر توجہ کی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ شفاعت کی قسموں میں سے نہیں

---

[۱] بحارالانوار، جلد ۸ صفحہ ۵۸، حدیث ۷۵۔

[۲] تفسیر المیزان میں شفاعت کی تفسیر مسبات میں اسباب کی تاثیر سے کرنے کے بعد شفیعوں کو دو قسموں عالم تکوین اور عالم تشریع میں تقسیم کیا گیا ہے اور تشریعی شفیعوں میں توبہ، ایمان، عمل صالح، قرآن، انبیائ، فرشتوں اور مومنوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں ان آیات سے استدلال کیا گیا ہے جو ان امور یا ان اشخاص کو گناہوں کی بخشش میں موثر قرار دیتی ہیں، اگرچہ شفاعت کا عنوان ان آیات میں نہیں ہے) مثلا زمر ۵۴، حدید ۲۸، مائدہ ۹، مائدہ ۱۶، نساء ۶۴، مومن ۷، بقرہ ۲۸۶۔

[۳] تفسیر المیزان جلد ۱ صفحہ ۴۷ سورہ بقرہ آیت ۴۸ کے ذیل ہیں۔

ہے بلکہ تصرف اور حکومت الہیہ میں سے ہے جو خدا نے انہیں عطا فرمائی ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ جب وہ شفاعت کی حقیقت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو اسے اتنی وسعت دیتے ہیں کہ عالم تکوین اور تشریع میں اسباب کی ہر طرح کی تاثیر کو شفاعت میں سے قرار دیتے ہیں لیکن یہاں اولیاء اللہ کی بعض مومنوں کو برزخ اور قبر کی مشکلات سے نجات کے لئے مدد اور اعانت کی شفاعت مصداق نہیں سمجھتے۔

بہر حال جو کچھ آیات اور روایات سے مجموعی طور پر حاصل ہوتا ہے یہ ہے کہ شفاعت اپنے وسیع مفہوم کے مطابق تینوں عالموں (دنیا، برزخ، آخرت) میں واقع ہوگی اگر چہ اس کا اصلی مقام قیامت ہے اور اس کے اہم آثار میں سے دوزخ کے عذاب سے نجات ہے۔

سورہ نساء کی آیت ۶۴ میں بیان ہوتا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۶۴

جب وہ اپنے آپ پر ستم ڈھاتے تھے (اور گناہ کا ارتکاب کرتے تھے) تو تمہارے پاس آجاتے اور خدا سے معافی مانگتے اور پیغمبر بھی اُن کے لئے استغفار کرتے تو وہ خدا کو توبہ قبول کرنے ولا اور مہربان پاتے۔

کیا پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے مومن خطا کاروں کی مغفرت کا تقاضا شفاعت کے علاوہ کوئی اور چیز ہوسکتی ہے؟

یہی مطلب قرآن میں حضرت یعقوبؑ اور ان کے فرزندوں کی داستان میں بھی آیا ہے کہ انہوں نے اپنے والد سے درخواست کی کہ خدا کے حضور ان کے لئے استغفار کریں اور انہوں نے بھی مان لیا (یوسف: ۹۷) اسی دنیا میں بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ افراد یا اقوام پیغمبروں اور اولیاء اللہ کی شفاعت کے باعث دنیا کے عذاب سے نجات پا گئے اور یہ شفاعت کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔

بہت سی رایتیں ملتی ہیں جو کہتی ہیں کہ برزخ میں انسان کے نیک اعمال مثلاً نماز، روزہ، ولایت اور ایسی دوسری چیزیں یا اولیا اللہ کا حاضر ہونا سزاؤں اور مصیبتوں میں تخفیف کا باعث بنتے ہیں یا کسی ایسے صالح، پاک دامن فرد کا جس کی نیکیاں بہت ہوں کسی قبرستان میں دفن کر دینا اس قبرستان کے گناہگار مردوں کی سزاؤں میں کمی کا باعث بنتا ہے۔

یہ ساری چیزیں عالم برزخ میں ہونے والی شفاعت کی طرف اشارہ ہیں۔

حتی کہ نماز جنازہ اور اس کے ضمن میں مردوں کے لئے کیا جانے والا مغفرت کا تقاضا مسلماً بے اثر نہیں ہے، یہ بھی ایک طرح کی شفاعت ہے۔

اس بناء پر شفاعت کسی ایک خاص عالم سے مخصوص نہیں ہے بلکہ تینوں عالموں میں ہوتی ہے، البتہ اس کا اہم ترین اور اصلی مقام قیامت ہے اور وہ وقت ہے جب عذاب الٰہی کے مرکز کا سامنا ہوتا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب:

ممکن ہے کہا جائے کہ متعدد روایات آئمہ سے اس مضمون میں مروی ہیں کہ برزخ کے مورد میں ہم ہم تمہارے لئے خوف زدہ ہیں، جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ فرمایا:

والله ما اخاف عليكم الا البر زخ. فاذا صار لامر الينا فنحن اولى بكم۔

خدا کی قسم تمہارے لئے صرف برزخ سے ڈرتا ہوں لیکن جب امور ہمارے ہاتھ آ جائیں گے (قیامت کی طرف اشارہ ہے) تو ہم تمہاری نسبت اولیٰ ہیں۔[۱]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق گناہگار مومنین سے وعدہ شفاعت کے ضمن میں فرماتے ہیں:

ولكني والله اتخوف عليكم في البرزخ۔

لیکن خدا کی قسم میں تمہارے لئے برزخ کے دور سے ڈرتا ہوں۔

راوی کہتا ہے میں نے عرض کیا: ''وما البرزخ؟ (برزخ کیا ہے؟) امامؑ نے فرمایا:

''القبر منذ حين موته الى يوم القيامة''

برزخ قبر ہے، موت کے وقت سے قیامت کے دن تک۔[۲]

لیکن ممکن ہے کہ یہ روایتیں برزخ کے کسی خاص مرحلے کے بارے میں ہوں یا پھر ہوسکتا ہے، جنھیں اولیاء اللہ کی، ہمسائیگی کی وجہ سے نجات ملتی ہے وہ محدود اور مستثنیٰ افراد ہوں اور تمام شفاعت کے لائق افراد کے لئے نہ ہو۔

۵۔ شفاعت کے مسئلے پر اہم اعتراضات:

جیسا کہ ہم اسلام اور قرآن کی نظر شفاعت کے معنی کی تحلیل میں کہہ چکے ہیں کہ اسلام میں شفاعت کا مفہوم عوام الناس کے درمیان رائج مفہوم شفاعت سے بالکل جدا ہے اور ان دونوں میں امتیاز میں غلطی بہت سے اشکالات اور اشتباہات کا اصلی سرچشمہ ہے جو اس مسئلے میں پیدا ہوئے، درحقیقت ایسے اکثر اشکالات کا جواب شفاعت اسلامی کے حقیقی مفہوم کی تحلیل میں چھپا ہوا ہے اس اجمالی اشارے کے ساتھ ہم

---

[۱] بحارالانوار جلد ۶، صفحہ ۲۱۴ حدیث ۲۔

[۲] بحارالانوار جلد ۶، صفحہ ۲۶۷ حدیث ۱۱۶۔

ان اشکالات اور ان کے جواب کی وضاحت کی طرف آتے ہیں:

الف۔کیا شفاعت گناہ کی تشویق نہیں ہے؟

کیا فشاعت کی امید اور اس کا سہارا اس چیز کا سبب نہیں ہوتا کہ کچھ لوگ گناہوں کے ارتکاب کے لئے اُسے چراغ سبز سمجھیں اور اس امید پر کہ یوم جزا کے شافعین انہیں عذاب الٰہی نے نجات دلا دیں گے،مختلف گناہان کبیرہ کا ارتکاب کریں اور عذاب کی الٰہی تہدیدات سے مطمئن ہو جائیں، دوسری عبارت میں قیامت کی سزائیں قوانین الٰہی کی مخالفت ترک کرنے کی اجرائی ضمانت ہیں کیا شفاعت اس اجرائی ضمانت کو ختم نہیں کر دیتی؟

جواب:

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے قرآنی مفہوم میں شفاعت گناہوں پر انسان کی تشویق نہیں کرتی بلکہ ان سے انسان کو روکنے والے قوی عوامل میں سے ایک ہے کیونکہ یہ باعث بنتی ہے کہ آلودہ افراد چاہے جس مرحلے میں ہوں توقف کرلیں اور گناہوں کے راستے میں آگے نہ بڑھیں بلکہ تدریجاً لوٹ آئیں گے۔

دوسری عبارت میں اسلامی شفاعت، شفاعت کرنے والوں (اولیاء اللہ، قرآن یا ایسی دوسری چیزوں) اور شفاعت پانے والوں کے مابین ایک تعلق کا نتیجہ ہے اور خدا کی اجازت پر متوقف ہے جو خود الٰہی مقدمات کی محتاج ہے، بنابرایں شفاعت کی امید انسان سے کہتی ہے کہ اپنے اور اولیاء اللہ کے مابین ایمان اور عمل کے حوالے سے تعلق قائم کرو اور رضائے الٰہی کے اسباب فراہم کرو تا کہ اس سخت دن میں اُن کے ہاں شفاعت کے لئے تمہاری کچھ عزت ہو۔

لہٰذا شفاعت کی امید ایک طرف تو گناہوں سے روکنے کا ایک عامل ہے دوسری طرف اپنے تاریک ماضی میں تجدید نظر کی دعوت ہے۔

یہ نکتہ بھی ضروری ہے کہ کسی شخص نے بھی کسی بھی ولی اللہ سے شفاعت کرنے کی ضمانت نہیں لی ہے اور کوئی گناہگار شفاعت کی امید پر مطمئن نہیں ہو سکتا بلکہ یہ مسئلہ صرف ایک امید اوار اور احتمال کی صورت میں ہے، وہ بھی ان شرائط کے ساتھ جو اوپر بیان ہوئی ہیں اس لئے یہ گناہوں کی جرات کا باعث ہرگز نہیں ہو سکتی۔

ب۔شفاعت کس لئے ہے؟

کیا یہ اپنے گناہوں پر نادم اور پشیمان افراد کے لئے ہے جب کہ ان کو تو شفاعت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ توبہ ہی ندامت ہے اور اُن کی نجات کا باعث اور جب کوئی توبہ کرلے تو شفاعت کی ضرورت کیا ہے؟ اگر شفاعت ان کے لئے ہے جو اپنے گناہوں پر پشیمان نہیں ہیں

بلکہ زیادہ جرات منداور بے پرواہ ہیں تو ایسے افراد شفاعت کے قابل ہی نہیں ہیں اورسوہ انبیاء کی آیت ۲۷ کے جملے ''من ارتضی'' کا مصداق نہیں ہیں۔

جواب:

اولاتو بہ کی شرائط ہیں، بسا اوقات انسان ان شرائط کی تکمیل میں کامیاب نہیں ہوتا کیونکہ قرآن کی بہت سی آیات میں توبہ کی شرائط میں سے ایک ماضی کے اعمال کی اصلاح بیان ہوئی ہے یعنی جو شخص سالہا سال تک گناہوں کا ارتکاب کرتا رہے اور بعد میں نادم ہوجائے اور توبہ کرلے، اسے اپنے گذشتہ اعمال کی نیک اعمال سے تلافی کرنی پڑے گی اگر حقوق اللہ میں سے ہو، اور اگر حق الناس میں سے ہو تو تمام حقوق ادا کرنے ہوں گے بنابرایں توبہ صرف ندامت کا نام نہیں ہے جیسا کہ تصور کیا جاتا ہے۔

بسا اوقات گناہ گار لوگ اپنی اصلاح اور تلافی میں کامیاب نہیں ہوتے جب کہ ان کا پورا وجود ندامت اور پشیمانی میں گھرا ہوتا ہے اب اگر وہ شفاعت پر امید نہ رکھیں تو خدا کی بخشش سے مایوسی کا شکار ہوجائیں گے اور یہی مایوسی انہیں گناہوں میں زیادہ غرق کردے گی۔

ثانیاً ممکن ہے کوئی شخص کسی گناہ میں آلودہ ہوا اور ابھی توبہ اور ندامت کی توفیق اُسے حاصل نہ ہوئی ہو اگر وہ محسوس کرلے کہ قیامت کے دن شافعین اسے اس شرط پر نجات دلا سکتے ہیں کہ وہ آئندہ گناہوں گناہوں کو ترک کردے یا نیک اور مثبت کام انجام دے تو یہی احساس اسے گناہوں کے ترک اور نیکیوں کے انجام کی ترغیب دے سکتا ہے۔

ج۔کیا شفاعت عدل الٰہی سے ہم آہنگ ہے؟

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کچھ گنہگار ایک جیسے ہوں، ان میں سے بعض شفاعت کی وجہ سے الٰہی سزاؤں سے نجات پالیں اور بعض سزاؤں میں مبتلا ہوجائیں؟ کیا یہ تبعیض خدا کی عدالت کے خلاف نہیں ہے؟

کبھی یہ مطلب ایک اور طرح سے بیان کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر گناہگاروں کے لئے الٰہی سزائیں عین عدالت ہیں تو اولیاء اللہ سے شفاعت کی درخواست، عدالت کے اجراء کو روکنے کی درخواست ہے اور اگر یہ سزائیں عدالت کے اصول کے مطابق نہیں ہیں تو آغاز ہی سے اس طرح کی سزائیں نہیں ہونی چاہیں۔

جواب:

گذشتہ ابحاث سے اس سوال کا جواب بھی واضح ہوجاتا ہے کیونکہ اولا شفاعت مناسب ماحول کے بغیر انجام نہیں پاتی، جو بھی شفاعت کے لائق ہوتا ہے وہ اس میں شامل ہوسکتا ہے اور جو لیاقت نہیں رکھتا شفاعت اُسے میسر نہیں آتی، اس بناء پر کسی طرح کی تبعیض یہاں نہیں ہے، ثانیاً گناہگار کی سزا عین عدالت ہے لیکن شفاعت کا قبول کیا جانا ایک طرح کا تفضّل ہے، ایسا فضل جو ایک طرف سے شفاعت پانے والے

میں موجود مناسب قابلیت کی وجہ سے ہے اور دوسری طرف شفاعت کرنے والے کی عزت، احترام اور اس کے اعمال صالحہ کی وجہ سے ہے۔

د۔ کیا شفاعت خدا کی خواہش سے تضاد نہیں رکھتی؟

کبھی یہ تصور کیا جاتا ہے کہ شفاعت کرنے والا الحقیقت میں عادل حاکم کے ارادے کو روکتا ہے اور وہ جسے سزا دینے کا ارادہ کرتا ہے اسے سزا سے نجات دلاتا ہے اور یہ چیز خدا کے بارے میں قابل قبول نہیں ہوسکتی، لیکن اس غلط فہمی کا سرچشمہ بھی یہی ہے کہ قرآن میں زیر بحث شفاعت اور جبار اور ستم گر حاکموں کے ہاں ہونے والی شفاعت کو یکساں سمجھا گیا ہے، وہاں پر با اثر لوگ کوشش کرتے ہیں کہ جن مجرموں سے ان کے تعلقات ہوتے ہیں انہیں قانون کے برخلاف سزاؤں سے بچائیں، بادشاہ، سلطان اور امیر کو بھی چونکہ ان با اثر افراد کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا ان کی سفارش ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے اور کبھی اپنی خواہش کے برخلاف ان گنہگاروں کی سزائیں معاف کر دیتا ہے۔

لیکن خدا کے بارے میں یہ مسائل اور اس کی بارگاہ میں ایسی شفاعت صحیح نہیں ہے (جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے)، یہاں پر شفاعت کی صورت بدل جاتی ہے، اولیا اللہ خدا کی اجازت سے ایسے افراد کی شفاعت کرتے ہیں جن کے گناہ زیادہ بھاری نہیں ہوتے اور ان گناہوں کے مقابلے میں اچھے اور نیک اعمال کے بھی مالک ہوتے ہیں، یہ درحقیقت نفوس کی تربیت اور روح کی طہارت کے لئے بنایا گیا پروگرام ہے۔

ھ۔ سزائیں اعمال کا تکوینی اثر ہیں تو پھر شفاعت سے ختم کیسے ہوسکتی ہیں؟

یہ ایک اور اعتراض ہے جو اس بحث میں کیا جاسکتا ہے کہ شفاعت صرف قراردادی اور تشریعی سزاؤں میں کام آسکتی ہے اور شفاعت کرنے والا شفاعت پانے والے پر اجراء ہونے والے حکم کے روک دیئے جانے کا باعث بنتا ہے لیکن جب ہم مان لیں کہ قیامت کی سزائیں زیادہ تر اعمال کا وضعی اور طبعی اثر ہیں جیسا کہ انسان کے قتل میں زہر کا اثر ہوتا ہے، یہ اثر ایسی چیز نہیں ہے جو شفاعت سے قابل تغیر ہو۔

جواب:

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں شفاعت کی دو قسمیں ہیں، تکوینی اور تشریعی، اس سے مندرجہ بالا سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے کیونکہ اگر سزائیں تکوینی پہلو رکھتی ہوں تو اولیا اللہ ایک طاقت ور اور برتر وجود کی حیثیت سے ''شفاعت پانے والے'' کے ہمراہ ہو جاتے ہیں اور اُن کی ناقص استعدادات کو اپنی روحانی امداد کے ذریعے کمال تک پہنچاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں گناہ کے تکوینی آثار پر ان کا غلبہ ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے سورج قابل پودوں کی پرورش کرتا ہے اور مختلف آفتوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے، اگر یہ چیز قراردادی ہو تو شفاعت کی قابلیت رکھنے والے افراد کے لئے خدا کے حضور شفاعت کی درخواست کے ساتھ ان کی مغفرت اور بخشش کا سوال کرتے ہیں اور دونوں صورتوں میں ان کے روحانی مقامات خدا کے فرمان سے ان شفاعتوں کے موثر ہونے کا باعث بنتے ہیں۔

یہی گفتگو تجسم اعمال کے مسئلے میں بھی کی جا سکتی ہے کیونکہ وہ بھی عمل کے وضعی اور تکوینی آثار سے مشابہت رکھتا ہے۔(غور کیجئے گا)

و۔کیا شفاعت پر اعتقاد پس ماندگی کا عامل نہیں؟

کچھ لوگ اس توہم کا شکار ہیں کہ شفاعت کا عقیدہ باعث بنتا ہے کہ افراد اپنے عمل کا سہارا نہ لیں اور اپنی لیاقت اور استعداد کو ظہور کے مرحلے تک نہ پہنچائیں۔

جواب:

یہ عبارت ہمیں بتاتی ہے کہ ایسے اعتراضات کرنے والے کی فکر وہی ہے جو دنیوی سفارش اور اس کے مفہوم کے بارے میں عام افراد رکھتے ہیں جب کہ ہم اس بحث کے آغاز میں یہ بات دلائل کے ساتھ کہہ چکے ہیں کہ اسلامی اور قرآنی شفاعت کا مفہوم نہ صرف یہ کہ پس ماندگی کا عامل نہیں بلکہ گناہوں کے ترک، اصلاح، ماضی کی تلافی، آئندہ کی امید اور نیکیوں اور پاکیوں کی طرف حرکت کی موثر دعوت بھی ہے چونکہ پہلے یہ موضوع تفصیل سے بیان ہو چکا ہے لہٰذا اب ہم تکرار کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

ز۔کیا توحید شفاعت سے تضاد رکھتی ہے؟

توحید کا شفاعت سے تضاد کا نظریہ معروف اعتراضات میں سے ایک ہے اور وہابیوں نے اس بارے میں بہت پروپگنڈے کئے ہیں، لہٰذا اس مسئلہ پر دقیق طور پر توجہ دینی چاہیے۔

وہابیوں کے عقائد چند محوروں کے گرد گھومتے ہیں جن میں سب سے زیادہ واضح توحید افعالی اور توحید عبادت کا مسئلہ ہے، وہ توحید کی ان شاخوں کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جو مسئلہ شفاعت، توسل، انبیاء و اولیاء کی ارواح سے استمداد اور خدا کے حضور اُن کی شفاعت سے تضاد رکھتی ہے، اسی لئے وہ ان تمام اسلامی فرقوں کو جو ان پر اعتقاد رکھتے ہیں مشرک قرار دیتے ہیں اور اگر آپ کو تعجب نہ ہوتا ہو تو یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ان کے جان و مال اور ناموس کو عرب جاہلیت کے مشرکوں کی طرح مباح سمجھتے ہیں۔

اسی عقیدے کی وجہ سے انہوں نے عراق اور حجاز کے بہت سے مسلمانوں کا خون بہایا اور ان کے اموال لوٹ لئے اور ایسے مظالم کئے جن کی اسلامی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

محمد ابن عبدالوہاب نے جو اس فرقے کا بانی ہے (متوفی ۱۲۰۶) ایک کتاب میں جو ''رسالہ اربع قواعد'' کے نام سے مشہور ہے، اس بارے میں کچھ باتیں کی ہیں جن کا خلاصہ یوں ہے:

شرک سے نجات ''چار قاعدوں'' کی شناخت ہی سے ممکن ہے:

(۱) پیغمبر اکرمؐ نے جن مشرکوں سے جنگ لڑی وہ سب یہ مانتے تھے کہ خدا جہانِ ہستی کا خالق، رازق اور تدبیر کرنے والا ہے جیسا کہ

قرآن نے سورہ یونس کی آیت ۳۱ میں فرمایا ہے:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ. فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ. فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ

کہو: کون تمہیں آسمان اورزمین سے روزی دیتا ہے اور یا کون کان اور آنکھوں کا مالک (اور خالق) ہے، کون زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور کون مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور کون ہے جو (دنیا کے) امور کی تدبیر کرتا ہے؟ بہت جلد (تمہارے جواب میں وہ) کہیں گے: اللہ۔ کہو: پس کیوں تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو (اور خدا سے نہیں ڈرتے ہو)؟

اس طرح سے وہ توحید رزاقیت، توحید خالقیت، توحید مالکیت اور توحید تدبر کے معتقد تھے۔

(۲)۔ مشرک کہتے تھے کہ بتوں کی طرف ہماری توجہ اس لئے ہے اور اُن کی عبادت ہم اس لئے کرتے ہیں کہ ہم چاہتے ہیں وہ خدا کے حضور ہماری شفاعت کریں اور ہمیں مقرب بنائیں:

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰۤؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ

وہ لوگ خدا کے علاوہ ایسے موجودات کی پرستش کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی فائدہ دے سکتے ہیں، اور وہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کے حضور ہمارے شفیع ہیں۔ (یونس؛ ۱۸)

(۳)۔ پیغمبر اکرمؐ نے ان تمام افراد سے جنگ لڑی جو غیر خدا کی عبادت کرتے تھے چاہے وہ درختوں، پتھروں، سورج اور چاند کی عبادت کرتے رہے ہوں یا فرشتوں، انبیا اور صالحین کی عبادت کرتے رہے ہوں، اور ان کے مابین پیغمبر اکرمؐ نے کوئی فرق روا نہیں رکھا۔

(۴)۔ ہمارے زمانے کے مشرکین (مراد وہابیوں کے علاوہ تمام اسلامی فرقے ہیں) عصر جاہلیت کے مشرکوں سے بدتر ہیں کیونکہ وہ اطمینان اور سکون کے موقع پر بتوں کی عبادت کرتے تھے لیکن سختیوں اور مصیبت کے موقع پر صرف خدا کی پرستش کرتے تھے، جیسا کہ عنکبوت کی آیت ۶۵ میں ہے:

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ۶۵ ﴿العنکبوت: ۶۵﴾

جب وہ کشتی پر سوار ہوتے تھےتو خدا کو خلوص سے یاد کرتے تھے (اور غیر خدا کو بھول جاتے تھے) لیکن جب خدا نہیں خشکی تک پہنچا دیتا اور نجات بخش دیتا تو وہ دوبارہ مشرک ہو جاتے تھے۔[1]

عجیب بات یہ ہے کہ وہ ان باتوں پر جو سفسطہ کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں اتنے پابند ہیں کہ بہت آسانی سے اپنے مخالفوں کی جان و مال کو مباح قرار دیتے ہیں اور ان کے قتل کو جائز قرار دیتے ہیں جیسا کہ اس گمراہ ٹولے کے ایک سربراہ شیخ سلیمان نے اپنی کتاب الھدیۃ السنیۃ میں لکھا ہے کہ کتاب وسنت اس مطلب کی گواہی دیتے ہیں کہ جو بھی فرشتوں اور انبیاء یا (مثلا) ابن عباس اور ابوطالب اور ان کی طرح دوسرے افراد کو اپنے اور خدا کے مابین واسطہ قرار دیتے ہیں تا کہ خدا سے اپنی منزلت کی بناء پر وہ ان کی شفاعت کریں جیسے سلاطین کے مقربین ان کے ہاں سفارش کرتے ہیں، ایسے افراد مشرک اور کافر ہیں اور ان کا خون اور ان کا مال مباح ہے اگرچہ شہادتین کہیں، نماز پڑھیں اور روزہ رکھیں۔[2]

انہوں نے مختلف تاریخی حوادث میں اس شرم آور اور پست حکم یعنی مسلمانوں کے خون اور مال کو مباح جاننے پر پابند ہونے کو ثابت کر دیا ہے مثلا حجاز میں طائف کے لوگوں کا (صفر سال ۱۳۴۳) مشہور قتل عام، عراق میں کربلا کے لوگوں کا (۱۸ ذی الحجہ ۱۲۱۶) کے دن مشہور قتل عام جو بہت سی تاریخی کتابوں میں مذکور ہے۔

اس استدلال کے انحرافی نقاط:

(۱)۔ اس بحث کے آغاز میں مذکورہ شفاعت کی ۱۲ آیات کی تفسیر کے بعد یہ حقیقت بخوبی واضح ہوگئی ہے کہ شفاعت قرآن اور اسلام کا ایک مسلمہ اصول ہے البتہ شفاعت کرنے والے اور شفاعت پانے والے کے لئے کچھ شرطیں بیان کی گئی ہیں، لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی قرآن اور اسلام کی پیروی کا دعوی تو کرے لیکن اس اصول کا اتنے واضح دلائل کے باوجود انکار کرے، ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ کیسے اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں جب کہ اس اصول کا انکار کرتے ہیں جو اسلام اور قرآن کی ضروریات میں سے ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی مسلمان اسلام کی ضروریات اور قرآن کے حقائق کا انکار کرے؟

(۲)۔ جس شفاعت کا قرآن ذکر کرتا ہے اور اس کا دفاع کرتا ہے ایسی شفاعت ہے جس کی اصلی راہ کی برگشت ''اذن خدا'' کی طرف ہوتی ہے اور جب تک وہ شفاعت کی اجازت نہ دے کوئی بھی شفاعت کا حق نہیں رکھتا، دوسری عبارت میں یہ ایسی شفاعت ہے جو اوپر کی جانب سے اور پروردگار کی اجازت سے ہے نہ کہ ایسی شفاعت جیسی سلاطین جور کے درباروالوں کی ہوتی ہے جو نیچے سے ہوتی ہے

---

[1] رسالہ ''اربع قواعد'' (تصنیف محمد بن عبدالوہابیت) صفحہ ۲۴ تا ۲۷ (کشف الارتیات صفحہ ۱۶۳ کے مطابق)۔

[2] الہدیۃ السنیۃ صفحہ ۶۶۔

اور جس کی اساس ذاتی تعلقات ہیں۔

اسطرح کی شفاعت توحید پر تاکید ہے کیونکہ اس کا اصل راستہ خدا کی جانب سے لیا جاتا ہے، ایسی توحید جو ہر طرح کے شرک سے پاک ہے لیکن وہابی جنہوں نے قرآنی شفاعت کو شیطانی اور سلاطین کے دربار کی سفارش سے خلط کیا ہے، اس کا انکار کرتے ہیں اور اسے توحید کے متضاد سمجھتے ہیں اور حقیقت میں انہوں نے اس مسئلے میں اپنے طرز تفکر پر ہی اعتراض کیا ہے نہ کہ شفاعت قرآنی پر۔

(۳)۔ شفاعت در حقیقت ایک طرح کا سبب نجات ہے جس طرح عالم آفرینش اور تکوین میں اسباب کے وجود پر اعتقاد اصول توحید کے منافی نہیں (مثلاً پودوں کی پرورش میں سورج کی تابش اور بارش کا اثر) کیونکہ ان اسباب کی تمام تاثیر خدا کے فرمان اور اجازت سے ہے اور دراصل ان کا یہ کام ایک طرح کی تکوینی شفاعت ہے، اسی طرح عالم تشریع میں اور شریعت میں بھی ایسے اسباب کا اُن کی مغفرت، بخشش اور نجات کے لئے موجود ہونا خدا کی اجازت سے ہے اور نہ صرف یہ کہ توحید کے منافی نہیں بلکہ اس کی تاکید بھی ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے ہم شفاعت تشریعی کا نام دیتے ہیں۔

(۴)۔ قرآن بتوں کے بارے میں جس شفاعت کی نفی کرتا ہے وہ ایک طرف تو اس لئے ہے کہ بت پرست ایسے موجودات کو خدا کی بارگاہ میں شفیع قرار دیتے تھے جو ہر جہت سے بے خاصیت تھے لہٰذا سورہ یونس کی آیت ۱۸ کے آغاز میں جو خصوصاً وہابیوں کے لئے مورد استناد قرار پائی ہے خدا صراحت کے ساتھ فرماتا ہے:

وَيَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمۡ وَلَا يَنۡفَعُهُمۡ وَيَقُوۡلُوۡنَ هٰٓؤُلَاۤءِ شُفَعَاۤؤُنَا عِنۡدَ اللّٰهِ

وہ خدا کے علاوہ ایسے معبودوں کی پرستش کرتے ہیں جو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ فائدہ اور کہتے ہیں کہ خدا کے حضور یہ ہمارے شفیع ہیں۔

مسلماً یہ چیز شفاعت انبیاء اور اولیاء سے کوئی ربط نہیں رکھتی، یہ ان بتوں سے مخصوص ہے جو پتھروں اور بے شعور و بے عقل دھات کے بنے ہوتے ہیں۔

دوسری طرف قرآن ایسی شفاعت کی مذمت کرتا ہے جو اس اعتقاد کی بناء پر ہو کہ شفاعت کرنے والا ذاتاً مستقل شفیع ہے اور انسانوں کی سرنوشت میں اس کی تاثیر خدا کی اجازت کے بغیر ہے، لہٰذا سورہ زمر کی آیت ۳ میں جو ان کے لئے خصوصا مورد استناد قرار پائی ہے، بیان ہوتا ہے:

وَالَّذِيۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ ۘ مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰىؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ فِىۡ مَا هُمۡ فِيۡهِ يَخۡتَلِفُوۡنَ

جولوگ غیر خدا کو اپنے اولیاء قرار دیتے تھے اور کہتے تھے ان کی ہم عبادت نہیں کرتے مگر اس لئے کہ ہمیں خدا کے قریب کر دیں، خدا قیامت کے دن جس چیز میں وہ اختلاف کرتے تھے اس میں ان کے مابین فیصلہ کرے گا۔

اس آیت کے مطابق وہ اپنے معبودوں کو اپنا ولی، سرپرست، حامی اور حافظ سمجھتے اوران کی پرستش کرتے تھے اوراُن کے یہ دونوں کام غلط تھے (انہیں اپنا ولی ماننا اوران کی عبادت کرنا)۔

لیکن اگر کوئی انبیاء اور اولیاء اللہ اور فرشتوں کی ہرگز پرستش نہ کرے بلکہ انہیں عزیز اور قابل قدر اور خدا کی بارگاہ میں اُسی کی اجازت سے شفیع سمجھے تو پھر وہ ان آیتوں کا مصداق نہیں ہوسکتا۔

شفاعت، مسئلہ کفر وایمان اور شفاعت کرنے والوں اور شفاعت پانے والوں کے لئے خدا کی طرف سے ذکرشدہ شرائط کے بارے میں آیات قرآنی پر عدم احاطہ کی وجہ سے وہابیوں نے اس مسئلے اور بت پرستوں کے بتوں پر جو اعتقادات تھے اس میں خلط کیا ہے اوراس طرح سے۔

چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زوند

جب حقیقت کی راہ انہیں سمجھائی نہ دی تو افسانوں کا راستہ اختیار کرلیا۔

(۵)۔ وہابیوں نے جو یہ کہا ہے کہ جاہلیت کے بت پرست عرب خالقیت، مالکیت، رازقیت اور تمام چیزوں کو خدا کے لئے مخصوص قرار دیتے تھے اوران کی گمراہی صرف بتوں کو واسطہ اور شفیع قرار دینے میں تھی، ان کی ایک اور غلطی ہے جس کا سرچشمہ ان کی علمی بے بضاعتی اور آیات قرآنی پر ان کا عدم احاطہ ہے کیونکہ متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان میں سے بعض صفات کی بتوں سے نسبت دیتے تھے، مثلاً سورہ عنکبوت کی آیت ۶۵ میں ہے:

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ

جب وہ کشتی پر سوار ہوجاتے ہیں تو خدا کو خلوص سے بلاتے ہیں (اور مشکلات کا حل صرف اسی سے مانگتے ہیں) لیکن جب وہ انہیں نجات دیتا ہے اور خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو مشرک ہو جاتے ہیں (یعنی اپنی مشکلات کا حل دوسروں سے چاہتے ہیں)۔

یہ عبارت بخوبی بتاتی ہے کہ وہ عام حالات میں اپنے بتوں کے پاس ہی اپنی مشکلات کے حل کے لئے جاتے تھے اگرچہ سختیوں اور مصیبتوں میں خدا کے لطف کا دامن پکڑتے تھے۔

سورہ فاطر کی آیت ۴۰ میں پیغمبر خداؐ کو حکم دیا گیا ہے:

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ شُرَکَآءَکُمُ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ اَرُوۡنِیۡ مَاذَا خَلَقُوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ اَمۡ لَہُمۡ شِرۡکٌ فِی السَّمٰوٰتِ

کہو: مجھے بتاؤ جن لوگوں کی تم خدا کے سوا عبادت کرتے تھے اور انہیں خدا کے برابر سمجھتے تھے انہوں نے زمین سے کون سے چیزیں پیدا کیں یا کیا وہ آسمانوں کی آفرینش میں شریک ہیں؟

اگر مشرکین خالق صرف خدا کو سمجھتے اور بتوں کو شفیع کی حیثیت سے دیکھتے تو یہ سوال کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ انہوں نے جواب میں کہنا تھا کہ ہم انہیں خالق نہیں سمجھتے اور خدا اور مخلوق کے مابین صرف ایک واسطہ سمجھتے ہیں، کیا واسطہ خالق یا خلقت میں شریک ہوسکتا ہے؟

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان بتوں کو خلقت میں ایک طرح کا شریک سمجھتے تھے اور پیغمبر اکرمؐ کو امر کیا جاتا ہے کہ ان کے کذب کو برملا کرنے کے لئے ان سے سوال کریں کہ انہوں نے کون سی چیز خلق کی ہے، سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۱۱ ہمیں بتاتی ہے کہ وہ بتوں کو عالم کی حاکمیت اور مالکیت میں خدا کا ہمتا سمجھتے تھے بلکہ ان کا عقیدہ تھا کہ بت مشکلات میں خدا کی مدد کرتے ہیں:

وَقُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ لَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ وَلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرۡہُ تَکۡبِیۡرًا ﴿۱۱۱﴾ ﴿الإسراء: ۱۱۱﴾

اور کہو: حمد اس خدا کے لئے ہے جس نے نہ اپنے لئے فرزند انتخاب کیا ہے اور نہ ہی اس کی حکومت میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ ضعف وذلت کے وقت کوئی اس کا حامی ہے اور تم اسے بہت عظیم اور بڑا جانو۔

ان جملوں میں سے ہر ایک بتوں کے ایک عقیدے کی نفی کے لئے ہے، وہ ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے (یہ توجہ رکھئے کہ ولد بیٹے اور بیٹی دونوں کو کہا جاتا ہے [1]) اور انہیں خلقت میں شریک اور خدا کا مددگار سمجھتے تھے۔

واضح ہے کہ اگر اس طرح کے عقیدے کا اس ماحول میں وجود نہ ہوتا تو قرآن کی اس طرح کی عبارتوں کا مفہوم بھی نا ہوتا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن نے ہر جگہ بت پرستوں کو مشرکین کے عنوان سے اور ان کے عمل کو شرک کے طور پر بیان کیا ہے اگر وہ لوگ بتوں اور خدا کے مابین کسی طرح کی شرکت کے قائل نہ ہوتے اور بتوں کو صرف بارگاہ الٰہی میں شفیع سمجھتے تو یہ عبارت درست نہ ہوتی کیونکہ شرک اور مشرک کا مفہوم یہی ہے کہ وہ لوگ بتوں کو ربوبیت، خلقت، مشکلات کے حل اور دوسری چیزوں میں خدا کا شریک سمجھتے تھے (البتہ ان کی نگاہ میں پتھر اور لکڑی کے یہ بت صالحین اور فرشتوں کا نمونہ اور مظہر تھے)۔

دوسری عبارت میں وہ عالم کے امور کی تدبیر میں بتوں کے ایک طرح کے استقلال کے قائل تھے اور اصطلاحاً انہیں خدا کا ہمسر سمجھتے

---

[1] ''ولد'' ''مولود'' کے معنی میں ہے جس کا چھوٹے بڑے، لڑکی لڑکے اور مفرد وجمع پر اطلاق ہوتا ہے۔ (مفردات راغب)۔

تھے، ایسا نہیں کہ وہ انہیں اس کی بارگاہ کے لئے فقط واسطہ سمجھتے ہوں، خصوصاً قرآن کی مختلف آیات میں متعدد تعبیرات آئی ہیں جو اس مطلب کو مکمل طور پر واضح کرتی ہیں، مثلاً سورہ عنکبوت کی آیت ۲۲ میں ہے:

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۲۲

تمہارا خدا کے علاوہ کوئی ولی اور مددگار نہیں ہے۔

یہ بت پرستوں کے عقیدے کی طرف اشارہ ہے جو بتوں کو (خدا کے علاوہ) اپنا ولی اور یاور سمجھتے تھے جیسا کہ جاثیہ کی آیت ۱۰ میں فرمایا گیا ہے:

وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْـًٔا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَاۗءَ

جو چیزیں مشرکین حاصل کر چکے ہیں وہ انہیں عذاب الٰہی سے ہرگز نجات نہیں بخش سکتیں اور نہ ہی وہ اولیاء جنہیں خدا کو چھوڑ کر انہوں نے اپنے لئے منتخب کیا ہے۔ (توجہ کیجئے گا)

''من دون اللہ'' کی عبارت جو مشرکوں کے بارے میں قرآن میں مکرر آئی ہے بتاتی ہے کہ وہ خدا کے علاوہ کچھ اور موجودات کو مورد توجہ قرار دیتے تھے تاکہ وہ ان کے ولی، ناصر اور حامی بنیں اور یہ شرک در ربوبیت ہے نہ کہ شفاعت کا مسئلہ۔

مختصر یہ کہ قرآن نے متعدد آیات میں دو بڑے اعتراضات مشرکین پر کئے ہیں، پہلا یہ کہ وہ بے شعور اور آنکھ اور کان سے محروم موجودات کو مبداء اثر سمجھتے تھے اور دوسرا یہ کہ تدبیر الٰہی کے ساتھ ساتھ ان کے لئے بھی ایک قسم کی ربوبیت کے قائل تھے۔

البتہ عصر جاہلیت کے بت پرست ضد و نقیض باتیں بھی کرتے تھے، ایسا نہ تھا کہ ایک باخبر اور منطقی انسان کی طرح بغیر تناقض کے اپنی باتیں بیان کریں، لہٰذا عین اس وقت جب بتوں کو مشکلات کے حل میں خدا کا شریک سمجھتے تھے اور انہیں ''من دون اللہ'' اور جدا طور پر اپنا ولی اور حامی قرار دیتے تھے کبھی خدا کے حضور شفاعت کا مسئلہ بھی اٹھاتے تھے اور یہ افعال میں شرک پر عدم اعتقاد کی ہرگز دلیل نہ تھی۔

یہ ایسی چیز ہے جو آیات اور ان کے مجموعی حالات کے مطالعے کے بعد معلوم ہوتی ہے اور عجیب ہے کہ وہ شفاعت کو ہرگز خدا کی اجازت پر متوقف نہیں سمجھتے تھے۔

بنابرایں ہم بخوبی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اگر انسان صرف اولیاء اللہ کا سہارا لے (نہ کہ پتھر اور لکڑی کے بتوں کا) اور صرف انہیں خدا کے حضور شفیع سمجھے (نہ کہ تدبیر و ولایت اور حمایت میں شریک) اور ان کی شفاعت کو بھی خدا کی اجازت پر موقوف سمجھے (نہ کہ اس سے مستقل) تو اس صورت میں اس پر کوئی اعتراض صحیح نہیں ہے۔

اعتراض اس وقت کیا جا سکتا ہے جب انسان ان تین اصولوں کو یا ان میں سے کسی ایک کو نظر انداز کر کے غلط راستہ اپنائے۔

اعراج کہاں ہے

اور

اعرافی کون ہیں؟

اشارہ:

قرآن مجید میں ایک سورہ اعراف کے نام سے ہے جس کی چار آیتیں ''اعراف'' کے مسئلے سے متعلق ہیں، ان آیتوں سے اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بہشت و دوزخ کے درمیان ایک جگہ کا نام اعراف ہے اور الٰہی انسانوں میں سے کچھ لوگ جو بہشتوں اور دوزخیوں کو خوب پہچانتے ہیں وہاں رہتے ہیں۔

لیکن ان الٰہی انسانوں کو ذمہ داریاں کیا ہیں اور ان کا مقصد کیا ہے اور اصولا میدان قیامت میں اعراف کی حیثیت کیا ہے اور ان الٰہی انسانوں کے علاوہ جو اعراف میں ایک خاص ذمہ داری کے حامل ہیں، ضعیف مومنین اور دوسرے افراد میں سے کوئی اور بھی وہاں پر ہے یا نہیں؟

یہ ایسے مسائل ہیں جو سورہ اعراف کی چار آیات اور ان کی تشریح میں اہم اسلامی منابع میں وارد شدہ روایات کے سائے میں واضح ہوں گے، اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن کا رخ کرتے ہیں اور ان آیات پر غور کرتے ہیں:

۱۔ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ ۚ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۚ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ۴۶

۲ ال أعراف: ۴٦

۲۔ وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ ۚ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ

۳۔ وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ قَالُوا مَا أَغْنَىٰ عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ ۴۸

۴۔ اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۴۹

ترجمہ:

۱۔ ان دونوں (جہنم اور جنت) کے درمیان ایک حجاب ہے اور اعراف پر کچھ مرد ہیں جو دونوں میں سے ہر ایک کو چہروں سے پہچانتے ہیں اور بہشتیوں کو آواز دیتے ہیں کہ تم پر سلام ہو، لیکن بہشت میں داخل نہیں ہوتے جب کہ اس کی امید رکھتے ہیں۔

۲۔ جب اُن کی نظریں دوزخیوں پر پڑتی ہیں تو کہتے ہیں: پروردگار! ہمیں ستم گروں کی جماعت کے ساتھ قرار نہ دے۔

۳۔ اور اصحاب اعراف (جہنم کے کچھ) مردوں کو جنہیں چہروں سے پہچانتے ہیں اور آواز دیں گے اور کہیں گے کہ تم نے دیکھا کہ تمہاری (مال و دولت اور بیوی بچوں کی) جمع آوری اور تمہارا تکبر تمہیں کوئی فائدہ نہ دے سکے؟

۴۔ کیا یہ وہی نہیں ہیں جن کے بارے میں تم لوگوں نے قسم کھائی تھی کہ خدا کی رحمت ہرگز ان کے شامل حال نہیں ہوگی؟ (لیکن ایمان اور بعض اعمال خیر کی وجہ سے خدا نے انہیں بھی اپنی رحمت سے نوازا اور اب ان سے کہا جائے گا کہ) بہشت میں داخل ہو جاؤ ایسی حالت میں کہ تمہیں کوئی خوف ہوگا نہ تم غمگین ہو گے۔

تفسیر:

دوزخ اور بہشت کے درمیان ایک جگہ:

پہلی آیت میں اس سے قبل والی آیتوں کی طرف اشارہ اور بہشت و دوزخ اور بہشتیوں اور دوزخیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اور ان دونوں (اہل بہشت اور اہل دوزخ) کے درمیان ایک حجاب ہے" وبینهما حجاب "یہ حجاب ان دونوں کے ایک دوسرے تک پہنچنے میں مانع ہے لیکن ایک دوسرے کی آوازیں سننے سے مانع نہیں ہے، کیونکہ اس سے پہلے کی آیتوں میں بہشتیوں اور دوزخیوں کے آپس میں گفتگو کا ذکر ہے کہ بہشتی دوزخیوں کو آواز دیں گے اور کہیں گے ہم نے وہ سب حق پایا جس کا وعدہ پروردگار نے ہم سے کیا تھا، کیا تم نے بھی اپنے پروردگار کا وعدہ حق پایا ہے؟ جواب دیں گے کہ "ہاں"۔ یہ مقام تعجب نہیں کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ دو ہمسائے دیوار کے پیچھے سے ایک دوسرے سے باتیں کر لیتے ہیں اور ایک دوسرے کا حال پوچھتے ہیں جب کہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ پاتے یا ایک دوسرے تک نہیں پہنچ سکتے، اس سے ملتا جلتا مفہوم سورہ حدید میں آیا ہے کہ قیامت میں جب منافقین مومنین سے کہیں گے کہ ہمیں مہلت دو (یا ہماری طرف دیکھو) تاکہ ہم تمہارے نور سے بہرہ مند ہوں تو وہ جواب دیں گے کہ پیچھے لوٹ جاؤ (عالم دنیا کی طرف) اور وہاں نور کسب کرو، اس وقت ان کے درمیان ایک دیوار بنائی جائے گی جس کا ایک دروازہ ہوگا جس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور باہر کی طرف عذاب منافقین آواز دیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ مومنین کہیں گے "ہاں" لیکن تم لوگوں نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔"

فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ (حدید ۱۳ و ۱۴)

کیا یہ بلند دیوار (اور قرآنی تعبیر میں سور) وہی اعراف ہے یا کوئی اور چیز؟ اس کا جواب ہم بعد میں پائیں گے۔

بہر حال اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اعراف پر ایسے مرد ہیں جو ہر ایک بہشتی اور دوزخی کو (اپنی ہی جگہ سے دیکھتے ہیں اور انہیں) ان کے چہروں سے پہچانتے ہیں "وعلی الاعراف رجال یعرفون کلا بسیماھم"۔

چونکہ اعراف کا لغوی معنی بلند جگہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ با حیثیت ہوں گے جو اس بلندی سے دونوں گروہوں پر ناظر ہوں گے اور چہروں سے انہیں پہچانیں گے۔

یہ شناسائی کس لئے ہے؟

ان زیر بحث آیات میں موجود قرینون سے جن کے بارے میں زیادہ وضاحت آئندہ آئے گی اور اسی طرح اسلامی منابع میں اعراف کے متعلق وارد شدہ بہت سی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اعراف میں دو جماعتیں ہوں گی، ایک جماعت الٰہی انسانوں کی بزرگ شخصیات اور خدا کی درگاہ کے مقربین کی اور دوسری جماعت مستضعفین کی اور ان لوگوں کی جنہوں نے صالح اور غیر صالح اعمال کو آپس میں ملا دیا ہے، بعض کی نیکیاں ان کی بدیوں پر حاوی ہیں اور بعض کی برائیاں ان کی نیکیوں پر حاوی، درحقیقت وہ بہشت اور دوزخ کے درمیان سرگرداں ہیں۔ یہاں پر وہ الٰہی انسان ان تمام افراد کو ان کے چہروں سے پہچانیں گے جو لوگ شفاعت اور مغفرت کے قابل ہوں گے اور اولیاء اللہ کی ولایت کے گوہر سے بہرہ مند ہوں گے ان سے کہیں گے کہ بہشت میں داخل ہو جا اور باقی افراد کو دوزخ کی جانب روانہ کر دیں گے۔ یہ مناسب ترین توجیہ اور تفسیر ہے جو اعراف سے متعلق تمام تر آیات اور قبل و بعد کی آیات کی وضاحت کرتی ہے اور ہمیں ہر طرح کی فضول باتوں سے نجات دیتی ہے، نیز یہ تفسیر بہت سے اقوال اور مفسرین کی تفسیروں کی مابین حلقہ اتصال اور وجہ جمع قرار پاسکتی ہے۔

مثلاً علامہ طباطبائی مرحوم نے اعراف پر موجود افراد کے بارے میں ۱۲ اقوال نقل فرمائے ہیں (بعض نے صرف ۱۰ قول یا سات قول نقل کئے ہیں مثلاً تفسیر قرطبی اور تفسیر اثنا عشری) ان کی ترتیب یوں ہے:

۱۔ وہ ممتاز شخصیات اور بزرگان ہیں۔

۲۔ وہ ایسے لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور بدیاں یکساں ہیں اور کوئی ایک دوسرے سے زیادہ نہیں ہے۔

۳۔ وہ اہل فترت ہیں (وہ لوگ جو دو پیغمبروں کی بعثت کے مابین قرار پائے اور ان تک حجت کافی نہ پہنچی)۔

۴۔ وہ مومن جن ہیں۔

۵۔ وہ کفار کی نابالغ اولاد ہیں۔

۶۔ وہ ناجائز بچے ہیں۔

۷۔ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنے والے لوگ ہیں۔

۸۔ وہ فرشتے ہیں (انہیں اس لئے مرد کہا گیا ہے کہ وہ انسانوں کی شکل میں آئیں گے)۔

۹۔ وہ پیغمبر ہیں۔

۱۰۔ وہ امت کے عادل مرد ہیں جو امت کے افراد کی شہادت اور گواہی دینے کے لئے وہاں ٹھہریں گے۔

۱۱۔ وہ صالح، باخبر اور عالم افراد کی ایک جماعت ہے۔

۱۲۔ وہ علیؑ، عباسؑ، حمزہؓ اور جعفرؑ ہیں۔[۱]

اہل بیتؑ کے منابع میں منقول بہت سی روایات میں ان مردوں کی تفسیر محمد وآل محمدؐ سے کی گئی ہے اور یہ مندرجہ بالا اقوال کے علاوہ ہے۔[۲] لیکن حقیقت میں یہ تمام اقوال (۱۲ یا ۱۳) مندرجہ بالا تفسیر میں جمع ہیں اور وہ یہ تھی ہ اعراف میں دو جماعتیں ہیں، ایک جماعت پاک و نیک افراد اور اولیاء اللہ کی ہے جن میں سب سے پہلے محمدؐ وآل محمد (علیہم السلام) ہیں، ان کے بعد انبیاء و فرشتے اور صالحین، علماء اور بزرگان کی ایک جماعت ہے، پھر مستضعفین اور ان افراد کا ایک گروہ ہے جن کی زندگی میں مثبت اور منفی نقاط تھے یا وہ منفی اور مثبت نقاط سے عاری تھے (جیسے کفار کے نابالغ بچے، قاصر، جاہل اور اہل فترت)۔

جن روایات کی طرف اوپر اشارہ ہوا وہ بھی صراحت کے ساتھ اعراف میں ان دو جماعتوں کے وجود کی تائید کرتی ہیں لہٰذا پہلی آیت کے ضمن میں دوسری جماعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: (مستضعفون کی جماعت) بہشتیوں کو آواز دے گی کہ تم پر سلام ہو لیکن جنت میں داخل نہیں ہو گی جب کہ انہیں جنت کی امید ہو گی" ونا دوا اصحاب الجنة ان سلام علیکم لم ید خلوھا وھم یطمعون"۔

اس طرح سے آیت کے آغاز اور درمیان میں ان دو مختلف جماعتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن کا اوپر ذکر آچکا ہے، دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے: اور جب اُن کی نظریں دوزخیوں پر پڑیں گی تو کہیں گے: خدایا! ہمیں ستمگروں کی جماعت کے ساتھ قرار نہ دے"واذا صرفت ابصارھم تلقاء اصحٰب النار قالوا ربنا لا تجعلنا مع القوم الظلمین"۔ اس آیت میں ضمائر (ابصارھم ورقالوا میں) قبل والی آیت ے وسط کی طرح ہیں اور دوسری جماعت کی طرف برگشت کرتی ہیں، جب کہ پہلی آیت کے آغاز

[۱] المیزان جلد ۸ صفحہ ۱۲۶ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[۲] علامہ مجلسی مرحوم نے یہ روایت بحار کی جلد ۸ صفحہ ۳۳۶ اور ۳۳۷ پر نقل کی ہے اور کلینی مرحوم نے اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۴۰۸ پر نقل کی ہے۔

میں گفتگو پہلی جماعت کے بارے میں ہو رہی ہے۔

ان آیات کی تفسیر میں صرف یہ خلاف ظاہر ہے جس کے ہم قائل ہیں، یعنی ہم ان ضمائر کے مرجع کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں لیکن اس خلاف ظاہر پر متعدد قرائن پہلی آیت میں ہیں اور بعد والی آیت میں بھی، کیونکہ جو رجال اعراف پر ہیں اور سب کو چہروں سے پہچانتے ہیں اور وہاں امر و نہی کرتے ہیں اور دوزخیوں کی ملامت اور سرزنش کرتے ہیں، اور جو لوگ خدا کے فضل سے بہشت کی لیاقت رکھتے ہیں وہ انہیں بہشت میں بھیج دیتے ہیں، وہ ان افراد میں سے نہیں ہیں جو 'لم یدخلوھا وھم یطمعون'' (بہشت میں داخل نہیں ہوں گے جب کہ اس میں داخل ہونے کی طمع رکھتے ہوں گے) کے جملے میں شامل ہوں۔ (توجہ کیجئے گا)

مختصر یہ کہ ان آیتوں میں بعض ایسے الفاظ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بلند مرتبہ افراد اعراف پر ہیں جو امر و نہی کے مالک اور بہشتیوں اور دوزخیوں کی شناخت میں معرفت کے اونچے مقام پر فائز ہیں (بہشت یا دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے بھی)، نیز ایسے الفاظ بھی ہیں جو بتاتے ہیں کہ اعراف میں پس ماندہ افراد کی ایک جماعت بھی ہے جو اپنی سرنوشت کے بارے میں سخت وحشت اور اضطراب کا شکار ہے، یہ لوگ بہشت کی طمع رکھتے ہیں اور دوزخ کا خوف، یہ تمام تر قرینے مجموعی طور پر ہمیں اعراف پر ان دو جماعتوں کے وجود کی خبر دیتے ہیں، اس تفسیر کے سائے میں ان آیتوں کی تفسیر میں موجود تمام سوالات کا جواب مل جائے گا۔ تیسری آیت میں ایک بار پھر پہلی جماعت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اصحاب اعراف کچھ (جہنمی) لوگوں کو آواز دیں گے جنہیں وہ چہروں سے پہچانتے ہوں گے اور کہیں گے جو کچھ (مال و دولت اور بیوی بچوں کے حوالے سے) تم نے جمع کیا تھا اور جن چیزوں کو تم نے دوسروں پر اپنی برتری کا ذریعہ قرار دیا تھا اس نے تمہیں بے نیاز نہیں کیا (اور تم عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے)۔

ونادی اصحب الاعراف رجالا یعرفونھم بسیماھم قالو ا ما اغنی عنکم جمعکم وما کنتم تستکبرون۔

اصحاب اعراف کی طرف سے کچھ جہنمیوں کی اس طرح شدید سرزنش ان کے بلند مقام کی واضح علامتیں ہیں جو وہ الٰہی فرشتوں کی طرف ملامت اور سرزنش کے ان دروں سے ان کو سزا دیتے ہیں،۔

چوتھی اور آخری آیت میں بھی یہی بلند مقام کے حامل اعراف کے ساکنین ایک طرف اعراف میں موجود ضعیف مومنین کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور دوسری طرف دوزخی مستکبرین کو مخاطب کرتے ہیں اور ملامت آمیز انداز میں ان سے کہتے ہیں: کیا یہ وہی لوگ نہیں جن کے بارے میں تم نے قسم کھائی تھی کہ ہرگز خدا کی رحمت ان کے شامل حال نہیں ہوگی؟''اھو الآءِ الذین اقسمتم لا ینالھم اللہ برحمة''۔ پھر اسی حالت میں ضعیف مومنین کی طرف اشارہ کرکے اظہار کریں گے: جاؤ او بہشت میں داخل ہو جاؤ نہ تم کو کوئی خوف ہے اور نہ ہی تمہیں کوئی غم ہوگا" ادخلوا الجنة لا خوف علیکم ولا انتم تحزنون"۔ یہ عبارت بھی بخوبی بیان کرتی ہے کہ وہاں پر دو جماعتیں ہوں گی، ایک بلند مرتبہ افراد کی جماعت اور دوسری ضعیف مومنین کی عقب ماندہ جماعت اور آخرکار رحمت الٰہی ان کے بھی شامل حال ہوگی اور وہ ان باحیثیت اصحاب اعراف کے حکم پر بہشت کی طرف روانہ ہوں گے۔

چند وضاحتیں:

۱۔ اعراف لغت اور تفسیر میں:

اعراف (عرف) (بروزن ''قفل'') کی جمع بلند اور مرتفع جگہ کے معنی میں ہے اور اصل میں 'عرف الفرس' اور ''عرف الدیک'' سے لیا گیا ہے جو گھوڑے کے پر اور مرغ کے تاج کے معنی میں ہیں، کبھی کہا جاتا ہے کہ لفظ معرفت اور عرفان کے ریشے سے لیا گیا ہے جو اشیاء سے آ گاہی اور ان کی خصوصیات کے بارے میں علم کے معنی میں ہے اس لئے کہ بلند زمینیں پشت اور نیچی زمینوں سے زیادہ واضح اور جلد پہچانی جاتی ہیں، (اور ان کی بلندیوں سے تمام جگہوں کو پہچانا جا سکتا ہے)۔

کبھی کہا جاتا ہے کہ بلند مرتبہ اور والا مقام افراد کی منزلت ہے۔[1]

اعراف کہا ہے اور کیسا ہے؟ اس بارے میں اقوال متعدد ہیں، المیز ان میں ان اقوال میں سے چھ اقوال بیان کئے گئے ہیں:

۱۔ ایسی جگہ ہے جو بہشتیوں اور دوزخیوں پر حاوی اور محیط ہے۔

۲۔ ایسی دیوار ہے جس پر مرغ کے تاج کی طرح ایک مخصوص تاج ہے۔

۳۔ بہشت اور دوزخ کے درمیان ایک ٹیلہ ہے۔

۴۔ وہ دیوار ہے جس کی طرف قرآن میں اشارہ ہوا ہے کہ مومنین اور منافقین کے درمیان قرار پائے گی اور سورہ حدید کی آیت ۱۳ میں اس بارے میں فرمایا گیا ہے:

فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝۱۳ ﴿الحدید: ۱۳﴾

مومنوں اور منافقوں کے درمیان ایک دیوار بنائی جائے گی جس کے اندر کی طرف رحمت اور باہر کی طرف عذاب ہو گا۔

۵۔ اعراف اس صراط اور پل کے معنی میں ہے جو دوزخ کے اوپر تنا ہوا ہے۔

۶۔ اعراف لوگوں کی حالت سے آ گاہی کے معنی میں ہے۔

لیکن ہمارے خیال میں اگر اعراف سے متعلق چار آیتوں میں غور کیا جائے تو اعراف کے معنی میں کوئی ابہام نہیں رہ جاتا اور اُن سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ اعراف ایسی جگہ ہے جو بہشت اور دوزخ پر ناظر ہے اور اولیاء اللہ میں سے بلند مرتبہ افراد کی ایک جماعت وہاں رہتی ہے

---

[1] التحقیق، مجمع البیان اور دوسری تفسیریں اور لغات۔

اور ضعیف الایمان عقب ماندہ افراد کی ایک جماعت بھی اور یہ اس وقت ہوگا جب خالص مومنین بہشت میں جا چکے ہیں اور بے ایمان گنہ گار دوزخ میں، لیکن وہ لوگ جن کے برے اور نیک دونوں طرح کے اعمال تھے اور بعض جہات سے مثبت نقاط اور بعض جہات سے منفی نقاط کے حامل تھے، اعراف میں باقی رہ گئے ہیں اور اس انتظار میں ہی کہ دیکھیں اعراف کے بلند مرتبہ الٰہی لوگ ان کے بارے میں کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

اعراف میں موجود ان دو جماعتوں کے بارے میں اور اس بارے میں کہ ان میں سے ہر ایک کون کون سے لوگ ہیں آیات کی تفسیر کے ضمن میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ اس طرح سے یہاں پر واضح ہو جاتا ہے کہ اعراف کے الٰہی لوگوں کا کام حقیقت میں ایسے افراد کی ایک طرح سے شفاعت کرنا ہے جو "خَلَطُوۡا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا"[1] نیک اور بے اعمال کو آپس میں خلط کر چکے ہیں اور ہمیشہ اضطراب اور پریشانی کے عالم میں ہیں، جب وہ اعراف کی بلندیوں سے بہشتیوں کو دیکھتے ہیں تو اُن کے ساتھ رہنے کی آرزو کرتے ہیں اور جب اُن کی نظریں دوزخیوں پر پڑتی ہیں تو مضطرب ہو جاتے ہیں اور آرزو کرتے ہیں کہ ہرگز ان کے ساتھ نہ رہیں۔ یہاں ضمنی طور پر اعراف کے وجود کا فلسفہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس کا مقصد اولیاء اللہ کے بلند مرتبے کو دکھانا اور عقب ماندہ افراد کے لئے ان کی دست گیری اور گنہگاروں کی ایک جماعت کی سرنوشت کا پیش کرنا ہے جو آخر کار ان عظیم افراد کی شفاعت پائیں گے۔

۲۔ اعراف منطق اور عقل کی روشنی میں:

واضح ہے کہ اعراف کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی عقلی دلیل نہیں ہے کیونکہ عقل صرف حساب و کتاب اور جزاء و سزا سے متعلق کلیات کو ثابت کر سکتی ہے کیونکہ ان چیزوں کا نہ ہونا خدا کی عدالت اور حکمت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔

لیکن قیامت کے مواقف، جزاو سزا کے مراحل، بہشتیوں کے بہشت میں داخل ہونے کی کیفیت اور دوزخیوں کے دوزخ میں داخل ہونے کا طریقہ، صراط، اعراف اور اس طرح کی دوسری چیزیں جو قیامت کی جزئیات میں سے ہیں، ایسے مسائل ہیں جو نقلی روش کے بغیر اثبات کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ شفاعت کا سرچشمہ بھی خدا کی حکمت ہے (جیسا کہ شفاعت کی بحث میں یہ بات آئی ہے) اور طبیعی طور پر شفیعوں کا بلند مرتبہ اور ولا مقام ہونا چاہیے تا کہ وہ ضعیفوں کی دستگیری کر سکیں، اس لئے حکم عقل کی گہرائیوں میں اعراف کے مسئلے کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ پایا جا ہے (توجہ کیجئے گا)۔

۳۔ اعراف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔روایات میں:

شیعہ و سنی اسلامی منابع میں اعراف اور اعراف والوں کے بارے میں بہت سی روایتیں وارد ہوئی ہیں اگر ہم انہیں دقیق طور پر ایک دوسرے کے ساتھ قرار دیں تو وہی نتیجہ نکل سکتا ہے جو ہم مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔

---

[1] توبہ، ۱۰۲۔

یہ روایتیں بہت زیادہ ہیں، بعض نے ان کی تعداد ۲۸ بتائی ہے[1]۔ان میں سے بعض احادیث اعراف ہی کے بارے میں ہیں اور بعض اُن مردان الٰہی کے بارے میں بتاتی ہیں جو اعراف میں ہیں اور بعض روایتوں کا اشارہ ضعیف الایمان عقب ماندہ افراد کی طرف ہے جو وہاں پر ہیں ہم انہی چند نمونوں پر قناعت کرتے ہیں:

(۱)۔امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک روایت میں آیہ شریفہ "وبینہما حجاب وعلی الاعراف رجال' کے بارے میں سوال کے جواب میں فرمایا:

سور بین الجنة والنار

اعراف بہشت اور دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہے۔[2]

تفسیر طبری میں یہی مطلب امام محمد باقرؑ سے نقل ہوا ہے۔[3]

(۲)۔"وعلی الاعراف رجال۔۔۔" کی تفسیر میں امام باقر علیہ السلام نے فرمایا:

نزلت فی هذه الا مة والرجال هم الائمة من ال محمد۔ قلت: فالا عراف؟ قال صراط بين الجنة والنار، فمن شفع له الامام منا من المومنين المذنبين نجا، ومن لم يشفع له هوی۔

یہ آیت اس امت کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور رجال سے مراد آل محمدؐ کے امام ہیں۔

راوی کہتا ہے: میں نے پوچھا:

پس اعراف کیا ہے؟

فرمایا:

بہشت اور دوزخ کے درمیان ایک راستہ ہے، گنہگار مومنین میں سے جس کسی کی شفاعت ہم آئمہ میں سے کوئی ایک کرے گا وہ رہائی پائے گا اور جس کی شفاعت نہ کرے وہ سقوط کر جائے گا۔[4]

اس روایت میں اعراف کا معنی بھی بیان ہوا ہے اور اس میں موجود دونوں جماعتوں کا ذکر بھی ہے۔

---

[1] تفسیر اثناعشری جلد ۴ صفحہ ۵۷۔

[2] تفسیر برہان، جلد ۲ صفحہ ۱۸ حدیث ۱۰۔

[3] تفسیر طبری جلد ۸ صفحہ ۱۳۲، طبع بیروت۔

[4] تفسیر برہان، جلد ۲ صفحہ ۱۸ حدیث ۸۔

(۳)۔مجمع البیان میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت طبرسی مرحوم نے یوں نقل کی ہے:

الا عراف کثبان بین الجنة والنار فیقف علیها کل نبی وکل خلیفة نبی۔ مع المذنبین من اهل الزمان کما یقف صاحب الجیش مع الضعفاء من جنده۔

اعراف بہشت اور دوزخ کے درمیان ایک ٹیلہ ہے جہاں ہر پیغمبر اور اس کا جانشین اپنے زمانے کے گنہگاروں کے ساتھ کھڑا رہتا ہے جس طرح لشکر کا کمانڈر اپنے لشکر کے کمزور افراد کے ساتھ (مشکل راستوں پر) توقف کرتا ہے۔[1]

اسی حدیث کے ذیل میں مکمل وضاحت کی گئی ہے کہ نیک کام کرنے والے لوگ پہلے بہشت میں چلے جائیں گے اور الٰہی افراد اپنے پاس والے گنہگاروں سے کہیں گے کہ اپنے نیک کام کرنے والے بھائیوں کی طرف دیکھو جو تم سے آگے نکل گئے ہیں اور بہشت میں چلے گئے ہیں یہاں گنہگار لوگ ان کی طرف دیکھیں گے اور ان پر سلام بھیجیں گے اور اسی کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

وبادوا اصحب الجنة ان سلام علیکم له یدخلوها وهم یطمعون۔

یہ گنہگار لوگ بہشت میں داخل نہیں ہوئے اور امید رکھتے ہیں کہ (پیغمبر اور امام کی شفاعت کی برکت ہے) بہشت میں چلے جائیں۔۔۔۔۔

پھر اسی طرح سے باقی آیتوں کی یوں تفسیر فرماتے ہیں کہ اعراف اور اس میں موجود دونوں جماعتوں کے بارے میں کوئی ابہام باقی نہیں رہتا، اعراف کے بارے میں چار آیتوں اور ان آیتوں کے آپس میں تعلق کے بارے میں جو تفسیر ہم نے بیان کی تھی، عیناً وہی تفسیر اس روایت سے بھی معلوم ہوتی ہے۔

(۴)۔درالمنثور میں رسول اکرمؐ سے ایک روایت نقل ہوئی ہے، فرماتے ہیں:

یجمع الناس یوم القیامة فیومر باهل اجنة الی الجنة ویومر باهل النار الی النار، ثم یقال لا صحب الاعراف ما تنظرون؟ قالو! اننتظر امرك فیقال لهم ان حسنا تکم تجاوزت بکم النار ان تدخلوها، وحالت

---

[1] مجمع البیان جلد ۳و۴، صفحہ ۴۲۳۔

بینکم وبین الجنة خطایا کم فادخلوا الجنة بمغفرتی ورحمتی۔

خدا قیامت کے دن تمام لوگوں کو جمع کرے گا، بہشتیوں سے کہا جائے گا کہ بہشت کی طرف چلے جاؤ، دوزخیوں سے کہا جائے گا کہ دوزخ کی طرف چلے جاؤ، پھر اصحاب اعراف سے کہا جائے گا کہ تمہیں کس چیز کا انتظار ہے عرض کریں گے: (پروردگار) تیرے فرمان کا انتظار ہے، ان سے کہا جائے گا! تمہاری نیکیوں نے تمہیں جہنم جانے سے بچالیا ہے، لیکن تمہارے گناہ بہشت جانے میں مانع ہو رہے ہیں اب میری رحمت اور مغفرت کے طفیل بہشت میں داخل ہو جاؤ۔[1]

البتہ بہشت میں داخل ہونے کا سبب یہاں پر اعراف کے مردان الٰہی اور شفعاء کی اذن خدا سے شفاعت ہی ہو سکتی ہے۔

(۵)۔ درالمنثور میں ابو سعید خدری سے ایک اور روایت نقل ہوئی ہے کہ رسول خدا سے اصحاب اعراف کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا:

هم رجال قتلوا فی سبیل الله وهم عصاة لا ابائهم فمنعتهم الشهادة ان یدخلوا النار ومنعتهم المعصیة ان یدخلوا الجنة وهم علی سور بین الجنة والنار...... فاذا فرغ من حساب خلقه فلم یبق غیر هم تغمدهم منه برحمة فادخلهم الجنة برحمته۔

وہ ایسے لوگ ہیں جو خدا کی راہ میں شہید ہوئے ہیں جب کہ انہوں نے اپنے والدین کی نافرمانی کی ہے۔ شہادت اُن کے دوزخ جانے میں مانع ہوئی ہے اور والدین کی نافرمانی اُن کے بہشت جانے میں رکاوٹ بنی ہے، وہ لوگ جہنم اور جنت کے درمیان ایک دیوار پر ہوں گے۔۔۔۔۔ جب خدا اپنے بندوں کے حساب کتاب سے فارغ ہوگا اور ان کے علاوہ کوئی باقی نہیں بچے گا تو ان پر اپنی رحمت کرے گا اور اپنی رحمت کے طفیل بہشت میں داخل کر دے گا۔[2]

جیسا کہ پہلے بیان ہوا کوئی مانع نہیں ہے کہ خدا کی رحمت انبیاء اور اولیاء کی شفاعت کے سائے میں ان کے شامل حال ہو۔

بحث معاد کا اختتام:

---

[1] درالمنثور جلد ۳ صفحہ ۸۷۔

[2] درالمنثور جلد ۳ صفحہ ۸۸۔

یہاں پر اعراف اور شفاعت کے مسئلے کے اختتام کے ساتھ معاد کی بحث بھی اختتام پذیر ہوئی جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ارادہ یہ تھا کہ معاد کی تمام بحثیں ایک ہی جلد میں آ جائیں لیکن اس مورد میں قرآنی ابحاث کی وسعت کی وجہ سے ہم نے اسے دو جلدوں میں پیش کیا ہے، البتہ یہ سب معاد کی بنیادی بحثیں تھیں ورنہ ان مباحث کے اطراف میں اور بہت سے مباحث موجود ہیں جن کی طوالت کے باعث ان سے احتراز کیا گیا ہے، امید ہے کسی اور وقت اس کی توفیق ملے۔

خدایا! ہمیں اس خوفناک اور خطرناک لیکن پر برکت و پر رحمت سفر میں تنہا نہ چھوڑ، ہمارا ہاتھ پکڑ لے اور خطرناک جگہوں اور عذاب کے مقامات سے نجات دے اور اپنی جوار رحمت تک پہنچا۔

بار الھا! ہمارے ہاتھ خالی، اعمال ناچیز، گناہ بہت زیادہ، اعمال نامے ہلکے ہیں، ہارے کندھوں پر بار مسئولیت کی سنگینی اور ہماری امیدیں تجھ سے وابستہ ہیں۔

پروردگار!

تیری رحمت وسیع، تیرے الطاف بیکراں، تیرا کرم بے انتہا اور تیری محبت ولطف ہمہ گیر ہے، تجھے تیرے اولیائے کرام کی قسم ہے کہ اس دن اپنی عنایات ہمارے شامل حال کردے اور اپنی لقاء کے شراب سے مرمست اور اپنے دیدار کے عشق سے بہرہ مند فرمادے۔

امین یا رب العالمین

قرآن میں معاد کے بحث

اور چھٹی جلد کا اختتام

۲۷ رذیقعدہ ۱۴۱۱ ہجری۔